کاروانِ احرار

مکمل

تاریخ

آزادی کی جدوجہد

جانباز مرزا

طبع اوّل

ناشر ـــــ مکتبہ تبصرہ لاہور

طابع ـــــ وفاق پریس میکلوڈ روڈ۔ لاہور

اشاعت اوّل ـــــ ایک ہزار

کتابت ـــــ مقصود احمد۔ لاہور

تاریخ اشاعت ـــــ ستمبر۔ ۱۹۷۵ء

قیمت ـــــ ۲۵/- پچیس روپے

سلام پہنچے

اُن سعید رُوحوں کو جنھوں نے اِسلام کی حِفاظت، وطنِ عزیز کی آزادی اور انسانیت کے لیے سامراجی طاقتوں سے جہاد کیا۔

جانباز مرزا

بخیلی ہوگی

اگر میں ڈاکٹر محمد جہانگیر خاں ڈائریکٹر ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان لاہور کا شکریہ ادا نہ کروں - جنہوں نے گاہے گاہے میری اس تصنیف کے سلسلے میں میرے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا۔ اس طرح حسب ذیل مصنفین کا بھی شکر گزار ہوں، جن کی کتب میرے لیے بے بہا خزانہ ثابت ہوئیں - ان میں

۱- شاہراہِ پاکستان مصنفہ چودھری خلیق الزمان -
۲- محمد علی جناح مصنفہ بولائتھو -
۳- نامۂ اعمال مصنفہ سر محمد یامین خاں -
۴- دوسری جنگ عظیم مصنفہ لوئس ایل - سنائیڈر - مترجم غلام رسول مہر
۵- کانگریس مصنفہ ڈاکٹر بی پٹا بھائی سیتا رامیہ -
۶- دنیا کی بساطِ سیاست مصنفہ مولانا مظہر علی اظہر
۷- مارشل لا سے مارشل لا تک مصنفہ سید نور احمد -
۸- مضامین رئیس الاحرار مرتبہ محمد احمد رحمانی لدھیانہ (انڈیا)

اور پنجاب لائبریری کے منتظمین کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان کا دستِ تعاون ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔

جانباز - مرزا

ہم اپنے وقت میں تیغِ ادا سے گزرے ہیں
وفا شعار تھے لیکن جفا سے گزرے ہیں
ہزار بار وہ زنداں میں آزمائے گئے
خدا کے ہو کے جو راہِ خدا سے گزرے ہیں

○

نگاہِ شوق میں کارِ جہاں سے گزرے ہیں
مکاں، مکان رہا، ہم لامکاں سے گزرے ہیں
ہمیں افسانہ سمجھ کر نہ بھول جاؤ ندیم!
کبھی تو ہم بھی تیری داستاں سے گزرے ہیں

○

خرامِ ناز میں سرو و سمن سے گزرے ہیں
صبا کے دوش پہ صحنِ چمن سے گزرے ہیں
جنہوں نے موت کو راہِ حیات جان لیا
وہ رسن و دار سے بھی بانکپن سے گزرے ہیں

○

جنونِ شوق میں قلب و نظر سے گزرے ہیں
ہم اپنی راہ میں شمس و قمر سے گزرے ہیں
بلند عزم، ارادے میں بانکپن لے کر
تیرے جہان کے شام و سحر سے گزرے ہیں

— جانباز مرزا

شکریہ!

بگڑے ہوئے معاشرے نے اپنے لیے لٹریچر بھی ویسا ہی قبول کر لیا۔ ان حالات میں رائٹر کا قلم اور اشاعتی ادارے برائی کے سانچے بن کر رہ گئے ہیں۔ ایسے میں زیرِ نظر کتاب کی اشاعت ہمالیہ پہاڑ کو سر کرنے کے مترادف تھی۔

ذاتِ باری تعالیٰ ان دوستوں کو جزائے خیر دے جنہوں نے "کاروانِ احرار" کی خریداری قبل از اشاعت قبول کر کے ادارہ کی حوصلہ افزائی کی۔ ورنہ کتابِ ہٰذا کی اشاعت ناگزیر تھی۔

ادارہ مکتبہ تبصرہ۔ ۴/۷۔ گلشن کالونی

شادباغ۔ لاہور

آئینہ

تاریخ آئندہ نسلوں کی امانت ہوتی ہے۔ اگر اس کے سنبھالتے میں مؤرخ کسی موڑ پر ٹھوکر کھا جائے تو نہ صرف مستقبل تاریک ہو جاتا ہے بلکہ ماضی کے مشکوک ہو جانے کا ڈر رہتا ہے۔ تو میں اسی روزن سے اپنے نقش و نگار دیکھتی ہیں اور اسی پگڈنڈی کے سفر پر انہیں اپنی منزل کے نشان ملتے ہیں۔ گذشتہ نصف صدی کی تاریخ برصغیر سے جو ناانصافیاں ہوئیں، اس دور کا مؤرخ اس کا سب سے بڑا مجرم ہے۔ اس نے اپنے ضمیر کے ساتھ قلم کا وقار بھی ضائع کیا۔ غلامی سے آزادی تک پہنچنے میں جن دشوار راہوں سے قافلہ ہائے حریت کو گزرنا پڑا۔ اگر خاک کے ان ذرات کو ہی گواہ ٹھہرا لیا جاتا، جن پر مجاہدین آزادی کے نشان ہنوز تازہ دکھائی دیتے ہیں۔ تو حقیقت کے رقم کرنے میں شرمندگی نہ ہوتی۔ لیکن ٹوٹ جائیں مؤرخ کی انگلیاں کہ اس کی ذاتی مصلحت نے حقیقت کے بگاڑ میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

تقسیم برصغیر کے بعد نام نہاد مؤرخین کا قلم اقتدار کے اشاروں پر رقص کرتا رہا۔ اور یہی وہ موڑ ہے جہاں پہنچ کر مؤرخ نے حقیقت کی بجائے افسانوں کا سہارا لیا۔ مآل کار تاریخ کا طالبعلم واقعات کی تلاش میں گم ہو گیا۔ ورنہ غیر ملکی حکومت نے ڈیڑھ صدی کے ظلم و جور سے جو نقوش چھوڑے تھے۔ ان پر خون ناحق کے چھینٹے اس طرح چمک رہے ہیں۔ کہ حقیقت کی تلاش کوئی مشکل نہیں تھی۔ لیکن اغراض کے اندھیرے میں کھویا ہوا مورخ اقتدار کے کھونٹے سے ایسا بندھا کہ اس کا ضمیر تک مفلوج ہو کر رہ گیا۔

واقعات اس قدر دور نہیں گئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے نقش پا ڈھونڈنے میں دقت ہوتی۔ مگر جو انداز اختیار کیا گیا اس نے آئندہ نسلوں سے وہ تصویر چھین لی۔ جس کی ٹیڑھی سیدھی لکیروں سے وہ راہِ مستقیم تلاش کرتیں۔ اسی طرح شبہات جنم لیتے ہیں کہ تاریخ کو مسخ کرنے میں کوئی پرایا ہاتھ کام کر رہا ہے۔

پاکستان کی ابتدائی عنانِ اقتدار جن افراد کے ہاتھوں میں رہی انہوں نے گیارہ برس تک جوان نسل کو یہ تاثر دیا کہ پاکستان صرف ۱۹۴۰ء کی قرارداد کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ یہی لوگ اگر اپنی ہی تاریخ صحیح خطوط پر مرتب کرتے تو انہیں اپنا سامنہ لے کر رہ جانا پڑتا۔

برصغیر کی جنگ حریت میں مسلمانوں کا کردار دیگر اقوام ہند سے بہر طور کم نہیں رہا۔ کالا پانی پھانسی کا تختہ اور جیل خانوں کی دیواروں تک کوئی مقام اور جگہ ایسی نہیں جہاں مسلمان کی شہادت کے نشان نہ ملتے ہوں۔ جلیانوالہ باغ اور قصہ خوانی بازار کی لاشیں اگر الٹ پلٹ کر دیکھی جائیں تو ان میں بھی مسلمان شہدا کی تعداد وافر ملے گی۔ لیکن تن آسان لوگوں نے اس حقیقت پر اس طرح سیاہی پھیر دی کہ جب تو میں ترازو لے کر بیٹھیں تو پاکستان کا مسلمان تہی دامن تھا۔

قرارداد پاکستان اپنی جگہ ایک واقع ہے۔ لیکن اسی ایک واقعہ کو ساری داستان کا عنوان قرار دے لینا اپنے وجود کی نفی کے برابر ہے۔

جو بات ہو چکی اس پر تکرار لا حاصل ہے۔ آؤ! رہے سہے مٹی کے ڈھیر سے جواہرات تلاش کریں۔ شاید کسی موتی سے حقیقت کا کھوج مل سکے۔ میرا عزم اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بکھرے ہوئے اوراقِ پارینہ اور کھوئی ہوئی داستان تلاش بسیار کے بعد آئندہ نسل کے سپرد کر رہا ہوں۔ کیونکہ حقیقت اور مجاز میں امتیاز کا حق انہی کو حاصل ہے۔ جبکہ موجودہ جوان کھیپ کو پہلے غیر ملکی حکمرانوں نے اور تیس سال گذشتہ سے اپنے قلمکاروں نے حالات و واقعات سے بیگانہ رکھا۔

اگر زندگی نے وفا کی تو کاروان احرار چار جلدوں میں مکمل کرنے کا ارادہ ہے۔ (انشاء اللہ) جلد اول حاضر ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ۱۹۲۷ء سے سیاسی تاریخ کے صحیح خدو خال نمایاں کروں۔ اگر کہیں کوتاہی ہوئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔

سه

میرا یہ دل بھی لے لو وقتِ زینت کام آئے گا
یہ آئینہ ہے جب زُلفیں بنانا، دیکھتے جانا

آپ کا جانباز مرزا
۲۴-مئی ۱۹۷۵ء، لاہور

ع
جوانی سے
چلی بات
بڑھاپے تک پہنچی

مصنّف
کے
دو
رُوپ

کتاب سے پہلے صاحب کتاب کا سمجھنا ضروری ہے۔

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

فطرت انسان کو ماں کی کوکھ سے جنم دینے کے بعد جب کارگاہ عالم میں چھوڑتی ہے، تو انسان ان راہوں سے بیگانہ ہوتا ہے جن پر زندگی کا سفر طے کر کے اسے موت تک پہنچنا ہوتا ہے۔ نہ تو ستاروں کی نبضیں ٹٹولنے والے منجم ہی جانتے ہیں کہ اس ہیولے کو کن آندھیوں کے تھپیڑے سہنے پڑیں گے۔ اور نہ ہی ریاضی دان بتا سکتے ہیں کہ ہواؤں کے کون سے جھونکے سکون دیں گے یا بادِ سموم کس انداز سے اسے بیدار کرے گی۔

اس کے قدم پہاڑوں کی بلندیاں اور سمندر کی گہرائیاں کیسے ناپ سکیں گے۔ مگر انسان ہے کہ چلتا جا رہا ہے۔ نہ دھوپ کی تمازت راستے کی روک بن سکتی ہے۔ نہ ساون بھادوں کی گھٹائیں زُلفِ یار میں الجھا سکتی ہیں۔ بہار و خزاں کے موسم آتے ہیں اور بیت جاتے ہیں۔ نگاہیں اٹھ اٹھ کے بیٹھ جاتی ہیں۔ غم آرزو اور غم روزگار خاصۂ زندگی ہونے پر بھی انسانی عزم سے مات کھا جاتے ہیں۔ مصائب و آلام بھی کئی روپ دھار کر نشاط انگیز زندگی میں مخل ہوتے ہیں۔ اور کبھی کبھار مصیبت انسان کو خود اُن پگڈنڈیوں پر چلنے کی دعوت دیتی ہے جن کی ایک ٹھوکر سے مقصدِ حیات کی تمام عمارت دھڑام سے نیچے آ رہتی ہے۔ ؎

ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے۔ سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

انسان اور موت کے مابین ہاتھا پائی کو صدیاں بیت چکیں۔ یہ جنگ آج لاانہ فیصلے کی منتظر نہیں۔ موت اپنی لاج چاہتی ہے اور انسان اپنی فتح کے منصوبے باندھ رہا ہے۔

تاہم یہ افسانہ نہیں کہ عقلِ انسانی نے موت کے اکثر دروازے مسدود کر دیئے ہیں۔
بیتے دنوں کی بات ہے کہ بعض امراض کے اچانک حملوں سے انسانی آبادیاں صحراؤں میں تبدیل ہو جاتیں۔ جنازوں کے جلوس گورکنوں کی مصروفیت بڑھا دیتے اور زمین کا دامن مردوں سے اس قدر بھر جاتا کہ اسے اپنی تنگ دامنی کا گلہ رہتا۔
۱۹۰۴ء کا سال موت اور زندگی کے درمیان کشمکش کا انتہائی سال تھا۔ اس سنہ میں متعدی امراض (پلیگ اور ہیضہ) کا رخ پنجاب کی سمت رہا۔ ان موذی امراض نے گھروں کے گھر خالی کر دیئے۔ اسی زہریلے موسم میں میرے چار جواں سال بھائی موت کی آغوش میں چلے گئے۔ ان بے کس ماؤں کی سسکتی ماتاؤں میں میری والدہ (محترمہ کرم بی بی) کی چیخ و پکار بھی شامل ہو گئی جن کی گود سے موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان کے لعل چھین لیے تھے۔
گو ماں کی گود خالی نہیں تھی۔ ان کا ایک اور بیٹا تھا (مرزا محمد عبداللہ) لیکن ہنستے کھیلتے کھلونوں کا ٹوٹ جانا، ماں کی دنیا ویران کر گیا۔ وہ پھر اٹھیں اور صنم کدوں سے توحید کے دروازوں تک پہنچیں، آنسو بہائے۔ پیروں فقیروں کے مزارات پر چراغ جلائے۔ خالی گود کی بہار کے لیے دعائیں کیں۔ وقت اور موت کا شکوہ کیے بغیر وہ اپنی پیشانی درِ خالق پر رکھے ہوئے ایک مدت پڑی رہیں۔ آخر کو شاخِ تمنا ثمر آور ہوئی۔
ماں اولاد کے لیے گنجِ گراں مایہ ہے۔ اس کی ممتا بھری گود اپنے لختِ جگر کیلئے کبھی تہی نہیں رہی۔ وہ خونِ جگر کی آمیزش سے اس پودے کو بہار بخشتی ہے۔ اس کی دعا اور بددعا کے لیے درِ قبولیت ہمیشہ وا رہتا ہے۔
سات سال کی مسلسل آرزوؤں، دعاؤں اور دُکھ بھری ممتا کی التجاؤں کے بعد ۴۔ ستمبر ۱۹۱۱ء کو امرتسر کوچہ عثمان ڈار میں میرا جنم ہوا تو گھر کے اداس چہرے پر رونق آ گئی۔ پلکوں پر مسرت کے چراغ جگمگا اٹھے۔ سسکتی آہوں نے قہقہے بکھیرے۔ ماں کی ویران تمنائیں انگڑائی لینے لگیں۔
میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس سال کی سیاست کس رخ پر تھی۔ تاہم تاریخ کے

مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بادل یورپ کے افق پر جمع ہو رہے تھے۔ مغربی سیاستدان ریاست ہائے بلقان پر قبضہ جمانے کے نقشے لکیر رہے تھے۔

محلے کی بڑی بوڑھیوں کا کہنا ہے کہ والدہ محترمہ مجھے آٹھوں پہر گود میں لیے پھرتی رہتیں۔ یہاں تک کہ میری عمر نو برس کی ہو چکی تھی لیکن ماں کا پیار مجھے کندھوں پر لیے پھر رہا تھا۔ ماں کی محبت ہنوز تشنہ تھی کہ ۱۹۲۱ء کے وسط میں میرے والد محترم (مرزا نور محمد صاحب) کا انتقال ہو گیا۔

والد محترم کی موت اور میرا بچپن ۔ دوگونہ مشکلات والدہ کی مسلسل بیماری کا باعث بنیں اور والد کی فوتیدگی کے چھ ماہ بعد وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میری عمر اس وقت شاید دس برس کی ہو گی کہ میں والدین کی شفقت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ اولاد کے لیے ماں کیا ہوتی ہے۔ باپ انگلی سے لگائے رنگین کائنات سے کیونکر گذارتا ہے۔ میں اس رسم سے بیگانہ رہا۔ یتیمی کے ایک ناخوشگوار جھونکے نے مجھے بھائی اور بھاوجہ کی گود میں لا پھینکا۔ اس منزل پر ایک کی محبت اور دوسرے کی نفرت نے مجھے اہلِ محلہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اور میں وقت کی بے رخی کا شکوہ کیے بغیر حادثات کی ٹھوکریں کھانے لگا۔

تحریکِ خلافت یہ دن تھے جب ہندوستان کے عوام ترکوں کی حمایت میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم اٹھائے گلی کوچوں میں پھر رہے تھے۔ ہندو، مسلمانوں کی ٹولیاں جلوسوں اور جلسوں کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی میں بھی اپنے ہم عمر بچوں کا جلوس بنا کر تمام محلے میں گایا کرتا تھا۔

سہ! غازی مصطفےٰ پاشا کمال دے ۔ تیریاں دور بلائیں
کر بکرے یونانی حلال ۔ وے بیبا! دنگ قصائیاں

یہ اس نظم کا ایک شعر ہے جو ان دنوں ہر ایک کی زبان پر تھی۔ میری آواز میں قدرتی حسن تھا۔ لوگ دکانوں کے تختوں پر بٹھا کر مجھ سے یہ نظم سنتے۔ گھروں میں عورتیں یتیم سمجھ کر بلا لیتیں۔ کہیں سے کھانا اور کہیں سے آنہ، دو پیسے خرچنے کو بھی مل جاتے۔

یہی روزمرہ کا معمول بن گیا اور وقت آگے بڑھتا رہا۔ کبھی کبھار بھاوجہ کی شکایت پر بھائی پٹائی بھی کرتے اور خوب کرتے۔

پہلی سزا

خلافت اور عدم تعاون کی مشترک تحریکیں زوروں پر تھیں۔ ملک بھر میں گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ میں ہم عمر بچوں کا جلوس لیے محلے کی گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ خلافت زندہ باد کے نعرے لگتے۔ نظم پڑھتا اور شام ہو جاتی۔ اس دوران ایک دن بھاوجہ نے سوال کیا "تو جو کہہ رہا ہے کہ گر بکرے یونانی حلال دے بیبا دانگ قصائیاں"

تجھے پتہ ہے! یہ کتنا بڑا جرم ہے"؟

"میں نہیں جانتا" اور واقعہ بھی یہی ہے کہ مجھے اس وقت اس ساری کہانی کا کوئی علم نہیں تھا۔ یونانی کون ہوتے ہیں؟ کمال پاشا کیا ہے؟ میں ناآشنا تھا۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ جب میں نظم پڑھتا ہوں تو لوگ میری آواز اور یتیمی پر ترس کھا کر مجھ سے پیار کرتے۔ اگر کوئی کہہ دیتا کہ یہ یتیم ہے تو میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو تیرنے لگتے۔ ماں کی محبت اور باپ کا پیار یاد آجاتے۔ کل جن گلیوں میں ماں کی گود میرا جھولنا تھی۔ آج ان گلیوں میں میں دوسروں کے رحم و کرم پر تھا۔

"یونانی بکرے، انگریزوں کو کہتے ہیں۔ اور تو ان کے ہلاک کرنے کا درس دے رہا ہے۔ اگر کسی نے پکڑ لیا تو؟"

انگریز ہوں یا کوئی اور۔ لوگوں کے ساتھ اگر میں بھی پکڑا گیا تو کیا ہوگا"۔ میرے اس جواب پر بھاوجہ کی بھنویں تن گئیں۔ اور رات کو بھائی دکان سے آئے تو تمام رام کہانی سنا دی۔ بس پھر کیا تھا۔ خوب پٹائی ہوئی۔ صبح ہوتے ہی گھر کے سامنے کنویں کی منڈھیر پر محلے کے بچوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے پھر وہی نظم دہرائی۔ میری اس حرکت سے بھاوجہ کو چڑانا مقصود تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ ابھی نظم کے دو شعر ہی کہے تھے کہ اچانک پولیس کا سپاہی کہیں سے آنکلا۔ وہ مجھے پکڑ کر گلوالی گیٹ کے تھانے میں لے گیا۔ یہ ہمارے حلقے کا پولیس تھانہ تھا۔ کافی دیر بٹھائے رکھنے کے بعد انچارج تھانہ کے حکم سے مجھے

چار بیت لگانے کا حکم ہوا - یہ بیت حد اسفل پر لگے اور اس کے ساتھ تھانہ انچارج نے میرے کان کھینچ کر دو تھپڑ بھی رسید کیے۔ اس سزا کی صدائے بازگشت جب برادر اکبر کے کانوں تک پہنچی تو بجائے ہمدردی کے اس نے ایسے کلمات کہے، جن کی تکلیف پولیس کی مار سے زیادہ محسوس ہوئی -

یہ اس سفر کی ابتدا تھی جس نے آگے چل کر ایسے کانٹے چبھوئے کہ جن کی چبھن زندگی بھر ارتعاش پیدا کرتی رہی۔ پولیس تھانہ کی ہلکی سی سزا عمر بھر کے لیے ایسا زخم چھوڑ گئی جس کی مرہم نہ مل سکی۔

آدمی کو حیاتِ مستعار کے لیے غمی اور خوشی کے درمیان رہ کر زندگی کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ کہیں سنگلاخ وادیاں اس راستے میں پڑتی ہیں اور کہیں گلہائے رنگا رنگ کی زیبائش سے گذرنا پڑتا ہے۔ موسموں کے جوار بھاٹا تو اس راہ کے کھلونے ہیں۔ اگر عزم میں پختگی نہ ہو تو قدم قدم پر جی ہار کر بیٹھ جانا کوئی مشکل نہیں۔

میری زندگی کے ہنوز بارہ برس پورے نہیں ہوئے تھے کہ تلخیِ حیات کے کئی گھونٹ حلق سے اتر گئے! اس عرصہ میں بہار و خزاں کے موسم آئے۔ گلوں کی کیاریوں میں نکھار ابھرا۔ ندی نالوں میں حباب اٹھے۔ ساون بھادوں نے گل بوٹوں کو اجلے لباس دیئے۔ مگر میرے دل کی کشتِ ویراں میں بہار کو نہ آنا تھا، نہ آئی۔ عیدین اور شبِ برات کی خوشیاں میرے مقدر میں کہاں تھیں۔ ان مواقعوں پر بچوں کے نئے کپڑے میرا دل میلا کر دیتے، میں آنسوؤں سے منہ دھو لیتا۔ مگر دل کا داغ کون صاف کرتا۔ برادرِ اکبر انہی دنوں ہندوستان سے باہر سفر پر چلے گئے اور بھاوج نے میکے کی تیاری کر لی۔ اس طرح رہے سہے سہارے بھی ٹوٹ گئے۔

میرے ایک تایا تھے (فتح دین) وہ اس سال ساٹھ برس کے پیٹے میں تھے اور نابینا۔ میرا بچپنا اور ان کا بڑھاپا دن بھر متصادم رہتے۔ جو وہ کہتے۔ میں اکثر ٹال دیتا۔ میری ضروریات بھی انہی کے تابع تھیں۔ لیکن جب میں ان سے غداری برتتا، تو وہ بھلا میری کیوں مانتے۔ وہ گرہ کے پکے تھے اور میرا لاابالی پن تھا۔

وہ پیسے دیتے تو میں روٹی لے آتا ورنہ رات بھر فاقے سے گذر جاتی۔ کئی راتیں یونہی بیت گئیں۔ ایسے میں کئی بار ان کا دامن چھوڑنے کو جی چاہا۔ مگر جاؤں تو کہاں جاؤں؟ جالندھر شہر میں میرے ماموں رہتے تھے۔ یہ سفر امرتسر سے باون میل کا تھا۔ ریل کا کرایہ کہاں سے آتے۔ آخر پیدل سفر کا قصد کر کے بھوکا نکل کھڑا ہوا۔ ٹھٹھرتا ہوا موسم۔ مسافت کی تلخیاں رات کی سرد ہواؤں سے لڑتا جھگڑتا۔ چار روز بعد جالندھر پہنچا۔ راستے کی بھوک، تہی دامنی۔ جب ماموں کے گھر پہنچا تو انہیں میری پہچان میں خاصی دقت ہوئی۔

ایک سال بعد بھائی سفر سے واپس آ گئے تو پھر انہی کے ہاں چلا آیا۔

تعلیم

بچپنا بھی زندگی کی عجیب پگڈنڈی ہے۔ اس موڑ پر شاہی ہو کہ فقیری انا پیوں میں کھیلتی نظر آتی ہیں۔ اس بازار میں بڑے بوڑھوں کی پگڑیاں بازیچۂ اطفال بن کر رہ جاتی ہیں۔

جہاں عقل اور عمر نابالغ ہوں وہاں گناہ و ثواب کی بحث فطرت سے جھگڑا مول لینے کی بات ہے۔

میرے سمیت اپنے محلے میں آٹھ لڑکوں کی ایک ٹولی تھی۔ سارا محلہ اس ٹولی کی شرارتوں سے اس قدر پریشان تھا کہ گھروں میں عورتیں اور دکانوں پر دکاندار ہم سے پناہ مانگتے تھے۔ ہر شام محلے کی ایک آدھ مرغی غائب ہو جاتی تھی۔ اس کا مجرم خواہ کوئی ہو لیکن یہ جرم بھی ہمارے پلے پڑتا۔ کشمیری ہاتو اکثر ہمارے محلے میں رہائش کرتے تھے۔ ان غریب مزدوروں سے اگر کوئی چھیڑ خانی کرتا تو اس میں بھی ہمیں ہی ملوث کیا جاتا۔

ایک دن ہمیں بھی کشمیری ہاتوؤں سے مذاق کی سوجھی۔ چنانچہ ان کے مکان کی چھت پر چڑھ کر روشن دان سے ایک اینٹ پھینکی۔ غریب ہاتو دکان کے اندر اپنے ہم وطن لوگوں کے ساتھ رات کے وقت لیمپ جلا کر درزی کا کام کیا کرتے تھے۔ اوپر سے اینٹ جو گری تو لیمپ ٹوٹ گیا۔ وہ شور مچاتے بازار میں آ نکلے۔ اب سارا بازار ہماری اس حرکت پر لال پیلا ہو گیا۔ اس ہجوم میں ہم سب بھی موجود تھے۔ "کیا ہوا ہاتو؟"

بدقسمتی کہیے کہ یہ سوال میں نے ہی کیا۔ کہ اتنے میں مجمع سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا۔ "کرتے بھی خود ہی ہو اور پوچھتے بھی ہو!" میں نے ہمت کہا کہ "میں بے گناہ ہوں"۔ مگر صاحب! سنتے کون ہے؟ جس نے کہا یہی کہا۔ "تم نے تمام محلے کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ خدا پناہ تم سب لڑکوں سے۔"

مجھے چونکہ ان سب کا رنگ لیڈر سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا یہ مقدمہ میرے بھائی کے پاس پہنچا۔ انہوں نے ساری روئیداد سن کر پہلے تو لیمپ کی قیمت ادا کی اور پھر جو میرا حشر ہوا، یہ قصہ کہنے کا نہیں۔ مختصر یہ کہ ہاتھوں کے جرم کی سزا سارے جسم کو بھگتنا پڑی۔ اور کئی روز تک درد و کرب میں مبتلا رہا۔

ہماری انہی حرکات کے باعث محلہ کے بعض نیک خصلت لوگوں نے ایک نائٹ سکول کا اہتمام کیا۔ اس سکیم کا کسی طرح ہماری ٹولی کو بھی پتہ چل گیا۔ پہلے تو سکول کا محل وقوع دریافت کیا۔ پھر ساتھیوں کی مدد سے اس میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا گیا۔ داخلے کے لیے کوئی فیس نہیں تھی۔ اس لیے یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ میرے ساتھ میرا ایک ہم نام بھی سکول میں داخل ہوا۔ ہماری ٹولی میں یہ بھی اوپر کے درجے کا اڈی تھا۔ جیسے ہی ہم دونوں نے سکول میں قدم رکھا۔ تمام لڑکوں اور اساتذہ کو حیرت ہوئی۔ ہماری ایک ایک حرکت پر کڑی نگاہ رکھی گئی۔ بہرحال پہلا دن بخیریت گذر گیا۔ اپنی شرافت کا سکہ جمانے کے لیے ہم نے کوئی شرارت نہ کی۔ خدا خدا کر کے رات نو بجے چھٹی ہوئی۔ گھر پہنچنے تک ساڑھے نو بج چکے تھے۔

سرما کی راتیں سر شام اپنا سفر شروع کر دیتی ہیں۔ گویا جب میں گھر پہنچا تو رات اپنا نہائی سفر ختم کر چکی تھی۔ اس سے پیشتر بھائی محلے بھر میں مجھے تلاش کر چکے تھے کیونکہ میں انہیں اطلاع دیے بغیر سکول چلا گیا تھا۔ جیسے ہی میں نے آواز دی۔ وہ ڈنڈا ہاتھ میں لیے باہر نکلے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بغیر کسی گفتگو کے گلی میں پٹائی شروع کر دی۔ آخر میں نے کہا۔ "میں کوچہ میلاناں میں جو نیا سکول کھلا ہے۔ اس میں پڑھنے بیٹھ گیا ہوں۔ انہیں میری بات کا یقین تو نہ آیا۔ لیکن بقیہ کارروائی دوسرے دن

کی تحقیق پر ملتوی کر دی گئی۔ چنانچہ اگلے روز وہ خود سکول تک ساتھ گئے۔ اور سامنے والی دکان پر بیٹھے رہے۔ چھٹی ہونے پر حلوائی کی دکان سے ساڑھے تین پیسے کا پاؤ دودھ اور دھیلے کا پتاشہ ڈلوا کر دودھ پلایا اور گھر لے آئے اور روزانہ کا یہی معمول ٹھہرا کہ وہ سکول کے سامنے والی دکان پر بیٹھے رہتے۔ چھٹی ہوتے پر مجھے دودھ پلا کر ساتھ لے آتے۔ سکول میں بھی اچھی خاصی ساکھ بن گئی کہ میں شرارتی نہیں ہوں۔ اس طرح اردو کا پہلا قاعدہ باقی لڑکوں سے امتحان میں اول پوزیشن میں رہ کر ختم کیا۔ اس پر مجھے سکول کی طرف سے مٹھائی ملی۔ گھر آیا تو اور خوشی ہوئی۔ اس خوشی میں صبح گلی کے بچوں میں میرے پاس ہونے پر میٹھے چنے تقسیم کیے گئے۔

سکول میں اب پہلی جماعت کی پڑھائی شروع ہو چکی تھی۔ اساتذہ میں ایک ایسے بزرگ بھی تھے جن کی طبیعت کا نسب نامہ غالباً قصابوں سے ملتا تھا۔

بچے مار سے نہیں، پیار سے کام دیتے ہیں۔ تعلیم کا ابتدائی دور بچوں کی ضرورت کا نہیں والدین کی خواہش کا ہوتا ہے۔ وہ اگر سکول جاتے ہیں تو بادلِ نخواستہ۔ اگر تعلیمی درسگاہوں میں بجائے پیار کے تشدد سے تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیا جائے تو اس تعلیم سے دل و دماغ کو جلا نہیں ملتی۔

موسم گرما میں سکول کی چھت پر کلاس لگتی تھی۔ ٹیچر صاحب ذرا سی لفظی غلطی پر لڑکوں کی پٹائی کرتے۔ کان پکڑی کراتے۔ تیسرا طریقہ سزا کا یہ تھا کہ کوٹھے کی منڈھیر پر کھڑا کر کے منہ کلاس کی طرف اور بیٹھ بازار کی طرف کرا کے کان پکڑی کراتے۔ بچے رو رہے ہیں کہ کہیں بازار میں نہ گر جائیں۔ یہ سزا دو چار منٹ کی نہیں بلکہ آدھ آدھ گھنٹہ گذر جاتا۔ اس ظالمانہ سزا کی شکایت کئی دفعہ سکول کی انتظامیہ تک پہنچی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ لڑکوں نے خود بھی ماسٹر صاحب سے گذارش کی کہ سزا کا یہ طریقہ بدل دیں۔ مگر پانی نے پتھر پر کوئی اثر نہ کیا۔ یہ بھی کہا کہ آپ کان پکڑی ضرور کرائیں لیکن جگہ تبدیل کر لیں۔ کوئی لڑکا اگر چھت سے نیچے گر پڑا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس درخواست کو مسکرا کر ٹال دیا گیا۔

مجھے سکول میں داخل ہوئے تیسرا مہینہ تھا۔ اس دوران شرارتوں سے تائب ہو چکا تھا۔ لیکن ماسٹر صاحب کی ان زیادتیوں کے باعث توبہ توڑنی پڑی۔ اپنے ہمنام کے علاوہ دو لڑکے مزید اپنے ساتھ کر لیے۔ انہیں ہدایت دی کہ جیسے ہی ماسٹر صاحب کل سکول میں داخل ہوں تم پہلے چیخنا چلانا اور جب وہ تمہارے پاس آئیں تو خاموش ہو جانا۔ چنانچہ اس ایک عمل سے ماسٹر صاحب قدرے گھبرا گئے، لیکن اتنا نہیں۔ دوسری حرکت یہ کی کہ ان کی قمیص پیچھے سے کرسی کے ساتھ باندھ دی۔ کلاس میں کئی لڑکوں نے بیک وقت کھانسنا شروع کر دیا۔ ماسٹر صاحب کو لڑکوں کی اس حرکت پر غصہ آیا۔ وہ جلدی میں کرسی سے اٹھے تو قمیص پھٹ گئی۔ اس پر انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ساری کلاس کی منڈھیر پر کان پکڑی کرا دی۔ اب لڑکے اپنی سزا پر زیرِ لب مسکرا بھی رہے ہیں اور ماسٹر صاحب کو کوس بھی رہے ہیں۔ اس دوران چھٹی کی گھنٹی بج گئی اور آج کا دن یوں ختم ہوا۔

دوسرے دن پڑھائی شروع ہونے سے پیشتر ماسٹر صاحب نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا۔ ایسے میں کسی شرارت کا موقعہ کہاں تھا۔ خیر — تھوڑی دیر بعد ماسٹر صاحب نے املا لکھانی شروع کی۔ تھوڑے وقفے کے بعد وہ مجھے کنکھیوں سے دیکھ لیتے۔ اتنے میں میرے ہم نام کی نظریں مجھ سے ملیں۔ بس کام شروع ہو گیا۔ یعنی دوسرے دونوں لڑکے مصنوعی طور پر آپس میں الجھ پڑے۔ ماسٹر صاحب ردل پکڑے ان کی طرف بڑھے۔ میں نے ان کی واپسی تک پیپر پن ان کی نشست کے نیچے لگا دیا۔ جیسے ہی وہ بیٹھے تڑپ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کلاس میں ایک قہقہہ لگا۔ میں نہایت مسکین صورت بنائے نیچی نظریں کیے بیٹھا رہا لیکن ماسٹر میرے سر پر کھڑا گھورتا رہا۔ میری حالت یہ کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ آخر مجھے کان سے پکڑ کر کلاس سے نکال دیا۔ اس روز اتنا ہی کچھ ہوا۔ تیسرا دن چھٹی کا تھا۔ ہفتہ کی شام کو معلوم ہوا کہ ماسٹر صاحب استعفیٰ دے گئے ہیں اس خوشخبری پر تمام لڑکوں نے تالیاں پیٹیں۔ ان کی جگہ نئے ماسٹر صاحب آئے۔ نہایت نیک سیرت اور طلبا سے باپ کی سی شفقت کرنے والے۔ یار لوگوں نے

نئے استاد سے ہمارا غائبانہ تعارف کرا دیا تھا۔ لیکن ہم اس سے بے خبر تھے۔ ایک دن کتاب کی پہلی کہانی

"ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ حقہ پی رہا ہے۔"

پڑھائی جا رہی تھی۔ سبق کی آخری سطریں تھیں کہ ہم دونوں نے باہم مشورے سے اپنی کلاس کے ایک لڑکے کی جوتی اٹھا کر پیڑ کے تنے میں چھپا دی۔ چھٹی ہونے پر متعلقہ لڑکا نہایت اطمینان سے اپنی جوتی پہن کر چلا گیا۔ اب ہمیں فکر ہوئی کہ پھر وہ جوتی کس کی ہے۔ اتنے میں شور اٹھا کہ ماسٹر غلام محمد کی جوتی نہیں مل رہی۔ سچ سچ بتاؤ کس نے چھپائی ہے؟۔ وہیں کھڑے کھڑے ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جلدی سے سکول سے باہر نکل گئے۔ رات جوں توں کر کے گذری۔ دن بھی شام کی فکر میں بسر ہو گیا۔ شام کو ہم سکول میں داخل ہوئے ہی تھے کہ کلاس کے لڑکوں کی نظروں میں مجرم ٹھہرے۔ جن لڑکوں کو کل شام ناکردہ گناہوں کی سزا مل چکی تھی، وہ چٹاخ پٹاخ بول اٹھے۔ لو جی یہ آ گئے جوتی چور۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اتنے میں ماسٹر صاحب تشریف لائے اور بغیر کسی کارروائی کے ہم دونوں کو سکول سے نکال دیا۔ ہم نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہنا چاہا لیکن سنی ان سنی برابر ہو کر رہ گئی۔ اس وقت تو ہم سکول کا وقت ادھر ادھر گذار کر گھر چلے گئے اور فیصلہ کیا کہ کل دوسرے سکول میں داخلہ لیں گے۔

گھر والے ہمارے سنہری کارناموں سے بے خبر تھے۔ چنانچہ دوسرے دن ہم محلے کے دوسرے سکول میں جا پہنچے۔ ہماری کسی بات سے پیشتر ہی متعلقہ سکول کا انچارج آگے بڑھا اور کہا "کیوں بھئی! کیسے آئے ہو؟" "جی ہم سکول میں داخل ہونے آئے ہیں"۔ "پہلے کہاں پڑھتے تھے؟"۔ ہم نے سکول کا نام اور پتہ بتایا تو کہنے لگے "وہاں سے کیوں چھوڑ دیا"۔ "پڑھائی اچھی نہیں تھی جی"۔ "ہوں"! اس ہلکی سی "ہوں" میں نہ جانے کتنے انکار پوشیدہ تھے۔

"پڑھائی تو تمہارے لیے یہاں بھی اچھی نہیں۔ خیر! وہاں سے سرٹیفکیٹ لاؤ

اس کے بغیر داخلہ مشکل ہے۔

دراصل قصہ سرٹیفکیٹ کا نہیں تھا۔ بلکہ ہماری آمد سے پیشتر ہماری شرافت کی کہانیاں یہاں پہنچ چکی تھیں۔ ہمارے نیک کارناموں سے یہ لوگ آگاہ ہو چکے تھے ۔۔ کیسا داخلہ اور کیسی پڑھائی۔

وہ دن جاتے اور یہ آئے کہ میں نے سکول چھوڑ دیا۔ اور سکول نے مجھے۔ گھر میں آسودگی نہیں تھی کہ سرکاری سکول کے اخراجات برداشت کیے جاتے۔ بھائی میری شرارتی طبیعت کے باعث بھی محتاط تھے کہ یہ شرارتیں کرے گا، اور مار کھائے گا۔ وہ خود تو سرزنش کرتے رہتے تھے، لیکن کسی کا ہاتھ مجھ پر اٹھے یہ انہیں گوارہ نہیں تھا۔ بہرحال میری تعلیم کا مستقبل تاریک تر ہو کر رہ گیا۔

شادی

آگے چل کر اس کے نتائج چاہے کچھ ہوں لیکن گھر کے آنگن میں بیٹھ کر معصوم اولاد کی تقدیر کو تدبیر کے دامن سے گرہ دے دینا ہمارے معاشرے کی پرانی ریت چلی آ رہی ہے۔ والدہ محترمہ کی خواہش پر میری نسبت ماموں کی لڑکی سے طے پا چکی تھی۔ ہنوز میں اس منزل سے دور تھا جہاں پہنچ کر ازدواجی زندگی اہم اور ضروری ہوتی ہے۔ لیکن سماج کے رسم و رواج نے مجھے گلیوں میں کھیلتے ہوئے گھریلو ذمہ داریوں کے بندھنوں میں جکڑ دیا۔

تیرہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے کہ مجھ سے میرے کھلونے چھین لیے گئے اور اس پر تاکید یہ ۔۔۔ کہ دامن تر مکن ہوشیار باش۔

بھائی کی محبت اور بھاوج کی نفرت کا جو ڈرامہ گھر میں میرے ساتھ کھیلا جا رہا تھا۔ میری رفیقہ حیات یہ سب کچھ دیکھ کر امرتسر سے میکے چلی گئی۔ مجھے زندگی کے نئے بوجھ کا احساس ہونے لگا۔ بھاوج کے مزاج کی تلخی نے بھائی کی محبت کو سرد کر دیا۔ اس راستے کا روشن چراغ زندگی کی ناہموار راہوں میں گل ہو گیا۔ جس کے بجھتے ہی میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ ان حالات میں بیوی اگر سسرال آئی بھی تو میرے بچپنے کی بے نیازیاں اس کا استقبال نہ کر سکیں۔ ساون بھادوں کی بھیگی راتیں اس کی تمناؤں کا خون

کرتی رہیں۔ آخر اس کی کشتیِ حیات اس کے اپنے آنسوؤں کے ندی نالوں میں ڈوب گئی۔

برس ہا برس گذرنے پر بھی اس کی بے گناہ موت کا داغ جب کبھی یادوں کے دامن پر ابھرتا ہے تو اس گھاؤ کی ایک ٹیس میرے لیے غموں کے ہزاروں افسانے چھوڑ جاتی ہے۔ بے جوڑ ازدواجی زندگی اور بے معنی رسم و رواج کی یہ لمبی لکیر جس پر ان گنت لاشیں تڑپ رہی ہیں۔ جانے کب ختم ہو گی؟۔

سیاسی زندگی

بازارِ سیاست کے نشیب و فراز بھی دولت کے تابع ہیں۔ اس منڈی میں اسی کی چلتی ہے جس کی جیب بھاری ہو۔ تہی دامن ہزار خلوص کے باوجود اس مارکیٹ میں ہلکی جنس کے بھاؤ فروخت ہو جاتا ہے۔ میں اس منڈی کی جنس کیونکر بنا؟ اس سوال کا جواب میرے پاس بھی نہیں۔

۱۹۲۸ء کا سال برصغیر کی سیاست میں ہنگامہ خیزیوں کا مصروف ترین سال تھا۔ ہر ہندوستانی کی رگِ حریت میں آزادی کا خون گردش کرنے لگا تھا۔ گھروں سے قلمکاروں تک کا احساسِ ذمہ داری بیدار ہو رہا تھا۔ غلاموں کے جذبات آزادی کا پرچم اٹھائے ایوانِ برطانیہ کی طرف دوڑ رہے تھے۔ بغاوت کی آگ کے دھوئیں یورپ میں اندھیر مچا رہے تھے۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک اجنبی میری دکان پر آیا۔ بلا کسی تمہید کے کہنے لگا۔ آپ کو قدرت نے بڑی حسین آواز دی ہے۔ اس انمول خزانے سے آپ کو وطن کی خدمت کرنی چاہیے۔ یہ انجانا چہرہ میری نظروں کے لیے بیگانہ نہ تھا۔ پرائے منہ سے نکلی ہوئی بات اپنی معلوم ہوئی۔ تاہم اجنبی کی رائے تفسیر طلب تھی۔

"آواز سے میں وطن کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"تم آزادی کے گیت گاؤ۔ لوگوں کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر اکساؤ۔ ویسے بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے تم پر وطن کی خدمت فرض ہے۔ تمہارے نغمے تمہیں وطن کا جانباز سپاہی بنا دیں گے۔

اجنبی کی بات ایسے لگی۔ جیسے کسی نے میرے بربطِ دل کے خاموش تاروں پر زور سے مضراب دے ماری ہو کہ ہر تار جھنجھنا اٹھا۔ ان کی لے میں پھر وہ نغمے پھوٹے

کہ میں بے اختیار کہہ اٹھا۔

تمنا ہے میری جانباز اپنے دل کے تاروں پر
میں نغمہ زندگی کا موت کی مضراب سے گاؤں

امرتسر سکھوں کے پہلے مذہبی پیشوا گورو رام داس نے آباد کیا تھا۔ مسلمانوں کی کثیر آبادی کے علاوہ یہ سکھوں کا مذہبی مرکز بھی تھا۔ گو شہری تجارت ہندوؤں کے قبضے میں تھی۔ لیکن پشمینے کا کاروبار مسلمانوں کے پاس تھا۔ اس تجارت کے لیے ہندوستان کی دور دراز منڈیوں تک ان کی آمد و رفت تھی۔

ہمارا آبائی پیشہ رنگریزی تھا۔ مگر ان دنوں دھاری دال کے کمبل رنگنے کی ایجنسی ہمارے پاس تھی۔ دکان سکھوں کے مرکز (چوک بابا اٹل) میں تھی۔

شاعر نہ ہونے کے باوجود میں پنجابی کے چند بے ربط مصرعے جوڑ کر رات کانگریس کے جلسے میں جا پہنچا، جو شہر کے ایک محلے میں ہو رہا تھا۔ جلسہ باقاعدہ شروع نہیں ہوا تھا کہ میں نے صدر جلسہ سے ایک نظم پڑھنے کی درخواست کی۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ ایک نوجوان غلام نبی جانباز نظم پڑھیں گے۔

عوام کے روبرو ہونے کا یہ میرا پہلا موقعہ تھا۔ گو دل و دماغ ہمنوا تھے لیکن جسم کا باقی حصہ میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ عوام نے میری نظم پر بڑی داد دی۔ مجمع میری آواز سے مسحور ہو گیا۔ ان دنوں پنجاب کے مشہور قومی شاعر خواجہ عبدالرحیم عاجز کی آواز اور ان کی انقلابی نظموں کا شہرہ تھا۔ جب میں نظم پڑھ چکا تو معلوم ہوا خواجہ صاحب اسٹیج پر تشریف فرما ہیں۔ میں نے بڑھ کر سلام کیا۔ انہوں نے دعا دی۔ اس جلسے کے بعد مجھے کچھ غلط فہمی سی ہو گئی کہ میں شاعر ہوں۔ دوسرے روز ایک دوسرے محلے میں اجتماع تھا۔ میں وہاں بھی بن بلائے جا پہنچا۔ جن لوگوں نے گذشتہ رات سنا تھا۔ انہوں نے خود ہی صاحب صدر سے میری نظم کا تقاضا کیا۔ چنانچہ نظم سے فارغ ہو کر جیسے ہی میں اسٹیج سے اترا۔ ایک صاحب عقیدت کے طور پر میرے قریب آن بیٹھے۔ سیاسی زندگی میں میرا یہ دوسرا دن تھا۔ اس لیے اپنے پرائے میں امتیاز مشکل تھا۔

باتوں باتوں میں اس نے میرا پتہ بھی دریافت کرلیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ دوسرے دن صبح دکان کھلتے ہی یہی صاحب پھر آموجود ہوئے اور یہ ان کا روز کا معمول بن گیا۔ یہ سی۔آئی۔ڈی کا آدمی تھا۔

بھائی سے چپقلش

ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے دو بھائیوں کی طبیعت کا ایک سا ہونا غیر ممکن ہے۔ عادات و نظریات میں بعد۔ کھانے اور پہننے میں اختلاف، گفتار و کردار میں فرق فطرتی امر ہے۔ میرا ذہن برادر اکبر سے بالکل جدا تھا۔ وہ اپنی طبیعت کے خلاف ہلکی سی بات بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔

سی۔آئی۔ڈی کی مسلسل آمدورفت بھائی کی طبیعت پر گراں گذرتی تھی! اچانک ایک دن میری غیر حاضری میں سی۔آئی۔ڈی کے سپاہی نے کہیں بھائی سے پوچھ لیا کہ آپ کے والد کا کیا نام ہے؟ بس جناب! اس کا اتنا پوچھنا تھا کہ بھائی نے اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ اور اس قدر پیٹا کہ اس کے ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ اتنے میں میں پہنچ گیا۔ دکان کے سامنے ایک میلہ سا لگ رہا تھا۔ ہجوم کو دیکھا۔ پھر بھائی کی طرف دیکھا تو وہ غصے سے کانپ رہے تھے۔ دراصل انہیں کہیں سے پتہ چل گیا تھا کہ یہ آدمی سی۔آئی۔ڈی کا ہے۔ اس دن کے بعد کوئی سرکاری آدمی دکان پر نہیں آیا۔

ابتدائی سرگرمیاں

دسمبر ۱۹۲۹ء کی ۲۴ تاریخ تھی۔ اور موسم اپنی آخری سرحدیں عبور کر رہا تھا۔ خزاں کے ڈھلتے سائے بہار کی رنگینیاں پھیلا رہے تھے اس جھٹ پٹے سے موسم میں لاہور راوی کے کنارے کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ اس میں شرکت کے لیے ہزاروں لوگ لاہور جا رہے تھے۔ میرا بھی جی چاہا۔ دکان کے پڑوسی سے مشورہ کر کے لاہور چلا گیا۔ بھائی ننھال گئے ہوئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میرے لیے اور بھی غنیمت تھی۔ دوپہر ڈھلنے پر لاہور پہنچے اسٹیشن پر صدر کانگریس کا جلوس ترتیب دیا جا رہا تھا۔ بھیڑ اس قدر تھی کہ اپنی نحیف جان کے لیے خطرہ پیدا ہوا۔ وہاں سے ہٹ کر انارکلی بازار کے درمیان ایک تختے پر جا کھڑا ہوا۔ اتنے میں سورج نے اپنا دامن سمیٹنا شروع کیا۔ شام ہو چکی تو انارکلی کی رونق میں اضافہ ہونے لگا۔

فضا میں جیسے جیسے سیاہی پھیلتی گئی دکانوں پر جلتے ہوئے چراغ اندھیری رات میں جگنو کی طرح چمکنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جلوس کی آمد کا شور ہوا۔ چند منٹ اور گذرے تو جلوس کا ہراول دستہ سامنے آیا۔ انارکلی میں اس قدر ہنگامہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ جلوس کی مختلف ٹولیاں گذر چکیں تو صدر کانگریس سیاہ اچکن اور اسی رنگ کی ٹوپی پہنے سفید گھوڑے پر سوار مسکراتے ہوئے ہمارے قریب سے گذرے۔ لوگوں نے ان پر عقیدت سے پھول برسائے۔ یہ نظارہ ایک گھنٹے تک رہا۔ اسی رات میں امرتسر واپس آگیا۔

بھائی اکثر و بیشتر سسرال رہا کرتے تھے۔ اس لیے دکان کی دیکھ بھال بہت حد تک میری ذمہ داری پر تھی۔ اور میں بساطِ سیاست کا نیا نیا کھلاڑی۔ شب و روز اسی زندگی میں مصروف نتیجہ میں بھائی سے چپقلش شروع ہو گئی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں غیر ملکی حکومت سے بغاوت کروں۔ اس تنازعہ کی ابتدا تھی کہ گوجرانوالہ میں کانگریس سنٹیہ گرہ کانفرنس کا اجلاس مولانا ظفر علیخاں کی صدارت میں ہونے کا اعلان ہوا۔ پنجاب بھر کے لوگ اس میں شمولیت کی تیاریاں کر رہے تھے۔ بھائی کی ناراضگی کے باوجود میں نے گوجرانوالہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ جیب خالی ہے۔ اسی فکر میں تھا کہ گاڑی آگئی۔ میں بغیر ٹکٹ کے سوار ہو گیا۔ گاڑی نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو معلوم ہوا کہ میں فرسٹ کلاس کے ڈبہ میں ہوں۔ اور اسی میں کانگریس کے دو بڑے رہنما سفر کر رہے ہیں۔

گاڑی اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔ غالباً یہ فرنٹیر میل تھی۔ میں چپکے سے ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ لاہور پہنچنے پر معلوم ہوا کہ میرے ہمسفر کانگریسی لیڈر پنڈت جواہر لعل نہرو اور جالندھر کے رائے زادہ ہنسراج ہیں۔ ہماری گاڑی گوجرانوالہ پہنچی تو سورج نصف النہار سے تجاوز کر چکا تھا۔ اسٹیشن پر رہنماؤں کے استقبال کا ہجوم دیکھ کر مجھے اپنے بچاؤ میں سہولت ہوئی۔

کانفرنس کے پہلے اجلاس میں پنڈت نہرو تقریر کر کے چلے گئے۔ رات کے اجلاس

صدرِ کانفرنس کی تقریر سے پہلے میں نے نظم پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن ناآشنائی ہونے کے باعث میری درخواست کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ کانفرنس کے آخری روز اجلاس سے کچھ دیر پہلے ہنگامہ ہوا کہ عطاء اللہ شاہ بخاری آگئے۔ لوگ شاہ جی کو ملنے کے لیے عقیدت کے پھول لے کر آگے بڑھے۔ میں نے بھی کوشش کی لیکن اس اچھوت کی طرح جسے مندر میں پڑی ہوئی بھگوان کی مورتی دیکھنے کا حق تو ہے لیکن قریب ہو کر چرن چھونے کی آگیہ نہیں۔

استقبالیہ کمیٹی کی بڑی سی چھولداری میں ایک بھاری بھرکم آدمی گاڑھے کی نیم آستین والا کرتہ پہنے سر پر خشخاشی بال اور کھدر کی ٹوپی۔ ایک تھیلا، اس میں سلور کا ایک برتن، شرعی پاجامہ، خوبصورت سفید چہرے پر سیاہ ڈاڑھی۔ یوں لگتا تھا جیسے سیاہ بادلوں نے چاند کو اپنے حلقے میں لے رکھا ہو۔ یہ تھے سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ میں انہیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

گوجرانوالہ سے واپسی پر امرتسر تک کا پیدل سفر کرنا پڑا۔ اور دکان کی بجائے میں جلیانوالہ باغ چلا آیا۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی زوروں پر تھی۔ کانگریس کیمپ میں بطور رضاکار کام کرنے لگا۔ ہر روز تیسرے پہر باغ سے جلوس نکلتا۔ ان دنوں میں خواجہ عبدالرحیم عاجز کی پنجابی نظمیں پڑھا کرتا تھا۔ جلوس میں سب سے زیادہ ہجوم میرے ساتھ ہوتا۔ راستے میں پھول اور مٹھائی سے لوگ تواضع کرتے۔ اس طرح شہر میں میرا خاصہ چرچا ہونے لگا۔ انہی دنوں میں نے خواجہ عبدالرحیم عاجز کے سامنے زانوئے ادب طے کیے۔ خود تو کبھی کبھار نظم کہتا۔ لیکن اکثر نظمیں انہی کی ازبر تھیں۔ میری آواز خواجہ صاحب کے کلام کو دو آتشہ بنا دیتی۔ گو ان کی اپنی آواز میں بلا کا سوز تھا۔ لیکن ہم دونوں کی عمر میں امتیازی تفاوت تھا۔ اگر ہم دونوں مل کر کسی جلوس میں شامل ہوتے تو لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ پولیس کو انتظام سنبھالنا مشکل ہوتا۔ ان دنوں انگریزوں کے خلاف عوام کے جذبات سے کھیلنا آسان نہیں تھا۔ پولیس کا تشدد عوام کو مرعوب کیے ہوئے تھا۔ دلوں کی دھڑکنیں پولیس کا ایک سپاہی دیکھ کر تیز ہو جاتی تھیں۔ ایسے میں

ہماری انقلابی نظمیں لوگوں کے حوصلے بڑھاتیں اور انہیں آزادیٔ وطن کے لیے بغاوت پرآمادہ کرتیں۔

احساسِ زندگی

اب تک میں زندگی کی بیس منزلیں طے کر چکا تھا۔ بیتے سال اور گزرے ہوئے راستوں کو مڑ کر دیکھتا ہوں تو حادثے ہی حادثے دکھائی دیتے ہیں۔ والدین کو موت کھا گئی۔ بھائی کا پیار بھاوجہ کی نظر ہو گیا۔ رفیقۂ حیات ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی۔ اس تنہائی میں میں اس مسافر کی طرح تھا جو کشتی میں سوار ہو اور ہاتھ سے پتوار گر جائے، سامنے تند و تیز موجیں ہوں اور ساحل دور۔

اس پر مستقبل کے لیے جو راستہ میں نے تجویز کیا اس خارزار وادی میں پاؤں کے تلوے ہی زخمی ہونے کا ڈر نہیں تھا۔ دل کے دامن کا تار تار ہونا لازمی تھا۔ زندگی کے اس گھپ اندھیرے میں کوئی غمگسار ہوتا، کوئی رازدار ہوتا تو احساسِ تنہائی شائد اس قدر بوجھل نہ رہتا۔ لیکن زندگی کے یہ روشن چراغ ایک ایک کر کے گل ہو چکے تھے۔ میرے گرد اگرچہ انسانوں کی بھیڑ تھی جو گلہائے عقیدت لیے کھڑے رہتے۔ لیکن ہر روز کا آفتاب احساسِ تنہائی کو اجاگر کر رہا تھا۔

بچپنا جوانی کی سرحدوں سے رخصت ہو چکا تھا۔ کھلتے ہوئے موسم کی طرح جذبات جوان ہونے لگے۔ ہر شام ان کی جواں مرگی پر ماتم کرنا پڑتا۔ ایسے میں امرتسر کانگریس کی طرف سے مجھے ترن تارن جانے کا حکم ہوا۔ یہ قصبہ امرتسر سے قریباً سترہ میل دور تھا۔ ریل گاڑی کے علاوہ تانگے عام جاتے تھے۔ یہاں بھی سکھوں کا تیرتھ تھا۔ ہر ماہ مستیا کا تہوار بڑی عقیدت اور رونق سے منایا جاتا۔ دیہاتیوں کے علاوہ شہری سکھ بھی اشنان (نہانے) کے لیے آتے۔ اس موقعہ پر خاصہ اجتماع ہوتا۔

مجھے اسی مقصد کے لیے بھیجا گیا تھا۔ چونکہ پہلی مرتبہ جانا ہوا تھا۔ لہٰذا عوام کی توجہ کوئی خاص نہ ہوئی۔ مگر آواز کا جادو چل چکا تھا۔ ایک ہفتہ بعد دوبارہ ترن تارن پہنچا تو ہجوم شہروں کی طرح تھا۔ لوگ عقیدت سے ملے۔ دیہاتی قسم کی پنجابی انقلابی نظمیں، اس پر میری آواز۔ قیامت ہی تو آگئی مجمع میں۔ دو گھنٹے کی مسلسل نشست

ہیں سوائے میری نظموں کے لوگوں نے کسی کی تقریر سننا پسند نہ کیا۔ ہر دوسرے دن ترن تارن جانے کا معمول بن گیا۔ عورتوں کی حاضری زیادہ ہوتی۔ مستورات کیمپ کی انچارج ۔۔۔۔۔ کی جواں سال لڑکی صفِ اول میں بیٹھتی۔ ایک دن جلسہ سے فراغت کے بعد مقامی کانگریس کے پردھان ڈاکٹر امر سنگھ نے مجھے اپنے ہاں چائے پر بلایا۔ استری پردھان سبھا کی جواں سال لڑکی اس موقعہ پر موجود تھی۔ اس سے میری دوسری ملاقات تھی۔ اس سے پہلے میں انہیں جلسہ میں دیکھ چکا تھا۔ کھدر کی سفید ساڑھی پہنے وہ بار بار میرے سامنے آتی۔ گاہے نظروں کا تصادم بھی ہوتا لیکن الجھاؤ کی صورت میں نہیں۔ عوام کی خواہش، مقامی کانگریس کی ضرورت اور دل کی کشش نے ترن تارن اور امرتسر کے درمیان کا فاصلہ ختم کر دیا۔ ہر شام ترن تارن کے جلسے میں حاضری ضروری قرار دی گئی۔ یہ امرتسر کانگریس کا حکم تھا۔

دل گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس میں ٹیس اٹھتی ہے تو جسم کو درد کا احساس ہوتا ہے۔ غالب نے اسی پر کہا ہے۔ ؏

"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں"

اور جب یہ درد سے بھر جاتا ہے تو اس سے وہ آگ نکلتی ہے جس سے عقل و خرد کے خرمن راکھ کا ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ پھر آدمی آدمی نہیں رہتا اور نہ ہی اسے آبادیاں پسند آتی ہیں۔ وہ صحراؤں میں گل بوٹے اگاتا ہے۔ چناب کے کنارے اور جھنگ کے بیلے اس کی بہاروں کے مسکن بن جاتے ہیں۔

زندگی میں یہ موڑ بھی آتا ہے کہ جوانی دیوانی ہو کر ان راہوں سے گذرتی ہے اکہ پتھر اور کانٹے استقبال کرتے ہیں۔ خرد دیوانگی پر قہقہے بلند کرتی ہے۔ یہیں سے شوقِ جنون کی راہیں کھلتی ہیں اور حقیقتیں افسانہ بن کر داستانِ محبت کو جلا بخشتی ہیں۔ میرا اور ۔۔۔۔۔ کا ہر روز کا سامنا دلوں میں الاؤ روشن کر گیا۔ اس آگ کی تپش نظروں سے ہٹ کر دلوں میں سلگنے لگی۔

۔۔۔۔۔ ان دنوں سترہ اور اٹھارہ سن سے گذر رہی تھی۔ سفید چہرے پر جوانی کی ہلکی

سی سہرنی نے اسے فطرت کا حسین شاہکار بنا دیا تھا۔ اس سال وہ میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی کہ دل ونظر کے فریب میں آ گئی۔ اس راستے کی آلائشوں سے بےخبر مزید کتنی دور نکل جاتی کہ اچانک حالات نے نئی کروٹ لی۔ مجھے امرتسر کانگریس کمیٹی کی طرف سے سارے ضلع کا دورہ کرنے کا حکم ملا۔

پانچ افراد پر مشتمل ہمارے قافلہ کا سفر ترن تارن سے شروع ہوا۔ ہم دن بھر گاؤں گاؤں پیدل چل کر کانگریس کا پرچار کرتے اور شام کو کسی گاؤں میں پہنچ کر جلسہ کرتے۔ اس طرح مسلسل ایک ماہ بیت گیا۔ تھک ہار کر ہم نے گرفتار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم جب کسی گاؤں سے گذرتے تو لوگ اپنے انداز میں ہماری آؤ بھگت کرتے۔ چھاچھ یا جَو کے ستوؤں سے تواضع کرتے۔ جیٹھ کے مہینہ میں موسم گرما کا عروج ہوتا ہے۔ ان تپتے ہوئے دنوں دیہاتوں میں پیدل چل کر تمام دن زمینداروں کو حکومتِ برطانیہ کے خلاف ابھارنا ہمارے فرائض میں تھا (کھدر کے کپڑے، اکینوس کے بوٹ، سر برہنہ کانگریس والنٹیر وردی) ان دنوں گندم کی کٹائی کے بعد گاؤں کے لوگ قدرے فرصت سے ہوتے ہیں۔ ہماری باتیں ان کے لیے نئی اور انوکھی تھیں۔ اکثر دیہاتی ہماری باتیں تعجب سے سنتے۔ رات کو جب ہم کسی بڑے گاؤں میں اکٹھ کرتے تو گردا گرد کے کافی لوگ آ جاتے۔ ہم انہیں فضول رسموں سے منع کرتے۔ آپس کے لڑائی جھگڑوں سے روکتے۔ شراب اور زنا کی برائیاں بیان کرتے۔ ان برائیوں کی ذمہ دار ہم حکومتِ برطانیہ کو قرار دیتے۔ دیہاتی ہماری ایسی باتوں سے خوش ہوتے۔ اور اپنے علاقوں میں کانگریس کمیٹیاں قائم کرتے۔

اس طرح دیہاتوں میں گھوم پھر کر کانگریس کا پرچار کرتے ہمیں ڈیڑھ ماہ گذر گیا۔ شہری ماحول میں زندہ رہنے والی ملوک قسم طبیعتوں کو گرمیوں میں پیدل چلنا پڑا اور وہ بھی ان دیہاتوں میں جہاں نہ برف نہ برقی پنکھے۔ درختوں کے سائے بھی دور تک نظر نہیں آتے تھے۔ آخر ہم سب نے گرفتار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

تحریک کے دنوں یہ سلوگن (نعرہ) عام تھا۔

- نعرہ تاند لے..... نہ دیو ٹیکس نہ دیو مالیے۔

اسی ایک نعرے پر گرفتاری لازماً ہوتی - دیہاتوں میں یہ نعرہ حکومت کے خلاف بغاوت کے مترادف تھا - چنانچہ اس علاقے کے بڑے قصبے (جھول ڈھائے دال) میں پہنچ کر ہم نے سینکڑوں دیہاتیوں کے اجتماع میں بیک زبان یہ نعرہ لگا دیا۔ اور دیہاتیوں کو بھی اس میں شامل کر لیا - سارا مجمع اس نعرے سے گونج اٹھا - (اور پھر یہی نعرہ تمام ضلع میں تحریک کا باعث بنا) اتنے میں پولیس آگئی اور ہم سب کو گرفتار کر لیا۔ لیکن گاؤں والوں نے ہمیں رات پولیس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ پولیس انسپکٹر نے مقامی لوگوں کی ضمانت پر رات یہیں گذارنے دی - صبح ضروریات سے فارغ ہوئے - دیہاتی قسم کا ناشتہ (تازہ مکھن، خالص گندم کی روٹی، شکر اور چھاچھ) کیا - دیگر مہمانوں کو بھی اسی ناشتے میں شامل کیا گیا - جو لوگ ہماری گرفتاری دیکھ کر یہاں رک گئے تھے، ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ پولیس نے آن گھیرا۔ ہم سب نے اپنا سامان درست کیا - گلاب اور موتیا کے پھولوں سے گندھے ہوئے ہاروں سے ہمیں لاد دیا گیا - رخصت ہوئے تو دیہاتی نوجوانوں کا ہجوم ہمارے ساتھ تھا - مکانوں کی چھتوں پر دیہاتی عورتیں پھولوں کی پتیاں برسا رہی تھیں - تھانہ پہنچ کر ہم نے عوام کا شکریہ ادا کیا اور تھانے کے اندر چلے گئے۔

ضروری کارروائی کے بعد انچارج تھانہ ہمیں لاری کے ذریعے ترن تارن تھانہ میں لے آیا - شہر میں میری آمد کی اطلاع جانے کس طرح پھیل گئی کہ ہجوم در ہجوم لوگ تھانہ کے سامنے آن جمع ہوئے - ان کے مطالبے پر انسپکٹر تھانہ مجھے حوالات سے نکال کر گیٹ پر لے آیا - ہتھکڑی سمیت میں نے لوگوں کو آداب عرض کہا - اتنے میں کچھ لوگ ہجوم سے نکل کر آگے بڑھے - ان میں ڈاکٹر امر سنگھ، عورتوں کے کیمپ کی پردھان بمعہ اپنی صاحبزادی . . . . کے نمایاں تھیں - سب نے ہار پہنائے اور ہاتھ باندھ کر نمستے کہا - میں نے . . . . کو ایک نظر دیکھا - اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے - مجھے احساس ہوا کہ انسان کبھی کبھار دل کے ہاتھوں کتنا مجبور ہوتا ہے - مذہب کے اصول اپنی جگہ - لیکن عشق کا مقام اپنا ہے -

۸ - جون ۱۹۲۰ء کو بابا نانک سنگھ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں ہمیں پیش کیا

گیا۔ کانگرس احکام کے تحت ہمیں عدالتی کارروائی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لہٰذا ہم سب عدالت کی طرف سے رخ پھیر کر کھڑے تھے، ایک اے۔ ڈی ایم نے مجھے مخاطب کرکے کہا۔ "تم بھی ملزم ہو؟" "تم نہیں، آپ کہیے"! میں نے اپنا رخ عدالت کی طرف پھیرتے ہوئے کہا۔ اپنے سوال کے جواب میں مجسٹریٹ ایک کھسیانی ہنسی ہنسا۔ اور مقدمے کی فائل دیکھنے لگ گیا۔ میرے رفیقوں کا مقدمہ سننے کے بعد عدالت پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔ "اچھا تو آپ نے نظم پڑھی تھی"۔ "جی ہاں"! میں نے ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے دونوں ہاتھوں کو کٹہرے پر رکھتے ہوئے کہا۔

عدالت ——— "کیا تھی وہ نظم"؟ عدالت کا یہ کہنا تھا کہ میں نے نظم پڑھنا شروع کردی۔ میری آواز پر کچہری کے تمام لوگ اے۔ ڈی ایم کے کمرے میں جمع ہوگئے۔ یہاں تک کہ باقی مجسٹریٹ بھی بابا نانک سنگھ کے پہلو میں آن بیٹھے۔ نظم سننے کے بعد مجسٹریٹ نے کہا۔ "دیکھو بھئی! آپ تو میرے پاس رہیں۔ گھوڑا گاڑی بنا دیتا ہوں۔ رات دن سیر کیا کرو اور مجھے گانا سناتے رہو۔"

مجھے منظور ہے۔ لیکن اس شرط پر کہ آپ میرا وطن انگریزوں سے آزاد کرادیں۔ اس پر عدالت میں ایک قہقہہ لگا۔ اور ساتھ ہی ہم سب کو سزائیں سنا دی گئیں۔ میرے ساتھیوں کو تین تین ماہ قید سخت اور مجھے ایک ماہ۔ اس امتیازی سلوک پر میں نے عدالت سے احتجاجاً کہا۔ "یا تو میرے ساتھیوں کی سزاؤں میں تخفیف کریں یا میری سزا بھی ان کے برابر کردیں۔ اس پر کافی دیر قانونی بحث رہی۔ آخر میری سزا بھی تین ماہ کردی گئی۔

بورسٹل جیل

حکم کے فوراً بعد ہم اسیرانِ افرنگ کو امرتسر جیل سے لاہور بورسٹل جیل میں منتقل کردیا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی کہ ہم نئے بندی خانے میں پہنچے۔ کاغذی کارروائی کے بعد ڈیوڑھی سے جیسے ہی ہم نے جیل کا بڑا پھاٹک عبور کیا۔ سامنے کی خوش رنگ گلپوش کیاریوں تے ایڑیوں کے بل بیٹھے مجرموں کو دیکھا۔ یہیں سے ہم ایک دوسرے سے الگ کردیے گئے۔ مجھے احاطہ نمبر ۲ میں لے جایا گیا۔

یہ جیل کم عمر قیدیوں کے لیے مخصوص ہے۔ ہر احاطے کا انچارج الگ ہے اور ہر احاطے میں ایک سو سے زائد کوٹھڑیاں ہیں۔ جہاں قیدیوں کو الگ الگ بند کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس جیل میں تین ہزار کے قریب قیدیوں کی گنجائش ہے۔ مجھے تنہا کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ رات کا اندھیرا غالب آ رہا تھا۔

ہمارے گھروں میں بچوں کو انہونی بلاؤں کے خوف سے ڈرایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بلی اور چوہا بھی شیر سے کم حیثیت نہیں رکھتے۔ اس خوف و ہراس میں پل کر جوان ہونے والا بچہ اپنے سائے سے بھی خوف کھاتا ہے۔ ہمارے محلہ کی نکڑ پر میونسپل کمیٹی کا لیمپ لگا ہوا تھا۔ ہم بچوں میں یہ مشہور تھا کہ اس لیمپ کے نیچے بارہ سنگھا رہتا ہے۔ چنانچہ سرِ شام بچے اس خوف سے گھروں میں چھپ جاتے تھے۔ اگر کبھی گھر والوں نے سودا سلف لینے بازار جانے کی خواہش کی تو انکار کر دیتے۔ اس پر خاصی پٹائی ہوتی۔

احاطہ نمبر ۴ میں اسی قسم کا ایک لیمپ لگا ہوا تھا۔ یہ لیمپ اور اس کا وہ تصور۔ اس پر تنہا کوٹھڑی۔ اور سارے احاطے میں مَیں اکیلا قیدی۔ جیل خانے کی پہلی رات عجیب کیفیت کا عالم تھا۔ سامنے لیمپ پر نظر پڑی تو یوں محسوس ہوا جیسے ابھی بارہ سنگھا مجھے کھا جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی میری حالت غیر ہونے لگی۔۔۔

پھر کیا ہوا؟ سہ   بعد کا قصہ نہ پوچھ اے میری بے ہوشیو!

لن ترانی کی صدا سننے تلک تو ہوش تھا۔

ہوش آیا تو میں جیل کے ہسپتال میں تھا۔ یہاں سے مجھے بارڈر لائن میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس احاطے میں میرے ہم عمر اور بھی تھے۔

مشقّت جیل میں ایک بڑا سا کارخانہ ہے۔ یہاں بڑھئی سے قالین بافی تک کا کام قیدیوں سے لیا جاتا ہے۔ ہر کام کی سکھلائی کے لیے استاد مقرر ہے۔ قیدیوں کی پڑھائی بھی ہوتی ہے۔ اور تفریحی کھیلوں کا انتظام بھی ہے۔ مجھے بیت سے کرسیاں بننے کی مشقت دی گئی۔ شام کو ایک چھٹانک گڑ اور صبح ناشتے میں بھنے ہوئے چنے ملتے۔ ہفتہ میں ایک دن آدھ سیر مصری یا چار عدد بوندی کے لڈو۔ دراصل

ان دنوں جیل قانون میں قیدی کو سرکاری طور پر ڈیڑھ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس میں سے آٹھ آنے کی متذکرہ اشیاء مل جاتیں۔ ایک روپیہ قیدی کے حساب میں جمع رہتا۔ اور یہ رقم اسے رہائی کے وقت دی جاتی تھی۔

خوراک میں تین تین برس کی پرانی سوکھی سڑی سبزیاں، شلجم اور ساگ تیل میں پکا ہُوا۔ دال ماش، دال چنا اور دال ہرہر۔ ہفتے میں ایک دن گندم کی دو روٹیاں اور باقی ہفتہ چنے کی روٹیاں۔

سزائیں چکی پیسنا، کولہو، خراس، مونج کوٹنا، بان بٹنا، جگائی (ردی کاغذ جو رات بھر پانی میں بھیگے رہتے ہیں، انہیں پاؤں سے ملیدہ کرنا) چلتے کنوئیں کی معل میں بچوں کو بٹھا کر اس کو پانی کی سطح کے برابر کر دینا۔ بیت زنی کی سزائیں۔ ٹکٹکی سے باندھ کر بید زنی کی سزا وغیرہ۔ کوٹھڑیوں میں روشنی بالکل نہیں۔ تین ماہ کے بعد وارثوں سے پندرہ منٹ کی ملاقات۔ اتنے ہی عرصے میں ایک خط۔

ایک قیدی کی غلطی پر تمام قیدیوں کو بلا امتیاز پیٹنا[1]۔

اس طرح ستمبر ۱۹۳۰ء کے آخر میں اس دنیائے دوزخ سے رہا کر دیا گیا۔

امرتسر زندانِ افرنگ سے رہا ہوا تو تین ماہ کی غیر حاضری مدتوں کی غیر حاضری معلوم ہوتی تھی۔ امرتسر کے دیوار و در پر اداسی برس رہی تھی۔ جو رونقیں اور ہنگامے چھوڑ کر گیا تھا وہ موت کی نیند سو چکے تھے۔ جلیانوالہ باغ کی بہاروں پر ہو کا عالم تھا۔ اجنبی حکومت کے تشدد کی بادِ سموم باغ کی تمام روشوں کو پامال کر چکی تھی۔ تحریک کے لیڈر جیلوں میں تھے۔ جو باہر تھے وہ مصلحت کی نذر ہو چکے تھے۔ البتہ شہر کے مسلمان نوجوانوں نے اپنے اپنے محلے میں والنٹیرز کوریں بنا رکھیں تھیں۔ ان میں انڈین نیشنل کور خاصی معروف تھی۔ باقی محض بے روح لاشیں۔

شہری کانگریس کمیٹی کے رہنما جوان جذبات کے راستے میں رکاوٹ تھے۔ میری رہائی کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ مجھے شہر کی تمام کوروں کا ڈکٹیٹر مقرر کیا جائے۔ چنانچہ ایسا

---

[1] باقی تفصیل کے لیے میری کتاب "بڑھتا ہے ذوقِ جرم" دیکھیں۔

ہی ہوا۔ اب میرے راستے میں سب سے بڑی دیوار مالی کمزوری تھی اور کانگریسی رہنما اس راستے میں حائل تھے۔ میں نے اپنی ذمہ داری پر شہر کا دورہ کیا اور مخیر حضرات سے روپیہ فراہم کر کے کام کو آگے بڑھایا۔ چند دنوں میں امرتسر کا سیاسی بحران ختم ہو گیا اور یہ شہر پھر تحریک کا مرکز بن گیا۔ روپوش لیڈر اپنے آشیانوں سے اترنے شروع ہوئے۔ نیشنل کورچوک بمبے والا میرا صدر دفتر تھا۔ اب شہر کے خاص وعام کی زبان پر میرا نام تھا۔ یہ میرے کام کی وجہ سے تھا۔ لیکن حکومت یہ کیسے برداشت کرتی کہ دبی ہوئی تحریک پھر ابھر آئے چنانچہ سی۔ آئی۔ ڈی سائے کی طرح میرے ساتھ رہنے لگی۔

ان دنوں ٹیکس نہ دینے کی تحریک عام شہروں میں شروع تھی۔ میں نے اسے امرتسر میں شروع کیا۔ ہر روز رات کو کسی نہ کسی محلہ میں جلسہ ہوتا۔ عوام کو ٹیکس نہ دینے کی تلقین کی جاتی اور اس بنیاد پر شہر کی مختلف والنٹیرز کوروں کے رضا کار گرفتار ہوتے۔ ان گرفتاریوں نے شہر کی پولیس اور پنجاب گورنمنٹ کو مجبور کیا کہ وہ مجھے گرفتار کرلیں۔

جب مجھے یہ اطلاع ملی تو میں رات کو جلسوں میں تقریر کے فوراً بعد اندھیرے میں غائب ہو جاتا۔ یہ اس طرح ہوتا کہ میری نظم یا تقریر کے دوران اچانک روشنی گل کر دی جاتی اور میں اندھیرے میں مقررہ مقام پر چلا جاتا۔ پولیس ڈھونڈتی رہتی۔ پولیس اور میرے درمیان یہ آنکھ مچولی تقریباً دو ہفتے تک رہی۔

دریار انسان کا وجود بھی ایک کائنات ہے۔ اس کے اندر بھی بغاوت کا امکان رہتا ہے۔ جس جگہ رائے میں ٹکراؤ ہو جائے وہاں جھگڑے کا امکان لازمی ہے۔ اگر کہیں دل و دماغ میں تصادم ہو تو سارے وجود کے کل پرزے جواب دے جاتے ہیں۔

میرے اور پولیس کے مابین کھینچا تانی، قانون اور اس کے مجرم کی بھاگ دوڑ ایسی سہل انگاری نہیں تھی کہ جذبات کو کسی اور رخ پر موڑا جا سکتا۔ مگر اقبال کہتا ہے۔ ؎

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اگر اسے تنہا چھوڑ دیا جائے تو سوائے چاکِ گریباں کے اس کی حشر سامانیوں کا

تماشہ کون کرے۔ بہرحال میں نے تماشائی بن کر دل و دماغ کا تماشہ کیا۔ اور جب دماغ نے شکست تسلیم کر لی تو پاسبانِ عقل کا قضیہ خود بخود طے ہوگیا۔ میں چاکِ گریباں کی دھجیاں لیے دریارِ پہنچا۔ ؎

نہ غرض حرم کے وقار سے نہ صنم کدے کی بہار سے
مجھے کام ہے دریار سے، دریار پھر دریار ہے

ترنتارن پہنچ کر پتہ چلا کہ چھ ماہ ہوئے ۔۔۔۔۔۔ کی شادی ہو چکی ہے۔ یہ سنتے ہی دل کا کھیل تو ختم ہوگیا۔ میں جلدی سے امرتسر پہنچ کر خود کچہری حاضر ہوگیا۔

یہاں آکر معلوم ہوا کہ میرے خلاف ۱۰۹ کا مقدمہ ہے۔ یہاں سے مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ چند دنوں کی مختصر کارروائی کے بعد ایک سال قید محض کی سزا ہوئی۔ یہ میری تیسری سزا تھی۔

میں خوش تھا کہ اپنا بہت سا بوجھ ہلکا کر چکا ہوں۔ وطنِ عزیز کی آزادی کے لیے میں نے مقدور بھر کام کیا۔ اور اپنی بساط سے بڑھکر۔ اب مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ لوہے کی زنجیریں ہوں یا جیل خانے میرے ارادوں کو کمزور نہیں کر سکتے تھے۔

سردار بھگت سنگھ سے مُلاقات

پھر وہی بورسٹل جیل اور وہی ماحول، وہی پرانے گنہگار۔ جیل سے ڈیڑھ ماہ کی غیر حاضری میں اس کے سوا کوئی تبدیلی نہ آئی کہ وہ کوٹھڑی جس میں گذشتہ سزا کے دن گذار چکا تھا کسی اور سیاسی قیدی کے حصے میں آ چکی تھی۔ وہی لوہے کی بالٹی اور موٹے کارٹھے کی چادر، میرے تمام کپڑے جوں کے توں رکھے ہوئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ جیل حکام کو میرے جلد واپس لوٹ آنے کا یقین تھا۔ البتہ اب کے میں اس احاطے میں اکیلا نہیں تھا۔ ع یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں۔

ان دنوں دوسری سازش کیس کے ملزم پنجاب کے سردار بھگت سنگھ اور بنگال کے مسٹر بی۔ کے۔ دت کے بغیر اس مقدمے کے دوسرے ملزم اسی جیل میں تھے۔ بھگت سنگھ اور مسٹر دت لاہور سنٹرل جیل میں تھے۔ دیہ جیل خانہ اب

شادمان کالونی میں تبدیل ہو چکا ہے) یہ ہر شام پولیس کی معیت میں بورسٹل جیل اپنے ساتھیوں سے والی بال کھیلنے آتے۔ ان کے لیے ایک میدان مخصوص تھا۔ اس دوران کوئی قیدی خواہ وہ سیاسی ہو یا غیر سیاسی، اس گراؤنڈ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

چودھری افضل حق نے جیل خانہ کو دنیا کا دوزخ قرار دیا ہے۔ خوف، ہراس، شب و روز کی تنہائی، خوراک میں سڑاند، قدم قدم پر قدغن، مجرموں کی تربیت گاہ، نسلِ انسانی کے خلاف جہاد کا مرکز۔ یہ تھا آج سے پچاس برس پیشتر کا جیل خانہ۔ یہاں آواز تو در کنار اونچا سانس لینا جرم تھا اور ایسا جرم جس کی سزا انتہائی کربناک ہوتی۔

جیسے ہی بھگت سنگھ اور ان کے رفقا رکھیل کے میدان میں اترتے تمام قیدیوں کو کوٹھڑیوں میں مقفل کر دیا جاتا۔ یہ ایک اور سزا تھی۔ جیل لار (JAIL LAW) کے مطابق گرمیوں میں قیدیوں کو سات بجے شام بند کرنے کا حکم تھا۔ مگر حکم حاکم کہ ہمیں پانچ بجے بند ہونا پڑتا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میں اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا شہید اشفاق اللہ بسمل کی نظم پوری آواز سے گا رہا تھا۔ ؎

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں دل مگر آزاد رہے

گراؤنڈ میرے احاطہ کی پشت پر تھی۔ انہوں نے میری آواز سن لی تھی۔ کھیل سے فارغ ہوئے تو سپرنٹنڈنٹ جیل مسٹر چوپڑہ سے کہہ کر مجھے دفتر بلوایا۔ مجھے اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ نمبردار میرے پاس آیا کہ مجھے صاحب نے بلوایا ہے اس بلاوے پر میں سمجھا۔ ع اس قفس کے قیدیوں کا چہچہانا ہے منع۔

اور میں اس قانون کا مجرم تھا۔ لہٰذا میں سزا کے لیے تیار ہو کر دفتر پہنچا۔ وہاں کچھ لوگ مغربی لباس پہنے بیٹھے سپرنٹنڈنٹ سے باتوں میں مشغول تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ "تم گا رہے تھے۔ جانتے ہو یہاں پر گانا جرم ہے۔" "جی ہاں۔" "پھر تمہیں اس کی سزا کیا دی جائے۔" "یہ آپ کا اختیار ہے۔" "اچھا سناؤ تم کیا گا رہے تھے؟" میں نے فوراً تعمیل ارشاد کی۔ جب نظم ختم ہوئی، تو میں نے کچھ

لوگوں کو آنسو پونچھتے دیکھا۔

یہ کون لوگ تھے، میرے علم میں نہیں تھا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ یہ سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی تھے۔ انہوں نے میری آواز سن کر سپرنٹنڈنٹ سے سفارش کر کے مجھے بلایا تھا۔ اس دن سے معمول بن گیا کہ جب وہ کھیل سے فارغ ہوتے۔ مجھے دفتر بلا لیتے۔ اس مسلسل ملاقات کا عام قیدیوں کو ایک فائدہ ہوا کہ پانچ بجے کی بجائے سات بجے بند ہونے لگے۔ مجھے بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں سے ملنے کی عام اجازت تھی۔ یہ سب لوگ مجھ سے پیار کرتے۔ سردار بھگت سنگھ نہایت شریف اور بہادر ہونے کے علاوہ صاحب ذوق تھے۔ اردو شعراء کا اکثر کلام انہیں ازبر تھا۔ ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر عام گنگنایا کرتے تھے۔ ؎

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

جیل خانے میں زندگی دو طریق سے گذرتی ہے۔ اوّل یہ کہ آدمی خاموشی اور شرافت سے اپنا وقت پورا کرے یا پھر بدمعاش بن کر۔ آخرالذکر طرزِ عمل کے لیے بہادری کی ضرورت نہیں۔ ڈھیٹ ہونے کی ضرورت ہے۔ جیل کے نمبردار قیدی بھی اچھے اخلاق کے نہیں ہوتے۔ جیل حکام کی خوشنودی کے لیے جو طرزِ تکلم وہ اختیار کرتے ہیں، آدمی اسے سننا بھی گوارہ نہیں کرتا۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ چپکے سے اپنے دن گذار لے۔ بدیں وجہ میں نے اوّل الذکر طریق زیادہ بہتر سمجھا اور میعادِ اسیری ختم کی۔

رہائی کے بعد ۵۔ مارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی اروِن سمجھوتہ ہوا۔ میں اپنی سزا قریباً ختم کر چکا تھا۔ تاہم ایک ہفتہ پیشتر رہا کر دیا گیا۔

جیل سے باہر آیا تو ساز کی تمام تاریں بکھری پڑی تھیں، جس پر آزادیٔ وطن کے گیت گایا کرتا تھا۔ لیڈر، جو گجرات جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔ ایک دوسرے سے میلوں دور جا چکے تھے۔ غریب والنٹیئر جیلوں سے رہا ہو کر آئے تو ان سب کو کہہ دیا گیا کہ تم اپنے اپنے گھروں میں آرام کرو۔ ضرورت پڑنے پر بلا لیا جائے گا۔ اس

اعلان کے ساتھ ہی جلیانوالہ باغ کے تمام کیمپ اکھاڑ دیئے گئے۔ ایک رات بھی والنٹیرز کو وہاں نہ رہنے دیا۔ وہ بے سروسامان کہاں جائیں۔ ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو آزادی کے راستے میں انگریز سے لڑنے کے جرم میں الگ ہو چکا تھا۔ یہ منظر بہت دردناک تھا۔ سال ڈیڑھ سال جیل خانوں کی مشکلات گذارنے کے بعد جب وہ رہا ہوئے تو وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جنگِ آزادی سے فراغت کے بعد تھکے ماندے سپاہیوں کو آرام ملتا۔ لیکن اس کے برعکس انہیں روٹی کے لیے در بدر ہونا پڑا۔ ایک سال پیشتر جو آبرو سے میدانِ جنگ کی طرف رخصت کیے گئے تھے، جب واپس آئے تو فقیر اور گداگر تھے۔ لیڈروں کی باہم پارٹی بازی نے تمام کارکنوں کو دل برداشتہ کر دیا۔ وہ مایوس ہو کر جہاں سینگ سمائے چلے گئے۔ معاشی پریشانیوں کے باعث کوئی برطانوی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اور کوئی بازار میں خوانچہ فروش بن گیا۔

آواز اور دعوتِ موسیقی

موسیقی روح کی غذا ہے۔ سات سروں کے الاپ سے اس کے کئی وجود ڈھلتے ہیں۔ ہر وجود دلوں میں نیا ارتعاش پیدا کرتا ہے۔

آسا۔ آساوری۔ درباری۔ شام کلیان۔ سوہنی۔ ملتانی۔ بھیروی۔ ٹھمری، گیت اور غزل۔ موسیقی کے نکھرے ہوئے روپ ہیں۔ جب یہ ملہار کا انگ لیتے ہیں تو ایک ایک سُر موسلا دھار بارش کی طرح دلوں پر برستی چلی جاتی ہے۔ پھر اس کے ایک پلٹے سے دیپک راگ کے شعلے بلند ہونے لگتے ہیں۔

شاہی دربار ہو کہ فقیر کی جھونپڑی، سات سُروں کے قدموں پر سبھی سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ ایک تارے سے چترینا تک اپنے حلق سے وہی راگ الاپتے ہیں جو ان کی خواہش ہو۔ آواز کا جادو بھی انہی سات سُروں کا محتاج ہے۔ جب سوز اور ساز ہم آہنگ ہوتے ہیں تو حسن، دولت اور شاہی اپنے غرور سمیت سات سروں کے سمندر میں غرقاب ہو جاتے ہیں۔

ہولی کے دنوں امرتسر میں ہندوستان بھر کے گائک جمع ہو کر فن موسیقی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ایک پندھواڑہ کی اس محفل موسیقی میں سات سروں کو کھنگال دیا جاتا تھا۔ موسیقاروں کے مضراب سے تاروں کے دل دہلنے لگتے۔ جب وہ دونوں پھیپھڑوں کے ملاپ سے سوز اور ساز پر آواز کا جادو جگاتے تو آسمان پر بھی بجلیاں کڑکنے لگتیں۔ ستارے ٹوٹ کر زمین پر آ رہتے۔ یہی موسم تھا کہ امرتسر نمک منڈی میں کانگریس کے ایک جلسے میں بمبئی کے معروف گائیک پنڈت وسنت راؤ نے مجھے نظم پڑھتے سنا۔ جلسے سے فارغ ہوا تو یہ مجھے الگ ملے۔ کہنے لگے "بیٹا بھگوان نے تجھے بڑا سندر کھنٹ دیا ہے۔ سوز کی مایا بھی ہے۔ سُر میں بھی ہو۔ اگر تم میرا کہا مانو اور میرے ساتھ بمبئی چلو تو میں تمہیں ہندوستان کا بڑا گائیک بنا دوں گا۔ ورنہ تیری زندگی جلسوں کی بھیڑ میں کھو جائے گی۔

آس پاس کے عوام نے بھی پنڈت جی کی تائید کی۔ لیکن میرا لاابالی پن اس پیش کش کو نہ سمجھ سکا۔ میں نے بچپنے کی مسکراہٹ سے انہیں ٹال دیا۔

بے شک میرے خالق نے مجھے اس دولت سے نوازا تھا۔ اگر میں پنڈت جی کی بات مان لیتا تو فطرت کے اس عطیے سے مجھے دولت ملتی۔ میری توقیر بڑھتی۔ مگر اس واقعہ پر مجھے کبھی نہ ندامت محسوس ہوئی نہ افسوس۔ کیونکہ میری آواز، میری آواز نہیں تھی۔ پروردگار کا انعام تھا مجھ پر۔

الحمدللہ کہ یہ جس کی امانت تھی۔ اسی کے دین اور مخلوق کے کام آئی۔ میں نے اپنے نغموں سے حق کے مقابل باطل کو للکارا۔ آزادیٔ وطن کے گیت گائے۔ ہزاروں نوجوانوں کو غیر ملکی حکومت کا باغی بنایا۔ درس حریت سے غلاموں کے دلوں میں فرنگیوں کے خلاف بغاوت کی آگ روشن کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ع

مرے تھے جن کے لیے، وہ رہے وضو کرتے

ریاض اور احتیاط کے بغیر آواز کی حفاظت مشکل ہے۔ مسلسل شب بیداری بھی آواز پر اثر کرتی ہے۔ اس دولت کے سنبھالنے میں خوراک کا تعاون بھی اہم ہے

لیکن اس رتن کے ضائع کرنے میں مجھ سے یہ سارا کچھ ہوا ہے ——— مگر اپنے لیے نہیں ———

گذشتہ نصف صدی کے سفر میں خواہشات کی تمام عمارت کا رنگ و روغن بے احتیاطی کے ہاتھوں ضائع ہو چکا ہے۔ راستے کی تھکاوٹ اور خوراک دونوں طبیعت کو راس نہ آئے۔ اب حال یہ ہے ؎

غزل اس نے چھیڑی، مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

مگر اس پر گلہ ہے نہ شکایت ؎

جان دی ادی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بنک پر ڈاکہ

دہشت پسند تحریک کے مقاصد میں ہے کہ پارٹی ضرورت کے لیے سرمایہ دار کو لوٹا جائے۔ چلتی گاڑیوں کے سرکاری خزانہ پر ڈاکہ ڈالا جائے یا پھر موقعہ ملے تو بنک لوٹے جائیں۔

سال ۱۹۳۰ء میں اس طرح کے کئی واقعات ہوئے۔ بعض جگہ گرفتاریاں ہوئیں اور اکثر ملزم بچ کر نکل جانے میں کامیاب رہے۔ گاندھی اروِن سمجھوتہ پر کانگریس کی تحریک اصولاً ختم ہو چکی تھی۔ لیکن انقلاب پسند اس سے متفق نہیں تھے۔ میں قریباً ایک سال بعد جیل سے رہا ہو کر آیا تو ملک کی فضا اداس تھی۔ کارکن یہ لڑائی ختم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ میں نے امرتسر کے چند معروف دہشت پسندوں کے ساتھ مل کر ترنتارن زمیندارہ بنک پر ڈاکہ ڈالنے کا پروگرام بنایا۔ دن کے گیارہ بجے ہم چھ آدمی مسٹر سوشل کمار بنگالی، کامریڈ کرانتی کمار، سردار موہن سنگھ امرتسر اور میں۔ دو آدمی ہمارے ساتھ ایسے تھے جن کا تعلق ضلع حصار سے تھا۔ ان کا نام یاد نہیں۔ ہمارے پاس دو ریوالور تھے، جو بستروں میں بند تھے۔ شکل و صورت اور لباس سے یہ مزدور معلوم ہوتے تھے۔ سر اور پاؤں سے برہنہ، نیم آستین کی واسکٹ اور ہندووانہ طرز کی دھوتی بندھی ہوئی

تھی۔ ہم سب کے پاس ترنتارن اور جالندھر کے ٹکٹ تھے۔ یہ دونوں گاڑیاں ایک ہی پلیٹ فارم پر بیک وقت برابر برابر کھڑی تھیں۔

پروگرام کے مطابق ہم سب کا رخ جالندھر جانے والی گاڑی کی طرف تھا۔ تاکہ ترنتارن جانے کا شبہ بھی نہ ہو سکے۔ ترنتارن والی گاڑی نے جیسے ہی حرکت کرنی تھی ہم نے جلدی سے بھاگ کر اس پر سوار ہو جانا تھا۔ میں جالندھر والی گاڑی کے بالکل قریب کھڑا تھا کہ پولیس نے پکڑ لیا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ میں نے پولیس کی آنکھ بچا کر ترنتارن کا ٹکٹ پلیٹ فارم کے نیچے پھینک دیا۔ باقی ساتھی بھی پکڑ لیے گئے۔ یہ گرفتاریاں کس کی مخبری پر ہوئیں؟ معلوم نہیں۔

"تم کون ہو؟" "کانگریس والنٹیر" - "یہاں کیوں کھڑے تھے؟"
"میں جالندھر جا رہا تھا"۔ "کیا لینے؟" "میرے ننہال ہیں وہاں"۔
"ٹکٹ کہاں ہے؟"

میں نے جالندھر کا ٹکٹ دکھایا۔ جو پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ باقی ساتھی دوسرے تھانے میں تھے۔ ان پر کیا گذری اور کیا بیتی؟ مجھے خبر نہیں۔ ریلوے تھانہ کی ابتدائی کارروائی کے بعد مجھے قلعہ گوبندگڑھ (امرتسر) میں لے جایا گیا۔ رات بھر سی۔ آئی۔ ڈی نے مجھ پر متعدد سوالات کیے۔ تم کون ہو؟ تمہارے ساتھ کون تھا؟ تم کہاں جا رہے تھے، تمہیں ٹکٹ کس نے خرید کر دیا؟ ترنتارن جا کر کیا کرنے کا ارادہ تھا؟ وغیرہ۔ وغیرہ۔

لیکن میں نے ایک ہی بات کی کہ میں کانگریس کا والنٹیر ہوں۔ جالندھر اپنے ماموں کے پاس جا رہا تھا۔ ٹکٹ میں نے خود خریدا تھا۔ ترنتارن سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ اور نہ مجھے کچھ پتہ ہے۔ تمام رات تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس طرح کے سوالات ہوتے رہے۔ صبح مجھے لاہور شاہی قلعہ لے جایا گیا۔

متحدہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں لاہور کے شاہی قلعہ کو بڑی اہمیت رہی ہے۔ محبِ وطن لوگوں کو اس مغلیہ حصار میں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر آج عدلِ جہانگیری کا میزان باقی ہوتا۔ یا اس زنجیر کی کوئی کڑی ہوتی جسے ہلا کر فریادی ہندوستان

کے شہنشاہ تک اپنی آواز پہنچا سکتا تھا۔ تو اس قلعہ کی ایک ایک اینٹ کو شہادت کے کٹہرے میں آنا پڑتا۔ تاکہ آزادیٔ وطن کے حصول میں غیر ملکی حکمرانوں کے ظلم و جور کی داستان سند حاصل کرتی۔ مگر آہ! مقامِ عبرت کو تماشہ گاہ بنا دیا گیا۔ وہ خون پانی ہو کر راوی کی موجوں سے جا ملا۔ جس کی بہار آفرینی سے گلوں کے چہروں پر نکھار آیا۔ وہ ہڈیاں کہ اگر وجود میں ہوتیں تو ان کی للکار سے کتنے شاہی محل جل گئے ہوتے۔ مگر آج اس مٹی کے سفال بنائے جا رہے ہیں جن سے آپ سیال کا ابال کسی نئے انقلاب کا پیغام دے رہا ہے۔

یہ تو پتہ چل گیا کہ میں کسی اجنبی جگہ لایا گیا ہوں۔ مگر کہاں؟ اس میں شبہ رہا۔ دن ڈھلنے تک کئی افراد مجھے دور سے دیکھ کر چلے جاتے رہے۔ رات ہو چکی تو کھانا آیا اور بڑا پر تکلف۔ جس میں انڈے، پراٹھے اور گوشت شامل تھا۔

سرکاری مجرم کے لیے یہ خوراک عجیب معلوم ہو رہی تھی۔ تاہم رات گئے پتہ چل گیا کہ یہ لاہور کا شاہی قلعہ ہے۔ اور تحقیق طلب ملزم سے شروع میں یہی سلوک ہوتا ہے۔ جوانی کے دن اور اس پر یہ خوراک، بجلی کی تیز روشنی ہو تو آرام کہاں۔ مگر نیند نے خواہ مخواہ غلبہ شروع کیا۔ پھر گذشتہ شب کی بیداری بھی تھی۔ ابھی اونگھ آئی ہی تھی کہ ایک صاحب نے ماں کی بڑی سی گالی دے کر بانس کی چھڑی سے بیدار کرتے ہوئے کہا۔ اٹھ اوئے! تیری . . . . . . لٹے پلنگ تے سونا آرام دی نیند رہے۔ پنجابی طرزِ تکلم سے اس طرح کے کئی سوالات اور گالیاں۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد سوالات کی بوچھاڑ۔ تیرے ساتھ کون کون تھا؟۔ ریوالور کہاں سے لیے تھے؟۔ پارٹی کے باقی آدمی کہاں رہتے ہیں۔ تم ان کے ساتھ کیسے اور کب سے شامل ہو۔

میرا پھر ایک ہی جواب تھا کہ میں کسی کو نہیں جانتا۔ نہ کوئی میرے ساتھ تھا۔ میں تو جالندھر جا رہا تھا۔ ایک گھنٹہ مغز کھپائی کے بعد ایک اور صاحب آ گئے۔ اس نے گالیاں پہلے سے زیادہ دیں۔ مگر تحقیق کا وہی رنگ۔ یہ سلسلہ رات بھر رہا۔ ہر گھنٹہ کے بعد نیا آدمی آتا۔ اس دوران سب سے بڑی سزا یہ تھی، کہ میں سونا چاہتا تھا اور وہ بیدار رکھنے

کی کوشش کرتے تھے ۔ مرغن غذا بھی اسی لیے دی گئی تھی کہ مجھے نیند آئے اور وہ بیدار
کریں ۔ تاکہ کسی وقت کوئی راز اگل دوں ۔ مگر ان تلوں میں تیل کہاں تھا ۔ صبح اذان کے
وقت تھوڑی دیر کے لیے یہ سلسلہ رک گیا ۔ اس فرصت میں آنکھ لگی ہی تھی کہ مجھے کوٹھڑی
سے نکال کر میرے دونوں ہاتھ چارپائی کے نیچے دے دیے گئے ۔ اور چارپائی پر ایک
موٹا سا کالے رنگ کا آدمی بٹھا دیا گیا ۔ اس کا رنگ اس قدر سیاہ تھا کہ اگر یہ کچھ دیر مزید
ماں کے پیٹ میں رہتا تو شائد اندر سے راکھ ہی نکلتی ۔ اس نے جو گالیاں دیں اور
سوالات کیے ۔ کاش تہذیب انہیں صفحہ قرطاس پر نقل کرنے کی اجازت دے ۔

ایسا لگتا ہے کہ انگریزی عہد میں پولیس کو گالیاں بکنے کا باقاعدہ کورس پڑھایا جاتا تھا اور
ایسے ہلکے گھرانوں کے لوگ پولیس میں بھرتی کیے جاتے جنہیں یہ زبان استعمال کرنے
میں کسی طرح کی دقت محسوس نہ ہو ۔

دو دن بیت گئے تو تیسری رات کا نصف بھی تحقیق میں ناکام گذرا ۔ البتہ رات
کا باقی حصہ قدرے سکون سے گذرا ۔ تیسرے روز مجھے برہنہ برف کی ایک بڑی سل پر بیٹھنے
کو کہا گیا ۔ اور سوالات بھی بڑے ٹھنڈے طریق پر کیے گئے ۔ ان میں بدزبانی کی حلاوت نہیں
تھی ۔ ڈیوٹی پر مقرر آدمی نے کہا " برخوردار تو کن لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا ۔ ابھی تمہاری
عمر پھلنے پھولنے کی ہے ۔ یہ لوگ تجھے برباد کر دیں گے ۔ ان کے نام بتا کر اپنی جان چھڑا ۔
میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں ۔ تجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی ۔

" میں اصولی طور پر تشدد پسند لوگوں کا ساتھی نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ میں کانگریس کا
رضاکار ہوں ۔ اور کانگریس تشدد کی حامی نہیں ۔ مگر پولیس نے مجھے خواہ مخواہ ملزم قرار
دے لیا ہے ۔ میں تو اس روز جالندھر جا رہا تھا ۔

آٹھ گھنٹے مسلسل برف پر بیٹھنے سے جسم کا نچلا حصہ ایک عرصہ تک مفلوج سا
رہا اس کے باعث دوڑنے اور تیز چلنے میں رکاوٹ رہی ۔

چوتھی اور آخری سزا یہ تھی کہ میرے کپڑے اتار کر تمام جسم پر مونج کا بان لپیٹ
دیا گیا اور اوپر سے پانی چھڑک دیا ۔ یہ سزا گذشتہ تمام سزاؤں سے سخت تھی میرا

تمام بدن اس طرح اکڑ گیا۔ جیسے مجھے کسی کولہو میں دے دیا گیا ہو۔ ہر آدھ گھنٹے بعد بان پر پانی چھڑک دیا جاتا تا۔ تاکہ وہ خشک نہ ہو۔

بحمد للہ کہ اس پر بھی میں ثابت قدم رہا۔ نہ جرم کا اقرار کیا اور نہ کسی ساتھی کا نام بتایا۔ آخر چوتھے روز پولیس نے مجھے قلعے سے رہا کر دیا۔ سنا تھا کہ اس مقدمہ میں صرف ان حصار کے ساتھیوں کو بغیر لائسنس اسلحہ رکھنے کے جرم میں دو دو سال قید کی سزا ہوئی تھی۔

احرار میں شمولیّت | امرتسر تجارتی مرکز ہونے کے ساتھ پولیٹیکل دنیا میں بھی انفرادی حیثیت رکھتا تھا۔ تحریک خلافت، ترک موالات، ستیہ گرہ اور کشمیر ایسی تحریکات کے دنوں یہاں سے جو سیاسی شخصیتیں ابھریں۔ ان میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، خواجہ عبدالرحمٰن غازی نمایاں ہیں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور عبدالرحمٰن غازی قربانی و ایثار کی دوڑ میں ہمیشہ ایک ساتھ رہے۔ امرتسر سے باہر کے عوام نے بھی انہیں احترام سے دیکھا۔

ڈاکٹر کچلو ہندوستانی پہلے اور مسلمان بعد میں کہلانا پسند کرتے تھے۔ جبکہ غازی عبدالرحمٰن اول مسلمان اور پھر ہندوستانی ہونے کے دعویدار رہے۔ اس بُعد میں دونوں کے مابین نفرت کی ایسی لکیر کھنچی کہ آخر کو امرتسر کا پالیٹیکس گدلا ہو کر رہ گیا۔

چودھری افضل حق، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، شیخ بشیر احمد رضوانی اور خواجہ عبدالرحیم عاجز، غازی صاحب کے دھڑے میں شمار ہوتے۔ غیر مسلم کانگریسی رہنما شیخ حسام الدین سمیت ڈاکٹر صاحب کے ہمنوا بن گئے۔

سیاسیات میں یہ زمانہ میری لاشعوری کا تھا۔ لیکن عاجز صاحب سے وابستگی کے باعث مجھے اول الذکر گروہ کے ساتھ رہنا پڑا۔

مقامی کانگریس کمیٹی کے صدر کا انتخاب تھا۔ اس کیلئے چودھری افضل حق اور ان کے مدمقابل ڈاکٹر کچلو اس عہدہ کے امیدوار تھے۔ دونوں اپنی جگہ صدر منتخب ہو گئے۔ چودھری افضل حق کا جلوس سفید گھوڑے پر شہر سے گذرا اور ڈاکٹر کچلو کار پر سوار گھومتے رہے۔ اس روز فریقین میں ہاتھا پائی ہوئی۔ شہر سے ہٹ کر یہ لڑائی

گھروں تک پہنچی۔ بہت سے کارکن ان گروہ بندیوں سے دل برداشتہ ہو کر گھروں میں جا بیٹھے۔

یہ کارروائی جب کانگریس کی میز پر پہنچی تو ڈاکٹر کچلو کا انتخاب جائز قرار دیا گیا۔ ہندو مہا سبھا کے ممبر ڈاکٹر گوپی چند بھارگو ان دنوں پنجاب کانگریس پر قابض تھے۔ اور ان کے حریف ڈاکٹر ستیہ پال۔ خواجہ عبدالرحمٰن غازی کے حامی سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح پنجاب کانگریس میں ایک خلیج حائل ہو گئی، جو تقسیم برصغیر تک قائم رہی۔

ان واقعات کے پس منظر میں ۱۱۔ جولائی ۱۹۳۱ء کو میں خواجہ عبدالرحیم کی معیّت میں لاہور پہلی احرار کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوا۔ ہر اجلاس کا آغاز قرآنِ حکیم کے بعد میری نظم سے ہوتا۔ قیام مجلس احرار کے بعد مرکز نے قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مجھے مغربی پنجاب میں مجالس احرار کے قیام کی ذمہ داری سونپی۔ گوجرانوالہ، سیالکوٹ گجرات، جہلم، راولپنڈی، لائلپور، چنیوٹ، پسرور، چونڈہ جیسے اہم شہروں میں جماعتی نظام کے ساتھ نئے کارکنوں کی تلاش اور اس میں کامیابی کا سہرا ہم دونوں کے سر ہے۔

اس دوران مرزائیوں کی کشمیر کمیٹی کی طرف سے ۱۴۔ اگست ۱۹۳۱ء کو یوم کشمیر کے سلسلے میں اکثر اجتماعات پر ہم نے قبضہ کیا۔ اور مرزائیت کے ناپاک عزائم کو شکست دی۔

میری مختصر سیاسی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں امرتسر کے علاوہ پنجاب کے مختلف شہروں سے آشنا ہوا۔ میری پنجابی نظموں اور آواز کا شہرہ بھی یہیں سے شروع ہوا۔

داغ ہائے

تن ہمہ داغ داغ شد

دل کے دامن پر داغوں کا اس قدر ہجوم ہے کہ انہیں شمار کرنے بیٹھوں تو نئے زخم ابھر آنے کا خطرہ رہتا ہے۔ سوچتا ہوں تو عمر بھر کے لیے یہی کافی ہیں کہ ان کی ہر ٹیس منزل کے نزدیک کر دیتی ہے۔ جب کبھی انہیں کریدنے بیٹھتا ہوں تو اپنے

اندر برائیوں کی کئی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ پھر یہ ہیولے آپ سے آپ مٹ جاتے ہیں۔ اپنے عصیاں کے ڈھیر پر کھڑا ہو کر جب ان داغوں پر نظر ڈالتا ہوں تو ہر ایک سے دیرینہ راہ و رسم معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں دھونے یا مٹانے کو کبھی جی نہیں چاہا۔ الحمدللہ کہ ان میں نہ تو کسی کی غیبت کا نشان ہے نہ جھوٹ کی کوئی علامت نظر آتی ہے۔ البتہ جسم کے داغ ایسے ہیں، جنہیں بہر حال باقی رکھنا اہم خیال کرتا ہوں کہ شاید انہی کے واسطے سے نامۂ اعمال میں رونق آجائے۔ ؎

مزا تو جب ہے خدا حشر میں کہہ دے

کہ یہ بندۂ دو عالم سے خفا میرے لیے تھا

اکتوبر ۱۹۳۱ء کا ذکر ہے لاہور میکلیگن کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر وہیکر نے کلاس میں خاتم الانبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ناپسندیدہ الفاظ کہے جسے مجلس احرار نے دیگر مسلمانوں کے ساتھ محسوس کیا۔ اور یہی احساس تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ رات بھر احرار رضاکار کالج کے مین گیٹ پر پکٹنگ کرتے رہے۔ صبح جماعت نے مجھے حکم دیا کہ ان رضاکاروں میں چنے تقسیم کرنے کالج کے دروازے تک جاؤں۔ لیکن ڈیوٹی پر کھڑے پولیس آفیسر نے روک دیا۔ یہ اس کے آفیسر کا حکم تھا۔ میرے آفیسروں کا حکم تھا کہ میں ان کے حکم پر عمل کروں۔ تاآنکہ ہم دونوں میں تکرار بڑھتا گیا۔ آخر میں نے دروازے پر پہنچنے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسے ہی میرا قدم اٹھا، پولیس آفیسر نے بید کا ڈنڈا اس زور سے میرے دائیں ہاتھ پر مارا کہ پانچے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اتنے میں قریب کھڑے عوام میں سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر جلدی سے مجھے اٹھا لیا۔ سکول کے ایک بچے کی تختی توڑ کر میرا ہاتھ باندھ دیا۔ تانگے میں ڈال کر وہ مجھے بھاٹی دروازے کے اندر اپنی دکان پر لے گیا۔ ہاتھ کا ٹوٹا ہوا جوڑ چڑھا کر پٹی باندھ دی۔ کچھ دنوں بعد یہ ہاتھ کام کرنے لگ گیا۔ لیکن اس کا داغ آج تک درست نہیں ہوا۔

۱۹۳۰ء کی تحریک آزادئ وطن میں ولائتی کپڑے کی دکان پر پکٹنگ کر رہا تھا کہ

پولیس نے لاٹھی چارج کر دیا۔ جس سے دائیں بازو کے کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی جسے
بعد میں ہسپتال والوں نے درست کیا۔ مگر کندھے کا ابھار ہنوز باقی ہے۔

ایک ہی بازو پر غیر ملکی تشدد کے دو نشان، کبھی کبھار تو ایسے درد کرنے لگتے
ہیں کہ ان کی تکلیف سے سارا جسم رونے لگتا ہے۔

۱۹۳۵ء میں گورداسپور جیل پہنچا اور وہاں چکی پیستے وقت ٹوٹے ہوئے ہاتھ اور
کندھے کے زخم تازہ ہو گئے۔ جن کے باعث مشقت نہ ہو سکی اور جیل خانے کے
چیف ہیڈ وارڈ نے ایک ہفتہ کے لیے تنہائی کوٹھڑی کی سزا دی۔

تحریک کشمیر

اکتوبر ۱۹۳۱ء میں مجلس احرار نے کشمیری مسلمانوں کو ڈوگرہ شاہی سے
نجات دلانے کے لیے راجہ سے جنگ لڑی۔ اس لڑائی میں میرے
سپرد جہلم کا محاذ تھا۔ دریا کا پتن عبور کر کے رضاکار میرپور میں داخل ہوتے تھے۔ یہ کشمیر
کا ایک حصہ ہے۔ پنجاب کے دیگر اضلاع سے قافلے آتے اور میں انہیں ترتیب دے کر
ساتھ ریاست کی حدود میں سول نافرمانی کے لیے بھیجتا۔ میری ان سرگرمیوں سے ضلعی
حکام نے گھبرا کر میری گرفتاری کا فیصلہ کر لیا۔ یہ اطلاع مجھ تک پہنچی، تو میں نے جہلم
کے علاوہ گجرات، وزیر آباد اور سیالکوٹ کو بھی اپنی کارگزاریوں میں شامل کر لیا۔

جہلم کے جلسے سے فارغ ہو کر راتوں رات کشتی کے ذریعے دریا عبور کر کے گجرات
وزیر آباد اور سیالکوٹ پہنچتا۔ تقریریں کرتا، لوگوں کو تحریک سے تعاون پر آمادہ کرتا
اور سر شام جہلم واپس آجاتا۔ احرار رہنما جیل خانوں میں تھے۔ تحریک کی تمام تر ذمہ داری
میرے ایسے کارکنوں کے سر تھی۔ رات یہاں خطاب کرتا اور اندھیرے اندھیرے یہ
ضلع چھوڑ دیتا۔ ضلعی حکام کے ساتھ مشورے سے حکومت پنجاب نے میری گرفتاری
کے آرڈر سخت کر دیئے۔ میری روزانہ آمدورفت کا حکومت کو علم تھا۔ انہوں نے
دریائے جہلم کے پل پر مجھے گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس سے بے خبر تھا۔ جیسے
ہی لاری جس میں میں سوار تھا، پل پر پہنچی۔ پولیس نے اسے اپنے گھیرے میں لے
لیا۔ لاری کی تلاشی لی اور دیکھ بھال کے دوران پولیس انسپکٹر بڑے اعتماد سے میری

طرف بڑھا اسے میرے متعلق شبہ ہوا کہ میں جانباز ہوں۔

"تم کون ہو؟" ۔"میں شہر میں ایک گھڑی ساز کا ملازم ہوں اور چھٹی پر گھر گیا ہوا تھا۔" اس ایک سوال کے بعد لاری کو جانے دیا گیا۔ رات جلسے میں میں نے اس واقعہ کا ذکر بڑی دلچسپی سے کیا۔ عوام محظوظ ہوئے لیکن متعلقہ پولیس افسر ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ دوسرے روز پولیس غصے میں تھی۔ آخر ۳۱۔نومبر ۱۹۳۱ء شام چار بجے جب میں قافلے کو محاذ کی طرف رخصت کر چکا تو شہر کے بڑے چوک کو فوج کے تعاون سے گھیرے میں لے لیا۔ قافلہ رخصت ہو چکا تو مجھے گرفتار کر لیا۔

ضلعی حکام کو میرے نام کی دہشت سے میرے متعلق بڑی غلط فہمی تھی۔ انہیں خیال تھا کہ جانباز بڑا قد آور بھاری بھر کم اور طاقتور ہو گا۔ اس لیے میری گرفتاری کے ضمن میں انہیں بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ جیل افسران تک کو جیل میں میرے لیے وسیع انتظام کرنے پڑے۔

جیسے ہی میں ڈسٹرکٹ جیل (جہلم) میں داخل ہوا۔ پولیس آفسر نے میرے وارنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل (جو ایک سکھ تھا) کو دکھائے۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ٹھہرو جی! ابھی تو وہ جانباز آ رہا ہے۔ اس کے انتظام میں صبح سے لگے ہوئے ہیں۔ تم ذرا ٹھہرو"! پولیس آفسر نے مسکراتے ہوئے کہا "سردار جی! یہی ہے جانباز۔ سپرنٹنڈنٹ نے اسے مذاق سمجھا اور اسے پھر ٹال دیا۔ دوسری دفعہ پھر وارنٹ آ گئے۔ تب اسے یقین ہوا کہ میں ہی وہ ملزم ہوں جس کے لیے پولیس کی اطلاع پر وہ صبح سے مصروف تھا۔ مجھے پھانسی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ رات گزار کر صبح تھوڑی دیر کے لیے مجھے دھوپ تاپنے باہر نکالا۔ تو میرے برابر والی کوٹھڑی سے ایک سفید ریش سرخ پوش ہتھکڑی اور بیڑیوں سے جکڑا ہوا باہر آیا۔ یہ سمجھ کر میں نے اسے بڑی عقیدت اور محبت سے دیکھا کہ یہ بزرگ اس علاقے کے کوئی بڑے احرار رہنما ہیں۔ ان کا سر سے پاؤں تک سرخ لباس، بڑی بڑی ڈاڑھی، پیشانی پر محراب، قد آور شخصیت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن بہت جلد یہ راز کھل گیا کہ یہ حضرت ضلع جہلم کے مشہور ڈاکو ہیں اور

گذشتہ ماہ جیل کی دیوار پھاند گئے تھے۔ دوبارہ گرفتاری پر جیل قانون اور ضابطے کے مطابق انہیں خطرناک قیدی قرار دے کر سرخ لباس پہنا دیا گیا ہے۔ یہ سن کر میں اپنی سابقہ رائے پر بڑا شرمندہ ہوا۔

میرے مقدمے کے لیے پنجاب حکومت نے امرتسر کے مشہور ظالم قسم کے مجسٹریٹ مسٹر عزیز دین کو متعین کیا۔ وہ روزانہ جیل میں میرا مقدمہ سنتا۔ جماعت کی ہدایت کے مطابق مجھے اس کارروائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لہٰذا میں خاموش بیٹھا رہتا چار دن کی مسلسل کارروائی کے بعد مجھے ایک سال قید محض اور بی کلاس کا حکم دے کر مجسٹریٹ نے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور چلا گیا۔ صبح جیل حکام نے مجھے کپڑے تبدیل کرنے کو کہا۔ چونکہ عدالت نے قید محض کا حکم سنایا تھا۔ لہٰذا میں نے جیل کا لباس پہننے سے انکار کر دیا۔ اس پر وارنٹ دیکھے تو وہاں سزا سخت تھی۔ قید ایک سال کی بجائے دو سال لکھی تھی۔ بی کلاس کی بجائے سی کلاس کا حکم تھا۔ یہ میری چوتھی سزا تھی

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر عزیز دین سزا دینے میں اپنے پورے اختیارات استعمال کرتا تھا ۱۹۳۵ء میں یہ گورداسپور تعینات تھا۔ قادیان میں تحریک جمعہ کے دوران قاضی احسان احمد کو اس نے چھ ماہ قید اور ایک ہزار جرمانہ کی سزا دی تھی۔ جبکہ اس تحریک میں حضرت امیر شریعت اور مجھے دوسری عدالتوں نے تین تین ماہ قید اور پچاس پچاس روپے جرمانہ کی سزا دی تھی۔

مسٹر عزیز دین امرتسر چوک فرید کا رہنے والا تھا۔ اور موت سے ایک سال پیشتر اسے گھمبیر (پھوڑا) نکلا۔ جس کے باعث اس کے جسم میں کیڑے پڑ گئے۔ جس کے لیے کئی سیر گوشت کا قیمہ روزانہ اس کے زخموں میں ڈالا جاتا۔ یہاں تک کہ موت کے وقت اس کے بدن سے اس قدر بدبو آ رہی تھی کہ اس کی اولاد بھی اس کے نزدیک نہیں گئی۔ آخر جنازہ بھنگیوں کے کندھوں پر اٹھا کر قبرستان تک لے جایا گیا۔ استغفر اللہ۔ استغفر اللہ۔ استغفر اللہ۔

شاعری کی ابتداء

ماں کی کوکھ سے قبر کی لحد تک انسان جن راہوں سے گذرتا ہے جوانی ان میں نہائت حسین شاہراہ ہے۔ان دنوں عقل وخرد سے بیگانہ اپنے لیے ایسی راہ پسند کرتا ہے۔ جسے وہ اپنی دانست میں دائمی سمجھتا ہے۔

حیاتِ چند روزہ میں کچھ ایسے دن بھی آتے ہیں
حیاتِ چند روزہ دائمی معلوم ہوتی ہے

یہاں وہ دل کے سوا کسی کی رہنمائی قبول نہیں کرتا اور اسی ساز کے تاروں پر ایسے گیت چھیڑتا ہے، جو بے وقت راگنی کی طرح بھلے نہ بھی ہوں۔ تو بھی اسے بھلے لگتے ہیں۔ جذبات کی پاکیزگی اور طبعِ سلیم پائی ہو تو شاعرانہ مزاج کی پرورش کے یہی دن ہوتے ہیں۔اس کو دوام بھی یہیں سے حاصل ہوتی ہے۔ اکثر تو دوریٔ منزل کے باعث راستے میں دم توڑ دیتے ہیں۔ اور جنہیں منزل نصیب ہوتی ہے۔ زمانہ انہیں مجنوں کہتا ہے۔ حالانکہ غالب کہتا ہے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

لیکن دوسری جگہ غالب کہتا ہے۔ ع

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تاہم یہ حقیقت ہے کہ عشق لازوال ہونے کے ساتھ لاعلاج مرض بھی ہے۔

جہلم کے متعینہ دن بہارِ زندگی کے عجیب دن تھے۔ شہرت اشباب کی آمد گلے میں حلاوت اور دریائے جہلم کی بھیگی ہوئی ترنم ریز موجیں اس آئینے میں ہر چیز حسین لگتی تھی۔ایسا لگتا جیسے میں کسی نئی دنیا میں آگیا ہوں۔ ان دنوں کی چاندنی راتیں۔ احساسِ تنہائی سے اندھیر دکھائی دیتیں۔ جذبات کا ہجوم انہیں بے روح بنا دیتا۔ شاید اس سفر کی مزید منزلیں طے کرتا مگر جلدی سے پلٹ کر دیکھا تو میں اپنی راہ سے بھٹک چکا تھا۔ جیل خانے کا سنگدلانہ ماحول میری شاعری پر مسکرا رہا تھا۔ یہ شعر انہی دنوں کی

پیداوار ہے۔ ؎

اپنی صورت دکھا دو خدارا مجھے ۔ نہیں دردِ محبت کا یارا مجھے

یہ شعر اس غزل کا ہے جو میں نے ابتدائے شاعری میں کہی۔ ورنہ عام طور پر پنجابی شعر کہتا تھا اور یہ بھی کہا ہے گا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے شروع میں آئینہ کے عنوان کا شعر بھی جہلم جیل کی یادگار ہے۔ ؎

میرا یہ دل بھی لے لو وقتِ زینت کام آئے گا
یہ آئینہ ہے جب زلفیں بنانا دیکھتے جانا

اسی غزل کا مطلع ہے۔ ؎

قفس میں تیلیوں کا آب و دانہ دیکھتے جانا
نرالا ہے زمانے سے یہ کھانا دیکھتے جانا

چونکہ یہ میرا میدان نہیں تھا۔ لہٰذا ابتدا کی چند غزلوں کے بعد یہ راستہ ترک کر دیا۔ ویسے بھی میرے نزدیک اسد اللہ خاں غالب کے بعد غزل کہنا غزل ایسی نازک جنس کو کانٹوں میں گھسیٹنا ہے۔ گو مولانا حسرت موہانی اور حضرتِ جگر نے اس گناہ کے وزن کو قدرے ہلکا کر دیا ہے۔ اور ان کے کلام نے غزل کے مقام کو سنبھال لیا تاہم یاروں نے بہت زور غزل میں مارا۔

شاعری اظہارِ محبت کا ایک انداز ہے۔ محبت کسی سے بھی ہو جب اس کے شعلے اٹھتے ہیں، تو خِرد دور سے تماشہ دیکھتی ہے۔ اگر یہ بھٹی کبھی بجھنے لگتی ہے تو عقل متقضی ہوتی ہے کہ اس میں مزید ایندھن ہونا چاہیے۔ تاکہ یہ چنگاری دھواں دیتی رہے۔ یہ درست ہے کہ عشق کا آزار مجھے بھی ہوا۔ لیکن اول اسلام کی سربلندی اور دوسرے درجے پر وطنِ عزیز کی آزادی کے لیے۔ عمر بھر میری شاعری کا یہی محور رہا ہے۔ اور یہی جذبات میری فردِ جرم کا عنوان ٹھہرائے گئے۔ ایمان اور ضمیر نے ان جرائم پر ہمیشہ فخر کیا۔ لیکن سزا اور جزا سے مادری رہ کر۔

پھر بورسٹل جیل سزا ملنے کے ایک ہفتہ بعد مجھے لاہور بورسٹل جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان دنوں اس قیدی خانے میں گناہگاروں کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی۔ احرار اور کانگریس کے قیدی اپنی اپنی تحریکات کے تحت ایام اسیری گذار رہے تھے۔ ڈیڑھ سال کی غیر حاضری کے بعد میں پھر یہاں لایا گیا تھا۔ اس جیل کی بھولی بسری یادوں نے کئی زخم تازہ کر دیے۔ بورسٹل جیل کی اونچی دیواروں نے دو برس کے لیے پھر مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔ پرانے قیدیوں سے نئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ہر ایک نے رودادِ اسیری دہرائی۔

ان دنوں احرار ورکنگ کمیٹی اور مہاراجہ کشمیر کے مابین صلح کی بات چیت اس جیل میں چل رہی تھی۔ جیل قانون کے مطابق نئے قیدی کو ایک عشرہ جیل کی مختلف کوٹھڑیوں میں رکھا جاتا۔ اس رسم سے فارغ ہو کر آخر کو میں بارڈر لائن میں آن پہنچا۔ احرار ورکنگ کے ممبران اسی احاطہ میں تشریف فرما تھے۔

بورسٹل جیل کے عقب میں نیو بورسٹل جیل اسی سال مکمل ہوئی تھی۔ میں پہلا قیدی ہوں جو اس میں داخل ہوا۔ (آجکل اسے کیمپ جیل کہا جاتا ہے) رات بارہ بجے مجھے جہلم سے یہاں لایا گیا۔ تو پہلی بار اس جیل کا پھاٹک کھلا۔ یہاں کے حکام میں ٹیلارام نامی آفیسر بھی تھا۔ میری اس سے آتے ہی ٹھن گئی۔ ایک روز اپنے احاطے میں کپڑے دھو کر خشک کرنے کے لیے ڈال رکھے تھے۔ اور خود ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ کہ بابو ٹیلارام کہیں سے آنکلا۔ مجھے دیکھ کر نمبردار سے کہا۔ اسے چوتھے احاطے میں لے جاؤ۔ یہ وہی احاطہ ہے جہاں ۱۹۳۰ء کو لایا گیا تھا۔ اس حکم کی تعمیل میں جیسے ہی نمبردار نے مجھے پکڑا۔ دوسرے قیدیوں نے ہنگامہ کر دیا۔ کہ وہ سب بھی جانباز کے ساتھ جائیں گے۔ اس پر حاکم اور محکوموں کے درمیان جھگڑے نے طول کھینچا۔ نوبت ہاتھا پائی تک آن پہنچی۔ خطرے کا آلارم ہو گیا۔ جیل افسران، نمبردار اور وارڈر سبھی کیل کانٹوں سے لیس ہو کر موقع واردات پر پہنچ گئے۔ وارڈروں نے لاٹھیاں چلائیں اور نمبرداروں نے پیٹیاں اتار کر قیدیوں کو پیٹا۔ میرے سمیت بیسیوں احرار رضاکار زخمی

ہوئے۔ مجھے سٹریچر پہ ڈال کر سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ ہنگامی حالات کا اعلان ہوتے ہی احرار رہنما بھی موقعہ پر آموجود ہوئے۔ حکام جیل نے تمام کارروائی کے بعد اس مقدمے کا فیصلہ میرے خلاف دیا۔ اور ایک ہفتہ تنہائی کوٹھڑی کی سزا دی۔

جیل خانے کی اس سزا کے بعد میں زعمائے احرار کی معیت میں رہنے لگا۔ قید کے دن آسان ہو گئے۔ دن ہنستے کھیلتے گذرتے رہے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری مولانا محمد چراغ گوجرانوالہ بھی یہیں تھے۔ ان دونوں کا احترام سب کے دلوں میں تھا۔ البتہ مولانا محمد چراغ بزم لطائف میں اکثر شامل رہتے۔ علمی مجالس ہوتیں مناظرے ہوتے۔ شعر و شاعری کی بزم آرائیاں اور سیاسی بحثیں ہوتیں۔

حکومت کشمیر سے ناکام گفتگو کے بعد احرار ورکنگ کمیٹی کے تمام رہنماؤں کو ملتان جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ ان کے جانے کے بعد کچھ دن جی اداس رہا۔ آخر دل بہلتے بہلتے بہل گیا۔

۱۹۳۰ء میں کرسی بننے کی مشقت ملی تھی۔ لیکن ایک دفعہ جیل ہسپتال کی خوراک کا انچارج مقرر کیا گیا۔ مجھ سے پیشتر نوسے پونڈ دودھ آیا کرتا تھا۔ وہ بھی ڈیری فارم کا۔ مگر انچارج صاحب دس پونڈ نکال کر اس میں پانی ملا دیتے۔ لیکن میں نے چارج سنبھالتے ہی سو پونڈ کر دیا۔ اس سے بیمار قیدیوں کی ڈھارس بندھی اور وہ خوش ہو گئے۔ ایک سال اسی طرح گذر گیا کہ اچانک جیل میں ایک بیماری پھیلی جس سے سینکڑوں قیدی موت کے منہ میں چلے گئے۔ لیکن مرض سمجھ میں نہ آسکی۔ اچھا بھلا قیدی مشقت میں مصروف ہے۔ کہ کان کے نیچے درد اٹھتا ہے۔ اور ساتھ ہی خصیوں میں ورم آجاتی۔ قیدی ہسپتال پہنچتے پہنچتے اللہ کو پیارا ہو جاتا۔ اتفاق ایسے کہ اس موذی مرض کا شکار ایسے قیدی ہوئے جن کی میعادِ اسیری قریب الاختتام تھی۔ یہ وبا ساری جیل میں پھیل گئی اور افسرانِ جیل نے ڈیوٹی پر آنا چھوڑ دیا۔ آخر ایک دن آیا کہ سوائے میرے اور ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر گلاب سنگھ کے اور کوئی نہ

رہا۔ میں اور ڈاکٹر ہر صبح جیل کا دورہ کرتے۔ اگر کوئی مریض ہوتا اسے فوراً ہسپتال لے آتے۔ اس طرح ہسپتال میں کم اور بیماروں کے درمیان زیادہ وقت گذرتا۔ انہی دنوں جیل ہسپتال کے احاطہ میں چوری کی ایک واردات ہوئی۔ یہ سارا احاطہ بھی میری ذمہ داری پر تھا۔ ہوا یہ کہ مراد آباد کا ایک گرہ کٹ جو دو سال کی سزا بھگت رہا تھا۔ ہسپتال لایا گیا۔ دراصل وہ بیمار نہیں تھا۔ اس نے بیماری کا بہانہ کیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر ہسپتال کی دیوار توڑ کر دوسری سازش کیس کے زیر سماعت حوالاتیوں کی اشیاء چوری کر لی گئیں۔ ان میں صوبہ سرحد کے ڈاکٹر خان صاحب کے لڑکے عبید اللہ بھی تھے۔

میں ڈاکٹر کی ہمراہی میں راؤنڈ سے واپس آیا تو ہسپتال کے سامنے ہجوم دیکھا جس میں افسران، قیدی، نمبردار اور وارڈر بھی شامل تھے۔ سب نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

" جانباز صاحب! رات آپ کے پڑوس میں چوری ہو گئی ہے!" "ممکن ہے صاحب ایسا ہوا ہو۔ کیونکہ یہ سارا گاؤں چوروں کا ہے"۔ ظاہر ہے کہ میرا یہ جواب جیل افسروں کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال مجھ سے پوچھ ہونی چاہیے۔

دو برس شرافت سے گذارنے کے بعد رہائی کے قریب، میرے لیے یہ حادثہ سوہانِ روح تھا۔ اس وقت تک میں ایک سال سات ماہ قید کاٹ چکا تھا۔ بقایا پانچ ماہ میں کٹوتی کی امید تھی۔ جو چار ماہ سے زیادہ تک مل سکتی تھی۔ لیکن چوری کے واقعہ سے میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

ہسپتال کے تمام کمرے اور آس پاس کے باقی وارڈ بیمار قیدیوں سے بھرے پڑے تھے۔ ایسے میں چور کا کھوج لگانا کارِ دارد تھا۔ آخر پتہ چل گیا کہ وہی گرہ کٹ چور ہے۔ اس بھلے آدمی نے رات لوہے کی چارپائی کے سہارے دیوار کا ایک حصہ توڑا۔ حوالاتی بیرک سے باہر صحن میں سو رہے تھے۔ اس نے نہایت اطمینان سے چوری کی اور واپسی پر دیوار کو بڑی صفائی سے برابر کر دیا۔ لیکن دیوار کی پشت غمازی کرتی رہی کہ چور ہسپتال

کی طرف سے آیا ہے۔ اس رات یہی گرہ گٹ وہاں سویا ہوا تھا۔ اس طرح اللہ تعالےٰ نے مجھے محفوظ کیا۔ آخر جولائی ۱۹۳۴ء کو ایک سال آٹھ ماہ بعد رہا کر دیا گیا۔

آگے بیٹھے بھی نہ تھے

چودہری عبدالستار مرکزی دفتر احرار کے انچارج تھے۔ رہی سہی تحریک کشمیر کو وہی سنبھالا دے رہے تھے۔ جیل سے رہا ہو کر دفتر پہنچا تو سیالکوٹ جانے کو کہہ دیا۔ جہلم میں گرفتاری کے وقت کا سامان وہیں پڑا تھا۔ ارادہ کیا کہ امرتسر جانے سے پیشتر جہلم ہو آؤں۔ لیکن چودہری صاحب کے حکم پر سیالکوٹ جانا پڑا۔ وہاں پہنچتے ہی دفعہ ۱۰۹ میں گرفتار کر لیا گیا۔ ایک ہفتہ حوالات میں رہنے کے بعد عدالت میں پیشی ہوئی تو انگریزی میں ٹائپ شدہ ایک تحریر پر مجھے دستخط کرنے کو کہا گیا۔ میرے اصرار پر مجھے بتایا گیا کہ اس میں درج ہے کہ میں آئندہ حکومت کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لوں گا۔ میں نے اس معافی نامے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر عدالت نے مجھے ایک ہفتہ کی مہلت دے کر دوبارہ جیل بھیج دیا۔

سیالکوٹ ڈسٹرکٹ جیل میں ان دنوں تحریک کشمیر کے رہے سہے قیدی سزا کے دن گذار رہے تھے۔ ان میں مولانا حبیب الرحمٰن کے بڑے لڑکے مولانا خلیل الرحمٰن اور سیالکوٹ کے ایک بڑے مولوی صاحب بھی تھے۔ محرم کے دنوں کی سرکاری چھٹیاں گذار کر دوبارہ عدالت میں لایا گیا تو عدالت کے حکم پر چھ ماہ کے لیے بیلا داخلہ سیالکوٹ میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔

یہ میری پانچویں سزا تھی۔

خانگی حالات

گذشتہ سالوں کی جیل خانوں کی آمد و رفت نے خانگی حالات سے لاپرواہی کا عادی بنا دیا۔ اگر خیال آیا تو ایک راہگیر کی طرح بھائی سے مل لیا۔ ورنہ ان کے مزاج اور طبیعت نے مجھے اپنا حریف سمجھ لیا تھا۔

امرتسر میں ہمارا محلہ پہلوانوں کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ مرحوم غلام پہلوان، رستم ہند کلو پہلوان، ان کے تیسرے بھائی رحمانی پہلوان۔ پھر ان سب کی اولاد یہیں کے تھے۔

محترم بھائی جان کی عام بیٹھک انہیں میں تھی۔ خوراک اور ورزش میں انہی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ اور روزمرہ کی زندگی اسی سانچے میں ڈھل چکی تھی۔ پہلوان طاقتور ہونے پر بھی بزدل ہوتا ہے۔ مار پیٹ سے کوسوں بھاگتا ہے۔

جسم کا حسن اور بناوٹ، خون کے رنگ و روغن کی محتاج ہے۔ یہ سرمایہ پہلوان شب و روز کی محنت سے جمع کرتا ہے۔ اس خون کی ایک بوند ضائع کرنا اس کیلئے خزانہ لٹ جانے کے مترادف ہے۔ اس تصور سے بھائی جان لڑائی جھگڑوں سے ہمیشہ بھاگتے رہے۔ اور پھر حکومت سے لڑائی۔ الامان۔ اس ذہن نے میرے اور بھائی کے درمیان دیوار کو ایسا پختہ کیا کہ ان کی موت کے بعد بھی میں ان کھنڈرات کے قریب نہ جا سکا۔

خویش و اقارب میں سرکاری ملازمین کی بھیڑ اور دولت کی ریل پیل تھی۔ میری غربت نے مجھے ان کے نزدیک اچھوت بنا دیا تھا۔ حکومت کا باغی ہونا بھی ان کے لیے سوہان روح تھا۔ رشتے ناطے چھوٹ گئے۔ آمنا سامنا ہونے میں مہینوں نہ سال بیت گئے۔ خانگی تقریبات میں میری شمولیت اگر ہوتی تو اجنبی کی سی۔ ایک دوسرے کو دیکھتے تو راستہ کاٹ لیتے۔ ایسے حالات میں بھائی نے گھر سے نکال دیا۔ اور میں نے خواجہ عبدالرحیم عاجز کے ہاں پناہ لی۔ روحانی اور جسمانی ناطے نے ہمیں ایک دوسرے کے ایسا قریب کیا۔ کہ انہوں نے مجھے باپ کی سی محبت دی۔ سیاسی ہم آہنگی نے اس رشتے کی گرہ کو اور مضبوط کر دیا۔ عاجز صاحب کی والدہ محترمہ اور اہل خانہ نے مجھے اولاد کی طرح سنبھالا دیا۔ میری حیثیت گھر میں ایک فرد کی طرح سمجھی جاتی۔ سال ہا سال گذرنے پر بھی ان تعلقات میں دراڑ تک نہیں آئی۔

والد مرحوم تین بھائی تھے۔ ان میں دو لاولد تھے۔ والد صاحب سے دوسرے درجے پر حاجی کریم بخش مدت دراز سے امرتسر میں مقیم تھے۔ ان کی وراثت ایک مکان تھا۔ جس کے وارث ہم دونوں بھائی تھے۔ لیکن چچا مرحوم کو بھائی جان نے میرے خلاف اس قدر بھکایا کہ یہ مکان بھی انہی کے قبضہ میں چلا گیا۔

نظر بندی ذاتی اور خانگی جھمیلوں میں تھا کہ انجمن اصلاح المسلمین میرپور (کشمیر) کے سالانہ اجلاس کے لیے دعوت آئی۔ دیگر احرار رہنماؤں کو بھی اس میں شامل ہونا تھا۔ لیکن حکومت کشمیر کو اتنی سی بات پر جان کے لالے پڑ گئے۔ اور اس نے انگریز کے دروازے پر دستک دی کہ بچاؤ! احرار والے پھر ریاست پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔

شیر مردہ بھی ہو تو خوف سے خالی نہیں۔

احرار، گلینسی کمیشن کی رپورٹ کے بعد (جسے کشمیری رہنماؤں نے قبول کر لیا تھا) تحریک کشمیر اور کشمیری زعماء سے مایوس تھے۔ مگر اس کے باوجود احرار کا خوف برطانیہ اور ڈوگرہ شاہی کے دلوں پر طاری تھا۔ جیسے ہی میرپور اجلاس میں ان کے ناموں کی تشہیر ہوئی۔ دونوں سامراجی نظام سکتے میں آ گئے۔ احرار رہنماؤں کو ان کے مکانوں میں اور میونسپل حدود میں تاحکم ثانی نظر بند کر دیا۔ مجھ سے اس نوٹس کی تعمیل امرتسر میں کرائی گئی اور میں یہیں نظر بند رہا۔ ان دنوں نہ تو کوئی اخباری بیان اور نہ کسی پبلک جلسے میں شمولیت کر سکتا تھا۔

تحریکِ جمعہ ۱۹۳۵ء کا سال احرار کی زندگی میں گوناگوں مصائب کا بھرپور سال تھا۔ تحریکِ مسجد شہید گنج اور قادیان میں نمازِ جمعہ پر پابندی اس سال کی تاریخ ہے۔

دسمبر کے دم توڑتے دنوں کی بات ہے کہ مرزائیوں کے کہنے پر حکومت نے قادیان میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دیا۔ یہ محض اس لیے کہ قادیان سے باہر کا کوئی مسلمان یہاں نمازِ جمعہ نہ پڑھ سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم مداخلت فی الدین تھا۔ احرار نے اس حکم کی خلاف ورزی کا فیصلہ کر لیا۔ جیسے ہی اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی دونوں باطل قوتیں اپنے حواس کھو بیٹھیں

جماعت نے حضرت امیر شریعت کو قادیان میں نمازِ جمعہ کے لیے جانے کا حکم دیا۔ حکومت اور مرزائیوں کو یقین تھا کہ احرار شہید گنج تحریک میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔ لہٰذا وہ قادیان آنے کا قصد نہیں کریں گے۔ مگر جو ہونے والی بات تھی وہ ہو کے رہی۔

مقررہ دن قادیان جاتے ہوئے حضرت شاہ صاحب بٹالہ اور قادیان کے درمیان گرفتار کر لیے گئے۔ لیکن میں کسی طرح قادیان پہنچ گیا۔ جمعہ کی نماز بیری والی مسجد میں پڑھی (یہ مسجد مرزائیوں کی نام نہاد مسجد اقصیٰ کے برابر میں تھی) مقامی مسلمانوں کو جو نماز کیلئے جمع ہو گئے تھے میں نے خطاب کیا۔ حکومت اور مرزائیوں کے باہم گٹھ جوڑ سے آگاہ کیا۔ آئندہ جمعہ کے لیے مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری کو قادیان جانا تھا۔ مجھے بٹالہ تک مولانا کی ہمراہی کے لیے جماعت نے حکم دیا۔ چونکہ گذشتہ جمعہ میں قادیان سے ہو آیا تھا۔ لہٰذا بٹالہ ریلوے اسٹیشن پر مولانا ابوالوفا کے ساتھ مجھے بھی حکومت نے نوٹس دے دیا کہ میں قادیان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں نے نوٹس پھاڑ دیا۔ اور مولانا کے ساتھ قادیان جانے کی تیاری کر لی۔ پولیس نے مقررہ حدود میں داخل ہونے پر ہم دونوں کو گرفتار کر لیا۔ اسی روز عدالت میں تین تین ماہ قید، پچاس پچاس روپے جرمانہ، عدم ادائیگی جرمانہ ایک ماہ قید مزید کی سزا دی۔ اور بی کلاس میں رکھنے کی سفارش کی۔ یہ میری پانچویں سزا تھی۔

گورداسپور جیل میں پہنچے تو شاہ جی سے ملاقات ہوئی۔ کچھ دن تو ایک ساتھ رہے۔ آخر دونوں بزرگ دوسری جیل میں تبدیل کر دیے گئے۔ آخر میں تنہا رہ گیا لیکن دوسرے جمعہ مولانا قاضی احسان احمد میرے ساتھ آ شامل ہوئے۔

اس جیل کی کہانی بڑی دردناک ہے۔ ایک موقعہ پر قاضی صاحب کی ہلکی سی اہانت پر ایک ماہ چکی پیسنے کی مشقت نے کندھا اور ہاتھ کے پانچے کے جوڑ از سر نو ہلا دیے۔ اور ایسی تکلیف ہوئی کہ اسے بیان کرتے ہوئے آنسو آ جاتے ہیں۔

بہر حال تین ماہ قید اور ایک ماہ جرمانے کی سزا گذار کر اپریل ۱۹۳۶ء کے آخر میں رہا ہو کر امرتسر ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو شیخ حسام الدین، خواجہ عبدالرحیم عاجز اور سینکڑوں شہری لوگوں کو اپنے لیے موجود پایا۔

گورداسپور جیل کے دوران لکھی گئی نظموں کا مجموعہ "حسیات جانباز" کے نام سے شائع ہوا جو ملک بھر میں کافی مقبول ہوا۔ یہ میرا تیسرا دیوان تھا۔ اس سے پیشتر نغمۂ حیات

اور درس حریت شائع ہو چکے تھے۔

زندگی کا یہ روپ بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔ جب جوانی انگڑائی لے کر آوارہ آہو کی کی طرح اپنے نافے کی خوشبو سے فضائے عالم کو معطر کرتی ہے۔ شباب کی یہ گھڑیاں ڈھلتے سائے کی طرح ڈھل جاتی ہیں۔ لیکن ایک دفعہ تو اس سورج کی تمازت ریت کے ذرّوں کو بھی گرما دیتی ہے۔ مگر آہ! مجھے نہ اس کے طلوع کا پتہ چلا نہ غروب کی خبر ہوئی۔

ہوئے جوان تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

جھولنے میں کھیلنے کے دن تھے کہ والدین کی شفقت نے منہ موڑ لیا۔ ایک ایک کر کے عزیز و اقارب نے ترک تعلقات کر لیے۔ اور میں یک و تنہا خزاں نصیب پتے کی طرح باد سموم کے تھپیڑے کھانے لگا۔ قدموں پر چلنے کا سلیقہ آیا تو راستہ ناہموار تھا۔ بے سہارا زندگی ایسے رخ پر چل نکلی۔ کہیں مصائب و آلام کی بھیڑ میں کھو گیا۔ اور آگے بڑھا تو احساس آدمیت نے ایسی ٹھوکر ماری کہ اس کے سوا ہر شے سے دور جا گرا۔ آنکھ کھلی تو میرے گرد قفس کی تیلیوں کا ایک طویل جال تھا اور حسن و عشق کی رعنائیاں جیل خانے کی اونچی دیواروں نے دبوچ لیں تھیں۔ ؎

بہار اپنی، چمن اپنا، قفس کی تیلیوں تک ہے
مبارک نکہت گل کو چمن بر دوش ہو جانا

زندگی کے پچیس سال آنکھ جھپکنے میں گذر گئے۔ ؎

ابھی آئے اور آتے ہی تقاضہ بھی ہے جانے کا۔ اس آنے کو کیا کہیے، اور اس جانے کو کیا لیے۔

شہید گنج کے ملبے نے احرار کی عمارت کو ڈھانپ لیا تھا۔ یہ گرد و غبار کاروان احرار کے خلاف فرنگی حکمرانوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ جماعت ان دنوں گرہن میں تھی اور یہ وقت پارٹی سے وفا کی استواری کا تھا۔ جیل خانوں کی مصروفیت سے ذرا نجات ملی تو ریل کا سفر سامنے آ گیا۔ یہ سفر حضرت امیر شریعت کی معیت میں بھیرہ ضلع سرگودھا سے شروع ہو کر کانپور تک چلا گیا۔

دو ماہ کی مسافت، تھکان، شب و روز کے اجلاس، پیہم شب بیداری نے صحت پر برا اثر کیا۔ البتہ اس دورے کا عظیم سرمایہ شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مفتی کفایت اللہ، حضرت مولانا احمد سعید اور مولانا حفظ الرحمٰن سہاروی سے ملاقات ہے۔ نیازمندی کا یہ شرف تادم زیست میرے لیے باعث افتخار ہے۔ ان شخصیتوں سے عقیدت کا وہی عالم رہا جو احرار رہنماؤں سے تھا۔

جمیعتہ علمائے ہند متحدہ ہندوستان میں مذہبی اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والی ایک فعال جماعت تھی۔ جس کے دونوں کردار بے عیب رہے۔ تاہم برصغیر کی سیاست میں ایک موڑ آیا کہ ان اکابر کا مسلم لیگ سے اشتراک یو پی کے مسلمانوں کے لیے ضرر رساں ثابت ہوا جس کا اعتراف حضرت مدنی (رحمتہ اللہ علیہ) نے مسٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) کے نام اپنے ایک خط میں کیا۔ (اس کی تفصیل آئندہ جلد میں آئے گی۔ مصنف)

اس پر بھی ان حضرات کے خلوص پر شبہ کی گنجائش نہیں۔ سیاسیات میں رائے کی تبدیلی بعض اوقات مصلحتاً ہوتی ہے۔

سیاسی رائے میں اختلاف کو سوشل تعلقات میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ اسی بنیاد پر میری اکابر جمیعتہ سے ہمیشہ نیازمندی رہی۔ اور آج بھی ان کی ارواح کو میں اپنے لیے دعاگو سمجھتا ہوں۔

یہ تاریخی واقعہ بھی اسی سفر کا ہے کہ مرزائیوں نے ایک سکھ نوجوان کو دس ہزار روپے معاوضہ دے کر حضرت امیر شریعت کو قتل کرانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ شخص متذکرہ سفر میں خفیہ طور پر ہمارے ساتھ رہا۔ (اس کی پوری تفصیل حیات امیر شریعت میں درج ہے)۔

ادھورا بندھن انسانی ہاتھ کی لکیریں ایک ایسی دستاویز ہے جس میں مصورِ فطرت نے رنگوں کے امتزاج سے حیات مستعار کا سارا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ ستارے ٹوٹ سکتے ہیں اور منجم کی رائے فریب کھا سکتی ہے۔ لیکن تقدیر کے فیصلے ان مٹ ہوتے ہیں۔

رفیقہ حیات کی موت کے دس سال بعد میرے سابقہ ہم زلف اور خوش دامنہ نے ضلع ہوشیار پور کے ایک قصبہ دینگا میں ایک گھرانا تلاش کیا۔ جن کی خواہش پر مجھے وہاں جانا

پڑا کہ وہ لوگ مجھے دیکھ لیں۔ یہ ایک نیا بندھن تھا میری ازدواجی زندگی کا۔ لیکن یہ گرہ راستے میں کھل گئی۔ واقعہ یوں ہوا کہ اس قصبہ کے ایک ہندو ساہوکار نے مسلمان خاتون سے سول میرج کر لی تھی۔ اس عورت کے سابقہ خاوند سے ایک لڑکی تھی جو اپنے ایمان پر قائم رہی۔ اس کی والدہ کی مرضی تھی کہ لڑکی کا نکاح اسلامی اصولوں پر ہو۔ چنانچہ میری پہلی ملاقات میں نہ صرف انہوں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی بلکہ شروع کی رسم بھی ادا ہو گئی۔ لڑکی کا سوتیلا غیر مسلم والد اور لڑکی کے حقیقی مسلمان بھائی اس رسم میں شریک ہوئے۔

گھرانہ دولت مند تھا۔ اور دو خاندانوں میں بھی ایک لڑکی تھی جس کی شادی فراخدلی سے ہوتی مگر جیسے ہی میں رات کی گاڑی جالندھر پہنچا۔ بھاوج سمیت تمام عزیز و اقارب نے اس شادی کی سخت مخالفت کی۔ یہاں تک کہ بھائی بھی ناراض ہوئے۔ خاندانی وقار کی لمبی ناک نے رسم زمانہ سے خائف ہو کر دونوں کی بساط الٹ دی۔

میری اطلاع کے مطابق تقسیم ملک کے بعد ۱۹۵۰ء تک مذکورہ لڑکی لائلپور میں بغیر شادی کے بیٹھی رہی۔ بعد کی کوئی خبر نہیں۔

ڈیرہ اسماعیل خاں اور سنٹرل جیل

بعض دفعہ انسانی حرکات ضمیر کی ایسی عکاسی کرتی ہیں کہ آدمی ننگا ہو جاتا ہے۔ ہزار ستر پوشی کے باوجود اس کی برہنگی دکھائی دیتی ہے اور خاندان کی حیثیت بھی یہیں واضح ہوتی ہے۔ ایسے افراد ماں کی کوکھ کو بھی شبہ میں ڈال دیتے ہیں۔

خدا کو صنم کہہ لینا آسان ہے۔ لیکن صنم کو خدا کہنا گناہ کی بڑی علامت ہے۔ مجرم ضمیر دن کے اجالے میں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ مگر سچائی حقیقت ہونے پر بھی اس کا محاسبہ نہیں کرتی۔ کہ راہِ مستقیم دکھانا خالق کائنات کے اختیار میں ہے۔ گمراہی کے دروازے یہیں سے کھلتے ہیں۔ جھوٹ اور فریب سے کمائی ہوئی دولت جہنم کے انگارے بن جاتے ہیں جو شب و روز اس کے جسم کو داغتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ پگلا انہیں امراض سمجھ کر کبھی اس طبیب کے پاس جاتا ہے اور کبھی دوسرے کی تلاش کرتا ہے۔

تحریک مسجد شہید گنج کے اثرات ہواؤں کے دوش پر شمالی مغربی صوبہ سرحد تک

پہنچ چکے تھے۔ مجلس احرار کا ہر کارکن قومی مجرم قرار دیا جا چکا تھا۔ انہی دنوں ڈیرہ اسماعیل خاں سے ڈاکٹر فضل کریم نامی ایک شخص دفتر مجلس احرار میں چودھری افضل حق کے پاس آیا کہ ڈیرہ کے عوام کی خواہش پر آپ کسی احرار لیڈر کو ہمارے ہاں بھیجیں۔ چودھری صاحب نے مجھے اور ایک ہفت روزہ رسالہ کے ایڈیٹر کو حکم دیا کہ ہم ڈیرہ جائیں۔

اسلام کا ظاہری رکھ رکھاؤ، لباس کی کتر بیونت سے اس شہر کے عوام کو قدر شریعت کا پابند کہا جا سکتا ہے۔ ہم دونوں بے ریش اور شکل و صورت سے بھی ہم میں لیڈروں کی سی کوئی علامت نہ تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی مقامی کارکن ڈاکٹر فضل کریم سے لال پیلے ہونے لگے کہ آپ کیا اٹھا لائے ہیں۔؟ اس پر کافی لے دے رہی۔ آخر ہمارے میزبان کو تاؤ آگیا۔ "اگر یہ لوگ آپ کو پسند نہیں تو نہ ہوں۔ انہیں میں لایا ہوں، یہ میرے مہمان ہیں"۔ ہم دو بیٹھے یہ سارا ماجرا دیکھ سن رہے تھے۔ "آپ بے فکر رہیں۔ البتہ کوئی منادی ہمیں دیا کریں"۔ ہم دونوں نے چار آنے دے کر شہر میں منادی کرائی۔ کہ احرار کے دو کارکن فلاں محلے کی جامع مسجد میں رات نماز عشاء کے بعد تقریر کریں گے۔ رات جلسہ میں حاضری خاص نہیں تھی تاہم دو اڑھائی سو آدمی تھے۔ نظم کے بعد میں نے جماعت کا تعارف کرایا۔ میرے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نے تقریر کی اور جلسہ رات بارہ بجے تک رہا۔

جن لوگوں نے ہمیں صبح ناپسند کیا تھا۔ اب لگے ہمارے آگے پیچھے پھرنے۔ مگر ڈاکٹر فضل کریم کی بن آئی۔ وہ انہیں ہمارے قریب نہ آنے دیتے۔ بڑی رد و کد کے بعد وہ لوگ ہم تک پہنچے۔ وہ اپنی غلطی کے احساس سے ندامت محسوس کر رہے تھے۔ اور دوسرے دن جمعہ کے بعد جلسہ میں تقریر کے لیے زور دیتے رہے۔ آخر ہم نے ان کی یہ خواہش قبول کر لی۔

صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان کی حکومت تھی۔ اور شہر میں خاکساروں کا چرچا۔ گذشتہ رات ہم اپنی تقریروں میں ان دونوں کو ہدف تنقید بنا چکے تھے۔ جو لوگ رات کے جلسے میں شریک تھے۔ انہوں نے شہر میں ہمارا چرچا کیا۔ اور صبح منادی بھی ہو گئی۔ اس طرح اس قدر ہجوم آیا کہ مسجد سے باہر گلی میں بھی جگہ نہ رہی۔

میں وضو کر رہا تھا کہ پولیس آن پہنچی۔ اور آتے ہی انہوں نے مسجد کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

جلسے کی کارروائی سے پیشتر پولیس انسپکٹر نے مجھے زبانی تنبیہ کی کہ ہم گزشتہ رات کی طرح نہیں۔ تقریروں کا لہجہ قدرے نرم رکھیں گے۔ اس پر میں نے انسپکٹر سے کہا۔ "آپ ہمیں مشورہ دے رہے یا حکم ہے؟" "یہ میری ذاتی رائے ہے۔" اس پر میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ "آپ کون ہوتے ہیں ہمیں اس قسم کا مشورہ دینے والے۔ ہم ابھی ڈاکٹر خان کو تار دیتے ہیں۔" میری اس دھمکی کا عوام پر بڑا اثر ہوا۔

نماز جمعہ میں جلسے سے فارغ ہوئے تو شہر کے غیر مسلموں کا ایک وفد ملنے آیا۔ جس کی رہنمائی سرحد گورنمنٹ کے وزیر مالیات مسٹر مہر چند کھنہ/بخرام گاندھی کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر گفتگو کے بعد وزیر خزانہ نے ہمیں اپنے ہاں عصرانہ کی دعوت دی۔ جسے ہم نے قبول کر لیا۔ نیز انہوں نے یہ بھی کہا کہ رات آپ کھلے میدان میں تقریر کریں۔ ایک تو مسجد میں جگہ کم ہے۔ دوسرے غیر مسلموں کے لیے وہاں دشواری ہے۔ آخری درخواست کو ہم نے بشرط قبول کیا۔ کہ اگر شہر کے مسلمان مجلس احرار بنانے کا وعدہ کریں تو ہم رات کے اجتماع میں شریک ہوں گے۔ اس پر تمام نے مجلس احرار بنانے کا فیصلہ کیا۔ اور اسی وقت عہدے داروں کا انتخاب ہو گیا۔ رضاکاروں کی بھرتی شروع ہو گئی۔ شام ہونے تک دو سو سے زائد رضاکار بھرتی ہو گئے۔

رات نمازِ عشا کے بعد جب ہم اجتماع میں شرکت کے لیے گئے تو کلہاڑیوں سے مسلح دو سو احرار سرخپوشوں کا دستہ ہمارے ساتھ تھا۔

ڈیرہ اسماعیل خاں میں احرار کا یہ پہلا اجتماع تھا جس میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں نے بھی شرکت کی۔ جلسہ شہر کے وسط میں ایک کھلی جگہ گراؤنڈ میں تھا۔ چاروں طرف عمارات تھیں گلیاں اور بازار ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ اسٹیج مسجد کی منڈھیر کو قرار دیا گیا۔ ضلعی حکام کے علاوہ پولیس اور فوج کا اپنا انتظام تھا۔ احرار سرخپوش اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ تلاوت قرآن حکیم اور میری نظم کے بعد...... نے تقریر شروع کی۔ ابھی ابتدا رہی تھی کہ بائیں کونے سے خاکساروں کا ایک مسلح دستہ جلسہ گاہ میں داخل ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اجتماع کو خراب کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ان کی یہ حرکت شہری عوام کو بری لگی۔ چند لمحوں کے بعد...... کو بٹھا کر میں نے خود عوام اور پولیس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اگر خاکساروں کی اس شرارت کے

جواب میں میرے رضاکاروں نے کوئی کارروائی کی تو اس کی تمام تر ذمہ داری پولیس یا خاکساروں پر ہوگی۔ کیونکہ پولیس انتظامیہ کی بجائے تماشائی بنی ہوئی تھی۔ دوسرے لمحے میں نے احرار رضاکاروں کو حکم دیا کہ وہ میرے دوسرے حکم کا انتظار کریں۔ بس۔۔ اتنا کہنا تھا کہ پولیس نے آگے بڑھ کر خاکساروں کو اسٹیج کے سامنے والی گلی میں دھکیل دیا اور پولیس آگے کھڑی کر دی۔ اب جلسہ دوبارہ شروع ہوا۔۔۔۔ نے اپنی تقریر شروع کی۔ اس دوران گو خاکساروں کا ہنگامہ جاری رہا۔ مگر ایک کونے میں۔ یہ جلسہ رات ڈیڑھ بجے اختتام کو پہنچا۔

سوداوی مزاج کے باعث مجھے بھوک بہت زیادہ لگتی ہے۔ لیکن خوراک اسی قدر کم ہے بشرطیکہ وقت پر مل جائے۔ ورنہ طبیعت بگڑ جاتی ہے اور اس بگاڑ پر گھر میں اکثر جھگڑا رہتا ہے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں آئے ہوئے دوسرا روز تھا۔ پہلا دن کارکنوں کی باہم کشمکش میں گذر گیا۔ لہٰذا کھانا رات کو کھایا۔ مجھ کو پھر بولنا تھا۔ لہٰذا صبح کا ناشتہ کیا اور کھانا نماز کے بعد کا تھا۔ لیکن عصرانے کی وجہ سے یہ وقت بھی کھو گیا۔ رات کا کھانا شہر کے ایک وکیل کے ہاں تھا۔ جلسہ ختم کر کے ہاں پہنچے اور میزبان کھانا لگا رہا تھا کہ پولیس آن پہنچی۔ انہیں دیکھتے ہی بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "کیوں جی چلیں"؟ "ہاں جی چلو"۔ انسپکٹر پولیس کا یہ فقرہ سنتے ہی میں نے کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ ممکن ہے۔۔۔۔۔ نے کھا لیا ہو۔ لیکن میں گرفتاری کے لیے تیار ہونے لگ گیا۔

رات کے اڑھائی بجے ہوں گے، جب ہم پولیس کی معیت میں میزبان کے ہاں سے نکلے ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ گرفتاری کے لیے پانچ صد سے زائد مسلح فوجی دستے اور اسی قدر پولیس کے جوان ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی اسلام علیکم کہا اور انچارج سے یوں مخاطب ہوا۔ ان سب کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ تنہا تشریف لا کر ہمیں چلنے کو کہہ سکتے تھے۔ اس پر انسپکٹر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔

ایک ہزار فوج اور پولیس کے جوانوں کے درمیان جب ہم رات کے سناٹے میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے سنسان بازاروں سے بطور مجرم گذر رہے تھے تو ڈھلتی ہوئی رات کے ستارے نیند سے بیدار ہو کر عشق کے مجرموں کا تماشہ دیکھنے لگے۔ اونگھتے ہوئے آسمان نے کنکھیوں سے دیکھا اور

خاموش ہو گئے۔ رات کے اندھیرے میں پٹی ہوئی خوفناک فضاؤں کے دور پہاڑوں سے انگڑائی لی اور رات کے ماندہ حصے کو محیط کر لیا۔ فوجی جوانوں کے بوٹوں کی چپ چپ راست نے فٹ پاتھ پر سونے والوں کی نیندیں حرام کر دیں۔

رات اپنا دامن سکیڑ رہی تھی کہ ہم کوتوالی پہنچ گئے۔ انچارج تھانہ نے نہایت احترام سے ابتدائی کارروائی کے بعد گھر سے فوری پلنگ منگوا کر حوالات میں بچھوا دیا۔ اور دروازہ مقفل کر دیا۔ اتنے میں مؤذن نے الصلوٰۃ خیر من النوم کی صدا سے سوئے ہوئے انسانوں کو ان کی ذمہ داریوں سے خبردار کیا۔ ہم مجرموں نے اپنے نگہدار کو پانی لے کر آنے کو کہا۔ مگر اس نے افسر کی اجازت کے بغیر حوالات کا دروازہ کھول دیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر نماز پڑھی اور پھر حوالات میں چلے گئے۔

اس شہر میں آئے ہوئے آج تیسرا روز تھا۔ طلوع آفتاب سے پیشتر ہی لوگ ہماری ملاقات کے لیے آنے شروع ہو گئے۔ اور چند منٹوں میں کوتوالی کا صحن بھر گیا۔ آنے والوں کی زبانی معلوم ہوا کہ شہر میں مکمل ہڑتال ہے۔ مسلم اور غیر مسلم ہماری گرفتاری کے خلاف احتجاج میں ہم آہنگ ہیں۔ اتنے میں فضل کریم ناشتے کا پر تکلف طشت اٹھائے کوتوالی میں داخل ہوئے۔ لیکن .... نے ناشتہ کرنے کی بجائے میرے مشورے کے بغیر بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔

حوالات میں آئے چار پانچ گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں پولیس کا برتاؤ نامناسب رہا۔ اہل شہر نے عقیدت کے پھول نچھاور کیے۔ گھروں میں بہو بیٹیوں نے ہمارے لیے دعائیں مانگیں۔ اس محبت پر بھی .... کا یہ اقدام سمجھ میں نہ آیا۔ پولیس اور شہری عوام ایک ساتھ پریشان تھے کہ آخر اس قدر انتہائی فیصلہ کیوں؟ اگر کسی نے کوئی زیادتی کی ہو تو یہ احتجاج ممکن ہے درست ہوتا۔ مگر یہاں تو ایسی کوئی بات نہیں کہ ہم خواہ مخواہ اپنے کو مشکل میں ڈالیں۔ اگر حکومت کے نزدیک ہم سے کسی قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ تو ٹھیک ہے۔ ہمیں سزا ملنی چاہیے۔ کیونکہ حکومت کی دانست میں ہم باغی ہیں۔

یہ کہاں کی بہادری ہے۔ کہ اسٹیج پر ہوں تو ساری دنیا کو للکارتے پھریں اور جب مصیبت آن پڑے تو بزدلوں کی طرح بھوک ہڑتال کر کے بیٹھ جائیں۔ اس کے معنی تو یہ

ہوئے کہ اسٹیج پر جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ جھوٹ تھا۔ لہٰذا خدا کے لیے ہمیں جیل سے نکالو! ورنہ
ہم حرام موت مرنے لگے ہیں۔

اگر آدمی اپنے ارادے میں مخلص ہو تو مصائب سے بھاگ کر بزدلی کی موت کو دعوت دینا اسلام اور اخلاق سے بعید ہے۔ بعض نام نہاد پیشہ ور سیاسی ورکروں نے جیل میں بھوک ہڑتال کو اپنے کاروبار میں شامل کر لیا ہے۔ بظاہر یہ لوگ فاقے سے ہوتے ہیں لیکن اندرون خانہ ان دنوں ایسی خوراک استعمال کرتے ہیں کہ شاید ہی جیل سے باہر انہیں میسر ہو۔ البتہ پہرے داروں کو ہم راز بنانے کے لیے انہیں رقم ضرور صرف کرنی پڑتی ہے اور یہ رقم وہ مظلوم بن کر سادہ لوح عوام سے کسی نہ کسی طرح ہتھیا لیتے ہیں۔

بات دور نکل گئی۔

ذکر ڈیرہ کے تھانہ میں بھوک ہڑتال کا ہو رہا تھا۔ شہر بھر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور اخباری نمائندے بھی آن پہنچے۔ ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ آپ نے یہ قدم کس Basis پر اٹھایا ہے؟ اس اہم سوال پر ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگ گئے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ بہرحال بھوک ہڑتال جاری رہی۔ مقامی مجلس احرار نے ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعظم صوبہ سرحد، عبدالغفار خاں، چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن اور کانگریس کے لیڈر مہاتما گاندھی کو برقی پیغامات بھیج کر ہماری گرفتاری اور بھوک ہڑتال کی اطلاع کر دی۔
اخباری نمائندوں نے بھی یہی خبر اپنے اپنے جرائد کو بھیجی

ہمیں دفعہ ۱۰۷ کے تحت نقص امن میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس پر یقین تھا کہ پولیس ڈیرہ سے دریا خان چھوڑ آئے گی۔ کیونکہ اس دفعہ کے نتیجے میں یا تو فریقین کی ضمانتیں ہو سکتی تھیں۔ یا پھر ضلع بدر۔

ہمارے مقابل خاکساروں کو فریق ٹھہرایا گیا تھا۔ دن کے گیارہ بجے پولیس ہمیں ایک کار میں لے کر روانہ ہوئی اور چند منٹوں میں ڈیرہ اسماعیل خان کے سنٹرل جیل کے دروازے پر جا رکی۔ جیل افسران خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ پولیس نے سپردگی کے کاغذات کے ساتھ ہماری فاقہ مستی کی اطلاع بھی کر دی۔ اس پر جیل کے عملے نے کہا، اگر پولیس نے آپ سے

کوئی زیادتی کی ہے ۔ تو اس کی شکایت آپ عدالت سے کریں ۔ آپ اب ہماری تحویل میں ہیں ۔ لہٰذا آپ کھانا کھالیں "۔

داروغہ جیل کی یہ بات درست تھی ۔ اس پر میں نے انسپکٹر پولیس کو کھانے کیلئے کہا ۔ تھوڑی دیر بعد کچہری کے ہوٹل سے کھانا آگیا ۔ لیکن ہزار کہنے کے باوجود مرغ کی وہی ایک ٹانگ ۔ نہ کھانا تھا نہ کھایا ۔ ظاہر ہے مجھے بھی فاقہ سے رہنا پڑا ۔ آخر پولیس ہمیں جیل افسران کے حوالے کر کے چلی گئی ۔ اور انہوں نے تیسرے پہر ہمیں کوٹھڑیوں میں بند کر دیا ۔

احاطے کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں ڈاکٹر خان صاحب کا لڑکا عبیداللہ خاں ملا ۔ یہ سرحد میں غلہ ڈھیر تحریک کے سلسلہ میں قید کاٹ رہا تھا ۔ یہ وہی عبیداللہ ہے جو ۱۹۳۰ء میں مجھے لاہور بورسٹل جیل میں ملا تھا ۔ آج یہ اپنے باپ کی حکومت میں بطور قیدی کے تھا ۔ باپ صوبہ کا وزیراعلیٰ اور بیٹا قیدی "انقلاب چرخ گردوں یوں بھی ہوتا ہے "۔

عبیداللہ نے مجھے دودھ کا پیالہ پینے کو دیا ۔ لیکن ساتھی کے احترام میں میں نے شکریہ سے واپس کر دیا ۔ احاطہ میں پہنچ کر معلوم ہوا ۔ یہ پاگلوں کے رہنے کی جگہ ہے ۔ پاگلوں نے ہمیں اپنے ایسا سمجھ کر ہمارے ساتھ ویسا ہی سلوک شروع کر دیا ۔ یعنی ہر ایک پانی کا ڈول بھر کر لاتا اور ہم پر ڈال دیتا ۔ ہم ایک حوض میں کھڑے تھے ۔ میرا ساتھی چونکہ قد میں لمبا تھا ۔ وہ بچ گیا ۔ لیکن پانی میری ناک تک آن پہنچا ۔ یہ تو اچھا ہوا کہ عبیداللہ بھاگ کر آیا ۔ اور اس نے ہماری جان چھڑائی ۔

پٹھان اور پاگل ، ہم دوگونہ مشکلات میں تھے کہ جیل کا کھانا آگیا ۔ جس سے ہم نے انکار کر دیا ۔ جیل احکام سے انکار ایک اور جرم ہے ۔ بہرحال یہ اطلاع جب سپرنٹنڈنٹ جیل تک پہنچی ۔ تو ان سب کی پریشانی بڑھی ۔ اتنے میں شام کے پانچ بج چکے تھے ۔ یکایک ہمیں رہا کر دیا گیا ۔ جیل سے باہر آئے تو سینکڑوں عوام استقبال کے لیے موجود تھے ۔ ہمیں کندھوں پر اٹھا لیا گیا اور اس طرح جلوس کی صورت بن گئی ۔ گھر پہنچ کر کھانا کھایا ۔ یہ ۲ ۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے ۔ دوسری جنگ عظیم کی خبر ہم نے یہیں ریڈیو پر سنی ۔

دوسری صبح خاکساروں نے شہر میں افواہ پھیلادی۔ کہ ہم جیل سے معافی مانگ کر آئے ہیں۔ ابھی اس غلط خبر کی تردید کے اسباب زیر غور تھے کہ لاہور کا روزنامہ احسان ڈیرہ پہنچ گیا۔ اس کی پہلی سرخی تھی " علامہ عنایت اللہ مشرقی نے لکھنؤ جیل میں معافی مانگ لی "
اس طرح اس خبر نے خاکساروں پر گھڑوں پانی ڈال دیا۔ ؎

رکھ لی خدا نے میری بے کسی کی لاج۔

ہم پانچ روز کے بعد لاہور پہنچے۔

باقی داستان دوسری محفل کے لیے اٹھا رکھتا ہوں! بشرط زندگی۔

قیامِ احرار کا پس منظر

متحدہ ہندوستان کی سیاست میں اکثر موڑ ایسے آئے کہ آزادیٔ وطن کے محاذ پر لڑنے والے اپنے ہی گریبانوں کی دھجیوں کا تماشہ دیکھنے لگے۔ غیر ملکی غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے والے ہاتھ برطانوی سامراج کے اقتدار کی دعائیں مانگنے لگے۔ وہ خون جس کی سرخی سے لالہ و گل کے چہروں پر نکھار آنا چاہیے تھا اور بہاروں کو زندگی کی آس تھی بادِ سموم کی دست درازیوں سے صحن چمن میں بکھر کر رہ گیا۔ اور اسی خون کے دھبے پھر رُخِ صیاد کا غازہ بن کر چمکے۔ فضاؤں کے نوکیلے خار کلیوں کا سینہ چھیدنے لگے۔ ہواؤں کی بے رُخی سے سارا چمن اجڑ گیا۔ پھر نہ برق گرنے کا خطرہ رہا اور نہ شاخِ نشیمن کو پت جھڑ کا گلہ۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانوی سلطنت کے تیور فتح و نصرت نے اس قدر بگاڑ دیئے کہ اسی نشے میں اپنی غلام رعایا سے کئے گئے وعدے بھی یاد نہ رہے۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ کے خونی حادثے نے اس غرور و تکبر کو مزید جلا بخشی کہ ایوانِ برطانیہ کا ہر فرد گونگا و بہرہ ہو کے رہ گیا۔ انہی دنوں وزیر ہند مسٹر لارڈ برکن ہیڈ نے ۱۹۲۷ء کے آفتاب کی کرنوں پر کھڑے ہو کر اعلان کیا۔

> "برطانیہ ہندوستان کو نئی اصلاحات دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ بشرطیکہ وہاں کے باشندے اپنے لئے مخلوط انتخاب پسند کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا۔"

حالانکہ مسلمان کی نجات جداگانہ انتخاب میں تھی۔ کیونکہ پیشتر ازیں کے سیاسی واقعات

نے مسلمان کو غیر مسلموں سے اس قدر دل برداشتہ کر دیا تھا کہ وہ برادران وطن سے ایک قدم بھی چلنے کو تیار نہ تھے۔ لیکن "برکن ہیڈ" کی اس آواز کو مسلمانوں نے من حیث القوم اپنے لیے ایک چیلنج خیال کیا۔ اور جواب میں ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو مسلمان رہنماؤں نے دہلی میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ اس اجتماع میں:

۱۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ ۲۔ مولانا محمد علی جوہر۔
۳۔ راجہ آف محمود آباد ۴۔ سر عبدالقیوم
۵۔ سر عبدالستار ۶۔ سر محمد یعقوب
۷۔ مسٹر محمد علی جناح

شامل ہوئے۔ دو دن کی بحث کے بعد مسلمانان ہند کے لیے حسب ذیل شرائط کے ساتھ مخلوط انتخاب کو اپنے لیے منظور کر لیا۔

۱۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے نیا صوبہ بنایا جائے۔
۲۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں اسی طرح قانون رائج کیا جائے جس طرح ہندوستان کے دیگر صوبوں میں ہے۔
۳۔ پنجاب اور بنگال میں نمائندگی کا تناسب آبادی کے لحاظ سے رکھا جائے۔
۴۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ⅓ نمائندگی دی جائے۔ وہ بھی مخلوط ا[illegible]ب سے۔"

اس تجویز کو انتہا پسند عناصر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ایسے لوگوں نے بھی قبول کر لیا۔ لیکن سر محمد شفیع، سر عبدالقیوم، سر ذوالفقار علی اور محمد علی جناح ایسے قدامت پسند حضرات نے اس فارمولا کو ماننے سے انکار کر دیا۔

۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو کانگرس ورکنگ کمیٹی نے اپنے دہلی کے اجلاس میں اول الذکر مسلمانوں کی رائے کو قبول کر لیا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۲۷ء کو ہندو مہا سبھا نے پنڈت مدہن موہن مالوی کی صدارت میں فیصلہ کیا کہ آئندہ ہندوستان کا آئین اس طرز پر مرتب ہو۔

۱۔ ہندوستان بھر کی مجالس آئین ساز کے لیے انتخاب مخلوط ہو۔
۲۔ ملک کی تمام مجالس قانون ساز میں آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کی جائیں۔

۳۔ صوبوں کو زبان یا دیگر وجوہ کی بنا پر از سر نو تنظیم کے معاملے کو غور کے لیے چھوڑ دیا جائے۔
۴۔ تقسیم مذہبی حقوق اور مذہبی تقسیم کی نگارشات کے لیے آئین ملکی میں تحفظات مقرر کئے جائیں۔
ہندو مہاسبھا کے اس فیصلے کی تائید میں ۲۲ اپریل پنجاب ہندو مہاسبھا نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو حسب ذیل تار دیا۔

"وہ مسلمانوں سے گفتگو کرتے وقت ہندوؤں کی نمائندگی نہ کرے۔ اور اگر ایسا ہوا تو ہندوؤں کیلئے کانگریس کا کوئی فیصلہ منظور نہیں ہوگا۔"

۲۵ اپریل ۱۹۲۷ء کو سکھوں کے نمائندے سردار منگل سنگھ نے حسب ذیل برقی پیغام کے ذریعے سکھ قوم کا نقطہ نظر انڈین کانگریس پر واضح کیا۔

"یہ درست ہے کہ جداگانہ انتخاب ہندوستان کی آزادی کے راستے میں سنگِ گراں ہے۔ لہٰذا اس کی جگہ مخلوط انتخاب ہی بہتر ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ مسلمان بھائی مخلوط انتخاب کو نشستوں کے تعین کے بغیر قبول کریں۔ مسلمان دوستوں کو اس فیاضی کے ساتھ جو انہوں نے غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ سندھ، سرحد بلوچستان میں کی ہے، مجھے سخت شکائت ہے کہ انہوں نے اپنی اقلیتوں کو وہی مراعات دی ہیں جو انہیں بحیثیت اقلیت دوسرے صوبوں میں ملیں گی۔ لیکن انہوں نے بڑی ہوشیاری سے پنجاب اور بنگال کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ان حالات میں سکھ قوم کا پنجاب میں کیا بنے گا؟

میرا مدعا یہ ہے کہ سکھ بہار اور یو پی کے مسلمانوں کی طرح پنجاب میں ایک اقلیت ہیں۔ نئے نظام میں ان سے پنجاب میں کیا سلوک کیا جائے گا، ان حالات کے پیش نظر پنجاب کو خاص طور پر زیر بحث لانا چاہئے۔ اور سکھوں کے لیے مناسب نمائندگی کا انتظام کیا جانا چاہیے۔ سکھ پنجاب میں ایک اہم اقلیت ہے جو ہر طرح سے بڑی حیثیت رکھتی ہے۔"

اس بیان کے ایک ماہ بعد سردار منگل سنگھ نے اپنے ایک دوسرے بیان کے ذریعے پنجاب ہندو مہاسبھا کے مطالبات کی تائید کر دی۔ اس طرح سکھ قوم اور ہندو مہاسبھا میں ہم آہنگی

پیدا ہو گئی۔ جس کے باعث فرنگی سیاستدانوں کو مسکرانے کا ایک اور بہانہ مل گیا۔

برطانوی حکمران اپنے فکر کی جولانگاہ میں اس قدر وسعت کے مالک تھے کہ ان کی ہر تجویز وقت کے بڑے سے بڑے فیصلے کو مات دینے میں تساہل نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے حریف کی ایسا لاسن خوبصورتی سے اٹھاتے کہ سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی محفوظ رہتی۔

وزیر ہند مسٹر لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستان کو نئی اصلاحات کی قسط دینے کے متعلق ایسے وقت میں اعلان کیا جب اقوام ہند گذشتہ کئی سالوں سے ایک دوسرے کے گریبانوں سے کھیل رہی تھیں۔

۱۹۲۳ء میں خلافت اور تحریک ترک موالات کے رہنما ہنوز اسیر افرنگ تھے۔ کہ پنڈت مدن موہن مالوی کو میانوالی جیل سے وائسرے ہند نے قبل از میعادِ اسیری رہا کر کے شدھی اور سنگٹھن کا ایسا ہنگامہ کھڑا کیا کہ ہندوستان کا باہم اتحاد نفرت کی آگ میں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ اس آگ کی چنگاریاں باقی تھیں کہ برطانوی ایوان سے ایک آواز نکلی جو بظاہر خوش کن تھی لیکن برطانوی دانشوروں نے "نو من تیل کی موجودگی میں رادھا کے ناچنے کی ایسی شرط عائد کی کہ ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مزاج کی تلخ راہوں سے گزر رہے تھے کہ فرنگی کی یہ شرط دونوں کو راس نہیں آ سکتی تھی۔

راجپال کا قتل

انڈین نیشنل کانگرس حالات کے انہی نشیب و فراز پر غور کر رہی تھی کہ لاہور کے ایک ہندو ناشر (راجپال) نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک کتاب شائع کی جس سے مسلمانانِ عالم کے جذبات بری طرح مجروح ہوئے۔ اور اس کے نتیجے میں علم الدین نامی نوجوان نے اس ناشر کو دن کی سفید روشنی میں سرِعام قتل کر دیا۔ ؏

آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے۔۔

ابھی ہندو مسلم اتحاد کی نیو اٹھائی جا رہی تھی۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء تک دلوں کی جن ہیٹیوں نے انسانی وقار کو مجروح کیا تھا۔ ان کی راکھ کرید کر راستے کی میل صاف کی جا رہی تھی۔ کہ انہی راہوں پر خون کے چند ایسے قطرے گرے کہ انسانیت کے سنورنے کی راہیں از سر نو مسدود ہو گئیں۔ ہندو اور مسلمان پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ اب کے لاٹھیوں

کی جگہ دونوں کے ہاتھوں میں چھرے اور خنجر تھے۔

یہ خونی لکیر ڈوبتے سورج کی طرح آسمان پر شفق کی سُرخیاں بکھیر رہی تھی کہ سرِ شام ابھرتے ستاروں نے امید کی تمام قندیلیں پھر سے گل کر دیں۔ اور انسانیت کو اندھیروں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

کشتیٔ آزادیٔ ہند کے کھیون ہار امیدوں کی پتوار کے سہارے ساحلِ مراد تک پہنچنے کی سعی میں تھے کہ ساحل پر کھڑے تن آسان تماشائیوں نے ایسا طوفان اٹھایا کہ کنارے منجدھار میں ڈوب گئے۔

سائمن کمیشن کی آمد

ہندوستان انہی لیل و نہار سے گذر رہا تھا کہ برطانوی سیاستدانوں نے بطورِ اہتمام جحت نومبر ۱۹۲۷ء کو آئینی اصلاحات کے لیے ایک کمیشن ہندوستان بھیجنے کا اعلان کر دیا۔ چونکہ اس کمیشن کے تمام ارکان برطانوی باشندے تھے۔ لہٰذا انڈین نیشنل کانگریس نے برطانوی سامراج کی اس حرکت کو ہندوستان کی توہین سمجھا اور اسی سال دسمبر میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں مدراس کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ اسی طرح جمعیۃ علمائے ہند نے ۵ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پشاور میں اور مسلم لیگ نے کلکتہ میں سائمن کمیشن کی آمد پر ناراضگی کا اظہار کیا۔

سائمن کمیشن کا اعلان کرتے ہوئے، وزیرِ ہند مسٹر لارڈ برکن ہیڈ نے کہا۔

"میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ ہندوستان کے لوگ متحدہ آئین پیش نہیں کریں گے"۔

وزیرِ ہند کا یہ فقرہ متحدہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ بطورِ خاص یادگار رہے گا کہ یہی ایک فقرہ غلاموں کے لیے تازیانہ ثابت ہوا۔ کہ پھر ایک موڑ پر ہندو مسلمان باہم دوستی کے گیت گانے لگے۔ دلوں سے دشمنی کی آگ مدھم پڑ گئی۔ گریبانوں سے الجھے ہوئے ہاتھ، غلامی کی گرہ کشائی میں مصروف ہو گئے۔

کانگریس، مسلم لیگ اور جمعیۃ علمائے ہند کی مشترک قراردادوں کا یہ اثر ہوا کہ ۳ فروری ۱۹۲۸ء کو جیسے ہی سائمن کمیشن نے بمبئی کے ساحل پر قدم رکھا۔ تمام ہندوستان کے شہر،

قصبات اور دیہات میں ایسی ہڑتال ہوئی کہ اس ملک کی تاریخ میں اس قدر پرامن اور کامیاب ہڑتال کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہاں تک کہ اس دن آسمان بھی ابر آلود رہا اور بعض شہروں میں بوندا باندی بھی ہوئی۔

اقوامِ ہند کے منتشر شیرازہ کے پیشِ نظر حکومت ہند کو سائمن کمیشن کی آمد پر اس کے خلاف مظاہروں کی اس قدر امید نہیں تھی مگر حالات دیکھ کر ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ارون نے اعلان کیا کہ

"حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ ہندوستان تعاون کرے یا نہ۔ حکومت کی یہ انکوائری بہرحال جاری رہے گی۔ اور آخر میں یہ رپورٹ پارلیمنٹ کو پیش کردی جائے گی۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرین پر سارے ہندوستان میں حکومت کی طرف سے تشدد کا آغاز ہوا۔ بیشتر شہروں میں پولیس نے عوام پر لاٹھی چارج کیا، گولیاں چلائیں۔ جن سے سینکڑوں ہندوستانی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ ہزاروں نوجوانوں پر مقدمات چلائے گئے۔ اور انہیں سزائیں ہوئیں۔ پنجاب میں کانگریس کے مشہور لیڈر لالہ جپت رائے بھی انہی دنوں لاہور سٹیشن پر پولیس کی لاٹھی سے زخمی ہو کر فوت ہوئے۔

آخر کو برطانیہ کا یہ وفد جس کی قیادت برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر سائمن کر رہے تھے ۳۱۔ مارچ ۱۹۲۸ء کو ناکام واپس چلا گیا۔

نہرو رپورٹ

ابر آلود موسم کی طرح غلام قوموں کے مقدر کا سورج بھی ڈوبتا اور ابھرتا رہتا ہے۔ سائمن کمیشن کے ناکام لوٹنے پر برطانوی سیاستدانوں کے تیور بدل گئے اور وہ غلاموں سے اپنا ناطہ مضبوط تر کرنے کے لیے حیلے بہانے تراشنے لگے۔ ہندوستان کے سیاسی رہنما بھی غافل نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے سائمن کمیشن کے خلاف اتحاد کو غنیمت جان کر ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں آل پارٹیز کا ایک اجلاس ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں منعقد کیا۔ جس میں حسب ذیل حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی مرتب کی گئی۔ اور جس کی صدارت پنڈت موتی لال نہرو کے سپرد ہوئی۔

۱۔ سر تیج بہادر سپرو　　　　　　۲۔ سر علی امام

۳۔ مسٹر شعیب قریشی　　　　　　۴۔ سبھاش چندر بوس۔

۵۔ مسٹر جے کار　　　　　　　　۶۔ سردار منگل سنگھ

۷۔ مسٹر پردھان　　　　　　　　۸۔ مسٹر اینے

۹۔ مسٹر جوشی۔

اس کمیٹی کے ذمہ لگایا گیا کہ وہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے درمیان مختلف سیاسی حقوق کے بٹوارے کا فیصلہ کر کے یکم جولائی (۱۹۲۸ء) کو کانگریس کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے (اسی رپورٹ کو آگے چل کر نہرو رپورٹ کا نام دیا گیا۔)

ڈیڑھ ماہ کی مسلسل میٹنگوں کے بعد آخر کمیٹی نے حسب ذیل رپورٹ مرتب کی۔

۱۔ ہندوستان سے جداگانہ انتخاب کو ختم کر کے اس کی جگہ مخلوط انتخاب کا طریقہ رائج کیا جائے۔

۲۔ مخلوط انتخاب کے ساتھ نشستوں کا تعین بھی غیر مفید قرار دیا گیا۔

۳۔ پنجاب اور بنگال میں انتخابات کو کھلا رکھا گیا اور کسی کے لیے کوئی نشست مخصوص نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۴۔ مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اور ان کو اسی تناسب سے نمائندگی دینے کا فیصلہ کیا گیا جو صوبہ جاتی نشستوں کے فیصلے کی رو سے انہیں مرکز میں حاصل ہو سکیں گی۔

نہرو رپورٹ کے اس فیصلے میں مسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں ان کے موجودہ حق سے کم نشستیں دینا منظور کیا گیا۔ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو ان کی قسمت پر چھوڑ دیا گیا۔ مرکز میں انہیں ایک تہائی کا یقین دلانے سے بھی انکار کیا گیا۔ حالانکہ یہ ان کا آئینی حق تھا۔ اس پر کمال یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے بھی نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا۔

۲۸۔ اگست (۱۹۲۸ء) کو لکھنؤ میں رہنمایان ملک کا ایک عام اجتماع آخری فیصلے کے لیے منعقد ہوا۔ ممکن تھا کہ دوسرے صوبوں کا فیصلہ ہو جاتا لیکن پنجاب کے جھگڑے نے

الجھن پیدا کردی۔ سکھ رہنماؤں نے حسب عادت چلتی گاڑی میں بریک لگادی۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ پنجاب کے مسلمان نہرو رپورٹ کے فارمولے پر دستخط نہیں کریں گے اور ہمارا دامن فرقہ پرستی کے داغ سے مبّرا رہے گا۔ آخر بحث اس بات پر ختم ہوئی۔

۱۔ ہر بالغ کو حق رائے دہندگی دی جائے۔

۲۔ حلقہ ہائے انتخاب مخلوط ہو۔

۳۔ کسی اقلیت یا اکثریت کے لیے نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔

۴۔ درجہ نوآبادیات کی حکومت قائم ہو۔

۵۔ دس سال تک مذکورہ بالا شرائط پر عامل رہنے کے بعد اگر کوئی قوم ضروری سمجھے تو فرقہ وارانہ نیابت کا سوال از سر نو بحث کے لیے اٹھایا جا سکتا ہے"۔

جب تک پنجاب کے مسلمان رہنماؤں نے اس فارمولے کو منظور نہیں کیا تھا۔ ہندو اور سکھ اس سمجھوتے کے حق میں رہے۔ اور مسلمانوں کو اس فارمولے پر دستخط کرنے پر مجبور کرتے رہے۔ لیکن پنجاب کے مسلمان راہنماؤں کے سامنے مخلوط انتخاب کی جہاں اور پیچیدگیاں تھیں وہاں ان کے ذہنوں میں یہ بات بھی تھی کہ پنجاب کے اکثر اضلاع خصوصاً ڈیرہ غازیخاں اور مظفر گڑھ کے مسلمان ہندو ساہوکاروں کے ترانوے[۹۳] کروڑ کے مقروض ہیں۔ اور ان حالات میں وہ آزادی کے ساتھ ووٹ نہیں دے سکیں گے اور مخلوط انتخاب مسلمانوں کے لیے مہنگا ہوگا۔ تاہم آزادی وطن کے لیے انہوں نے اس فارمولے پر دستخط کر ہی دیے۔ ان میں چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا ظفر علی خاں پیش پیش تھے۔

پنجاب کے مسلم اکابرین کے دستخط ہوتے ہی ہندو اور سکھ رہنماؤں کے اوسان خطا ہو گئے۔ اگرچہ سکھ رہنما بھی با دل نخواستہ اس فارمولے کو بغیر نشستوں کا تعین کیے مخلوط انتخاب کے ساتھ مان گئے۔ لیکن لکھنؤ سے واپسی پر اس فیصلے سے منحرف ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں نے اپنی بساط پر سکھوں کو بطور مہرے استعمال کرنا شروع کیا۔ پنڈت مدن موہن مالوی اور گاندھی جی نے سکھوں کے ہمدرد بن کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ سکھ قوم سے نہرو رپورٹ میں ناانصافی ہوئی ہے۔ اس موقعہ پر مسلمانوں میں بھی اختلاف ابھرا۔ گو اس اختلاف کی نوعیت ملک کی

آزادی کے راستے میں رکاوٹ نہیں تھی۔ تاہم حزب مخالف میں مولانا محمد علی جوہر اور مسٹر محمد علی جناح شامل تھے۔ اور یہیں سے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اختلاف کی ابتدا ہوئی۔

پھول کسی موسم کا ہو کانٹے اس کے دامن سے بہرطور چمٹے رہتے ہیں۔ نہرو رپورٹ پر پنجاب کے رہنماؤں کے دستخط ہوتے ہی رجعت پسند مسلمانوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ یہ لوگ ہندوؤں سے مسلمانوں کے حقوق کا سودا چکا آئے ہیں۔ حالانکہ اس سودے میں پنجاب کے سکھ سب سے زیادہ خسارے میں تھے اور ہندو چونکہ انہیں بطور مہرے کے استعمال کرنا چاہتا تھا لہٰذا ہندو اخبارات نے سکھوں کے حقوق کی اوٹ لے کر نہرو رپورٹ کو ختم کرانے کا فیصلہ کر لیا مگر سرکار پرست مسلمان تھا کہ جن رہنماؤں نے لکھنؤ میں ہندو اور سکھوں کو سیاسی شکست دی تھی، انہی کے خلاف لٹھ لے کر کھڑا ہو گیا۔ آخر سر فضل حسین نے مسلمانوں کی ایک محفل میں انہیں مشورہ دیا کہ

"جن لوگوں نے نہرو رپورٹ پر دستخط کیے ہیں وہ نہ تو غدار ہیں اور نہ ہی غلطی پر۔ بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ پنجاب کا ہندو اور سکھ اس فارمولے کو ہرگز تسلیم نہیں کرے گا۔ اگر وہ یہ فارمولا مان بھی لے تو میری رائے میں اس فارمولے سے پنجاب کے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا ہم سب کو آپس کی لڑائی چھوڑ کر غیر مسلموں کے تاثر کا انتظار کرنا چاہیے۔"

اس بیان کے ایک ہفتہ بعد پنڈت مالوی اور گاندھی جی کھلم کھلا سکھوں کے ہمدرد بن کر سامنے آ گئے۔

۵۔ نومبر ۱۹۲۸ء کو آل انڈیا کانگریس نے اپنے کلکتہ کے اجلاس میں نہرو رپورٹ کی تمام تجاویز منظور کرتے ہوئے کہا کہ

"موجودہ سیاسی صورت حال کے پیش نظر کانگریس اس دستور اساسی کو قابل قبول سمجھتی ہے بشرطیکہ ۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۹ء تک برطانوی حکومت اور پارلیمنٹ اسے منظور کر لے اور اس کو منظور نہ کرنے کی صورت میں کانگریس پر امن عدم تعاون کی مہم شروع کر دے گی اور لوگوں کو مالیہ اور ٹیکس ادا نہ کرنے کا مشورہ دے گی۔"

اس قرارداد کی تصدیق کے بعد ۲۸۔دسمبر ۱۹۲۸ء کو کلکتہ کنونشن میں نہرو رپورٹ کو اپنے ہاتھ میں لے کر گاندھی جی نے حکومت برطانیہ کو ایک چیلنج دیا کہ

"آئندہ سال ۳۱۔دسمبر تک حکومت برطانیہ اس تجویز کو بہر حال منظور کرلے۔"

دہشت پسند تحریک

غلامی سے آزادی تک کا راستہ دشوار بھی ہے اور آسان بھی اوّل الذکر راہوں سے گذرنے والی قومیں غلامی کے بندھن توڑ کر جب آزادی کا سانس لیتی ہیں تو ان کا مستقبل نہ صرف تابناک ہوتا ہے بلکہ ان کی قربانیاں ان کے گرد ایسا حصار کھینچتی ہیں کہ پہاڑ پانی ہوکر ان کے قدم لیتے ہیں ۔ وہ جہاں کہیں اور جب کبھی اپنے کسی ارادے کا نقشہ لکیرتی ہیں تو ان کا خون آپ سے آپ ابھر کر اس نقشے میں ایسا رنگ بھرتا ہے کہ دیکھتی آنکھیں چندھیا کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن تن آسان اور ساحل پر کھڑے ہوکر طوفانوں کا تماشہ دیکھنے والی قوموں کی جھولی میں جب بطور عطیہ آزادی کی بھیک ڈال دی جاتی ہے، تو ایسی قوموں کا بناؤ سنگھار ہمیشہ بیگانے ہاتھوں کا محتاج رہتا ہے۔

جدوجہد آزادی کی تحریک جب اس موڑ پر پہنچی کہ ہندوستان پر قابض غیر ملکی قوم ہندوستانیوں کی باہم کشمکش کا تماشہ دیکھ رہی تھی تو کانگریس کی تحریک عدم تشدد اور فرقہ وارانہ ذہنیت سے اکتائے ہوئے نوجوان ذہنوں نے ایک نئی تحریک کو جنم دیا۔ یہ دہشت پسندوں کی تحریک تھی۔ ان کے نزدیک حصولِ آزادی کا وہ راستہ غلط تھا جو کانگریس یا ہندوستان کی دوسری جماعتوں نے اپنا رکھا تھا کیونکہ غلامی کی زنجیریں آگ اور خون کے سنگم پر ڈھلتی ہیں۔ چنانچہ ان دنوں بنگال میں TERORIST PARTY (دہشت پسند جماعت) اور صوبہ یوپی میں "یوتھ لیگ" اور پنجاب میں "نوجوان بھارت سبھا" کے نام پر جماعتیں قائم ہوئیں ہر سہ جماعتوں کے مقاصد مشترک تھے۔ یعنی تشدد کے ذریعے ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا۔ گو کانگریس خلافت تحریک کی ناکامی کے بعد تحریک آزادی کی تنہا علمبردار تھی۔ مندرجہ بالا مقاصد سے وہ ہم آہنگ نہیں تھی۔ لیکن پنجاب، بنگال اور یوپی کے نوجوان اقوام ہند کی آپس کی فرقہ وارانہ منافرت سے بغاوت کرکے اس راستے پر آ کھڑے ہوئے تھے کہ اس برتن سے گھی سیدھی انگلی نہیں نکلے گا۔ جبکہ ہندو مسلم کی باہم کشمکش سے انگریز کی حمہ ہندوستان کی غلامی کو طویل کر

رہی ہے۔ چنانچہ دہشت پسندوں نے تحریک آزادی کا رخ کچھ وقت کے لیے عدم تشدد سے موڑ کر تشدد کی طرف کر دیا۔ اس کے نتیجے میں اس سال بہت سے واقعات ہوئے کہ جس سے کانگریس کے مقاصد کو نقصان پہنچا۔

۳۰۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو جب سائمن کمیشن لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو باقی شہروں کی طرح یہاں بھی ان کی آمد پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے ایک عظیم ہجوم نے سائمن کمیشن GO BACK کے نعرے لگائے۔ اس ہجوم میں پنجاب کے مشہور رہنما لالہ جپت رائے بھی تھے پولیس کے ایک انگریز افسر مسٹر سکاٹ نے جلوس پر لاٹھی چارج کا حکم دیا اور خود بھی عوام پر ڈنڈے برسائے۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ لاجپت رائے بھی زخمی ہوئے اور قریباً ایک ماہ بعد وہ انہیں ضربات کے باعث انتقال کر گئے۔ پنجاب نوجوان بھارت سبھا نے متعلقہ پولیس آفیسر سے لاجپت رائے کی موت کا انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۱۶۔ دسمبر ۱۹۲۸ء کو چار بجے شام ہندو سبھا کالج کے ہوسٹل اور سول پولیس دفتر کے درمیان چوک میں مسٹر سکاٹ کی بجائے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر سانڈرس اور اس کے اردلی ارجن سنگھ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے چند ماہ بعد ۸۔ اپریل ۱۹۲۹ء کو دہلی سنٹرل اسمبلی کے اجلاس میں ایک بم پھینکا گیا۔ جب اس بم کا دھواں صاف ہوا تو سامنے گیلری پر دو نوجوان کھڑے تھے۔ پنجاب کے سردار بھگت سنگھ اور بنگال کے مسٹر بی۔ کے۔ دت جنہیں پولیس نے بغیر کسی مزاحمت کے اسی وقت گرفتار کر لیا۔ ۲۳۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کو دہلی کے ایک میل کے فاصلے پر وائسرائے ہند لارڈ ارون کی گاڑی کے نیچے بم کا دھماکہ ہوا۔ گو وائسرائے اور اس کا باقی عملہ اس حادثے میں محفوظ رہا۔ لیکن ریل گاڑی کے چند ڈبے تباہ ہو گئے۔ اس واقعہ نے اور اس سے پیشتر تشدد کے دوسرے واقعات نے ہندوستان کی سیاست میں کافی گرما گرمی پیدا کر دی۔

۱۹۲۸ء اور ۲۹ء کے سال کانگریس کے نہیں بلکہ دہشت پسندوں کے سال تھے۔ انقلاب پسند نوجوانوں کی گرفتاریوں نے نہ صرف سیاسیات کا رخ بدل دیا بلکہ جوان دلوں میں جذبات کو بھی بیدار کیا۔ اور انگریزی سامراج کے خلاف ایک ایسی آگ روشن ہوئی۔ جس سے سارا ہندوستان فرنگی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کے گیت گانے لگا۔

آل انڈیا نیشنل کانگرس اور دہشت پسندوں کے مابین ان حالات نے مزید کھچاؤ پیدا کر دیا۔ ۱۹۲۹ء کے آخر تک ہندوستان تشدد اور عدم تشدد کے علاوہ رجعت پسند ہندو مسلمان اور سکھوں کی حرکات کے باعث ایسے چوراہے پر کھڑا تھا جہاں سے غیر ملکی غلامی سے نجات کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

خلافت کمیٹی کا آخری اجلاس خلافت عثمانیہ کے خاتمے پر اتاترک غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے جب ٹرکی کا اقتدار سنبھالا۔ تو ہندوستان سے خلافت کمیٹی کا وجود بھی عملاً ختم ہو گیا تھا۔ صرف علی برادران اس جماعت کے وارث رہ گئے تھے۔ ۱۹۲۸ء کے آخری دنوں کانگریس، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور دیگر سیاسی جماعتوں کے اجتماعات کلکتہ میں ایک ساتھ منعقد ہوئے کہ نہرو رپورٹ پر تمام جماعتیں اپنی منظوری دیں۔ مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں پنجاب خلافت کمیٹی کے ارکان نے (جن میں چودھری افضل حق، مولانا عبدالقادر قصوری مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر محمد عالم، خواجہ عبدالرحمٰن غازی مولانا مظہر علی اظہر اور شیخ حسام الدین شامل تھے۔) نہرو رپورٹ کے حق میں بحث شروع کی، تو اجلاس میں ہنگامہ ہو گیا۔ علی برادران نہرو رپورٹ کے خلاف تھے۔ جبکہ پنجابی ٹولی لکھنو میں نہرو رپورٹ پر دستخط کر چکی تھی۔ اس ہنگامہ نے اس قدر طول کھینچا کہ آمنے سامنے ریوالور نکل آئے۔ لیکن ڈاکٹر انصاری کے درمیان میں آجانے سے حالات قابو میں رہے۔ اس ہنگامہ آرائی کے نتیجہ میں مرکزی خلافت کمیٹی نے نہرو رپورٹ کو نامنظور کیا اور ۱۷ جولائی ۱۹۲۹ء کو ایک خط کے ذریعہ پنجابی ٹولے کو مرکزی خلافت کمیٹی سے علیحدہ کر دیا گیا۔۔۔۔ اس طرح خلافت کمیٹی جس نے ترکوں کی حمایت میں انگریزوں سے پرامن جنگ لڑ کر عالمگیر شہرت حاصل کی تھی ختم ہو گئی۔ اور اس کے لیڈر مختلف جماعتوں میں منقسم ہو گئے۔

مجلس احرار کا قیام

۱۴ اپریل ۱۹۲۹ء کو سائمن کمیشن جب دوسری بار ہندوستان سے اپنی ناکامی کے بعد انگلستان پہنچا تو برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی (جس کے لیڈر مسٹر چرچل تھے) لیبر پارٹی کے

پانچویں الیکشن میں شکست کھا چکی تھی۔[1] اس طرح ۴۔ جون ۱۹۲۹ء کو جب مسٹر ریمزے میکڈونلڈ نے اپنی وزارت بنائی اور وہ برطانیہ کے وزیر اعظم مقرر ہوئے تو ہندوستان کو ایک گونہ مسرت ہوئی۔ کیونکہ ہندوستان سے متعلق ان کی پالیسی مسٹر چرچل سے مختلف تھی۔ گو نئے وزیر اعظم سیاسی اعتبار سے اس قدر انتقامی جذبہ نہیں رکھتے تھے جس قدر کہ مسٹر چرچل ہندوستان کے دشمن تھے۔ تاہم بحیثیت انگریز اپنی غلام رعایا سے انہیں کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔

جون کے آخری دنوں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ اِروِن وزیر اعظم سے حکومت کی نئی پالیسی سمجھنے کے لیے انگلستان گئے اور واپسی پر ۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو انہوں نے ایک بیان کے ذریعے برطانوی پالیسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

برٹش گورنمنٹ اپنے وعدے اگست ۱۹۱۷ء کے مطابق "ہندوستان کو اب بھی بتدریج ذمہ دار حکومت دینے کو تیار ہے۔ جیسے کہ سلطنتِ برطانیہ کے مختلف وزراء نے گاہے گاہے ہندوستان کو یقین دلایا اور وعدہ کیا تا کہ ہندوستان برطانیہ کا ایک جزو لاینفک رہے۔"

کانگریس اور مسلم لیگ کے مشترک حلقوں نے اس بیان کا خیر مقدم کیا اور مسٹر محمد علی جناح نے پنڈت موتی لال نہرو کو ایک خط کے ذریعہ اپیل کی کہ کانگریس برطانوی وزیر اعظم کے اس اعلان کو قبول کر لے۔ نیز اپنے مطالبات برطانوی وزیر اعظم کی گول میز کانفرنس میں رکھیں، جن کا شاید وہ عنقریب اعلان کریں۔ اس خط کے بعد مسٹر جناح سنٹرل اسمبلی کے صدر مسٹر پٹیل کی ہمراہی میں صابرمتی آشرم میں گاندھی سے ملنے گئے۔ خود لارڈ اِروِن کی بھی خواہش تھی کہ حکومت کو کانگریس کا تعاون حاصل ہو جائے۔ اس تمام دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۳۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کو لارڈ اِروِن اور گاندھی جی کے درمیان ملاقات ہوئی۔ اسی صبح وائسرائے کی ٹرین کو بم کا حادثہ پیش آیا۔ اور وہ سلامتی کے ساتھ دہلی واپس آ گئے تھے۔

وائسرائے گاندھی کی تمام شرائط میں سے صرف ایک شرط کو فی الفور ماننا چاہتے تھے کہ سیاسی قیدیوں کو فوراً رہا کر دیا جائے گا۔ لیکن کانگریس اور گاندھی جی برطانیہ سے نہرو رپورٹ کی منظوری یا انکار کے راستہ پر کھڑے تھے۔

ان دنوں کانگریس اور دہشت پسند تحریکات نے ملک بھر میں انگریزی حکومت کے خلاف [illegible]
پھیلا رکھی تھی کہ آزادی وطن کے سوا دوسرا کوئی سودا غیر ملکی حکمرانوں سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ [illegible]
جماعت اگر اس سے کم درجے پر سودا کرتی تو ہندوستان میں اس کی ہتک عزتی ہو جاتی۔ لیکن اس کے
باوجود برطانیہ کی خواہش تھی کہ حکومت اور کانگریس کے مابین تصادم ٹل جائے۔

اقتدار اپنوں کا ہو کہ غیروں کا، ہر ایک کے ساتھ مخصوص لوگوں کا ایک ٹولہ ہمیشہ چمٹا رہا۔
جو اقتدار کی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ برطانوی اقتدار کے دنوں میں بھی یہ گروہ موجود تھا۔ اور
ایوانِ فرنگی کی ہر دھڑکن کو وہ اپنے دل کی دھڑکن محسوس کرتا تھا۔ ایسے ہی لوگ تھے جو برطانیہ اور
کانگریس کے درمیان مفاہمت کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اور کسی بات کو آگے نہ بڑھنے دیتے۔

آخر یہ ہوا کہ ۲۸ دسمبر ۱۹۲۹ء کو آل انڈیا نیشنل کانگریس نے لاہور دریائے راوی کے کنارے
اپنے سالانہ اجلاس میں سکھوں کی ناراضگی کا بہانہ تراش کر نہرو رپورٹ کو دریائے راوی کے سپرد کر کے
ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس کر دیا۔ بنیادی کانگریس (۱۹۰۵ء) سے کانگریس سمیت
دوسری جماعتیں انگریزوں سے ہندوستان کے لیے صرف درجہ نوآبادیات کا مطالبہ کرتی چلی آئی تھیں لیکن
۱۹۲۹ء کا سال ہے کہ کانگریس نے برطانیہ سے ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔

نہرو رپورٹ کے خاتمے سے اُن مسلمانوں کو بے حد صدمہ ہوا جنہوں نے ملتِ اسلامیہ کی
ناراضگی کے باوجود صرف آزادئ وطن کے لیے نہرو رپورٹ پر دستخط کیے تھے۔ لیکن کانگریسی رہنماؤں
نے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کرتے وقت ان سے مشورہ لینا بھی مناسب نہ سمجھا اور
ایسی بے اعتنائی کا ثبوت دیا کہ بہی خواہانِ وطن کو کانگریس کی اس بے وفائی پر دلی رنج ہوا۔ اسی
لیے ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں نے اپنی الگ تنظیم کا وجود شدت سے محسوس کرتے ہوئے ۲۹ دسمبر
۱۹۲۹ء کو کانگریس کے اسی پنڈال میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے پر حضرت امیرِ شریعت مولانا
سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی صدارت میں اپنا ایک اجلاس منعقد کیا جس میں فیصلہ کیا کہ:

" ہندوستان کی آزادی کا سہرا دوسری قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے سر بھی ہونا
چاہیے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں سے [illegible]
مسلمانوں کے اندر حریت پسند تنظیم کا ہونا نہایت اہم ہے [illegible]

اس اجلاس میں امیر شریعت کے علاوہ چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا ظفر علیخاں، خواجہ عبدالرحمٰن غازی، شیخ حسام الدین اور مولانا داؤد غزنوی نے شرکت کی۔ اسی اجلاس میں مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا۔

ہندو کاروباری ذہن رکھتا تھا۔ اور سیاسیات میں بھی اس نے یہی روش اختیار کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہرو رپورٹ کا فارمولا جسے پنجاب کے مسلم رہنماؤں نے اپنی قوم کی مخالفت کے باوجود قبول کر لیا تھا۔ محض پنجاب میں ایک نشست کی زیادتی کی بنا پر ہندو اور سکھوں نے رد کر دیا۔ جیسے کہ مولانا مظہر علی اظہر اپنی کتاب "ہمارے فرقہ وارانہ فیصلے کا استدراج" کے صفحہ ۷۶ تا ۸۴ پر لکھتے ہیں۔

"تجاویز دہلی اور نہرو رپورٹ کا تذکرہ کرنے کے بعد اب ہم ایک اور فارمولا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جو پنجاب کے سامنے آیا۔

پنجاب کا مسئلہ ہی ہمیشہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کی راہ میں بدترین رکاوٹ رہا۔ فیصلے کی جتنی کوششیں ہوئیں وہ بیکار گئیں۔

سائمن کمیشن کی آمد پر صوبوں میں کونسلوں کے ممبروں کی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ جو سائمن کمیشن کے ساتھ مل کر اس کا کام آسان بنانے کی خاطر کاروائی کرتی تھیں۔ پنجاب کی اس ریفامز کمیٹی کے ارکان حسب ذیل تھے۔

سر سکندر حیات خاں صدر، مسٹر اوون رابرٹس، چودھری چھوٹو رام، چودھری ظفر اللہ خاں، راجہ نرندرا ناتھ، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ اور سردار اجل سنگھ۔

اس کمیٹی نے تحقیق و بحث کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کے ساتھ راجہ نرندرا ناتھ اور ڈاکٹر گوکل چند نارنگ نے مل کر اپنا علیحدہ اختلافی نوٹ شامل کیا اور سردار اجل سنگھ نے اپنا علیحدہ اختلافی نوٹ لکھا۔

مخلوط انتخاب کا فارمولا

ہمیں اس جگہ اس رپورٹ اور ان اختلافی نوٹوں کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ مسلم ارکان نے اپنی رپورٹ اور تجویزوں کے علاوہ یہ تجویز بھی پیش کی کہ اگر آئندہ پنجاب اسمبلی میں نشستوں کی تعداد طاق رکھی جائے۔ یعنی ایسی تعداد جو دو پر تقسیم نہ ہو سکے تو مسلموں اور غیر مسلموں

کی نشستوں میں فقط ایک نشست کا فرق رکھا جائے۔ یعنی آخری فالتو نشست مسلمانوں کو دی جائے۔ مثلاً اگر دو سو ایک نشستیں مقرر کی جائیں تو ایک سو ایک نشست مسلمانوں کو دی جائے اور اگر ایک سو چھتر نشستیں مقرر ہوں تو ان میں سے اٹھاسی مسلمانوں کو دی جائیں۔ اٹھاسی نشستیں غیر مسلموں کو۔ اور حلقہ ہائے انتخاب مخلوط رکھا جائے۔

مسلم راج کی رٹ

مگر راجہ نریندر ناتھ اور گوکل چند نارنگ ایک طرف اور سردار اُجل سنگھ دوسری طرف اس تجویز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے

پنجاب کے صوبے میں ایک مسلم نشست کی اکثریت بھی منطقی حیثیت سے ہندوؤں اور سکھوں کے لیے کیسے قبول ہو سکتی تھی۔ جبکہ وہ تجاویز دہلی کو مسترد کرنے کے بعد نہرو رپورٹ کو بھی رد کر چکے تھے۔ ان کو تو پنجاب میں ایک مسلم نشست کی زیادتی بھی ظالمانہ اور مسلم راج نظر آتی تھی۔ چنانچہ ملک کے طول و عرض میں تقریروں اور تحریروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر امڈ آیا۔ جس نے صاف صاف کہہ دیا کہ پنجاب میں مسلم راج قائم نہیں ہو سکتا۔ پنجاب کا ہندو اور سکھ کٹ مرے گا لیکن پنجاب میں مسلم راج قائم نہیں ہونے دے گا۔

ہندو کا مذہبی اور سیاسی تعصب مسلمانوں کے جذبۂ حریت کو تو مجروح نہ کر سکا۔ البتہ ایسے زخم ضرور آئے جس سے دونوں قوموں کا اتحاد باہمی کا خواب پھر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

غیر مسلموں کی انہی حرکات کے باعث مسلمانوں کا وہ طبقہ جو آزادی وطن کے لیے ہمیشہ ہندو کے ساتھ رہا اپنی الگ تنظیم قائم کرنے پر مجبور ہوا۔ ورنہ پیشتر ازیں انہی لوگوں نے ہندوؤں کے دوش بدوش غیر ملکی غلامی کا جوا اتارنے کے لیے فرنگی حکمرانوں کے خلاف جہاد کیا تھا۔

نمکین ستیہ گرہ

۱۹۲۸ء میں کلکتہ کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر حکومت برطانیہ کو نہرو رپورٹ کے منظور کرنے کا جو چیلنج دیا گیا تھا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو اس نوٹس کی میعاد ختم ہو گئی۔ مگر برطانوی حکومت نے نہرو رپورٹ کی منظور کردہ تجاویز کو قابل قبول نہ

سمجھ کر اسے رد کر دیا۔ تو کانگریس نے نہرو رپورٹ کی بجائے فرقہ وارانہ فیصلے کا حل صرف مکمل آزادی میں سمجھا اور اس کے لیے لاہور کے سالانہ اجلاس میں مکمل آزادی کا ریزولیوشن منظور کیا۔ اس اجلاس کی صدارت پنڈت جواہر لعل نہرو نے کی تھی۔

اس دوران مسلم لیگ کانگریس اور برطانوی حکومت کے مابین کافی دیر گفتگو اور خط و کتابت رہی لیکن غیر ملکی غلامی سے اکتائے ہوئے ذہن اور گذشتہ سالوں کی جدوجہد آزادی نے برطانیہ کے خلاف ایسی آگ بھڑکائی کہ لڑائی کے بغیر اس کا کوئی دوسرا حل نہیں تھا۔

کانگریس نے حکومت سے پرامن جنگ سے پیشتر ۲۶۔جنوری ۱۹۳۰ء کو ہندوستان بھر میں اپنی جدوجہد کا ایک اہم دن منایا۔ اس دن ملک بھر میں انگریزی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی لڑائی کا عملی آغاز کیا۔ ۱۴۔۱۵۔۱۶ فروری ۱۹۳۰ء کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے سابرمتی میں حکومت کے خلاف سول نافرمانی کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی گاندھی نے وائسرائے ہند کو اپنے مطالبات کی حسب ذیل فہرست بھیجی۔

۱۔ منشی اشیاء کو مکمل طور پر ممنوع قرار دیا جائے۔
۲۔ شرح تبادلہ ۱۸۔پنس کی بجائے ۱۶۔پنس۔
۳۔ مالیہ زمین میں ۵۰ فیصدی تخفیف اور اسے لیجسلیٹو کنٹرول میں کرنا۔
۴۔ محصول نمک کی تنسیخ۔
۵۔ فوجی اخراجات میں کم از کم ۵۰ فیصدی تخفیف۔
۶۔ اعلیٰ آسامیوں کی تنخواہیں نصف کی کمی یا جو تخفیف شدہ مالیہ زمین کے متناسب ہو۔
۷۔ غیر ملکی کپڑے پر حفاظتی محصول۔
۸۔ کوسٹل ٹریفک ریزولیشن بل کا راستہ۔
۹۔ قتل کے ملزموں کے علاوہ تمام سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کی رہائی۔ تمام ہندوستانی جلاوطنوں کی واپسی کی اجازت۔ اور دفعہ ۱۲۴ا کے تحت چلائے گئے تمام مقدمات کی واپسی۔
۱۰۔ محکمہ سی۔آئی۔ڈی توڑ دیا جائے۔
۱۱۔ آتشیں اسلحہ کے لیے عام لائسنس جاری کیے جائیں۔

ظاہر ہے کہ ان شرائط کو منظور نہ کرنے کی صورت میں کانگریس اور [illegible] جنگ یقینی تھی۔ دوسرے ہندوستانی رہنماؤں کے علاوہ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر رمزے میکڈانلڈ کو گاندھی نے بھی حسب ذیل خط لکھا۔

"ہندوستانی ضروریات اور مطالبات کی مندرجہ بالا فہرست مکمل نہیں لیکن اگر والسرائے انہیں معمولی ضروریات اور مطالبات کے متعلق ہندوستان کو مطمئن کر دیں تو پھر وہ سول نافرمانی کے سلسلے میں کوئی لفظ نہیں سنیں گے۔ اور کانگریس اس کانفرنس میں نہایت خوشی سے شمولیت اختیار کرلے گی جس میں اظہارِ مطالبات کی مکمل آزادی ہوگی۔ بالفاظِ دیگر ان مطالبات کو منظور نہ کرنے کی صورت میں سول نافرمانی شروع کی جائے گی۔

گاندھی جی کے اس خط کو الٹی میٹم یا چیلنج کہا جا سکتا ہے۔

نمکین ستیہ گرہ میں شمولیّت

بساطِ سیاست پر انگریز کھلاڑی جس انداز سے اپنے مہرے کھلاتا ہے۔ زمانہ اس کے جواب میں قاصر ہے۔ بظاہر اس کی نگاہ نیلے پر ہوتی ہے مگر اس کی سوچ اور فکر میں پیادہ کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ اور مقابل کا کھلاڑی منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

سرزمین حجاز اور دوسری عرب ریاستیں جس بری طرح فرنگی سیاست کا شکار ہوئیں گزشتہ پچاس سال کی تاریخ ان واقعات کو اپنے اوراق میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔

وسط ایشیا کا تمام علاقہ اپنی معدنیات (سونے اور پٹرول) کے باعث فرنگی حکمرانوں کی نگاہوں کا ہمیشہ مرکز رہا۔ اور اس کے حصول کے لیے یورپین اقوام نے گزشتہ نصف صدی کے واقعات کو کچھ ان اطوار سے جنم دیا کہ سارا عرب دریائے نیل کی موجوں [illegible] کناروں میں ڈوب کر رہ گیا۔

خلافت عثمانیہ سارے حجاز پر بطور خدام کعبہ قابض تھی۔ اور [illegible] حد قدم کو شکست دے کر مکہ میں داخل ہوا تھا۔ برطانوی وزیر اعظم [illegible] سے اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے اس سے معاہدہ کیا کہ اگر [illegible]

دو تو ہم سارے حجاز کی سلطنت کو تمہارے سپرد کر دیں گے۔

شریف حسین حجاز کی سلطنت کے لالچ میں ایسا رام ہوا کہ اس نے آتے ہی

" ترکی ترکوں کا عرب عربوں کا "

ایسا جذباتی نعرہ لگایا کہ ترک اور عرب ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ پھر یہ دشمنی اس قدر جوان ہوئی کہ وہ ترک جنہوں نے پانچ سو سال تک کعبۃ اللہ اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کو اپنی ڈاڑھیوں سے صاف کیا تھا۔ مکہ کے بازاروں میں عربوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اور ان کی عورتیں بے عزت ہوئیں۔ ترکوں کے معصوم بچوں کو " ترک عرب دشمنی " کے جرم میں نیزوں پر اچھالا گیا۔

مکہ کے شریف حسین ترکوں کی خونریزی کے بعد جب انگریزوں سے اپنی محنت کی مزدوری مانگنے گیا تو لارڈ جارج نے کہا۔

"مسٹر شریف! تلوار سے کیے ہوئے وعدے ہی پائیدار ہوتے ہیں۔ لیکن جو وعدے قلم سے کیے جائیں وہ قلم کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں"۔

برطانوی وزیراعظم کے ان الفاظ سے شریف حسین کے تصورات کی ساری عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہی۔ اور اس وعدہ شکنی پر شریف حسین نے انگریزوں کو آنکھیں دکھانا چاہیں تو انہیں مالٹا میں نظربند کر دیا گیا۔ اور حجاز کو چار حصوں میں تقسیم کر کے اس کے لڑکوں کو ان پر حکمران بنا کر ان پر انگریز ریذیڈنٹ مقرر کر دیے۔

اس طرح سے مصر، شام، عراق، شرق اردن اور سعودی عربیہ انگریزوں کی آماجگاہ بن کر رہ گئے۔ اور اسی سرزمین کی معدنیات سے پھر کمزور قوموں کی غلامی کی زنجیریں ڈھلیں۔

ہندوستان کے بعد عرب پر انگریزی اقتدار سارے اسلامی ملکوں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوا۔ احرار رہنماؤں کے نزدیک ہندوستان کا آزاد ہونا ایشیا اور وسط ایشیا کی آزادی کے لیے اسی قدر اہم اور ضروری تھا جس قدر کہ یورپ کی زندگی کے لیے ہندوستان کا غلام رہنا۔"

چالیس کروڑ (۱۹۲۰ء میں متحدہ ہندوستان کی آبادی اسی قدر تھی) غلاموں کا یہ دیش انگریزی سامراج کو دنیا کے غلام رکھنے کی قوت فراہم کر رہا تھا۔ چنانچہ ان حالات کے پس منظر میں

کانگریس کی تحریک سے ہندوستان کے مسلمانوں کا تعاون یا اس میں شمولیت کی نہایت ضروری ہو گیا

پھر جبکہ دوسری جماعتیں جن پر ان دنوں لوڈی اور حریت پسند مسلمانوں کا قبضہ تھا اس پر امن

لڑائی میں خاموشی اور علیحدگی اختیار کیے ہوئے تھیں۔ اور بھی اہم ہو گیا کیونکہ حقوق کے بٹوارے میں

جب قومیں ترازو لے کر بیٹھتی ہیں تو گفتار سے کہیں زیادہ کردار کا جائزہ لیا جاتا ہے اور اس میدان میں

جیت بھی انہیں کی ہوتی ہے جو بجائے گفتار کے کردار کے غازی ہوں۔

ان وجوہ کی بنا پر مجلس احرار کے رہنماؤں نے اپنی نئی تنظیم (مجلس احرار) کی سرگرمیوں کو کچھ

دیر کے لیے ملتوی کر دیا۔ اور کانگریس کے ساتھ ہو کر ہندوستان کی آزادی کے لیے انگریزوں

سے نبرد آزما ہوئے۔

احرار رہنماؤں کے اس فیصلے نے ہندوستان کے حریت پسندوں کو متاثر کیا اور وہ

بھی انگریزی سامراج سے آخری جدوجہد کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

کانگریس کی تحریک سول نافرمانی میں احرار رہنماؤں کی شمولیت سے ہندوستان کے

مسلمانوں میں توانائی محسوس ہونے لگی۔ آزادی وطن کے لیے ایثار و قربانی کے میدان میں وہ

برادران وطن کے ہمدوش آگے بڑھنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے جبکہ فروری ۱۹۳۰ء

میں مسلم لیگ کے رہنماؤں نے مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں اپنے ایک اجلاس میں برطانوی

وزیر اعظم کی دعوت پر لندن گول میز کانفرنس میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔

برطانوی سیاستدانوں کے خیال میں یہ ان کی بڑی کامیابی تھی کہ انہوں نے یہ کانفرنس ایسے

وقت میں بلائی جب غلام ہندوستان اپنی آزادی کی آگ روشن کر چکا تھا اور قریب تھا کہ غلامی

کی تمام کڑیاں اس الاؤ میں پانی پانی ہو کر رہ جائیں۔ انہوں نے ہندوستانی ریاستوں کے

علاوہ باقی ہندوستان سے ستاون اور گیارہ افراد کو ریاستی نمائندگی دے کر گول میز کانفرنس

کامیاب کرنا چاہی۔ چنانچہ حسب ذیل ہندوستانی وزیر اعظم مسٹر ریمسے میکڈانلڈ کی دعوت پر

لندن گئے۔

ریاستی ڈیلیگیٹ	مہاراجہ بیکانیر۔ مہاراجہ الور۔ نواب آف بھوپال۔ سر اکبر حیدری (نظام حیدر آباد کی طرف سے)

مسلم نمائندے | مسٹر محمد علی جناح ۔ ہز ہائی نس آغا خاں، مولانا محمد علی جوہر، سر محمد شفیع مسٹر فضل الحق، ڈاکٹر شفاعت احمد، سر ظفر اللہ خاں اور نواب چھتاری۔

ہندو نمائندے | سری نواس شاستری، ڈاکٹر مونجے، سر تیج بہادر سپرو وغیرہ۔ انگلستان کی مختلف جماعتوں کے ۱۳ نمائندہ کانفرنس میں شامل ہوئے۔

سول نافرمانی | میدان کارزار گرم ہو تو غیر مسلح افراد یا قومیں شکست کھا جاتی ہیں۔ میدان ہمیشہ انہی کے ہاتھ رہا، جن کے مقاصد بلند۔ ہاتھوں میں تلوار، سینے پر زرہ بکتر اور ارادے متزلزل نہ ہوں۔ لیکن متحدہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی اپنی نوعیت کی منفرد لڑائی تھی۔ اس میدان میں ایک طرف غیر ملکی حکمران اپنی مسلح افواج، جیل خانے، پھانسی کا رسہ اور عبور دریائے شور کی سزاؤں سے لیس تھے۔ مقابل میں غیر مسلح رعایا۔ اگر کوئی چیز ان کے پاس تھی تو وہ جذبۂ آزادی وطن تھا اور بس!۔ دنیا اس لڑائی کو حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ توپ اور بندوق کے مقابل سینہ تانے ہوئے لوگ موت کی آغوش میں تو جا سکتے ہیں مگر اپنی منزل کو کیوں کر پا سکتے ہیں؟ لیکن مصلحت اندیش ہی ایسا سوچ سکتے ہیں اور جنہیں معلوم ہو کہ موت کے بغیر زندگی کا سراغ نہیں مل سکتا وہ بے دریغ توپ اور بندوق سے لڑ جاتے ہیں اور یہی ان کی منزل ہوتی ہے۔

آخر حکمران اور غلام ایک دوسرے کے آمنے سامنے آکھڑے ہوئے۔ ۱۲۔ مارچ ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی ہاتھ میں بانس کی ایک چھڑی لے کر بچھتر رضا کاروں کی معیت میں اپنے آشرم صابرمتی سے سول نافرمانی کے لیے ڈانڈی کی طرف روانہ ہوئے۔ (ڈانڈی سمندر کے کنارے دو سو میل کے فاصلے پر ایک بستی ہے) اور اپنے بعد عباس طیب جی کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اور ساتھ ہی انہوں نے ہندوستان سے اپیل کی کہ وہ اپنے بدن پر کھدر استعمال کریں۔ اور اخبارات کے نمائندوں کے جواب میں انہوں نے کہا۔

"برطانوی حکومت ہندوستان کی جسمانی، اقتصادی، روحانی، مالی اور اخلاقی تباہی کا باعث ہوئی ہے۔ اور میں اس نظام حکومت کو تباہ کرنے کیلئے نکلا ہوں۔ میں نے بادشاہ کی وفاداری خود کی تھی۔ اور لوگوں کو اس کی اطاعت و فرمانبرداری

کی تلقین خود کی تھی۔ میں سیاسیات میں گفت و شنید اور درخواستوں کا قائل تھا لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اس حکومت کو راہ راست پر لانے کے یہ طریقے نہیں ہیں۔ اس حکومت سے بغاوت میرا مذہب اور ایمان ہو گیا ہے۔

ہماری یہ جنگ نہایت پر امن ہے۔ ہم کسی کو قتل کرنے نہیں جا رہے بلکہ انگریزی حکومت کی لعنت کا دھبہ ہندوستان کے دامن سے دور کرنے جا رہے ہیں۔ اس طرح سے یا تو میری لاش سمندر میں تیرتی نظر آئے گی اور یا پھر میں آزادی حاصل کر کے رہوں گا۔

نمک

خالق کی ہر شے اس کی مخلوق کے لیے ہے۔ اس پر نہ تو کسی حکمران کو ملکیت کا حق پہنچتا ہے اور نہ ہی کسی قانون کی کوئی قدغن اس پر زیب دیتی ہے۔ ہوا اور پانی کے علاوہ زمین کی پیداوار پر اس کے مالک حقیقی کا ہی اختیار ہے۔ یہ حق اور بھی زیادہ محفوظ ہو جاتا ہے جب کوئی غیر ملکی حکمران اس کو اپنے آئین کے تابع کر کے اس پر ایسی پابندیاں عائد کرے کہ مخلوق خدا کے لیے اس کا حصول مشکل ہو جائے۔

نمک لندن یا یورپ کے کسی شہر سے درآمد نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ فطرت نے انسانی ضرورت کے لیے ہندوستان میں اس کے پہاڑ کھڑے کر دیے ہیں۔ لیکن غلام ہندوستان کے غیر ملکی آقاؤں نے اس ملک کی ہر چیز کو اپنی حاکمانہ جاگیر سمجھ کر اس پر اس قدر ٹیکس یا محصول عائد کیا کہ نمک ایسی عوامی ضرورت کی چیز بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

گاندھی جی نے انگریزوں سے پر امن لڑائی کا آغاز نمک پر ٹیکس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ وہ ڈانڈی پہنچ کر سمندر کے پانی سے نمک تیار کریں گے۔

حالانکہ یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ سمندر اپنا، پانی اپنا، اور ان سے بنائی جانے والی چیز اپنی لیکن انگریزی قانون کی رو سے یہ بھی جرم تھا۔

۵۔ اپریل ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی سابرمتی سے پیدل سفر کرتے ہوئے [illegible] کے ڈانڈی پہنچ گئے اور ۶۔ اپریل (۱۹۳۰ء) صبح انھوں نے نمک [illegible] ساتھ ہی ہندوستانی عوام کو ہدایت کی،

"ہوائیں انسان کے لیے خدا کا انعام ہے۔ سمندر اور ان کے پانی غیر ملکی نہیں۔ ہمارا ان پر حق ہے۔ ہم اگر اس پانی سے نمک تیار کرتے ہیں تو یہ کوئی جرم نہیں۔ لیکن اگر حکومت اس پر گرفتار کرے اور مقدمہ چلائے تو میں کہوں گا کہ آپ عدالتوں کا بائیکاٹ کریں۔ نہ تو ضمانت دیں اور نہ مقدمہ کی کارروائی میں حصہ لیں۔ جلوس یا دوسرے اجتماع پر پولیس اگر کسی قسم کا تشدد کرے تو آپ پر امن رہیں۔ اسی طرح کی پابندیاں اگر اخبارات پر عائد ہوں تو انہیں بھی ضمانت نہیں دینی چاہیے۔ اخبار بند ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

اس اعلان کے بعد ۶۔اپریل کو جب گاندھی جی نے نمک بنایا تو حکومت نے انہیں گرفتار نہ کیا۔ اور اس کے بعد سارے ہندوستان میں پانی اور مٹی سے نمک بنانے کی تحریک شروع ہو گئی۔ اس قسم کا نمک ملک میں عوام کے رہنما فروخت کرتے اور لوگ اسے زیادہ سے زیادہ قیمت پر خریدتے۔

انہی دنوں حکومت نے ۲۲۔اپریل ۱۹۳۰ء کو بنگال آرڈیننس از سر نو جاری کیا اور اس کے ساتھ ہی ۱۹۱۰ء کے پریس ایکٹ کو از سر نو استعمال کرنے کے لیے ایک آرڈیننس جاری کیا اور گاندھی جی کو گرفتار کر کے یوروڈا جیل میں بھیج دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ہندوستان میں نمک ستیہ گرہ پر گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔

۲۳۔اپریل

۱۳۔اپریل ۱۹۱۹ء کی طرح پشاور میں ۲۳۔اپریل ۱۹۳۰ء کا دن بھی متحدہ ہندوستان کی تاریخ میں برطانوی سامراج کے ظلم و جور کا تاریخی دن ہے۔ اس دن کے اڑے ہوئے خونِ مظلوم کے چھینٹوں سے ایوانِ فرنگی کا چہرہ دنیائے آخرت تک داغدار رہے گا۔

۱۸۵۷ء کی خون آشام حقیقت کے بعد غیر ملکی سلطنت نے غلاموں پر صرف اپنے وقار کے لیے ۲۳۔اپریل کو پشاور کے قصہ خوانی بازار میں جو ڈرامہ کھیلا اس دن کی یادگار جلیانوالہ باغ کے حادثہ کی طرح برطانوی وقار پر جھومر کی طرح آویزاں رہے گی۔ فطرت نے انسانی موت کے آجلانہ فیصلے اس دن سے زیادہ کبھی تحریر نہیں کیے ہوں گے۔

نمکین ستیہ گرہ کی تحریک آگ کی طرح سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ پنجاب اور

دوسرے صوبوں کے بعد سرحد کے رہنما بھی پشاور کے قریب ایک گاؤں چارسدہ میں ۱۸ تا ۲۰ اپریل کو انگریزوں کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کرنے والے تھے۔ اس کانفرنس میں مولانا ظفر علی خان اور مولانا عبدالقادر قصوری کو پنجاب سے شامل ہونا تھا۔ سرحد کے رضاکار ان رہنماؤں کے استقبال کے لیے پشاور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو پتہ چلا کہ پولیس نے ان رہنماؤں کا سرحد میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا ہے۔ حکومت کی اس جارحانہ پالیسی کے خلاف احتجاجی جلسہ ہوا۔ دوسری طرف سرحد کے تمام رہنما جن میں مفتی سرحد مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، آغا سید لال بادشاہ، عبدالرب نشتر، ارباب عبدالغفور شامل تھے، گرفتار کر لیے گئے۔ صبح ہوئی تو پشاور ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ ان رہنماؤں کو ہتھکڑیاں پہنا کر پولیس تھانہ لے جایا گیا۔ جس سے عوام میں جوش پیدا ہوا۔ اور وہ کابلی تھانے کی طرف روانہ ہوئے جہاں یہ رہنما پولیس کی حراست میں تھے۔ بڑی مشکل سے عوام کو سمجھا کر گرفتار شدہ رہنماؤں نے واپس کیا۔ عوام پرامن واپس آ رہے تھے کہ گورا پلٹن قصہ خوانی بازار میں بکتر بند گاڑیاں اور دوسرے آتشیں اسلحہ کے ساتھ موجود تھی۔ اس سے ہجوم کے جذبات میں اشتعال پیدا ہوا۔ اور ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر انگریز فوجی افسر کو جو رہنماؤں کو گالیاں دے رہا تھا قتل کر دیا۔ دوسرے ہجوم نے بکتر بند گاڑیوں پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ اس موقعہ پر گڑھوالی پلٹن کے سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ہجوم پر گولی چلائیں۔ لیکن انہوں نے نہتے عوام پر فائرنگ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر گورا پلٹن نے خود آگے بڑھ کر بغیر کسی وارننگ کے ہجوم پر اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ ہر جوان "اللہ اکبر" کہہ کر انگریز کی گولی اپنے سینے پر کھاتا اور گر جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قصہ خوانی بازار چوک یادگار تک شہیدوں سے بھر گیا۔ تڑپتے ہوئے نیم بسمل عوام کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی۔ گورا فوج کے سپاہی اپنی انتقامی آگ کو نہتے ہجوم پر گولیاں چلا کر ٹھنڈا کر رہے تھے۔ اور آزادی وطن کے دیوانے شمع حریت پر فدا ہو رہے تھے۔

یہ ۲۲۔اپریل ۱۹۳۰ء کا دن تھا۔ اس خونی حادثے میں پانچ سو سے زائد پٹھان شہید ہوئے اور اسی دن سارے سرحد میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

جمیعتہ علمائے ہند کا فیصلہ

احرار رہنما مسلمانان ہند کی رہنمائی کے لیے سارے ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے کہ ۲۔مئی ۱۹۳۰ء کو ایک اجلاس

امروہہ ضلع مرادآباد (یوپی) میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس ۹ مئی تک جاری رہا۔ اس اجلاس میں دوسرے علماء کے علاوہ حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مسلسل سترہ گھنٹے تقریر کی اور آخر میں جمعیۃ علمائے ہند نے حسب ذیل قرارداد منظور کی۔

(و) چونکہ نیشنل کانگریس نے اجلاس لاہور میں مکمل آزادی کا اعلان کر دیا ہے جو جمعیۃ علماء کا پہلے سے نصب العین ہے اور نہرو رپورٹ کو جس سے جمعیۃ نے شدید اختلاف کیا تھا کالعدم کر دیا ہے۔ اور ایک تجویز میں یہ بھی طے کر دیا ہے کہ آئندہ کوئی دستور اساسی اس وقت تک کانگریس قبول نہیں کرے گی جس سے متعلقہ اقلیتیں پورے طور پر مطمئن نہ ہو جائیں۔

اس لیے جمعیۃ علماء کے اس اجلاس کے نزدیک بحالات موجودہ مسلمانوں کے لیے کانگریس سے علیحدہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(ب) مسلمانوں کے مذہبی و قومی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اجلاس اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہے کہ کانگریس کا کوئی آئندہ عملی پروگرام مسلمانوں کے لیے آخری فیصلہ نہ ہوگا جب تک جمعیۃ علمائے ہند اس کی تصدیق نہ کر دے۔

(ج) چونکہ شاردا ایکٹ بحق اہل اسلام صریح مداخلت فی الدین ہے اور اسلامی پرسنل لاء پر شدید حملہ ہے اور حکومت ہند نے انتہائی احتجاج و تنبیہہ کے بعد بھی مسلمانوں کو آج تک اس سے مستثنا نہیں کیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح اس حکومت نے جارحانہ قبضہ کر کے تمام اہل وطن کو غلام اور مفلس و بے کس بنا دیا ہے اور ظالمانہ قوانین کے وضع و نفاذ اور اخلاق و معاشرت کی تخریبی حکمت عملی پر اسے اصرار ہے اس طرح وہ اب اسلامی پرسنل لاء کے واجب التحفظ قلعہ کو بھی مسمار کر کے دین و ملت کو بھی برباد کر دینا چاہتی ہے۔ جو تمام اہل ملک اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ اور ان تمام مقاصد کے سدباب اور ناموس شریعت کی حفاظت کے لیے آخری صورت یہ ہے کہ ملک و ملت کو حکومت متسلطہ کی گرفت سے مکمل طور پر آزاد کر لیا جائے۔

اس لیے یہ اجلاس مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ ملک و ملت کی آزادی اور اپنے

پرسنل لار کی حفاظت کے لیے پورے جوش اور کامل استقلال سے احکام [illegible] کے موافق کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کرتے ہوئے سرفروشانہ [illegible] جنگ آزادی کی راہ میں گامزن ہوں۔

(د) یہ اجلاس تین حضرات کی کمیٹی منتخب کرتا ہے (مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صدر جمعیتہ علمائے ہند، مولانا محمد نعیم لدھیانوی اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری امیر شریعت صوبہ پنجاب) جو مخصوص ملی نظام کے ماتحت حصولِ آزادی اور تحفظ پرسنل لار کے واسطے مفصلہ ذیل امور کا تعمیری لائحہ عمل اور سول نافرمانی کا پروگرام مرتب کرے اور مسلمانوں کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دے۔

۱۔ ضبط شدہ فتاویٰ اور لٹریچر کی اشاعت۔

۲۔ شراب اور دیگر منشیات کے استعمال و تجارت پر احتساب۔

۳۔ ولائتی مال کا عموماً اور کپڑے کا خصوصاً مقاطعہ اور دیسی کپڑے کے استعمال و ترویج کی سعی بلیغ اور ہر ممکن جگہ پر انتظام۔

(ھ) جمعیتہ علماء کو امید ہے کہ اگر انڈین نیشنل کانگریس اس شک و شبہ کا بھی ازالہ کر دے جو بعض مسلمانوں کے قلوب میں اس کی طرف سے پیدا ہو گیا ہے۔ اور ان کو پورا اطمینان دلا دے تو پھر متفقہ جدوجہد کے بروئے کار آنے میں کوئی مانع باقی نہ رہے گا۔ اور کامیابی بھی سریع اور یقینی ہو جائے گی۔"

احرار رہنماؤں کی گرفتاریاں

تاریخ انسانیت میں جنگ و قتال کے جن مناظر کو مؤرخین نے رقم کیا ہے انہیں دیکھنے اور مطالعہ کرنے کے بعد فکر انسانی خون کے دریاؤں میں اس طرح لت پت ہوا کہ شفق کی سرخیاں بھی مات اور شرمندہ ہو گئیں۔ خون کی یہ ندیاں کبھی شخصی وقار کے لیے بہائی گئیں اور کبھی سلطنت کے عروج کے لیے۔ لیکن متحدہ ہندوستان میں یہ لڑائی آزادی کے لیے غلام اور آقاؤں کے درمیان لڑی جا رہی تھی۔ اس [illegible] جنگ میں رعایا کا خون تو بہایا گیا۔ مگر غیر ملکی حکمران گواہ ہیں کہ ان کا خون بہانا ہندوستانیوں [illegible] گوارا نہ کیا اور اس کے لیے کانگریسی رہنماؤں کے علاوہ زعمائے احرار نے بہت [illegible] سے نکل کر

قصبات اور گاؤں تک پہنچے۔ کالج کے طلبا سے دیہات کے جاٹ تک انہوں نے انگریز کے خلاف بغاوت پڑا کسایا۔ ان کی جدوجہد سے ولائتی کپڑے کی ملیں متاثر ہوئیں۔ مانچسٹر کا مال احمد آباد کے مقابلہ میں مات کھا گیا۔ شراب کی دکانوں پر پکٹنگ کرنے ہندو نوجوانوں کے برابر مسلمان نوجوان بھی کھڑا پایا گیا۔ اگر ہندو وکلاء نے سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ کیا تو مسلمان وکیل بھی پیچھے نہیں رہا۔ اگر دنیاوی درسگاہوں سے نکل کر غیر مسلموں نے آزادی وطن کے لیے جیل خانوں کو بھرا، تو دینی مدارس کے طلبار کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔

احرار رہنماؤں کے کندھوں پر یہ بوجھ اس لیے بھی آن پڑا کہ جون ۱۹۳۰ء کو حکومت نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ اس کے بعد نئے کارکن آگے بڑھے۔ جیسے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی گرفتاری کے بعد احرار رہنما چودھری افضل حق کو آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا اور انہوں نے دہلی میں اپنی گرفتاری سے پیشتر تک سارے ملک کی تحریک سول نافرمانی کو کنٹرول کیا۔ اور آخر کو مولانا سید عطاء اللہ بخاری دیناج پور (بنگال) سے گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانہ سے۔ شیخ حسام الدین امرتسر سے۔ مولانا مظہر علی اظہر بٹالہ اور مولانا محمد داؤد غزنوی لاہور سے پابند سلاسل کیے گئے۔

تشدد کی صدائے بازگشت

عدم تشدد کی اس لڑائی کے ساتھ ساتھ پنجاب اور سرحد میں تشدد کے اکثر واقعات ہوئے۔ پشاور کے بعد کوہاٹ اور مردان میں بھی انگریزی فوج نے نہتے پٹھانوں پر بے دریغ گولیاں برسائیں۔ اس تشدد نے پٹھان نوجوانوں کو غیرت دلائی اور وہ اپنی روایات کے مطابق بندوق لے کر نکل آئے اور جہاں انگریز کو دیکھتے گولی کا نشانہ بنا دیتے۔ اگر قاتل گرفتار ہو جاتا تو وہ عدالت میں صرف اس قدر بیان دیتا۔

"میں نے انگریز کو بطور ثواب کے مارا ہے۔ میں غازی ہوں۔"

فقط اسی بیان پر ملزم کو سزائے موت کا حکم ہوتا اور اس مختصر سماعت کے بعد فوراً پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ چنانچہ ان دنوں غازی حبیب نور نے مسٹر ہارنس مجسٹریٹ درجہ اول چارسدہ کی عدالت میں داخل ہو کر اپنی گولی کا نشانہ بنایا۔ وہ اسی وقت گرفتار کر لیا گیا۔ تین گھنٹے کی عدالتی کاروائی کے بعد حبیب نور کو جن کی عمر پچیس سال تھی، پشاور سنٹرل جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ اس طرح غازی عبدالرشید کو

تین گھنٹے کی عدالتی سماعت کے بعد تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

کئی ایک پٹھان نوجوانوں کو تشدد کے ذریعے قوت مردمی سے محروم کر دیا گیا۔

پنجاب میں ان دنوں نوجوان بھارت سبھا کے رہنما سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی راج گرو اور مسٹر بی۔ کے۔ دت (بنگالی) پر پولیس کے ڈپٹی۔ آئی۔ جی مسٹر سانڈرس کے قتل اور سنٹرل اسمبلی میں بم پھینکنے کے جرم میں مقدمہ چل رہا تھا۔ اس مقدمہ نے بھگت سنگھ کو نوجوانوں کا ہیرو بنا دیا تھا۔ ان کا عوام میں چرچا تھا۔ پولیس ان مجرموں کو جیل سے سماعت مقدمہ کے دوران ہتھکڑیاں لگا کر عدالت میں پیش کرنا چاہتی تھی۔ ملزم اس سے انکاری ہوئے۔ اس پر پولیس اور ملزموں کے درمیان رسہ کشی ہوئی اور یہ جھگڑا ایک الگ مقدمہ کی صورت اختیار کر گیا۔ اور آخر کو یہ مقدمہ تین ججوں کے سامنے پیش ہوا۔ ان میں ایک جج آغا حیدر علی تھے۔ جنہوں نے اس مقدمہ میں ملزموں کے مؤقف کو درست قرار دیا لیکن حکومت نے اس رائے سے اختلاف کیا اور جب ۷۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو اس اہم مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا تو آغا حیدر علی کو ان کی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

قریباً نو ماہ کی مسلسل کاروائی کے بعد بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کو سانڈرس کے قتل کے جرم میں سزائے موت ہوئی اور سنٹرل اسمبلی میں بم پھینکنے کے جرم میں سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھ مسٹر بی۔ کے دت کو بیس بیس سال قید سخت کی سزائیں سنائی گئیں۔

اس مقدمہ کے فیصلے نے جلتی آگ پر تیل چھڑک دیا جس کے باعث کانگریس کی تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ انگریزی سامراج کا سورج غروب ہوتا نظر آنے لگا۔

پہلی گول میز کانفرنس

نیند سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اقتدار کے ساتھ حسن تدبر آپ سے آپ نکھرتا چلا جاتا ہے۔ خرد کے تمام گوشے وا ہو جاتے ہیں اس آفتاب کی کرنیں پھر انسانیت کو بھی محیط کر لیتی ہیں۔ دیوانوں کو صحراؤں سے ہی داد نہیں ملتی محلات سے بھی مبارکباد کی صدائیں اٹھنے لگتی ہیں۔ اور شاہوں کے تاج ایسے اچھلتے ہیں کہ گداؤں تک کے پاؤں بھی انہیں اماں نہیں دیتے۔ تشدد اور عدم تشدد کے ملے جلے جذبات سے ہندوستان نے اپنی آزادی کے لیے جو لڑائی چھیڑ رکھی تھی، برطانوی سیاستدان اس لڑائی سے ایسے بوکھلائے کہ ایوان افرنگ میں قہقہے

مارنے والے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر سوچ میں ڈوب گئے۔

۳۱۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو وائسرائے ہند لارڈ اردن نے اپنے بیان میں جس گول میز کانفرنس کا اشارہ کیا تھا متحدہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں جب یونین جیک کی اڑانیں سرنگوں نظر آئیں تو ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو اس کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا۔

انگریزوں کو یقین تھا کہ اقوام ہند کا منتشر شیرازہ حکومت سے ٹکرانے کی قوت نہیں رکھتا لہٰذا اکتوبر ۱۹۲۹ء کے وعدے کو وہ اس خوبصورتی سے ٹالتا رہا کہ "باغبان بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی"۔ لیکن سال رواں کے حالات نے مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان کے دروازے پر صلح کی دستک دے کر کہے کہ آؤ مل بیٹھ کر کوئی بات طے کر لیں۔

شہیدوں کے خون اور جیل خانوں کے مصائب نے قربانی و ایثار میں اس درجہ جلا پیدا کی کہ فرنگی سیاستدانوں کی آنکھیں اپنے ظلم و تشدد پر شرم محسوس کرنے لگیں۔

گول میز کانفرنس کے شروع میں ہی برطانوی حکمت عملی کے باعث یہ کانفرنس ہندو مسلم بحث کا اکھاڑہ بن گئی۔ چونکہ مسلمانوں نے سر آغا خاں کو اپنا نمائندہ منتخب کر لیا تھا لہٰذا مسٹر محمد علی جناح اس کانفرنس میں شمولیت کے باوجود الگ تھلگ رہے۔ نیز انہوں نے مسلم مطالبات کی تمام تر وکالت سر محمد شفیع کے سپرد کر دی۔

کانگریس اس کانفرنس میں شریک نہیں تھی۔ اور نہ ہی کوئی دوسری سیاسی جماعت اس کانفرنس میں مدعو تھی۔ اگر ایسا ممکن بھی ہوتا تو ان دنوں کے سیاسی حالات کسی ہندوستانی کو برطانوی دعوت پر انگلستان جانے کی اجازت ہی نہیں دیتے تھے کیونکہ برطانوی حکمرانوں کی پالیسی سراسر فریب پر مبنی تھی۔ ایک طرف وہ ہندوستان کے رہنماؤں کو بلوا کر ان سے امن پسندی اور صلح کی [illegible] تھے تو دوسری طرف لندن کے اخبارات واشگاف الفاظ میں اس کے برعکس لکھ رہے تھے۔

> "ہمیں صاف طور پر اس بات کو واضح کر دینا چاہیے کہ انگریز ہندوستان میں بحالی صحت کے لیے مقیم نہیں ہیں بلکہ ان کا مقصد روپیہ پیدا کرنا ہے۔ لہٰذا ہم ہندوستان کو کسی صورت میں نہیں چھوڑ سکتے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا ہمارے مفاد اور مصلحت کے سراسر خلاف ہے۔ ہندوستان رہ کر اپنا مقصد حاصل کرنا ہمارا فرض ہے۔" (سنڈے ٹائمز آف لندن ۲۵ مارچ ۱۹۳۱ء)

اسی طرح انگلستان کے ہوم سیکرٹری سر ولیم جوائس ہکس کہتے ہیں۔

"ہم نے ہندوستان کو ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے فتح نہیں کیا اور نہ ہی ہم ہندوستان میں ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے ہیں۔" (روزنامہ "تیج" دہلی۔ ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء)

لیکن ان کے برعکس گول میز کانفرنس کے دوران لیبر پارٹی کے برطانوی وزیر اعظم کا رویہ کانگریس کے ہمنوا رہا۔ پارلیمنٹ کے دوسرے ارکان بھی وزیر اعظم کی زبان میں بولتے رہے۔

"ہندوستان میں فرقہ وارانہ انتخاب کا اصول برطانیہ کی جمہوری روایات کے منافی اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔"

ہندوستان میں نیشلزم اور مطالبہ آزادی کی اصل ترجمان کانگریس ہے۔ ہندوستان کا اصل مسئلہ برطانوی حکومت اور کانگریس کے درمیان ہے۔"

خود وزیر اعظم مسٹر رمزے میکڈانلڈ بڑے محتاط طریق سے گفتگو کرتے اور بار بار کہتے،

"آپ ملک کے مجموعی مفاد اور آزادی کے مقاصد کو پیش نظر رکھیں اور فرقہ وارانہ مطالبہ کو طول نہ دیں۔"

حالات کو اس رخ پر دیکھتے ہوئے میاں سر فضل حسین نے مسلم نمائندوں کو جن میں ڈاکٹر شفاعت احمد قابل ذکر ہیں۔ انگلستان متعدد خطوط لکھے جن میں وزیر اعظم کے اس جانبدارانہ رویئے کا اکثر گلہ کیا ؎

ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد
وہ بھی کم بخت تیرے چاہنے والا نکلا!

برطانوی حکومت کی اس منافقانہ پالیسی کو دیکھتے ہوئے گول میز کانفرنس کے ایک اجلاس میں مولانا محمد علی جوہر نے کہا۔

"مائی لارڈ! تقسیم کرو اور حکومت کرو کا دستور آج دنیا میں عام ہے مگر ہندوستان میں ہم تقسیم ہوتے ہیں اور آپ حکومت کرتے ہیں۔ لیکن آج میں لندن میں یہ فیصلہ کرنے آیا ہوں کہ آپ میرے ملک میں اور کتنے دن قیام کریں گے۔

میں اپنے وطن کی آزادی کا پروانہ لینے یہاں آیا ہوں۔ میں اس کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، یا پھر میری لاش یہاں سے اٹھے گی۔"

آزادی نہ تو گفتار سے حاصل ہوتی ہے۔ اور نہ ہی گفتار سے اس کی ضمانت لی جا سکتی ہے۔ پھر انگریز ایسے حکمران سے جس کے کردار اور گفتار دونوں میں تضاد پایا جا رہا ہو۔ انگریز نے مولانا محمد علی جوہر کی تقریر کو محض جذبات کے آلات سے سنا لیکن یہ خیال نہ کیا کہ ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

پاکستان کی طرف

جب قومیں آپس کا اعتماد کھو بیٹھتی ہیں تو جس طرح شیشے میں دراڑ اس کی رعنائی ضائع کر دیتی ہے اسی طرح قوموں کا وقار بھی مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہندوستان کی دو بڑی قومیں جو اپنے اپنے کلچر میں منفرد حیثیت کی مالک تھیں، لیکن دیوار بہ دیوار رہتے ہوئے انہیں صدیاں بیت گئی تھیں، طرزِ تمدن کی علیحدگی کے باوجود زندگی کی شاہراہ پر اس طرح گامزن تھیں کہ ان کے خون کی حرارت ان کے سانس سے ہم آہنگ سنائی دیتی تھی ــــ رشتے ناطوں کے وقت میل جول میں اس قدر قرابت داری تھی کہ "ما و تو" کا احساس اٹھ گیا تھا لیکن غلامی کی منحوس گھڑی ایسی آئی کہ غیر ملکی اقتدار کے سائے جیسے جیسے آگے بڑھتے رہے۔ کشتِ محبت ویران ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ یہی لکیر نفرت کی سرحدوں تک آن پہنچی۔

حکمران قوم کے طرزِ معاشرت، طرزِ تمدن اور طرزِ تکلم نے تہذیبِ کہنہ کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے۔ صدیوں کے ملاپ میں ایسا زہر گھولا کہ اس زہر کے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے بادلوں نے متحدہ ہندوستان کے سارے رسم و رواج اپنی تہذیب کے سانچے میں ڈھال لیے۔ پھر ہندوستان۔ ہندوستان نہ رہا اور نہ ہندوستانی رہے۔ بلکہ برِ اعظم ہندو اور مسلمانوں کا ملک کہلانے لگا۔ پرائی تہذیب نے غلاموں کے کلچر کو مسخ کر کے اس پر اپنی چھاپ لگا دی۔ غلاموں کی زبان پر اپنا طرزِ تکلم رائج کر دیا۔ لباس کی کتر بیونت میں ایسی تبدیلی کی کہ نام بھی ہندوستانی نہ رہے۔ غرض تہذیبِ نو کے طلوعِ آفتاب سے ایسی روشنی پھیلی کہ ہر طرف اندھیر گردی چھا گئی۔ غلامی کے لیل و نہار میں پرورش پا کر جوان ہونے والی نسل نے اپنے گرد و پیش ایسے کانٹے بوئے کہ گلوں کے چہرے ہی داغدار نہیں ہوئے صحنِ چمن کی رونقیں بھی اپنا حسن کھو بیٹھیں۔

۱۹۴۰ء کا سال جن واقعات کو اپنے ساتھ لایا ان کی کڑیوں نے ایسا جال بُنا کہ برِ صغیر کا

ماضی، حال سے گذر کر جب مستقبل کی طرف بڑھنے لگا تو اس کے پاؤں ناہموار راہوں میں الجھ کر رہ گئے۔

ہمسایہ قوم پرائے اقتدار میں عافیت تلاش کرنے لگی۔ اس کے قافلوں نے گنگا جمنا پر پڑاؤ کرنے کی بجائے انگلستان کے شاہی ایوانوں کو اپنا سہارا قرار دیا۔ جس کے نتائج میں انہیں مسلمان آزادیٔ وطن کے لیے اپنے ایثار کے باوجود اچھوت نظر آنے لگا۔ یہی جذبات تھے کہ مسلمان گول میز کانفرنس سے مایوس ہو کر اپنا راستہ تلاش کرنے لگا۔

۲۹۔ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنے طویل خطبہ صدارت میں مسلمان کے لیے الگ وطن کی نشاندہی کی۔

"میں چاہتا ہوں کہ پنجاب، صوبہ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک الگ سٹیٹ بنا دی جائے، جو برٹش سلطنت کے اندر خود اختیار ہو۔ اس کے باہر ایک آزاد مملکت ہو۔" جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیہ کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانانِ ہندوستان کو اپنی روایات و تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو اپنے وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ یہ اصول کہ ہر فرد اور ہر جماعت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ ترقی کرے، کسی تنگ نظر فرقہ داری پر مبنی نہیں۔

فرقہ داری کی بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ وہ فرقہ داری جو دوسری قوموں سے نفرت اور ان کی بدخواہی کی تعلیم دے اس کے ذلیل اور ادنیٰ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ دوسری قوموں کے رسوم و قوانین اور ان کے معاشرتی اور مذہبی ادارات کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ بلکہ بحیثیت مسلمان میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو احکامِ قرآنی کے حسبِ اقتضا میں ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کروں۔

بایں ہمہ، مجھے اس جماعت سے دلی محبت ہے جو میرے اوضاع و اطوار اور میری زندگی کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین، اپنے ادب، اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی۔

یہ اسی کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سر نو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرم ہے"۔

نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی فرقہ واری کے اسی پہلو کا اعتراف کیا ہے"۔

علیحدگی سندھ کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"یہ کہنا کہ قومیت کے وسیع نقطۂ نگاہ کے ماتحت کسی فرقہ وارانہ صوبے کا قیام مناسب نہیں بالکل ایسا ہے، جیسے یہ دعویٰ کہ بین الاقوامی نصب العین کا تقاضہ ہے کہ علیحدہ علیحدہ قوموں کا وجود قائم نہ رہے۔

ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے لیکن بین الاقوامی نصب العین کے گرم سے گرم حامیوں کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی پوری آزادی کے بغیر کسی بین الاقوامی ریاست کا وجود قائم کرنا مشکل ہے۔ اس طرح مکمل تمدنی آزادی کے بغیر ایک ہم آہنگ اور متوازن قوم کا پیدا کرنا ناممکن ہے۔ ("حرف اقبال" ص ۲۸-۲۹)

سنہ ۱۹۳۱

۱۹۳۰ء کا سورج اپنی شام کی آخری صف لپیٹ کر جب شفق کی وادیوں میں کھو گیا تو آسمانوں نے نئے سال کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنی قندیلیں اس انداز سے روشن کیں کہ آسمان پر خونِ ناحق کے چھینٹے دکھائی نہ دیں، وہ داغ ابھر کر روشن نہ ہو جائیں جو برطانوی سامراج کے دامن کو اخلاق اور اصول کی دنیا میں ہمیشہ تار تار کرتے رہیں گے۔ رات کے اندھیروں نے ۱۹۳۱ء کے طلوع ہونے سے پیشتر آسمانوں سے ٹوٹتے ہوئے آوارہ ستاروں سے ایسی سرگوشیاں کیں کہ حقیقت افسانے کے دامن میں منہ چھپا کر رہ گئی۔ بایں ہمہ دوشِ سحر پر جب ۱۹۳۱ء کا سال طلوع ہوا تو وہ داغ لالہ زار کے چہرے پر بہر طور ہویدہ تھے۔ حالانکہ شبنم رات بھر اسی ردوکد میں رہی کہ لالہ زار کے داغ کلیوں کے خون سے دھو دیے جائیں لیکن نسیم صبحگاہی گواہ ہے کہ شبنم اپنی اس کوشش ناتمام میں بالآخر پانی پانی ہو کر رہ گئی۔ اور ۱۹۳۱ء جب طلوع ہوا تو جلیانوالہ باغ سے قصہ خوانی بازار تک کے شہیدوں کے خونِ ناحق سے اس کا چہرہ داغدار تھا۔

کانگریس کی سول نافرمانی اور انگلستان میں گول میز کانفرنس کے اجلاس ہنوز جاری تھے کہ ۴۔ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی جوہر کا لندن میں انتقال ہو گیا۔ آزادی وطن اور ملتِ اسلامیہ کا

حقیقی ہی خواہ جدوجہد زندگی کے طویل سفر سے فارغ اور اپنی ذمہ داریوں سے باحسن عہدہ برا ہوکر مالکِ حقیقی سے جا ملا۔ ع خدا بخشے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں!

مولانا محمد علی جوہرؒ ۱۸۷۸ء کو ریاست رامپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی گھریلو تعلیم کے علاوہ علی گڑھ اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ انگلستان سے واپسی پر نواب رامپور کے ہاں ملازم رہے۔ پھر ریاست بڑودھا چلے گئے۔ وہاں سے اکتائے تو ۱۹۰۷ء میں کلکتہ آکر انگریزی کا ہفت روزہ "کامریڈ" جاری کیا۔ اس کے ساتھ ہی دہلی سے روزنامہ "ہمدرد" بھی نکال لیا۔ دونوں کی ادارت خود سنبھالی لیکن اس تجربہ میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ پھر مقدونیہ سے "ہماری مدد کر" نامی ماہنامہ جاری کیا۔ یہ رسالہ ۱۹۱۴ء میں ضبط کر لیا گیا۔

پہلی جنگ عظیم کے شروع میں مولانا محمد علی جوہرؒ کو نظر بند کر دیا گیا۔ اور وہ ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے تو سیدھے امرتسر کانگریس کے سالانہ اجلاس میں پہنچے اور پہلی تقریر میں کہا۔

"میں جیل سے واپسی ٹکٹ لے کر آیا ہوں"۔

۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی کا ایک وفد ان کی راہنمائی میں انگلستان گیا۔ واپسی پر آل انڈیا نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور خلافت کانفرنس ۱۱۔ جولائی ۱۹۲۱ء منعقدہ کراچی میں صدر کی حیثیت سے مولانا حسین احمد مدنیؒ کی قرارداد کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"انگریز کی فوج میں بھرتی ہو کر مسلمان کے لیے فوجی خدمات انجام دینا جائز نہیں ہے"۔

اس پر ستمبر ۱۹۲۱ء میں مدراس کے قریب والٹر کے مقام پر مولانا جوہر دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔ اس مقدمہ میں مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور شنکر اچاریہ بھی شامل تھے۔ اس تاریخی مقدمہ میں مولانا جوہر نے عدالت کے روبرو کہا۔

"کئی ماہ ہوئے ہندوستان کے بڑے بڑے علمائے اسلام نے ترکِ موالات کی مذہبی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے صاف طور پر اعلان کر دیا تھا کہ حکومت کی قانون ساز کونسلوں میں شرکت کرنا، اس کی عدالتوں میں وکالت کرنا، سرکاری مدرسوں میں تعلیم پانا، حکومت کے خطابات حاصل کرنا، اس کی نوکری کرنا خواہ وہ فوجی ہو یا سول سب ناجائز ہیں۔ علما کے اس فتوے کے بعد اگر ہم نے کراچی کانفرنس میں خطاب پانے والوں کو نشانہ

جنہوں نے اپنی عزت بیچ کر یہ خطابات خریدے ہیں تو ہمارے خلاف یہ سازش کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ ہم نے خطاب یافتوں کے خلاف سازش کی ہے۔

- "میں نے عیدگاہ کی تقریر میں کہا تھا تم لوگوں کے دلوں میں موجودہ نظام سلطنت کے خلاف بے اطمینانی اور نفرت کے جذبات ہونے چاہییں سے مجھے اس نظام سلطنت سے نفرت ہے۔"
- "میں نے جو کچھ کہا ہے یہ حکومت کو یقین دلانے کے لیے نہیں ہے بلکہ خدا کو یقین دلانے اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے۔ یعنی وہ خدا جس کو ہم اپنا بادشاہ سمجھتے ہیں اور اسی حیثیت سے اس کی اطاعت کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"
- "وبس! اسی قدر مجھے کہنا تھا۔ اب اگر حکومت یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ کن شرائط کی بنا پر وہ ہندوستان کے ساتھ اپنے تعلقات استوار رکھ سکتی ہے تو میرا صرف ایک جواب ہے اور وہ یہ کہ حکومت کو اپنے خیالات و جذبات بدلنے کی ضرورت ہے اور اس کیلئے ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی مطالبات پورے کیے جائیں۔ پنجاب کے معاملے میں انصاف کیا جائے۔ اور ہندوستان میں ایک ایسی حکومت قائم ہو جو صرف خدائی قوانین اور عوام کی رائے کی پابند ہو۔ مجھے یقین ہے کہ برطانوی حکومت کا اس میں کوئی نقصان نہیں۔ لیکن حکومت اگر اپنی ضد پر قائم رہی تو مجھے پوری امید ہے کہ اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو بڑی بڑی سلطنتوں کا زمانہ قدیم میں ہو چکا ہے۔"

گاندھی ارون پیکٹ

مولانا محمد علی جوہر کی موت کے ساتھ ہی گول میز کانفرنس نے بھی دم توڑ دیا۔ چنانچہ ۱۹۔ جنوری ۱۹۳۱ء کو وزیر اعظم برطانیہ مسٹر رمزے میکڈونلڈ نے اعلان کیا۔

"ہندوستان کے موجودہ سیاسی اور ہنگامی حالات کے پیش نظر گول میز کانفرنس کی کارروائی کو نہ تو آگے بڑھایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے ختم کرنے کا اعلان کیا جا سکتا ہے لہٰذا ان لوگوں کو بھی اس میں شمولیت کی دعوت دی جائے گی جنہوں نے اس اجلاس سے عدم تعاون کی وجہ سے شرکت نہ کی۔"

اس اعلان کے فوراً بعد ۲۶۔ جنوری کو مہاتما گاندھی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ارکان کو جیل خانوں سے رہا کر دیا گیا۔

حکومت کی پالیسی کے پیشِ نظر ۲۵۔ جنوری کو وائسرائے ہند لارڈ اروِن نے اپنے ایک پریس نوٹ میں وزیرِ اعظم کے اعلان کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"میری حکومت صوبجاتی حکومتوں کے مشورہ سے اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ وزیرِ اعظم کے ۱۹۔ جنوری ۱۹۳۱ء کے کیے گئے اعلان پر اچھی طرح غور کرنے کے لیے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ارکان کو آزاد کر دیا جائے۔

اس فیصلے کے مطابق ان کی کمیٹی کی میٹنگ جو قانون ترمیم ضابطہ فوجداری کے تحت خلافِ قانون جماعت قرار دی جا چکی ہے، کرنے کیلئے اس پر سے تمام صوبجاتی حکومتیں پابندیاں دور کر دیں گی اور مہاتما گاندھی دوسرے احباب کی، جو جنوری ۱۹۳۰ء سے کمیٹی کے ممبر رہے ہیں، رہائی عمل میں آ جائے گی۔

ان تمام احباب کی رہائی غیر مشروط ہو گی۔ کیونکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ صلح کی گفت و شنید اور امن و امان کی گفتگو، غیر مشروط آزادی کی صورت ہی میں اچھی طرح کامیاب ہو سکتی ہے۔

حکومت ہند کی یہ کاروائی وزیرِ اعظم کے اعلان کے مطابق اس پالیسی کی مظہر ہے کہ ہم ہندوستان میں پر امن صورتحال پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ اس اعلان کے مطابق جن لوگوں کی رہائی عمل میں آئے گی وہ بھی اسی سپرٹ کا اظہار کرتے ہوئے اس معاملے کی اہمیت پر خاطر خواہ توجہ دیں گے۔

رہائی کے بعد مہاتما گاندھی نے اپنے ایک طویل بیان میں کہا۔

"غیر ملکی کپڑے پر پابندی اور نمک بنانے کے حقوق کو کسی صورت میں بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ شراب کے خلاف جہاد یا بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ، صرف موجودہ حکومت کے خلاف نہیں کیے جا رہے ہے بلکہ یہ ہندوستان کے دائمی مفاد کیلئے بھی یہ اہم اور ضروری ہے۔

میں امن اور صلح کے لیے بیتاب ہوں بشرطیکہ وہ عزت سے حاصل ہوں۔ اور

اس امن اور صلح کو ہرگز ہرگز منظور نہیں کروں گا، جس میں ان کے تین سوالات کو پورا نہ کیا جائے گا۔ اور میں گول میز کانفرنس کے درخت کو بھی اس کے پھل سے پہچان لوں گا۔"

ان اعلانات کے بعد گول میز کانفرنس کے تمام ارکان لندن سے واپس آگئے۔ لیکن مسٹر محمد علی جناح مسلمان ممبروں کی اس حرکت کے خلاف بطور احتجاج لندن ہی رہے کہ انہوں نے میری موجودگی میں سر آغا خاں کو گول میز کانفرنس میں اپنا لیڈر کیوں منتخب کیا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ پہلی گول میز کانفرنس میں مسٹر محمد علی جناح اس کی تمام کاروائی سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ان دنوں وہ سنٹرل اسمبلی کے ممبر تھے (پھر ان کی جگہ سر ابراہیم رحمت اللہ کو سنٹرل اسمبلی کا ممبر منتخب کیا گیا)

برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستان کی لڑائی جس تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ برطانوی حکمران پیشتر ازیں اس جذبہ سے غافل تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ہندو مسلمان کی باہمی آویزش اس حد تک آگ پکڑ چکی ہے کہ اب ان شعلوں کا رخ برطانوی ایوان کی طرف مڑنا مشکل ہے۔ لیکن غلام آزادی وطن کی لڑائی میں اپنا اثاثۂ حیات اٹھائے اس تیزی سے دوڑے کہ راستے کی ہر چیز مات کھا گئی۔ فرنگی حکمران بھی آہنی زنجیروں اور آتشیں اسلحہ سے آگے دار و رسن تک کی آزمائش میں ہندوستان کو ڈالنے کا عزم لے کر اپنے وقار کی حفاظت کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ لیکن آزادئ وطن کے جذبات نے ان تمام ارادوں کو شکست دے دی۔ اور ۵۔ مارچ ۱۹۳۱ء کو ہندوستان میں برطانوی نمائندوں مسٹر لارڈ ارون نے مہاتما گاندھی سے صلح کر لی۔

—— "یہی صلح سیاسی تاریخ میں گاندھی ارون پیکٹ کہلاتی ہے۔"

اس پیکٹ کے نتیجے میں ملک بھر کے تمام سیاسی قیدی جو نمک ستیہ تحریک میں گرفتار ہوئے تھے یا جنہیں سزائیں ہوئی تھیں، رہا کر دیے گئے لیکن مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو جو آگے چل کر آل انڈیا مجلس احرار کے پہلے صدر منتخب ہوئے، رہا نہیں کیا گیا۔ ۵۔ مئی ۱۹۳۱ء کو دہلی سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے مولانا حبیب الرحمٰن کو جو ان دنوں گجرات جیل میں میعاد اسیری گزار رہے تھے حسب ذیل خط لکھا۔

"میں آپ کی طرف سے نہ تو غافل تھا اور نہ ہی لاپروا بلکہ کماحقہٗ سعی رہائی کی گئی اور پھر

مایوس ہو کر اپنے اور آپ کے جذبۂ خودداری پر بھروسہ کر لیا۔ ہوم ممبر اور دیگر ذمہ داروں سے جا کر تبادلۂ خیالات اکثر اوقات رہا۔ لیکن گورنمنٹ پنجاب کی رپورٹ پر کہ آپ کی تقریر تشدد آمیز ہوتی ہے۔ بدیں وجہ ہمارے لیے فوراً سوال خودداری پیدا ہو گیا۔ اب امید ہے کہ آپ قریباً دو ہفتوں کی قید پوری کر کے بخیریت وطن واپس آئیں گے۔

فقط آپ کا مخلص، مختار احمد انصاری"

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی پر الزام تھا کہ انہوں نے لاہور آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس میں تقریر کے دوران وائسرائے پر بم مارنے والوں کی حمایت کی تھی۔

نمک ستیہ گرہ میں گرفتار ہونے والوں کی تعداد نوے ہزار ہے۔ جبکہ پولیس تشدد سے مرنے والوں کی تعداد تین ہزار ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق مختلف صوبوں سے گرفتار ہونے والوں میں مسلمانوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

پنجاب سے پانچ ہزار، یوپی سے دس ہزار، بہار سے تین ہزار، بنگال سے چار ہزار، آسام سے تین ہزار، بمبئی سے تین ہزار، سی پی سے ڈیڑھ ہزار، سندھ سے تین ہزار، مدراس سے ایک ہزار، اڑیسہ سے ایک ہزار، صوبہ سرحد سے دس ہزار ——— کل تعداد ساڑھے چوالیس ہزار۔

سردار بھگت سنگھ کو پھانسی

سیاست ایک ایسی دیوی ہے جس کی جنم پتری میں حصولِ مقاصد کے لیے رعائت کی کہیں گنجائش نہیں۔ اس کے قدموں میں باپ ہو کر بیٹا، دونوں کا خون جائز ہے۔ اس وادی میں ہلکا سا ارتعاش بھی حریف کو اپنی گرفت مضبوط کرنے کا موقعہ دیتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کو غیر ملکی طاقت سے نجات دلانے کے لیے دو نظریے آمنے سامنے اکھڑے ہوئے۔ تشدد اور عدم تشدد ان نظریات کی کشمکش نے سیاسیات کے میدان میں ایک دوسرے کو مات دینے کی فکر میں غیر ملکی غلامی کی گرہ ایسی مضبوط کی کہ جب کبھی اس گرہ کشائی کا وقت آیا تو یہی دونوں فریق حریف بن کر اپنے اپنے مقاصد میں مات کھا گئے۔

۵۔ مارچ کو جب کانگریس کا نمائندہ وائسرائے ہند سے صلح کی بات چیت کر رہا تھا تو سارے ملک کی نگاہیں منتظر تھیں کہ مہاتما گاندھی لارڈ اِروِن سے بھگت سنگھ اور اس کے دوسرے ساتھیوں

کی رہائی سے متعلق بھی کہیں گے۔ لیکن جب وہ وائسریگل لاج سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں صرف کانگرسیوں کی رہائی کا پروانہ تھا۔

صلح کی میز پر اگرچہ تشدد کے قیدیوں کی بات بھی چلی کہ ان کی سزائے موت کو عبور دریائے شور میں تبدیل کر دیا جائے جس پر وائسرائے نے گاندھی کو صرف اس قدر کہا کہ اس کے متعلق میں پنجاب گورنمنٹ سے مشورہ کے بعد کچھ کہہ سکتا ہوں۔

مہاتما گاندھی نے جب یہ رپورٹ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں رکھی تو ان دنوں ڈاکٹر ستیہ پال پنجاب کانگریس کی طرف سے ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ انہوں نے اس گفتگو سے یہ اندازہ لگا لیا کہ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی سزائے موت قید میں تبدیل کر دی جائے گی۔

یہ بات ورکنگ کمیٹی کے اندر کی بات تھی اسے عام نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن ڈاکٹر ستیہ پال نے یہ بات دوسرے دن لاہوری دروازہ کے جلسہ عام میں کہہ دی کہ "اب سردار بھگت سنگھ کو کوئی پھانسی نہیں دے سکتا، مہاتما جی نے یہ بات وائسرائے سے منوا لی ہے۔"

یہ فقرہ سننا تھا کہ اسی شام پنجاب پولیس نے اپنے استعفے گورنر کے حوالے کر دیے۔ کیونکہ بھگت سنگھ پر پولیس آفیسر کے قتل کا الزام تھا اور اسے پولیس نے اپنے وقار کا سوال بنا لیا تھا۔

ڈاکٹر ستیہ پال یہ بات اگر عوام میں نہ کہتے تو ممکن تھا کہ وائسرائے پنجاب گورنر سے کوئی بہتر فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور ان نوجوانوں کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل ہو جاتی لیکن ذمہ دار لیڈر کی غیر ذمہ دار حرکت نے تین نوجوانوں کی جانیں ضائع کر دیں۔

پنجاب پولیس کے تیور دیکھ کر حکام نے ۲۳۔ مارچ ۱۹۳۱ء کو دن کے پانچ بجے لاہور سنٹرل جیل میں بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی دے دی۔

بھگت سنگھ کی برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت برصغیر کی تاریخ آزادی میں ایک زریں باب ہے۔ جس نے سارے ملک خصوصاً پنجاب کو غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف اس قدر مشتعل کیا جس کا اثر دیر پا رہا اور بالآخر حکمرانوں کو یہ ملک چھوڑنا پڑا۔

بھگت سنگھ موضع بنگا ضلع لائلپور کے ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس کے تقریباً سبھی افراد تحریک آزادی میں سرگرم رکن تھے۔ بھگت سنگھ کی پیدائش کے دن اس کے چچا سردار جیت سنگھ

مانڈلے سے چھ ماہ کی نظر بندی کی مدت گذار کر گھر پہنچے تھے۔ اسی روز بھگت سنگھ کے والد کی ضمانت ہوئی تھی۔ وہ متعدد مقدمات میں مفرور تھے اور نیپال سے گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اسی دن ان کے دوسرے چچا کی ضمانت ہوئی جنہیں سیاسی بلوے کے الزام میں ڈیڑھ برس کی سزا ہو چکی تھی۔ اس خاندان نے بجا طور سے اس بچے کی پیدائش کو خاندان کی خوش قسمتی پر محمول کیا۔ اور اس کا پہلا نام ہی بھاگانوالا رکھا گیا جسے بعد میں بھگت سنگھ بنا لیا گیا۔

بھگت سنگھ کا خاندان سیاسیات کا گہوارہ تھا۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی جلیانوالہ باغ اور عدم تعاون کی تحریک کے زمانے کے خونی واقعات سے اثر قبول کیا۔ ۱۹۲۱ء میں اس نے سکول چھوڑا اور نیشنل کالج میں تعلیم پانا شروع کی۔ ۱۹۲۴ء میں بھگت سنگھ نے اپنے گاؤں کے لوگوں میں ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔ جس پر حکومت پنجاب نے انہیں گرفتار کر لیا۔ ۱۹۲۷ء میں انہیں لاہور میں دسہرہ بم کیس کے سلسلہ میں گرفتار کر کے لاہور شاہی قلعہ میں رکھا گیا۔ وہاں سے رہائی کے بعد اس نے نوجوان بھارت سبھا بنائی اور انقلابی پارٹی قائم کی۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کی آمد پر لاہور میں جو مظاہرے ہوئے پولیس نے ان مظاہرین پر لاٹھی چارج کیا۔ جس میں زخمی ہو کر لاجپت رائے انتقال کر گیا۔ اس قتل کا بدلہ لینے کے لیے بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے انگریز پولیس کپتان سٹر سانڈرس کو لاہور یونیورسٹی گراؤنڈ کے برابر، ۲۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کو ہلاک کر دیا اور خود غائب ہو گئے۔ اس کے بعد ان پر دہلی کے اسمبلی ہال میں بم پھینکنے کا مقدمہ قائم کیا گیا اور حکومت نے ملزم کی حاضری اور وکیل یا گواہ کے بغیر مقدمہ چلانا شروع کر دیا۔

لاہور سازش کیس قریباً نو ماہ چلتا رہا۔ انگریز حاکموں کو اپنی عدالتوں پر بھی بھروسہ نہ رہا چنانچہ اس دوران ججوں کی فہرست میں کئی بار ردوبدل کیا گیا۔ بالآخر بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو سزائے موت سنا دی گئی۔

بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے جیل خانوں میں اصلاحات کے سلسلے میں بھی متعدد بار بھوک ہڑتالیں کیں۔ انہوں نے بڑی جرأت اور دلیری سے انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے پھانسی کے پھندے خود اپنی گردنوں میں ڈالے۔

بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی عوام میں مقبولیت سے خائف ہو کر جیل حکام نے ان کی

لاشیں جیل کی عقبی دیوار توڑ کر باہر نکالیں کیونکہ انہیں سیدھے راستے سے لاشیں نکالنے پر ہنگامہ کا خطرہ تھا۔
ان شہیدانِ وطن کی لاشیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے فیروزپور دریائے ستلج میں بہا دی گئیں۔
ان دنوں مولانا ظفر علی خاں کی یہ نظم بہت مقبول ہوئی۔

شہیدانِ وطن کے خونِ ناحق کا جو ست نکلے
تو اس کے ذرّے ذرّے سے بھگت سنگھ [illegible]ت نکلے

چڑھا ایران میں منصور انا الحق کہہ کے سولی پر
مزا جب ہے کہ تارِ ہند سے ایسی ہی گت نکلے

مسلمانوں نے کتنے نوجواں اب تک کیے پیدا
جو آزادی کے گہوارے میں پا کر تربیت نکلے

خدا حافظ مسلمانوں کے اقبال اور دولت کا
خدا کے شیر بھی نکلے تو شیرِ آغا صفت نکلے

حقوقِ مسلمین کے کچھ محافظ چل دیے لندن
مگر وہ بھی پرستارانِ کیشِ آشتیت نکلے

نثار اس رندِ عالم سوز پر سو جان سے محفل
کہ جس کوچے میں جا نکلے حریفِ مصلحت نکلے

رسول اللہ کا ہم گاڑ دیں جھنڈا ہمالہ پر
ہمارے بازوؤں میں گر یدِ الٰہی سکت نکلے (بہارستان ص ۳۲۳)

اس کھلے اور عظیم ظلم کی صدائے بازگشت لاہور سنٹرل جیل کی چار دیواری سے باہر سارے ہندوستان میں سنی گئی۔ سارا ملک انگریز اور کانگریس کے رویے پر ناراض ہو گیا۔ اس سے پیشتر ۱۹۔فروری ۱۹۳۱ء کو شمالی مغربی صوبہ سرحد کے ایک نوجوان حبیب نور کو جو مہمند قبیلہ سے تھا، اس جرم میں پھانسی دی جا چکی تھی کہ اس نے ایک انگریز افسر مسٹر کیپٹن بارنس پر دو فائر کیے جو خالی گئے۔ لیکن بارنس کے اردلیوں نے حبیب نور کو گرفتار کر کے اسی روز سیشن جج کے سامنے پیش کر دیا۔
حبیب نور نے اپنے جرم کا اقبال کرتے ہوئے کہا،

میرے باپ اور چچا کو انگریزوں نے مار دیا تھا۔ میں نے ان کا انتقام لینے کیلئے یہ کارروائی کی ہے"۔
اس پر عدالت نے حبیب نور کو ریگولیشن ۴ مجریہ ۱۹۰۱ء کی دفعہ ۲ کے تحت اسی دن پھانسی کا حکم دے دیا اور اگلے دن صبح پشاور سنٹرل جیل میں اس نوجوان کو پھانسی دے دی گئی۔
ان واقعات نے حالات کو اس قدر بگاڑ دیا کہ حکومت اور کانگریس دونوں کا وقار بری طرح مجروح ہوا۔

بہا دینا کسی کی راکھ کو ستلج کی موجوں میں!
کسی کی لاش اٹک کے پار خاک و خوں میں تڑپانا

زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے
کہ اپنی ہی رعایا سے پڑا ہو جس کو ٹکرانا (مولانا ظفر علیخاں)

کراچی کانگریس کا اجلاس

پشاور سے بمبئی اور کراچی تک سارا ملک سوگوار تھا۔ نوجوانوں کے غم میں دل اور آنکھیں آنسو بہا رہے تھے۔ ہندوستان میں سائمن کمشن کی آمد پر ہڑتال کے بعد یہ دوسری ہڑتال تھی جس میں ہندوستان کا ہر فرد لطور انسان شامل ہوا۔ مسلمان بھی اسی قدر غم زدہ تھے جس قدر کہ غیر مسلم۔ لیکن انہی دنوں کانپور میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ جس نے ہندوستان کی فضا کو ازسر نو گدلا کر دیا۔ کانپور میں مسلمانوں کا خون کیا گیا کہ سیاسی فضا پر مصیبت کے پہاڑ آگرے۔ کانپور کے مسلمانوں کے خون نے چلتی گاڑی کے پہیوں کو پھر سے جام کر دیا۔
انہی دنوں کراچی میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مہاتما گاندھی دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے سوچ رہے تھے۔ لیکن ان کے پاس ایسی کوئی دستاویز نہیں تھی جس سے انہیں ہندوستان کا نمائندہ تسلیم کر لیا جائے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۳۱ء کے دم توڑتے دنوں کراچی میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ یہ اجلاس ان تین ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔
۱۔ نوجوانوں نے کانگریس سے بھگت سنگھ اور دوسرے پھانسی پانے والے شہیدوں کے خون کا حساب مانگا۔ اس لیے انہوں نے پہل یہاں سے کی کہ جب گاندھی جی کانگریس کے پنڈال میں داخل ہونے لگے تو انہیں کالے گلاب کے پھول پیش کیے گئے۔ نیز اجلاس کے دوران کارروائی میں کئی دفعہ رکاوٹیں ڈالیں اور لیڈروں پر آوازے کسے گئے۔ جس سے کانگریس کی تمام کارروائی متاثر ہوئی۔ ان نوجوانوں کی رہنمائی سوشلسٹ رہنما منشی احمد دین کر رہے تھے۔

۲۔ اجلاس کے دوران مولانا ظفر علیخاں نے نماز عصر کے لیے کانگریس کا اجلاس ملتوی کرنے کی تحریک پیش کی، جنہیں ان الفاظ کا سہارا لے کر ٹال دیا گیا۔

"اگر آج نماز کے لیے اجلاس ملتوی کر دیا گیا تو کل ہندو پرارتھنا کے لیے کہیں گے اور اس طرح ملک کا کام انہی جھگڑوں میں اُلجھ کر رہ جائے گا۔ لہٰذا جس کسی کو نماز کے لیے جانا ہو وہ آپ سے آپ اٹھ کر چلا جائے اجلاس ملتوی نہیں کیا جائے گا۔"

اس اعلان سے کانگریس کے اندر مسلمانوں کا وہ گروہ جو ہندو ذہنیت سے پہلے ہی پریشان تھا اجلاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

۳۔ دوسری گول میز کانفرنس میں اگر گاندھی جی بطور کانگریس نمائندہ کے شامل ہوں تو کس بنیاد پر۔ جبکہ نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کر دینے کے بعد اقلیتوں کے حقوق کے لیے ان کے پاس کوئی بنیادی فارمولا نہیں۔ یہ سوال پیشتر کے جھگڑوں سے اہم اور بنیادی تھا۔

کانگریس آخر اس نتیجے پر پہنچی کہ اس نے مسلم آل پارٹیز کانفرنس دہلی منعقدہ ۲۰۔ مارچ ۱۹۲۷ کی منظور کردہ قراردادوں میں سے تین چھوڑ کر حسب ذیل منظور کریں۔ اور اپنی تجویز کو حسب ذیل طریق پر منظور کیا۔

۱۔ اقلیتوں کو تمام بنیادی حقوق حاصل ہوں گے۔

۲۔ اقلیتوں کے مذہبی قوانین کا تحفظ ہو گا۔

۳۔ ان کے مختلف صوبجات میں سیاسی اور دوسرے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

۴۔ ہر بالغ کے لیے ووٹ کا حق ہو گا۔

۵۔ طریقہ انتخاب مخلوط ہو گا۔

۶۔ ان اقلیتوں کا جو کسی صوبے میں پچیس فیصدی سے کم ہوں مناسب تعداد میں حق نمائندگی دی جائے اور ان کو دوسری نشستوں سے کھڑے ہونے کا حق بھی حاصل ہو۔

۷۔ ملازمتوں میں پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ جو کسی پارٹی سے متعلق نہ ہو، انتخاب۔"

۸۔ صوبائی اور فیڈرل گورنمنٹ میں اقلیتوں کے حقوق تسلیم کیے جائیں۔

۹۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات جاری کی جائیں۔

۱۰۔ سندھ کو بمبئی کے صوبہ سے الگ کر کے ایک الگ صوبہ بنایا جائے۔ بشرطیکہ وہ اس کی مالی ذمہ داریاں اٹھائے۔

مسلم کانفرنس کے جو تین مطالبات رد کر دیے گئے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریتوں کا تحفظ

۲۔ مرکز میں مسلمانوں کی نمائندگی۔

۳۔ تمام متنازعہ تجاویز یا بل جو مجالس قانون ساز میں پیش ہوں۔ ان پر اگر کسی قوم کی ۳/۴ اکثریت مخالف ہو تو اس پر بحث نہ ہو۔

اس اثنا میں لارڈ اردن کی جگہ ۱۷ اپریل ۱۹۳۱ء کو لارڈ ولنگڈن ہندوستان کا وائسرائے ہو کر آ چکا تھا۔ نئے وائسرائے نے چارج سنبھالتے ہی اپنے پیشرو کے وعدے پس پشت ڈال دیے اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں آزادی پسند عوام پر تشدد شروع ہوا۔ جسے انگریزوں کی بدعہدی سے تعبیر کیا گیا۔

لکھنؤ قرارداد

کراچی کانگریس کی قرارداد کے باوجود گاندھی جی کے ہاتھ مضبوط نہیں تھے۔ اور اس آڑے وقت میں پھر مسلمانوں نے ان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے اپریل ۱۹۳۱ء کے وسط میں لکھنؤ میں سر علی امام کی صدارت میں حریت پسند مسلمانوں کا ایک اجلاس کیا۔ جس میں حسب ذیل قرارداد پاس ہوئی۔

• آئندہ دستور اساسی میں بنیادی حقوق کا اعلان ہو جانا چاہیے۔ تہذیب، زبان اور شخصی قانون وغیرہ کے تحفظ کی ضمانت ہونی چاہیے۔

نیز فیصلہ کیا گیا کہ سرکاری عہدوں پر پبلک سروس کمیشن کے ذریعے تقرر ہوا کرے جس میں قابلیت کا معیار کم سے کم ہو اور کوئی اقلیت عہدوں سے محروم نہ رہنے پائے۔

نیز یہ کہ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔ شمال مغربی سرحد اور بلوچستان میں بھی حکومت کا وہی طریق رائج کیا جائے جو دوسرے صوبوں میں رائج ہے اور یہ کہ بالغ مرد و عورت کو حق رائے دہندگی حاصل ہو۔ انتخابات مشترک ہوں اور آبادی کی بنا پر ان اقلیتوں کیلئے، جن کی آبادی تیس فیصدی سے کم ہو نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔ نیز ان کو حق حاصل ہو

کہ وہ مزید نشستیں حاصل کرنے کی جدوجہد کر سکیں۔

نہرو رپورٹ کے بعد مسلمانوں کی یہ دوسری سعی تھی جس میں فرقہ وارانہ تصفیہ کی کوشش کی گئی تھی۔ اس قرارداد نے کانگریس کے نمائندہ گاندھی جی کے ہاتھ مضبوط کر دیے۔ ہندوستان کے نیشلسٹ مسلمانوں نے گاندھی جی کے راستے کی تمام آئینی رکاوٹیں دور کر دیں۔ جس کا صلہ یہ ملا کہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری جن کا نام دوسری گول میز کانفرنس کے لیے خود لارڈ ارون نے تجویز کیا تھا لارڈ ولنگڈن نے انہیں نظر انداز کر دیا اور گاندھی جی نے بھی اس پر کوئی احتجاج نہ کیا۔

تقسیم پنجاب

سر علی امام کی صدارت میں منظور کردہ قرارداد کے خلاف ۱۱ مئی ۱۹۳۱ء کو پنجاب، سندھ اور سرحد کے ہندوؤں کا ایک مشترک اجتماع لاہور ڈی۔ اے۔ وی کالج کے ہال میں ہوا جس میں بھائی پرمانند، راجہ نریندر ناتھ، پنڈت نیکی رام شرما، ڈاکٹر مونجے، لالہ چنیت رام شامل ہوئے۔ اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ اگر مسلمان فرقہ وارانہ فیصلے سے مطمئن نہ ہوں تو پنجاب کو اس طرح تقسیم کر دیا جائے۔

"ملتان اور راولپنڈی کو سرحد سے ملا دیا جائے۔ انبالہ اور کانگڑہ کا الحاق میرٹھ سے کر دیا جائے۔ باقی پنجاب کو ایک علیحدہ صوبہ قرار دیا جائے۔"

دوسری قرارداد میں کہا گیا،

"ہندو مسلم تصفیہ کے لیے لیگ آف نیشنز کو جج مقرر کیا جائے۔"

مہاراجہ پٹیالہ کا وزیر برطانیہ کو تار

اس سے پیشتر، اپریل ۱۹۳۱ء کو مہاراجہ پٹیالہ نے سکھوں کی طرف سے وزیر اعظم برطانیہ کو ایک تار کے ذریعے متنبہ کیا،

"اگر پنجاب میں سکھوں کو چوبیس فیصد حقوق نہ دیے گئے تو وہ خون کی ندیاں بہا دیں گے۔"

پنجاب، سرحد، سندھ کے ہندوؤں اور سکھوں نے مندرجہ بالا دھمکیاں ایسے وقت میں دیں جب گاندھی جی انگریزی میز پر بیٹھ کر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے لندن جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ایسے وقت میں ہندوؤں کا یہ فیصلہ گاندھی جی کی پشت میں چھرا گھونپ دینے کے مترادف تھا۔ ان قراردادوں کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ جون ۱۹۳۱ء کے شروع میں بنارس، کانپور اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہندو مسلمان کے درمیان فرقہ وارانہ تصادم ہوئے۔

نیشلسٹ مسلمان ہندوستان کی سیاسی تحریکات میں جہاں اور بہت سی اصطلاحات رائج ہوئیں وہاں نیشلسٹ مسلمان کا لفظ اس قدر عام ہوا کہ ۱۹۴۷ء تک یہ لفظ بطور محاورہ کے استعمال ہوتا رہا۔

نیشن "NATION" انگریزی کا لفظ ہے جس کے معنی قوم کے ہیں۔ اسی لفظ کی آمیزش سے نیشلسٹ کا اردو میں استعمال شروع ہوا۔ یعنی "قوم پرست" اور یہ لفظ ان مسلمانوں پر استعمال کیا گیا جو ہندوستان کی آزادی کے لیے کانگریس کے ہمنوا ہو کر غیر ملکی حکمرانوں سے نبرد آزما رہے۔ گو یہ محاورہ ان کے لیے موزوں نہیں تھا کیونکہ وہ قوم کی پرستش نہیں کرتے تھے بلکہ قوم کے نجات دہندہ تھے۔ وہ قوم کو مانتے ضرور تھے لیکن پرستش اپنے رب کی کرتے تھے۔ تاہم اس عام محاورے کا اطلاق انہی لوگوں پر رہا۔

۱۹۳۱ء کے وسط تک ہندوستان کے سیاسی حالات جب اس نہج پر پہنچے کہ ملکی سیاسیات میں واحد نمائندگی کی دعویدار کانگریس نے ہندوستان کی غالب اقلیت (مسلمان) قوم کے سیاسی اور مذہبی حقوق سے بہر طور پہلوتہی شروع کی تو ان مسلمانوں کا ماتھا ٹھنکا جو سالہا سال سے کانگریس کو پولیٹیکل جماعت کی حیثیت سے جانتے اور مانتے چلے آرہے تھے۔ نیز ہر اس محاذ پر بطور ہراول دستے کے رہے جہاں آزادی وطن کے لیے لڑائی لڑی گئی ہے جیل خانوں سے پھانسی کے تختے تک کوئی موڑ ایسا نہیں آیا۔ جہاں مسلمانوں کا خون ہندو کے برابر نہ گرا ہو۔ لیکن جب اس خون میں نکھار کا وقت آیا، جب قربانیاں رنگ لانے لگیں، جب حقوق کے بٹوارے کا دن آن پہنچا تو وہ ہاتھ جن کے ہاتھ میں ترازو تھا۔ کانپنے لگے اور ان کی ڈنڈی مارنے کی عادت نے انہیں ایسا مجبور کیا کہ قربانی و ایثار کی دوڑ میں برابر ہی نہیں بلکہ میلوں آگے دوڑنے والا مسلمان ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اور اس کے احساس نے ایک نئی کروٹ لی۔ وہ اپنے شہیدوں کے خون کی تلاش میں کفن بردوش ہو کر زندگی کی نئی راہیں تلاش کرنے نکل کھڑا ہوا۔

دوسری طرف برطانوی وزیر اعظم مسٹر رمزے میکڈونلڈ کی حیثیت واضح نہیں تھی۔ وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی ناکامی بجائے اپنے ہندوستان پر ڈالنا چاہتا تھا۔ ہندو مسلمان سمجھوتے کی آڑ میں برطانوی پالیسی اپنا استحکام چاہتی تھی۔ گو سر علی امام کی صدارت میں مسلمانوں نے گاندھی کے ہاتھ مضبوط کر دیے تھے۔ تاہم نیشلسٹ مسلمانوں کا ایک خیال گروہ جنہوں نے آگے چل کر مجلس احرار کی بنیاد رکھی، سر علی امام کی صدارت میں مرتبہ قرارداد کی اس شق کے خلاف تھے کہ ہندوستان میں انتخاب مخلوط ہو۔ کیونکہ نہرو رپورٹ

ایسی کامیاب تجویز کی ناکامی کے بعد کسی دوسری تجویز پر ہندو کا مسلمان کے حق میں ہم آہنگ ہونا مسلمان کے لیے ایک نیا فریب تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن کی رہائی

گاندھی ارون سمجھوتے کے بعد جو لوگ جیلوں میں رہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ان میں سرفہرست ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن کانگریس ستیہ گرہ کی تحریک میں گرفتار ہوئے تھے لیکن انگریز اور کانگریس کے اتحاد نے مولانا حبیب الرحمٰن کو ان قیدیوں میں شمار کرنا گناہ سمجھا جو ان دونوں کے نزدیک قابلِ التفات تھے۔ تاہم مولانا اپنی میعادِ اسیری ختم کر کے مئی ۱۹۳۱ء کے آخر میں گجرات جیل سے رہا کر دیے گئے۔

چودھری افضل حق جنہیں ۱۹۳۱ء میں کانگریس کمیٹی کے خلاف قانون ہونے پر مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی گرفتاری کے بعد آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا تھا اور وہ خلاف قانون ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شمولیت کے باعث گرفتار ہوئے تھے۔ جب رہا ہو کر کراچی کانگریس کے اجلاس میں شامل ہوئے تو کانگریس ہائی کمانڈ نے چودھری صاحب سے پوچھے بغیر مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا آزاد کے مشورے پر چودھری صاحب کی جگہ ڈاکٹر محمد عالم کو نئی ورکنگ کمیٹی میں لے لیا۔ اس واقعے سے کچھ دنوں بعد جون کے شروع میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے فرید آباد میں اپنی تقریر کے دوران بحیثیت صدر کانگریس سکھوں کو مخلوط انتخاب کے ذریعے نہرو رپورٹ سے زیادہ حقوق دے کر خوش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ڈاکٹر انصاری کی اس سیاسی رعایت سے پنجاب کے مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ کانگریس کی اس فرقہ وارانہ کوشش یا سیاسی رشوت کے باعث پنجاب کے نیشنلسٹ مسلمان دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئے۔

ڈاکٹر محمد عالم، مولانا عبدالقادر قصوری، میاں سراج احمد پراچہ، مولانا ظفر علیخان، مولانا محمد اسحاق مانسہروی، مولانا عبداللہ قصوری، ملک برکت علی ایڈووکیٹ، شیخ عبدالقادر بیرسٹر سیالکوٹ اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں نے مسلم نیشنلسٹ پارٹی بنالی اور فیصلہ کیا کہ وہ کانگریس کے ساتھ مل کر ملک کا کام کریں گے۔ یہ جلاس ۱۲ اپریل ۱۹۳۱ء کو دفتر ستیہ گرہ بیرون دہلی گیٹ، حجازی بلڈنگ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت ملک لال خاں نے کی۔

دوسرے گروہ نے ۵۔ جون ۱۹۳۱ء کو لاہور میں جمع ہو کر مجلس احرار السلام کے احیا کی از سر نو

تجویز کی۔ اس اجلاس کی صدارت حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کی۔ ان کے علاوہ جو دوسرے حضرات شامل ہوئے وہ حسب ذیل ہیں۔

شیخ حسام الدین، چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا داؤد غزنوی اور خواجہ عبدالرحمٰن غازی۔

(آخر الذکر اس اجلاس کے علاوہ پھر کبھی مجلس کے اجلاسوں میں نہیں دیکھے گئے)

اس اجلاس میں مندرجہ ذیل تجویز پاس کی گئی۔

"مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا کہ مسلمانان پنجاب اس تجویز پر متفق نہیں ہیں، جس سے انہیں مخلوط انتخاب کے لیے مجبور کیا جائے۔ ہمارے نزدیک چند کانگریسی مسلمانوں کے سوا کوئی مسلمان مخلوط انتخاب کا حامی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ تجویز پنجاب اور بنگال کی مسلمان آبادی کو جہاں کہ ان کی اکثریت ہے، اقلیت میں تبدیل کرنے کی ایک ناپاک کوشش ہے۔"

اس سے پیشتر پنجاب کانگریس سے مستعفی ہوتے وقت چودھری افضل حق نے حسب ذیل بیان پریس کو دیا۔

"چند روز ہوئے نیشلسٹ مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کی رکنیت سے میرے مستعفی ہونے کی خبر شائع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی استعفٰی کی مختصر وجوہات بھی شامل تھیں۔ ہندو اخبارات نے نہ معلوم میری اس کارروائی پر کیوں نکتہ چینی کی اور اسے حق بجانب قرار نہیں دیا۔ نیز مجھ سے متعدد سوالات بھی کیے گئے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس امید پر اپنی پوزیشن کی مزید وضاحت کر دوں تاکہ وہ لوگ جن کے دل تعصب سے خالی ہیں اور ٹھنڈے دل سے غور کر سکتے ہیں۔ میرے نقطۂ نگاہ سے آگاہ ہو کر میرے اور میرے ہم خیال اشخاص سے انصاف کریں۔

لکھنؤ کا فیصلہ

لکھنؤ میں مسلم نیشلسٹ کانفرنس نے جو قرارداد منظور کی تھی۔ اس کے لحاظ سے تمام اقلیتوں کے لیے جن کی آبادی تیس فیصدی سے کم ہو خواہ وہ پنجاب ہی میں کیوں نہ ہوں تناسب آبادی کے لحاظ سے نشستیں مخصوص کر دی گئی تھیں

اور اس کے علاوہ انہیں مزید نشستوں کے لیے مقابلے کا حق بھی دے دیا گیا تھا۔

پنجاب کا مطالبہ اور کانگریس کا نقطۂ نگاہ

مسلمانانِ پنجاب ہمیشہ سے آبادی کے تناسب سے نشستوں کے لیے مطالبہ کر رہے ہیں ان میں سے صرف قوم پرور طبقہ ہی نے اس مطالبے سے اس شرط پر دست بردار ہونے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا کہ تمام بالغوں کو رائے دہی کا حق حاصل ہو۔ اگرچہ کانگریس مسلمانانِ پنجاب کے لیے تناسب آبادی کی بنا پر نشستیں مخصوص کرنے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن وہ پنجاب کی اقلیتوں کے لیے بھی نشستیں محفوظ کرنے اور انہیں مزید نشستوں کیلیے مقابلہ کرنے کا حق دینے پر بھی رضامند نہیں تھی۔

اقلیتوں سے بے جا رعایت

نہرو رپورٹ اور اس کے حامیوں کا خیال بھی یہی تھا کہ پنجاب کی اقلیتیں بڑی زبردست اور مضبوط ہیں۔ اس لیے جب آبادی کے تناسب سے نشستیں دے کر وہاں کی اکثریت سے تحفظ نہیں کیا جاتا تو پھر اقلیتوں کو آبادی کے تناسب سے نشستیں اور مزید نشستوں کے لیے مقابلے کا حق عطا کر کے ان کی پوزیشن کو کیوں مضبوط بنایا جائے۔

پنجاب کی حالت

پنجاب کی حالت قابلِ غور ہے۔ کہ پنجاب میں ہندو کی آبادی تیس فیصدی ہے اس سے زیادہ نہیں۔ اس لیے قرارداد سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن ابھی تک نئی مردم شماری کے اعداد و شمار شائع نہیں ہوئے۔ اور غالباً ہندو تیس فیصدی سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ اگر اچھوتوں کو علیحدہ نیابت دی گئی تو پھر اونچی ذات کے ہندوؤں کے لیے کوئی موقعہ نہیں کہ وہ تیس فیصدی کی امید رکھ سکیں۔ اگر ہندو، سکھوں، اچھوتوں اور عیسائیوں وغیرہ سب کے لیے نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔ اور ساتھ ہی انہیں زائد نشستوں کے لیے مقابلے کا حق بھی دے دیا جائے تو کیا نتیجہ نکلے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ صرف مسلم نشستیں مقابلے کے لیے کھلی رہ جائیں گی اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ حلقہ ہائے انتخاب میں ایک عظیم جنگ شروع ہو جائے گی۔

اقلیتوں کا مشترک مفاد نہرو رپورٹ نے پنجاب کے متعلق جو حل پیش کیا تھا ہندو اور سکھ اس سے بھی مطمئن نہیں۔ انہوں نے یہ بھی الاعلان کہہ دیا ہے کہ وہ کسی ایسے دستور اساسی کو منظور نہیں کریں گے۔ جس میں مسلمانوں کی اکثریت کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صرف مسلمانوں سے برسرپیکار ہیں۔ اور انہوں نے اپنی خواہش کو کسی پردے میں نہیں رکھا۔ اگر اس حقیقت سے متعلق کوئی شک شبہ رہ گیا تھا تو پنجاب کی اقلیتوں کی کانفرنس نے اسے بھی دور کر دیا ہے۔

مسلمانوں کے خلاف جو جذبات پھیل رہے ہیں۔ اگر انہیں نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی مختلف اقلیتوں کا مشترک مفاد یہی ہے کہ مسلمانوں کی نشستوں پر قبضہ کیا جائے جو مسلمانوں کے خلاف اس کے اتحاد اور استحکام کو اور مضبوط کر دے گا۔

جداگانہ انتخاب بدرجہا بہتر ہیں اگر پنجاب کی اقلیتیں اکثریت کے پرخچے اڑانے کے لیے پیشتر ہی سے منصوبہ بازی کر رہی ہیں جن کی وجہ سے مسلمان اپنے تحفظ اور حقوق کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں تو دستور اساسی کی رو سے مخالفت اور معاندت کا ایک مستقل محاذ قائم کرنے کے لیے انہیں قوم پرستی کا کوئی امکان پیدا ہونے کی توقع نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً جبکہ فرقہ وارانہ جماعتوں کے علاوہ کسی قسم کی سیاسی پارٹیوں کے پیدا ہونے کا امکان بھی نہیں۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ایسے خطرناک فارمولوں کے ساتھ مخلوط انتخاب کی نسبت جداگانہ انتخاب بدرجہا بہتر ہیں۔

ہندو اور سکھ اس نظریے کے خلاف تھے کہ تمام قوموں کے لیے تناسب آبادی کی بنیاد پر نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔ اس تجویز کو قوم پرستی اور اصول جمہوریت کے خلاف بتایا جاتا تھا۔ اور اس کا باعث صرف یہی تھا کہ اس سے مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہو جاتی تھی۔ حالانکہ اس صورت میں انتخابات فرقہ وارانہ اصولوں پر نہ ہوتے لیکن لکھنؤ کے جدید فارمولہ کے حامی پنجاب کی اقلیت کے لیے نشستیں محفوظ کر لینے کے لیے تیار نہیں حالانکہ اس سے مسلم نشستوں کی اقلیت میں تبدیل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگرچہ

یہ بھی ظاہر ہے کہ فرقہ وارانہ نظریہ سے حلقہ ہائے انتخاب میں معاندانہ افتراق پیدا ہو جائے گا۔ لیکن یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قسم کا فارمولا نافذ کرنے سے حقیقی قوم پروری کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔

دوسرے صوبوں کی غلط مثال

بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ جب دوسرے صوبوں میں تناسب آبادی کی بنا پر نشستیں اور مزید نشستوں کے لیے مقابلے کا حق دیا جاتا ہے تو یہی اصول پنجاب پر بھی کیوں حاوی نہ کیا جائے لیکن پنجاب کی حالت دوسرے صوبوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں کی اکثریت کئی پہلوؤں سے کمزور ہے۔ اس کی تعداد میں بھی بہت خفیف زیادتی ہے۔ یہاں ہم اقلیتوں سے سیاسی اور معاشرتی تعلقات کی رو سے ایک ہیں۔ صوبہ یوپی، سی پی، مدراس اور دیگر صوبجات میں اقلیتوں کو محض اکثریت کی عنایت سے زائد نشستیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ حقیقت میں وہ اکثریت کے رحم پر ہوں گی۔ اور اس کا اتحاد حاصل کرنے کی کوشش کریں گے لیکن پنجاب میں دوسری حالت ہے۔ یہاں کی اقلیتیں مسلم اکثریت کو تباہ کرنے کا تہیہ کر چکی ہیں۔ انہوں نے اعلان جنگ کر دیا ہے اور خود میدان عمل میں اتر آئی ہیں۔ وہ اتحاد کی فضا پیدا کرنے کی کوئی پرواہ نہیں کرتیں۔

لہٰذا ایسا دستور اساسی منظور نہیں کیا جا سکتا جو فرقہ وارانہ فضا میں منافرت کا ذریعہ بن کر اسے تباہ و برباد کر دے۔

اعلان میں تاخیر

آخر میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے لکھنؤ میں بھی اس قرارداد کو منظور نہیں کیا تھا۔ وہاں بھی میں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ لیکن مجلس عاملہ کی رکنیت سے مستعفی ہونے سے پیشتر مجھے اپنے رفقائے کار سے مشورہ کرنا تھا اگر اس وجہ سے اعلان کرنے میں کوئی تاخیر ہو گئی ہے تو اس سے مجھ پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا۔

مجلس احرار السلام

۱۹۲۷ء سے اب تک کے اس پس منظر کے روزن سے جھانکنے والی نگاہیں اندازہ کر سکتی ہیں کہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمان کا کردار کس قدر بے داغ اور بے خطر رہا ہے۔ اس دوران کوئی موڑ ایسا آیا ہو کہ مسلمان سیاسی اعتبار سے آزادی وطن کی راہ میں رکاوٹ یا اس کے

کسی فیصلے نے ان دیواروں کو اونچا کیا ہو جن کی اوٹ میں فرنگی حکمرانوں نے ہندوستان کا مقدر لگاڑنے کا منصوبہ سوچا ہو تو بلاشبہ تاریخ کے صفحات انہیں مجرم قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن ماضی قریب کے سیاسی واقعات برادرانِ وطن کو کبھی معاف نہیں کر سکتے جنہوں نے اکثریت کے زعم میں ہندوستانی مسلمانوں سے ہمیشہ اچھوتوں کا سا برتاؤ کر کے انہیں اپنے سے اس قدر بیگانہ کر لیا کہ غیر ملکی قانون کو غلامی کے سلسلے بڑھانے میں دشواری نہیں ہوئی۔

یہ درست ہے کہ پولیٹیکل دوڑ میں قومیں کبھی معاف نہیں کرتیں اور کرنا بھی نہیں چاہیے لیکن غلامی سے آزادی کے سفر میں ہمسایہ قوموں سے لگاڑ نے منزل کو اس قدر دور کر دیا کہ جو راستے ۱۸۵۷ء کو ختم ہو جانے چاہییں تھے۔ ان کے لیے مزید ایک صدی انتظار کرنا پڑا۔ مؤرخ جب آزادی وطن کے غداروں کی فہرست تاریخ کے سپرد کرے گا تو اس میں مسلمانوں کے نام آئیں گے۔ اگر غداروں کی فہرست پر ہی انحصار کر لیا جائے تو شاید ہندو اور سکھ اس فہرست میں بھی نکلیں۔ تاہم یہ کوئی حجت نہیں۔ چمن میں پھول بھی ہوتے ہیں اور کانٹے بھی۔ سوال چمن کی بیخ کنی کا ہے۔ آیا یہ گناہ کانٹوں کے ذمہ ہے یا پھول اس کے مجرم ہیں ظاہر ہے کہ بہار تک پہنچنے کے لیے جن پھولوں کو خون جگر کی آبیاری سے اپنے کو لالہ رخ بنانا پڑتا ہے، وہ پھول کانٹوں سے زخمی تو ہوتے ہیں لیکن خزاں کی آمد ان کے ذمہ عائد نہیں کی جا سکتی۔

۱۸۰۷ء سے اب تک آزادی وطن کے لیے کالے پانی کا دروازہ کھلنے کی ابتدا کس پر ہوئی؟ دریائے گنگا و جمنا سے بیاس اور راوی کے پانی ۱۸۵۷ء میں کس کے خون سے سرخ ہو کر بہے؟ رسم ہائے دار و رسن کی تکمیل میں کس کے قدم آگے ہیں؟ جیل خانوں کی تاریک کوٹھڑیاں روشن کرنے میں کن کا خون زیادہ کام آیا؟ اگر سودا کرنا ہے تو اس فہرست کو سامنے رکھو نہ کہ وہ فہرست جو فرنگی حکمرانوں کی میز پر تیار ہو۔

تاریخ کے اس موڑ پر کانگریس سے ان کی گزشتہ بے وفائیوں سے عاجز آ کر علیحدگی کا فیصلہ احرار رہنماؤں کا اہم ترین فیصلہ ہے اور یہ فیصلہ ایسے وقت میں ہوا جب رجعت پسند مسلمان بھی انگریز کی میز پر مسلمان کے حقوق تلاش کر رہا تھا۔

۱۰ جولائی ۱۹۳۱ء کا دن برصغیر کی سیاسی تاریخ میں اہم ترین دن تھا۔ جب مولانا حبیب الرحمٰن پہلی پولیٹیکل احرار کانفرنس کی صدارت کے لیے لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ کانگریس اور انگریز دشمنی کے جذبات سے اہل لاہور نے اپنے رہنما کا استقبال کیا۔ گلیاں اور بازار اُجلے اور خوبصورت طریق پر سجائے گئے۔ عوام کے ہجوم میں

مولانا حبیب الرحمٰن کی کار کو کئی بار پھولوں سے خالی کرنا پڑا۔

۱۱۔جولائی (۱۹۳۱) کو مولانا حبیب الرحمٰن جب حبیبیہ ہال میں احرار کانفرنس کی صدارت کے لیے پہنچے تو احرار ورکنگ کمیٹی نے ان کا استقبال کیا۔ ابتدا میں تلاوتِ قرآن حکیم کے بعد خواجہ عبدالرحیم عاجز اور راقم نے اپنا اپنا کلام پڑھا۔ چودھری افضل حق نے مولانا حبیب الرحمٰن کی صدارت کی تحریک کی۔ جس کی تائید حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کی۔ اس کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن کرسی صدارت پر بیٹھے۔ مولانا مظہر علی اظہر نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا اور ان کے بعد کانفرنس کے منتخب صدر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اپنا صدارتی خطبہ دیا۔ اس اجلاس میں مولانا محمد علی جوہر (رحمۃ اللہ علیہ) کی تعزیتی قرارداد مولانا محمد داؤد غزنوی نے پیش کی۔ جس کی تائید میں احرار رہنماؤں نے تقریریں کیں۔

کانفرنس کے شب و روز چھ اجلاس ہوئے۔ جن میں احرار رہنماؤں نے ملکی حالات پر تقریریں کیں اور ۱۲۔ جولائی رات کے آخری اجلاس میں حسب ذیل قرارداد مولانا مظہر علی اظہر نے انگریزی اور اردو میں پیش کیں۔ جس کی تائید میں شیخ حسام الدین، چودھری افضل حق اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقاریر کیں۔

قرارداد

(الف) ہر گاہ کہ ان تجاویز دہلی کو جو ارچ ۱۹۲۷ء میں مختلف الخیال کے ذی اثر مسلمان رہنماؤں نے مرتب کیں اور جن کی رو سے تمام صوبجات میں تمام اقوام کے لیے مخلوط انتخاب کے طابع نشستیں مخصوص کرنے کی تجویز کی گئی تھی۔ پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں نے منظور نہیں کیا۔

(ب) ہر گاہ کہ مسئلہ پنجاب کے فیصلے کو جو نہرو رپورٹ کے تصفیہ کے مطابق ہندو، سکھ میثاق لکھنو ۱۹۲۸ء میں درج ہے اور جس کی رو سے نشستوں کی تخصیص کیے بغیر باشندوں کو حق رائے دہی اور مخلوط انتخاب کی سفارش کی گئی تھی سکھ قوم نے مسترد کر دیا اور جن سکھ رہنماؤں نے اس پر دستخط کیے تھے وہ بھی منحرف ہو گئے اور ہندوؤں نے کھلم کھلا ان کی حمایت کی ہے۔

(ج) ہر گاہ گاندھی جی نے خود بھی اس میثاق سے علیحدگی اختیار کر لی اور اعلان کیا کہ سکھوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ اور اس طرح وہ اس واحد فارمولا کی بنیاد کھا نے

میں آلہ کار بنے جس سے سمجھوتے کی بنیاد قائم ہونے کی توقع قائم ہو سکتی تھی۔

(د) ہرگاہ پنجاب کے ہندو اور سکھ مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ اور باعزت سلوک کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اور ان کا معاشری مقاطع کر کے مسلمانوں کے ساتھ اچھوتوں کا سا سلوک کرنے اور مشترک قومیت کے راستے میں روز افزوں مشکلات حائل کر رہے ہیں۔

(ہ) ہرگاہ، گاندھی جی نے مسلمانوں سے مشترک مطالبہ طلب کیا ہے جس کے بغیر وہ ہندو مسلم مسئلہ پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

(و) ہرگاہ، مسلمانوں کا اعتدال پسند اور قدامت پسند طبقہ جداگانہ انتخاب ترک کرنے کو تیار نہیں ہے۔

(ز) ہرگاہ، پنجاب کے ہندو اور سکھوں نے مخلوط انتخاب کے اس فارمولے کو منظور کرنے سے انکار کر دیا ہے جو پنجاب کے نیشنلسٹ مسلمان قبول کرنے کو تیار ہیں۔ اس لیے معاملات کو مزید توقف میں ڈالے رکھنا فضول ہے۔

۲۔ ہرگاہ، سکھوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر کوئی ایسا دستور منظور کیا گیا جس سے پنجاب کونسل میں مسلمانوں کے لیے اکثریت کا موقعہ نکل آئے تو ہم خون کی ندیاں بہا دیں گے اور ہرگاہ ہندو بھی تہ دل سے اور سنجیدگی کے ساتھ سکھوں کی اس دھمکی کی پشت پر کھڑے ہیں۔

اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ مسلمان اپنی حفاظت کرنے کے لیے متفق اور متحد ہو جائیں۔

۳۔ اور ہرگاہ، ہندو اور سکھ اس بات کے لیے تیار نہیں ہیں کہ مرکز یا کسی بڑے صوبے کے نظام حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف کیے جانے کا کوئی موقعہ بھی پیدا ہونے کی اجازت دیں۔

اس لیے موجودہ حالات کے اندر اس کانفرنس کی رائے میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب بدستور بحال رہنے چاہییں۔ اور جن صوبوں میں مسلم آبادی کو اکثریت حاصل ہے۔ ان مجالس قانون ساز میں انہیں لازمی طور پر اکثریت حاصل ہونی چاہیے۔ نیز مخلوط انتخاب کا نفاذ جو مشترک قومیت کا نتیجہ ہوتا ہے اس وقت تک معطل رکھا جائے جب تک ہندو اکثریت مسلمانوں کے خلاف معاندانہ رویہ ترک کر کے تمام ہندوستان کے طول و عرض میں زندگی کے ہر شعبے میں ہندوستانی اخوت، رواداری اور وسیع الخیالی کا عملی ثبوت بہم پہنچاتے ہوئے متحدہ

قومیت کے لیے خوشگوار فضا پیدا نہیں کرتی۔

دوسری قرارداد "دربار کشمیر کی طرف سے مسلم رعایا پر جو ناگفتہ بہ سختیاں کی جا رہی ہیں اور اس خطہ کے بے کس وفا شعار اور اطاعت گزار مسلمانوں کو ان کے مذہبی شعار سے روکنے کے لیے جو شرمناک رویہ اختیار کیا گیا ہے اس پر اظہار نفرت کرتے ہوئے مجلس احرار کا یہ اجلاس مہاراجہ سر ہری سنگھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ بیان کردہ واقعات کی آزادانہ تحقیقات کے لیے ذمہ دار جماعتوں کو ریاست میں حکومت کی طرف سے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ اور جن اہلکاروں کی بداعمالی کی وجہ سے مسلمان رعایا پر سختیاں کی جا رہی ہیں انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔"

تیسری قرارداد "مجلس احرار اسلام کا یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ جس طرح سکھوں کو کرپان رکھنے کی اجازت ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی امرتسر، لاہور، لائلپور، میانوالی، ملتان، شاہ پور وغیرہ اضلاع میں بلا لائسنس تلوار رکھنے کی اجازت دی جائے۔"

حبیبیہ ہال (جہاں احرار کی پہلی کانفرنس ہوئی)۔ غلامی کے ابتدائی دور میں مذہبی تعلیم سے ناآشنائی کی طرح مسلمان دنیاوی تعلیم سے بھی بیگانہ تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کھانے کے بعد مسلمان نے تعلیمی کمی کو شدت سے محسوس کیا اور اسی کے پیش نظر ۱۸۹۲ء میں لاہور اسلامیہ کالج کی بنیاد اندرون شیرانوالہ موجودہ اسلامیہ ہائی سکول کی عمارت میں رکھی گئی۔ آگے چل کر یہی کالج اپنی نئی عمارت ریلوے روڈ پر جس کی بنیاد ۱۹۰۰ء میں رکھی گئی تھی منتقل ہو گیا اور کالج کے لیے ہال کی تعمیر بھی اسی سال شروع ہوئی جس کی بنیادی اینٹ افغانستان کے شاہ حبیب اللہ نے رکھی تھی اور اسی نسبت سے اس کا نام حبیبیہ ہال رکھا گیا۔ اس کا طول ایک سو اور عرض باون فٹ کے قریب ہے۔ یہ ہال کالج کی موجودہ عمارت کے ساتھ ساتھ ۱۹۱۲ء میں مکمل ہوا۔

احرار ورکنگ کمیٹی مجلس احرار کا ابتدائی نظام چونکہ ہنوز پنجاب تک محدود تھا۔ لہٰذا ورکنگ کمیٹی کے لیے بھی اسی صوبے کے جن احباب کو منتخب کیا گیا ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ چودھری افضل حق۔ ضلع ہوشیارپور ۲۔ چودھری عبدالعزیز بیگھووال (ریاست کپورتھلہ) ۳۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانہ ۴۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ گجرات۔ ۵۔ شیخ حسام الدین امرتسر ۶۔ مولانا داؤد غزنوی امرتسر۔ ۷۔ مولانا مظہر علی اظہر۔ بٹالہ ضلع گورداسپور۔ ۸۔ خواجہ غلام محمد۔ لاہور۔ ۹۔ ماسٹر محمد شفیع۔ لاہور۔

تعارُف

احرار رہنماؤں کا

جن مردانِ حر نے تاریخ کے اہم ترین سیاسی موڑ پر متحدہ ہندوستان میں مسلمان قوم کی سیاسی اور مذہبی رہنمائی کی، نیز مجلسِ احرار کی عنانِ اقتدار جن لوگوں کے ہاتھ رہی ان سے واقفیت تاریخ کے مستقبل کے لیے نہایت ضروری ہے۔

چودھری افضل حق

۱۸۹۱ء کو ہوشیارپور تحصیل گڑھ شنکر میں راجپوتوں کے ایک معزز گھرانے چودھری امیر خاں کے گھر پیدا ہوئے۔ گھر کا ماحول دیندار تھا لہٰذا بچپنا میں نماز اور دین کے دوسرے امور سے کماحقہ آشنا اور ان کے پابند تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے سکول میں مکمل ہوئی۔ انٹرنس امرتسر میں کیا۔ جبکہ ان کا باقی خاندان بھی امرتسر منتقل ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۰ء کو لاہور اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۲ء میں چودھری صاحب ایف۔ اے میں فیل ہو گئے اور آئندہ سال دیال سنگھ میں داخل ہو گئے۔ اس کالج کے ایک عیسائی پروفیسر سے اسلام اور فلسفہ پر بحث شروع ہوئی جس نے اس قدر طول کھینچا کہ چودھری صاحب کی صحت اور تعلیم متاثر ہوئیں۔ انہی دنوں امرتسر میں ہیضے کی وبا پھوٹی۔ اور چودھری صاحب خدمت خلق کے جذبے سے اس بیماری کے دوران عوام کی خدمت کرتے رہے اور اس مرض نے انہیں بھی آلیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا کہ ان کی جان بچ گئی۔ لیکن کھانسی کی ابتدا یہیں سے شروع ہوئی۔ آخر کار تعلیم کا ارادہ ترک کر کے ۱۹۱۷ء میں پولیس میں سب انسپکٹر بھرتی ہو گئے۔ اور ابتدائی ٹریننگ کے لیے فلور بھیج دیے گئے۔ یہاں سے فارغ ہوئے تو انہیں لدھیانہ پولیس تھانہ میں لگا دیا۔

ان دنوں ہندوستان میں تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ چودھری صاحب بطور سب انسپکٹر پولیس سیاسی جلسوں کی رپورٹ لکھنے پر مامور تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ بخاری لدھیانہ میں تقریر کر رہے تھے اور چودھری صاحب حسب معمول ان کی تقریر کی ڈائری لکھ رہے تھے۔ شاہ جی نے تقریر کے دوران انگریزوں کے ترکوں پر مظالم اس انداز میں بیان کیے کہ چودھری صاحب پولیس سے مستعفی ہو کر خلافت کمیٹی میں شامل ہو گئے۔ یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے۔ نوکری سے فارغ ہو کر چودھری صاحب نے اپنے آبائی گاؤں گڑھ شنکر سے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔

ترکوں پر انگریزوں کے ظلم و تشدد کی داستانیں گاؤں گاؤں بیان کرتے اور عوام کو حکومت کیخلاف بغاوت پر ابھارتے۔ آخر گرفتار کر لیے گئے۔ اور ۱۶ فروری ۱۹۲۲ء کو زیر دفعہ ۱۱۷ چھ ماہ کی سزا ہوئی اور انہیں انبالہ جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان دنوں جیل خانوں میں سیاسی اور غیر سیاسی قیدیوں کے درمیان خوراک اور لباس میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ البتہ ٹیکس گزار یا گریجویٹ سیاسی قیدی کو سپیشل کلاس کی رعایت حاصل تھی۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں ان اقسام کے لوگ خال خال تھے۔ اور پھر انگریزوں سے لڑائی لڑنے کے لیے ان خوبیوں کے لوگ کب میدان میں آتے تھے۔ چودھری افضل حق نے جیل خانے میں غیر سیاسی قیدیوں پر سرکاری افسروں کا تشدد اور سیاسی قیدیوں میں امتیاز کا مطالبہ کرتے ہوئے جیل کے نظم و نسق کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس پر جیل خانے میں کافی ہنگامہ ہوا۔ جس کی تحقیقات کے لیے انسپکڑ جنرل جیل خانہ جات کے علاوہ پنجاب پولیس کے انگریز آئی۔ جی بھی انبالہ جیل پہنچے۔ جیل لار (۱۲۳۲) کے مطابق ایسے افسروں کی آمد پر قیدی ان کے احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی یہ دونوں ذمہ دار افسر چودھری صاحب کی کوٹھڑی کے سامنے پہنچے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کے حکم کے باوجود چودھری صاحب اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ آئی۔ جی پولیس نے چودھری صاحب کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اور غصے میں کہا

"پولیس کی نوکری چھوڑ کر انگریزوں سے حکومت چھیننے آئے ہو۔ اب اس کا مزا دیکھو"

چودھری صاحب کے اب دو جرم ہو گئے۔ اول جیل خانے میں غیر سیاسی قیدیوں کی حمایت اور سیاسی قیدیوں سے ترجیحی سلوک کا مطالبہ اور دوسرے جیل افسروں کی توہین۔ اس کے نتیجے میں چودھری صاحب کو تا سزا یعنی چھ ماہ تک پاؤں میں بیڑیاں اور ساتھ ہی کھڑی ہتھکڑی کی سزا دی گئی۔

چودھری صاحب کو صبح آٹھ بجے ان کی کوٹھڑی سے نکالا جاتا اور ایک درخت کے ساتھ دائیں ہاتھ کو ہتھکڑی لگا کر باندھ دیا جاتا اور شام چھ بجے تک چودھری صاحب اسی حالت میں کھڑے رہتے۔ یہ سزا انہیں ۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو ملی اور تا اختتام سزا مسلسل ہتھکڑی، بیڑیاں اور دایاں بازو اوپر اٹھائے کھڑے رہنے کے نتیجہ میں ان کا دایاں بازو بیکار ہو چکا تھا یہی وجہ تھی کہ چودھری صاحب بائیں ہاتھ سے لکھا کرتے تھے۔

جیل خانے کی دنیا میں یہ پہلی آواز تھی جو سیاسی اور غیر سیاسی قیدیوں کے حق میں بلند ہوئی۔
سزا ختم کر کے رہا ہوئے تو اپنے ضلع کی کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں چودھری صاحب پہلی بار اپنے ضلع سے پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اور یہ سلسلہ ۱۹۳۷ء تک رہا۔ اسی عرصہ میں قیدیوں کی اصلاح کے لیے سرکاری کمیٹی کے غیر سرکاری ممبر بھی رہے۔ اور پنجاب کے جیل خانوں کی اصلاح کی۔ نیز پنجاب اسمبلی میں سکھوں کی طرح مسلمانوں کے لیے تلوار اور کلہاڑی بلا لائسنس رکھنے کی اجازت حاصل کی اور اس کے لیے باقاعدہ قانون بنوایا۔

جب مسلم لیگ، جناح لیگ اور شفیع لیگ میں تقسیم ہوئی تو چودھری صاحب سر شفیع لیگ میں شامل ہو گئے۔

۱۹۳۰ء میں آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر نامزد ہوئے اور اسی حیثیت میں دہلی سے گرفتار کر لیے گئے۔ ۱۹۳۱ء کو رہا ہو کر باہر آئے تو کانگریس کی مسلم آزار پالیسی کے پیش نظر مجلس احرار کی بنیاد رکھی۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

پانچ دریاؤں کے بہتے پانیوں پہ آباد اور شاداب خطے کو پنجاب کہا گیا ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جس کے بہادر اور جیالے جوانوں نے میدانِ کارزار سے سیاست تک اپنی دانشمندی کے ایسے پھول بکھیرے ہیں کہ یورپ اور ایشیا ان کی مہک سے کبھی اپنا دامن تہی نہیں کر سکتے۔

دریائے بیاس اور ستلج کے مابین آبادی کو دوآبہ کہتے ہیں۔ لدھیانہ اسی جگہ واقع ہے۔ یہ شہر سیاسی اور مذہبی بیداری کے باعث تاریخ کا ایک اہم ترین شہر شمار کیا گیا ہے۔ اسی شہر میں مولانا حبیب الرحمٰن ۳۔ جولائی ۱۸۹۲ء کو مولانا محمد ذکریا کے ہاں پیدا ہوئے۔ خاندان چونکہ پیدائشی انگریزوں کا باغی تھا۔ لہٰذا مولانا حبیب الرحمٰن کی ابتدائی تربیت بھی اسی نہج پر ہوئی۔ دینی اور دنیوی تعلیم کی ابتدائی منزلوں کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن نے امرتسر مولانا نور احمد کی خدمت میں بیٹھ کر دین کی باقی کتابیں پڑھیں۔

تعلیم کا یہ سلسلہ ۱۹۱۴ء تک جاری رہا۔ اسی سال یورپ کی پہلی بڑی لڑائی شروع ہوئی اور ترکوں پر انگریزوں کے ظلم کی داستانیں اخبارات میں شائع ہونے لگیں۔ دوسرے اہلِ دل کی طرح

مولانا حبیب الرحمٰن بھی جنگ بلقان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور انہی دنوں لدھیانہ میں ایک تقریر کی۔ زندگی میں مولانا کی یہ پہلی تقریر تھی۔ جس نے شہری عوام کو ترکوں کا ہمدرد اور انگریزوں کا دشمن بنایا۔ یہ خبر جب مولانا محمد ذکریا تک پہنچی تو وہ مولانا حبیب الرحمٰن کو لے کر اسی صبح دیوبند روانہ ہو گئے۔ کیونکہ شہر میں مولانا کی گرفتاری کی افواہ عام تھی۔

ان دنوں مدرسہ دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اور شیخ الحدیث حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب تھے۔ انہوں نے اپنے ہونہار شاگرد کی تربیت اپنے خاص اہتمام میں کی۔

۱۹۱۹ء کے حادثہ جلیانوالہ باغ کے بعد جو لوگ نکھر کر سیاسی میدان میں آئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن ان لوگوں کی صفِ اول میں شمار ہوتے ہیں۔ مدرسہ دیوبند میں تعلیم کے دوران مولانا حبیب الرحمٰن اپنے استاد محترم اور شیخ الحدیث کی اجازت سے مولانا شبیر احمد عثمانی کی معیت میں سیاسی اجتماعات میں شرکت کرتے رہے۔ ان واقعات کی اطلاع جب ان کے والد کو ہوئی تو آپ دیوبند پہنچے مہتمم مدرسہ نے مولانا محمد ذکریا سے کہا "آپ کا بیٹا پھانسی کی سزا سے تو بچ رہے گا لیکن اسے جیل جانے سے نہیں روکا جا سکتا۔ لہٰذا اب انہیں سیاسی کام کرنے کی اجازت دے دیجئے"

اسی طرح مولانا حبیب الرحمٰن کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔

پہلی گرفتاری

دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں مسلم لیگ، کانگریس اور جمعیتہ العلمائے ہند کے مشترک جلاس ہوئے۔ اس میں مسلم لیگ نے جس کے صدر حکیم اجمل خان تھے۔ اعلان کیا کہ آئندہ مسلمان برادرانِ وطن کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے گائے ذبح نہیں کریں گے۔ اسی طرح کانگریس کے پنڈال سے باہر پانچوں نمازوں کا اہتمام ہندو اور سکھ والنٹیر کرتے تھے۔ اس انداز سے مذہبی عبادت گاہوں کا احترام بھی بڑھنے لگا۔ یہ شہیدان جلیانوالہ باغ کے خون کا اثر تھا کہ ان جذبات کی پالنا کرتے ہوئے قوموں نے کچھ وقت کے لیے اپنے فروعی مذہبی اصول اس حد تک نظر انداز کر دیئے کہ غیر ملکی سامراج کو اپنی موت دکھائی دینے لگی۔ آزادی وطن کے لیے باہم اشتراک اس حد تک بڑھا کہ انگریزوں کو اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ بلا کسی ہنگامی تحریک کے وائسرائے ہند نے اچانک ایک آرڈیننس جاری کیا کہ

"جو شخص خلافت، کانگریس یا جمعیتہ العلمائے ہند کا والنٹیر بنے گا اس کو چھ ماہ قید کی

سزا ہوگی اور جو والنٹیر بھرتی کرے گا اس کو تین سال قید کی سزا دی جائے گی"۔

حکومت کے اس اعلان نے کانگریس کے رہنما مہاتما گاندھی کو موقع دیا کہ اس نے سارے ملک میں اسی ایک بنیاد پر سول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔ یہ دسمبر ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے۔

اس تحریک کی ابتدا میں مولانا حبیب الرحمٰن کو والنٹیر بننے اور بنانے کے جرم میں ۲۲۔ دسمبر ۱۹۲۱ء کی صبح ان کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد چھ ماہ قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔

یہ سزا جون ۱۹۲۲ء میں ختم ہوئی اور جرمانہ باقی تھا کہ حکومت نے اس کی وصولی کے لیے مولانا حبیب الرحمٰن کے گھر کا تمام اثاثہ یہاں تک کہ بچوں کے معمولی زیور اور کپڑے تک اتروا کر سرعام نیلام کر کے جرمانہ وصول کر لیا۔

۸۔ جون ۱۹۲۲ء کو مولانا حبیب الرحمٰن کی رہائی کا دن تھا اور بظاہر انہیں اس غرض سے دھرم سالہ جیل سے لدھیانہ جیل میں منتقل کر دیا۔ اور اسی روز بجائے رہائی کے ایک دوسرے مقدمے کیلئے دفعہ ۱۰۸ کے تحت وارنٹ دکھلا کر پھر جیل میں رکھ لیا۔ کچھ دنوں بعد ایک سال قید کی مزید سزا کا حکم سنا دیا گیا اور ۲۰۔ اگست ۱۹۲۲ء کو پھر دھرم سالہ جیل میں پہنچا دیا۔ اور یہیں شیخ حسام الدین سے ان کی پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ یہ سزا ختم کر کے مولانا ۱۶۔ مئی ۱۹۲۳ء کو رہا ہوئے۔

آتے ہی آپ کو پنجاب خلافت کمیٹی کا ناظم اعلیٰ منتخب کر لیا گیا۔ ہندو مسلمان اتحاد کے صاف اور شفاف پانی کو گدلا کرنے کے لیے ۱۹۲۳ء میں محرم کے دنوں سب سے پہلا ہندو مسلم فساد ملتان میں کرایا گیا۔ یہی فرقہ وارانہ تحریک آگے بڑھی کہ سارا ہندوستان اس آگ میں جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ ان لوگوں کی قربانیاں موسم سرما کی چاندنی راتوں کی طرح ضائع ہو گئیں جنہوں نے وطن عزیز کو غیر ملکی اقتدار سے نجات کے لیے اپنے کو مصائب میں ڈالا تھا۔

۱۹۲۷ء کے وسط میں لاہور کے ایک ہندو ناشر راجپال نے ایک کتاب شائع کی جس میں خاتم الانبیا حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن اطہر پر ایسے گندے چھینٹے ڈالے کہ پنجاب کا مسلمان بے قرار ہو گیا۔ اس کے خلاف ۴، ۵۔ جولائی ۱۹۲۷ء کی درمیانی رات کو لاہور دہلی دروازہ سے باہر ایک اجتماع ہوا۔ جس میں مولانا حبیب الرحمٰن، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور

خواجہ عبدالرحمٰن غازی نے چودھری افضل حق کی صدارت میں تقریریں کیں۔ انہی تقریروں کے اثرات تھے کہ غازی علم الدین نے راجپال کو قتل کر دیا۔ ۱۰ جولائی کو مولانا حبیب الرحمٰن زیر دفعہ ۱۰۷ کے تحت لدھیانہ سے گرفتار کر لیے گئے۔ جبکہ ان کے رفقاء امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری غازی عبدالرحمٰن کو لاہور سے گرفتار کر لیا گیا۔

ہر سہ رہنماؤں کو ایک ایک سال کی سزا ہوئی۔ مولانا حبیب الرحمٰن کی یہ تیسری گرفتاری اور سزا یابی تھی۔

فرنگی سیاستدانوں نے ہندوستان کے باہمی اتحاد کی عمارت میں آگ لگا کر افغانستان کے شاہ غازی امان اللہ کو بھی اس کو اس جرأت کی سزا دینی چاہی کہ اس نے تحریک ہجرت کے موقعہ پر ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو اپنے ہاں پناہ کیوں دی۔ چنانچہ افغانستان کے چند نام نہاد مولویوں نے انگریزی سیاست کے پس منظر میں امان اللہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس موقعہ پر مولانا حبیب الرحمٰن پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جنہوں نے شاہ افغانستان کے حق میں آواز بلند کی اور صحافت میں ہندو اخبارات کے علاوہ مولانا ظفر علیخاں کے اخبار روزنامہ زمیندار نے ان کے بیان کو شائع کیا۔ پنجاب خلافت کمیٹی کے جنرل سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے مولانا کا یہ بیان مرکزی خلافت کمیٹی کو پسند نہ آیا۔ جبکہ مولانا شوکت علی نے بچہ سقہ کے حق میں فری پریس کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ،

"باغی افغانستان میں جو کچھ کر رہے ہیں۔ وہ اسلامی احکام کی عزت ہے اور مغربی تہذیب کے خلاف ایک شرعی جہاد ہے اور غازی امان اللہ کو ان کی بے دینی کی وجہ سے تخت سے علیحدہ کیا گیا ہے۔" (کتاب رئیس الاحرار ص۱۲۲)

مولانا شوکت علی کے اس بیان کے جواب میں مولانا حبیب الرحمٰن نے حسب ذیل فتویٰ علمائے ہندوستان کو بھیجا۔

محترم المکرم!

السلام علیکم

ذیل کے سوالات ارسال خدمت ہیں۔ حالات کا تقاضہ ہے کہ ان کا جواب جلد از جلد ملک میں شائع کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد مختصر و مدلل جواب

ارسال فرمائیں گے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت شاہ امان اللہ غازی پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے۔ اور باغیوں کی شرعی حیثیت سے امداد کی جا رہی ہے جس سے دشمنانِ اسلام فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطنت اسلام کو برباد کر رہے ہیں۔ (حبیب الرحمٰن لدھیانوی)

۱۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شاہ امان اللہ غازی والئی افغانستان نے جو اصلاحات اپنے ملک میں جاری کی تھیں کیا وہ ان کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا؟

۲۔ (ا) کیا ان اصلاحات کا اجرا شاہ امان اللہ کے خلاف بغاوت کی شرعاً اجازت دیتا ہے؟

(ب) جو جماعت ان اصلاحات کی بنا پر بغاوت کرنا چاہتی ہے اس قسم کی جماعت کی معاونت کرنا کسی مسلمان کے لیے شرعاً جائز ہے؟

۳۔ جو لوگ ان اصلاحات کے اجرا کی وجہ سے شاہ امان اللہ کو کافر کہتے ہیں کیا وہ حق پر ہیں؟

۴۔ جبکہ دشمنانِ اسلام مختلف ذرائع سے سلطنت افغانستان کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں شاہ امان اللہ کی امداد کرنا ہر مسلمان پر شرعاً فرض نہیں ہے؟

آپس کے ان اختلافی بیانات کے نتیجے میں مرکزی خلافت کمیٹی کے آفس سیکرٹری مولانا محمد عرفان نے ۷ جولائی ۱۹۲۹ء کو ایک خط کے ذریعے اطلاع دی کہ پنجاب خلافت کمیٹی کے سارے نظام کو توڑ دیا گیا ہے۔

چوتھی گرفتاری

۱۹۳۰ء کی نمک ستیہ گرہ کا آغاز ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو ہوا لیکن مولانا حبیب الرحمٰن نے اس سے پیشتر ۱۱ مارچ کو لدھیانہ کے ہزاروں عوام کی موجودگی میں دریائے ستلج کے کنارے نمک بنا کر انگریز کے خلاف سول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔ اس جرم میں مولانا حبیب الرحمٰن کو ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کو اپنے مکان (لدھیانہ) سے دفعہ ۱۰۸ اور ۱۲۴ الف کے تحت گرفتار کر لیا۔ انہی دنوں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مولانا حبیب الرحمٰن سے لدھیانہ جیل میں ملاقات کی۔

تاکہ امروہہ ضلع مراد آباد میں ۳-۴-۵-۶ مئی کو منعقد ہونے والے جمعیۃ العلمائے ہند کے اجلاس میں اس قرارداد پر بحث ہو سکے جو کانگریس میں شمولیت اور عدم شمولیت کی بناء پر پیش کی جا رہی ہے۔
مقدمہ کی کاروائی سے لاتعلق رہ کر مولانا حبیب الرحمٰن نے ۲۷ مئی ۱۹۴۰ء کو عدالت میں حسب ذیل بیان دیا۔

"۱۹۲۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے مجسٹریٹ کے سامنے بیان دیتے ہوئے فرمایا تھا۔
"میرا ارادہ نہ تھا کہ اس مقدمہ میں کوئی بیان پیش کروں، لیکن جب میں نے دیکھا کہ گورنمنٹ مجھے سزا دینے کے بارے میں عاجز اور پریشان ہے تو میں نے محسوس کیا کہ جو سبب بیان نہ دینے کا تھا وہی اب مقتضی ہے کہ خاموش نہ رہوں۔ اور جو بات گورنمنٹ جاننے کے باوجود دکھلا نہیں سکی اسے کامل اقرار کے ساتھ اپنے قلم سے لکھ دوں"

اسی طرح جب میں نے اپنے مقدمہ میں حکومت کو پریشان پایا کہ وہ مجھ پر الزامات ثابت کرنے سے قطعاً قاصر ہے جو اس نے مجھ پر لگائے ہیں۔ اور لدھیانہ کی کسی تقریر پر مجھے سزا نہیں دے سکتی تو لاہور کے گواہوں سے مدد لی گئی۔ مگر لاہور کے گواہوں کی شہادت بھی مفید ہونے کی بجائے گورنمنٹ کے خلاف گئی تو میں نے ضروری سمجھا کہ اپنے عقیدے اور یقین کا غیر مشتبہ الفاظ میں اظہار کروں اور انگریزی حکومت کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کو صاف بیان کروں، جس کو میں اپنی بے شمار تقریروں میں بیان کر چکا ہوں۔ سچائی اور ایمان داری کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اپنے دلی جذبات کا اظہار بلا کسی خوف کے عدالت میں کیا جائے۔ اگر اقرار جرم پر پھانسی کے تختے پر بھی لٹکا دیا جاؤں تو سزا کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ کیونکہ جس چیز کو حکومت جرم قرار دیتی ہے، میرے نزدیک وہی سچائی اور ایمان ہے۔

عام طور پر بیان طلب انصاف اور برأت کی نظر سے دیئے جاتے ہیں۔ مگر میں اپنا بیان استغاثہ کی امداد کے لیے دے رہا ہوں۔ اس کٹہرے میں پیش ہونے کا مجھے پہلا ہی اتفاق نہیں۔ دسمبر ۱۹۲۱ء کو مجھے دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار کیا گیا۔ اور

جیل میں مجھ پر مقدمہ چلایا گیا۔ مگر مقدمہ کے دوران میری دفعہ ۱۰۸ بدل کر ۱۲۴ کردی گئی۔ اس دفعہ کے تحت مجسٹریٹ نے مجھے چھ ماہ کی قید اور ایک ہزار جرمانہ کی سزا دی۔ پھر اس جیل میں جب میری رہائی کے تین دن باقی رہ گئے تو حکومت نے دفعہ ۱۰۸ کے تحت مجھ پر از سر نو مقدمہ چلا کر ایک سال کی سزا دی۔

میں نے ۲۶۔ جنوری ۱۹۳۰ء کو شاہی مسجد میں قومی جھنڈا لہرایا اور حکومت کی تمام تدبیریں اور دفعہ ۱۴۴ ناکام ہوگئی۔ شکست فاش کھانے کے بعد مقامی حکومت میری گرفتاری کا بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ ۱۱ اپریل ۱۹۳۰ء کو لدھیانہ میں میں نے اپنے پروگرام کے مطابق سول نافرمانی شروع کردی۔ ۲۲۔ اپریل ۱۹۳۰ء کی شب کو شکست خوردہ حکومت نے کانگریس کے پرامن جلوس پر دل کھول کر ڈنڈے برسائے اور سینکڑوں بے گناہ عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو زخمی کیا۔ جب اس تشدد اور ظلم سے بھی کام نہ چلا اور تحریک سول نافرمانی تیز ہوگئی تو حکومت کو مجھے گرفتار کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔

میں حکومت انگریز کو ایک ایسی غیر ملکی حکومت سمجھتا ہوں، جس نے اپنی چال بازیوں اور طاقت کے بل پر ہندوستان کو غلام بنا رکھا۔ میں اپنے لیے اور ہندوستانیوں کے لیے یہ فرض سمجھتا ہوں کہ انگریز گورنمنٹ کو جس ممکن طریق سے بھی ہم نکال کر ہندوستان کو آزاد کرائیں۔ اس بارے میں جو سزا بھی ہم کو ملے، ہم اسے بخوشی قبول کرلیں۔ انگریزی حکومت نے جو نہ صرف غیر ملکی حکومت ہے بلکہ ظالم اور ہندوستانیوں کا خون چوسنے والی حکومت ہے۔ اس لیے حکومت کی مشینری کو ناکام بنانا اور انگریزی مال کا بائیکاٹ کرنا ہر ہندوستانی کا اولین فرض ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ سچائی کے اجلے دامن پر برطانوی حاکمیت و طاقت ایک سیاہ داغ ہے اور اس داغ کو دھونا اگر جرم ہے تو میں اقرار جرم کرتا ہوں اور قانونِ عدالت کو اپنی منشا پوری کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔

حبیب الرحمٰن۔ لدھیانہ جیل۔ ۲۷۔ مئی ۱۹۳۰ء

اس تحریری بیان کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن کو ایک سال قید کی سزا ہوئی اور انہیں لدھیانہ جیل سے گجرات جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں سے وہ مئی ۱۹۳۱ء کو رہا ہوئے اور اس کے بعد مجلس احرار کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری

اقوام مشرق نے قطب، ابدال اور ریشیوں کو جنم دے کر روحانی دنیا سے برائی اور پاپ کی بیخ اکھاڑ دی تو اس دھرتی نے کچھ ایسے لوگوں کو بھی اپنی آغوش میں پالا اور جوان کیا کہ جن کی ایک للکار سے شہنشاہوں کے محل ریت کے گھروندے کی طرح گر گئے۔ ایسے لوگ کبھی تلوار سے باطل پر حملہ آور ہوئے اور کبھی انہوں نے گفتار کے سہارے سلطنتوں کے کردار روندھ ڈالے۔

برطانوی گورنمنٹ کے عہد میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے برصغیر پاک و ہند میں اپنی تقریروں سے ایسا انقلاب کیا کہ وہ یونین جیک، جس کی اڑانوں نے سارے ایشیا کو گھیرے میں لے رکھا تھا اس بری طرح اس کی دھجیاں اڑیں کہ سمندر کی گہرائیاں بھی اسے امان نہ دے سکیں۔ یہ مرد درویش سید عطاء اللہ بخاری ماہ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۱ء بروز جمعہ نور کے تڑکے حافظ سید ضیاء الدین بخاری کے گھر پٹنہ شہر (عظیم آباد) ضلع بہار میں پیدا ہوئے۔ ننیال کی طرف سے سید شرف الدین احمد اور ددیال نے سید عطاء اللہ شاہ نام رکھا۔

حافظ سید ضیاء الدین شاہ بخاری ناگڑیاں ضلع گجرات (پنجاب) کے وسنیک تھے لیکن بطور سوداگر پشمینہ اکثر اپنے آبائی گاؤں سے پٹنہ جایا کرتے تھے۔ یہیں ایک شریف اور علمی گھرانے میں ان کی شادی ہوئی۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قریباً چار سال کی عمر میں تھے کہ والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ ماں کے سائے سے محروم امیر شریعت باپ کی آغوش میں تربیت پانے لگے۔ ابتدائی تعلیم ختم کر کے شاہ جی امرتسر مولانا نور احمد کے پاس آ گئے۔ یہیں انہوں نے مولانا مفتی محمد حسن اور مولانا نور احمد کی مشترک ہمتوں سے دین کی باقی تعلیم مکمل کی۔

حادثۂ جلیانوالہ باغ سے ایک ہفتہ پیشتر ۹۔ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر ریلوے پل پر گورا پلٹن نے نہتے عوام پر فائرنگ کی جس سے ہندو اور مسلمان شہید ہوئے۔ ان سب کی لاشیں جائے حادثہ سے اٹھا کر ہال بازار خیر الدین کی مسجد میں لائی گئیں۔ ان دنوں امیر شریعت اس مسجد کے مدرسہ میں

زیر تعلیم تھے۔ امیر شریعت نے تمام لاشوں کو اپنے ہاتھوں غسل دیا اور یہیں سے سب کے جنازے اور ارتھیاں اٹھائی گئیں۔ یہ ہے امیر شریعت کی عوامی زندگی کا آغاز

مولانا محمد داؤد غزنوی بلقانی ریاستوں پر فرنگی ظلم و ستم کی داستانیں اجتماعات میں بیان کرنے کے باعث خاصے مقبول تھے۔ امیر شریعت کا ابتدائی طور تھا۔ وہ دن بھر جو سبق اساتذہ سے پڑھتے رات کو کسی نہ کسی محلے اس پر واعظ کرتے۔ مولانا غزنوی ان کی شہرت سے متاثر ہو کر ان سے ملے اور ترکوں پر عیسائیت کے ظلم و تشدد کی داستانیں سنائیں۔ غزنوی کی گفتگو سے متاثر ہو کر امیر شریعت تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر سیاسیات کے میدان میں آشامل ہوئے۔

اسی سال دسمبر (۱۹۱۹ء) کو امرتسر میں آل انڈیا کانگریس، خلافت اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ہوئے۔ امیر شریعت نے پہلی دفعہ ان اجلاسوں میں سیاسی تقریر کی۔ اور اسی پنڈال میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے رہنماؤں سے ان کی شناسائی ہوئی۔

پہلی گرفتاری تحریک ترک موالات اور خلافت کے سیاسی گھوڑے ایک ساتھ دوڑ رہے تھے۔ ہندوستان گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف جہادِ آزادی میں شریک تھا اور امیر شریعت امرتسر سے نکل کر پنجاب کی فضاؤں میں انگریزی سامراج کے خلاف بغاوت کے جراثیم پھیلانے لگے۔ اس دوران آپ نے گجرات ہائی سکول کی بنیاد رکھی اور سارے ضلع کے عوام کو اس سکول سے تعاون پر آمادہ کیا۔ یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ ۲۷ مارچ ۱۹۲۱ء کو انہیں امرتسر میں ایک تقریر کے جرم میں دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت رات تین بجے امرتسر سے گرفتار کر لیا۔ ۲ اپریل کو امیر شریعت انگریز مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیے گئے۔ اور استغاثہ کی ابتدائی شہادتوں کے بعد ۸ اپریل ۱۹۲۱ء کو انہیں تین سال قید کی سزا سنائی گئی۔ جن میں تین ماہ قیدِ تنہائی کے لیے عدالت نے خاص حکم دیا۔ یہ سزا میانوالی جیل میں گزاری۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو امیر شریعت رہا ہوئے تو ہندوستان کے سیاسی حالات کا وہ رنگ و روغن ضائع ہو چکا تھا جس کی زیبائش کے لیے شہیدانِ جلیانوالہ باغ نے اپنا خون دیا تھا۔ ہندو مسلمان باہم ایک ساتھ جس کی بنیادیں مدفون تھے۔ محبت کی وہ عمارت انگریزی سامراج کی سیاسی حکمت عملی سے اینٹ اینٹ ہو کر گر گئی تھی۔ تحریک خلافت اور ترکِ موالات کی وہ آندھی جس سے برطانوی اقتدار کا چمن اجڑنا چاہیے تھا،

اپنے ہی باغ کی روشیں ویران کر گئی۔

ستمبر ۱۹۲۳ء کو ملتان میں محرم کے موقعہ پر پہلا ہندو مسلم فساد ہوا۔ اور دوسرا ۹-۱۰ ستمبر ۱۹۲۴ء کی درمیانی رات کو ہاٹ میں ہوا۔ ان فسادات سے تحریک آزادی وطن کو شدید نقصان پہنچا۔ اور اسی فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں تحریک شاتم رسول نے جنم لیا۔ اور لاہور میں راجپال کے قتل سے یہ سلسلہ شروع ہوا کہ جس کسی نے حضور سرور کائنات کی توہین کی یا اس کا ارادہ بھی کیا۔ فوراً قتل ہو گیا۔ قتل کی اس تحریک کے محرک امیر شریعت تھے جنہوں نے ایسے موقع پر صرف ایک بات کہی۔

"مسلمانو! یا توہین رسول سننے والے کان نہ رہیں یا توہین رسول کرنے والی زبان نہ رہے۔"

لاہور، قصور، جہلم، کراچی، کیمبلپور، کلکتہ اور دہلی۔ ان تمام شہروں میں گستاخان رسول قتل کیے گئے۔ اور ان کے قاتلوں نے پھانسی کے تختے پر جام شہادت نوش کیا۔

امیر شریعت کی سیاسی اور مذہبی زندگی کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے سارے ہندوستان میں اپنی شعلہ نوائی سے ایسی آگ لگائی کہ شدھی و سنگھٹن کی وہ تحریک جس نے گستاخان رسول کو جنم دیا تھا، ہمیشہ کے لیے مات کھا گئی۔

انہی دنوں جنوری ۱۹۲۵ء کو حضرت امیر شریعت دہلی میں دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔ اس گرفتاری کے پس منظر میں ان کی وہی تقریریں تھیں۔ جو انہوں نے ہندو مہا سبھا کے خلاف کیں اور ہندوستان کے فسادات کی ساری ذمہ داری گورنمنٹ برطانیہ پر ڈال دی۔ اس مقدمہ میں حضرت امیر شریعت کو چھ ماہ قید اور پانچسو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ امیر شریعت کی یہ دوسری گرفتاری اور سزایابی تھی۔

میعاد اسیری گذار رہے تھے تو پنجاب میں راجپال کا فتنہ سر اٹھائے ہوئے تھا۔ گھر آتے ہی سستانے کی بجائے اس فتنہ کی سرکوبی میں مصروف ہو گئے۔ اور ایسی تقریریں کیں کہ ۶ اپریل ۱۹۲۹ء کو غازی علم الدین نے مہاشہ راجپال کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے کے جرم میں سر عام قتل کر دیا۔ اور اس ضمن میں حضرت امیر شریعت کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور غازی عبدالرحمٰن کو بھی ایک ایک سال کی سزا ہوئی۔

ہر سہ رہنماؤں کا مطالبہ تھا کہ حکومت برطانیہ کو ایسا قانون وضع کرنا چاہیے کہ آئندہ ہندوستان کے کسی باشندے کو کسی مذہب کے بزرگ کی توہین کا موقعہ نہ ملے۔ اور جو ایسا کرے اسے قرار واقعی سزا ملنی چاہیے۔ آخر حکومت کو یہ قانون بنانا پڑا۔

تیسری بار جیل سے رہا ہوئے تو ملک میں کانگریس تحریک آزادی وطن شروع کر چکی تھی۔ اس دوران جمعیۃ علمائے ہند کا امروہہ (یوپی) میں خاص اجلاس ہو رہا تھا۔ جس میں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ جمعیۃ علمائے ہند کو تحریک کانگریس میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں۔ یہ مئی ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ اس اجلاس میں امیر شریعت نے سترہ گھنٹے تقریر کر کے جمعیۃ کی یہ تاریخی قرارداد منظور کرائی۔

۱۹۲۰ء کی تحریک کانگریس کے ضمن میں ہندوستان کے طول و عرض کا سفر کیا۔ اور عوام کو انگریزوں کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی۔ اس سفر میں کوئی ضلع یا شہر ایسا نہیں تھا جہاں سے ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری نہیں ہوئے تھے۔ اسی دوران آگرہ اور بمبئی میں ان پر قاتلانہ حملے بھی ہوئے۔ آخر آپ بنگال میں گرفتار کر لیے گئے۔ اور چھ ماہ قید کی سزا پائی۔ یہ قید آپ نے ڈم ڈم جیل میں گزاری۔

جنوری ۱۹۲۱ء کو گاندھی اروِن پیکٹ پر رہا ہوئے اور جولائی ۱۹۲۱ء میں مجلس احرار کی تنظیم نو میں مشغول ہو گئے۔

مولانا مظہر علی اظہر

کاشتکاروں کے لیے زمینوں کے بعض خطے عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ ان کی پیداوار میں زمیندار ہر موسم کو اپنے لیے بہتر سمجھتا ہے اسی طرح بعض زمینیں مردم خیز ہوتی ہیں۔ ایسی زمین میں پرورش پانے والے بعض افراد ذاتی فوائد کے حصول میں تاریخ کو بھی داغدار کر گزرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ جیسے ضلع گورداسپور میں مرزا غلام احمد قادیان نام کے ایک گاؤں میں پیدا ہو کر مقام نبوت کے علاوہ اسلام کی دوسری حدیں بھی توڑ دیں، اور ایسی مٹی سے بعض ایسے لوگ بھی اٹھے جن کا ہر قدم وطن اور ملت کے لیے باعثِ افتخار ہوتا چلا گیا

بٹالہ (گورداسپور) میں جہاں اور بہت سی سیاسی اور مذہبی شخصیتیں پروان چڑھیں وہاں ۱۸۹۵ء میں مولانا مظہر علی اظہر بھی پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد عبداللہ تھا اور یہ

کشمیری قوم کے معزز گھرانے سے متعلق تھے۔ کنجروڑ ضلع سیالکوٹ تحصیل شکرگڑھ سے یہ لوگ کسی زمانہ میں برائے ملازمت ضلع گورداسپور میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ میٹرک تک تعلیم ایم۔ بی ہائی سکول بٹالہ میں حاصل کی اور پھر لاہور اسلامیہ کالج میں داخل ہوئے۔ یہیں مولانا مظہر علی کی ملاقات چودھری افضل حق سے ہوئی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد لا کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۸ء میں وکالت شروع کر دی۔

۱۹۱۹ء کا سال انگریزی تشدد کی وجہ سے ہندوستانیوں کے لیے خوف وہراس کا انتہائی نازک ترین سال تھا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ پولیس مین بڑے سے بڑے رئیس کو جس طرح چاہتا ذلیل کرتا۔ جرم و سزا کے اس دور میں ، ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز انتہائی بربریت پر اتر آیا تھا۔ جلیانوالہ باغ کے خونی حادثہ نے عوام کے دلوں پر انگریزی اقتدار کی ایسی چھاپ لگا دی تھی کہ شب و روز موت کا نقشہ سامنے رہتا۔

ایسے ہی دن تھے کہ جنرل ڈائر (جس نے جلیانوالہ باغ میں گولی چلائی تھی ، نے ۲۲ اپریل (۱۹۱۹ء) کو بٹالہ میں ایک دربار منعقد کیا اور عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا ۔

> "میں تم سب کو گرفتار کرنے کے لیے آیا ہوں اور تمہاری گرفتاری چند روز کیلئے ملتوی کی جاتی ہے اور تم کو مہلت دی جاتی ہے ، کہ تم سرکاری گواہ بن جاؤ۔ اور اپنی اپنی درخواستیں فوراً بھیج دو۔ اور ہم تم سے یہ وعدہ نہیں کرتا کہ ہم سب درخواستیں منظور کریں گے بلکہ ہم جس شخص کی درخواست مناسب سمجھیں گے منظور کریں گے۔
>
> پنجاب میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گورنمنٹ برطانیہ کو برطرف کر دینے کے لیے ایک سازش عظیم کی گئی ہے۔ اور تم سب اس سازش میں شریک ہو۔ گورنمنٹ اس سازش کا پتہ لگا رہی ہے۔ اور تم سرکاری گواہ بن کر اس سازش کا پتہ دو۔ تم میں سے بعض کے خلاف گواہی مکمل ہو چکی ہے۔ اور بعض کی نسبت تحقیقات جاری ہے۔ اور چند دنوں میں تحقیقات مکمل ہو جائے گی۔ اور تم کو گرفتار کر لیا جائے گا۔"
>
> (انگریزی تقریر کا ترجمہ)

جنرل ڈائر کے اس دربار میں شہری معززین کے علاوہ وکلاء بھی بلائے گئے تھے۔

اس تقریر کے بعد شہر کے دکلاء کو مشورہ کے بہانے کمشنر کے دفتر بلوا کر گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں شیخ چراغ دین وکیل۔ مولانا مظہر علی اظہر، لالہ دیوان چند وکیل، خورشید الحق خاں وکیل، لالہ دیوان چند بھنڈاری وکیل۔ ان سب کو ہتھکڑیاں لگا کر وہیں سے گورداسپور جیل بھیج دیا گیا۔ ان سب پر جرم یہ تھا کہ انہوں نے رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کیوں کیا؟

مولانا مظہر علی اظہر کی مندرجہ ذیل نظم اس دور کی پیداوار ہے۔

پڑی ہے سر پہ ہمارے بلائے رولٹ بل ۔ خدا جہاں سے اٹھائے بنائے رولٹ بل

سناؤں آپ کو میں ماجرائے رولٹ بل ۔ زباں سے آپکی نکلے گا ہائے رولٹ بل

کسی غریب پہ شک ہو جو افسروں کو کہیں ۔ تو اس کے سر پہ اعلان آئے رولٹ بل

دوسرا جرم یہ تھا کہ ان سب نے جنرل ڈائر کے حکم پر سرکاری گواہ بننے سے انکار کر دیا تھا۔

جیل میں ان سب کو الگ الگ اندھیری کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ اور کچھ دنوں بعد ان سب کو پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا کر لاہور سنٹرل جیل بھیج دیا۔ وہاں ان کی ملاقات غلام محی الدین خاں قصوری (وکیل)، ڈاکٹر سیف الدین کچلو بیرسٹر امرتسر۔ سردار حبیب اللہ خاں۔ مسٹر بدرالاسلام علی خاں وکیل۔ لالہ ہرکشن لال، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ، ڈاکٹر لامبہ سنگھ، شیخ دین محمد، چودھری لال خاں، مسٹر مطیع اللہ سے ہوئی۔ مندرجہ بالا احباب مارشل لاء ۱۹۱۹ء کے مجرم تھے۔ ان سے مل کر نووارد مجرموں کے ذوقِ جرم کو مزید جلا ملی۔ اور وطن عزیز کی آزادی کیلئے ایمان میں مزید پختگی آئی۔

اتنے میں حالات میں تغیر آیا۔ جرمن اور برطانیہ کے درمیان مزید معاہدہ ہوا۔ لہٰذا تمام سیاسی قیدیوں سے نرمی ہونے لگی۔ اور اس سلسلہ میں مولانا مظہر علی اظہر اور ان کے رفقاء کو لاہور سنٹرل جیل سے گورداسپور جیل واپس لایا گیا۔ یہاں جنرل ڈائر نے ایک اور تقریر کی۔

"ڈیکھو ٹم لوگ احمق لوگ کے پیچھے لگ گیا۔ فساڈ کرٹا ہے اور رولٹ بل رولٹ بل کہٹا ہے۔ رولٹ بل بہانہ ہے۔ تم بغاوٹ کرٹا ہے۔ رولٹ بل کیا ہے؟ ہمارے پاس رولٹ بل سے بڑا قانون ہے۔ ڈیکھو! امرٹسر میں کیا ہوا ہے۔ لڑٹا ہے۔ حکومت زبرڈسٹ ہے۔ ہم حکومت کرٹا ہے۔ ہنڈوسٹانی ٹیٹس کرو ہے

کیا ہے، ہتھیار نہیں۔ کچھ نہیں۔ کیا کر سکتا ہے۔ ڈو آدمی ہم کا ٹم سب کو کافی ہے۔ ٹم احمق لوگ کے پیچھے لگتا ہے۔ وہ ٹم کو آگے کرتا ہے خود پیچھے ہٹتا ہے اس کو کہو آگے گولی ٹم کھاؤ۔ وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ احمق مت بنو۔ احمق لوگ کے پیچھے مت لگو۔ امرتسر فساد کیا۔ صاب لوگ کو مار ڈیا۔ میم صاب کو پٹیا یہ کوئی مرڈانگی نہیں۔

اس کے بعد افسران سے مخاطب ہو کر کہا "کوئی بڈمعاش ہے"۔

اس حکم پر شہر کے وکلا کو پیش کیا گیا۔ سب آگے بلائے گئے۔ اور پلیٹ فارم کے تین طرف کھڑے کیے گئے۔ اور جنرل ڈائر نے کہا۔

ترجمہ:۔ "معززین! میں نہیں جانتا کہ آپ کو معززین کیوں کہتے ہیں"۔

یہ کہتے ہوئے کچھ سوچ کر ڈائر نے اردو میں تقریر شروع کی اور کہا

"ٹم رولٹ بل کو برا کہتا ہے۔ اس کو پڑھا۔ وہ برا نہیں اچھا ہے۔ ٹم رولٹ بل نہیں جانتا۔ ہم جانتا۔ ہم ٹمہارا امتحان لے گا۔ خوب یاد کرو۔ ہم پھر آئے گا اور ٹمہارا امتحان لے گا۔

آخر ۸۔ جولائی ۱۹۱۹ء کو یہ سب لوگ رہا کر دیے گئے۔

رہائی کے بعد پولیس کی وساطت سے مولانا مظہر علی اظہر کو سب جج بنانے کا لالچ دیا گیا۔ جس پر گھر کے لوگ بھی راضی تھے۔ لیکن آزادئ وطن کا نشہ اس ترشی سے کہاں اتر سکتا تھا۔ آخر ۸۔ جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا مظہر علی اظہر نے لاہور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی۔

دسمبر ۱۹۲۹ء کو جب مجلس احرار کی نیو اٹھائی گئی تو مولانا مظہر علی اظہر کو مجلس احرار کا پہلا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں کانگریس تحریک شروع ہوئی اور دیگر ساتھی جیلوں میں چلے گئے تو مولانا مجلس احرار کی عارضی دیکھ بھال کے لیے تحریک کانگرس میں شریک نہ ہوئے۔ گاندھی ارون پیکٹ کے بعد جب ساتھی باہر آئے تو جولائی ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار کے نظام کو از سر نو زندہ کیا گیا۔ تو آپ نے پہلی احرار کانفرنس میں خطبۂ استقبالیہ دیا۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی

یورپ کی پہلی لڑائی کے بعد انگریزوں کی ہندوستان سے بدعہدی نے راعی اور رعایا کے مابین اس قدر بد اعتمادی پیدا کی کہ دونوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور دونوں آمنے سامنے آکھڑے ہوئے۔ نہتی رعایا توپوں اور مشین گنوں سے آراستہ حکمرانوں سے بدلہ چکانے اور اپنے وطن کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے میدان کارزار میں اتر آئی۔ اس جنگ کی جن لوگوں نے رہنمائی کی مولانا محمد داؤد غزنوی اس دور کے چند منتخب رہنماؤں میں شامل ہیں۔ یہ دور بڑا مہیب دور تھا۔ غیر ملکی سامراج ہارے ہوئے جواری کی طرح اوچھے اور کمینے ارادوں کے ساتھ اپنی غلام رعایا پر حملہ آور تھا۔ جلیانوالہ باغ کا حادثہ اس دور کی بھیانک تصویر ہے۔

مولانا داؤد غزنوی جولائی ۱۸۹۶ء کے آخر میں یا اگست کے اوائل میں امرتسر مولانا عبدالجبار کے ہاں پیدا ہوئے۔ مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبداللہ غزنوی کے بیٹے تھے۔ ان کا اصل وطن غزنی کے قریب قصبہ قلعہ بہادر خیل تھا۔ اپنے مذہبی عقیدے کی بنا پر والیٔ افغانستان دوست محمد خاں سے اَن بن ہوگئی اور انہیں اپنا چمنستان چھوڑ کر ہندوستان میں پناہ لینا پڑی۔ اور یہ زمانہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کا زمانہ تھا۔ گورا فوج وحشی کتوں کی طرح ہندوستانیوں کا شکار کھیل رہی تھی۔ دوسری طرف مغلیہ سلطنت کے بے قاعدہ لشکر انگریزوں سے اپنا انتقام لے رہے تھے۔ انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ مولانا عبداللہ غزنوی کو سڑک کے کنارے ایک یورپین عورت زخمی حالت میں ملی۔ مولانا اسے اٹھا کر اپنی قیام گاہ پر لے آئے اور تیمارداری کے بعد جب اس کی صحت بحال ہوگئی تو مولانا محمد عبداللہ خود اسے جنرل نکلسن کے ہیڈکوارٹر چھوڑنے آئے۔ جب اس یورپین عورت نے جنرل نکلسن کو اپنی رام کہانی سنائی اور حضرت مولانا کے حسن سلوک کی تعریف کی تو جنرل نکلسن نے مولانا عبداللہ کو قلعہ میں بلوا کر انعام دینا چاہا تو مولانا محمد عبداللہ غزنوی نے فرمایا۔

"عورت کی حفاظت میرا مذہبی فرض ہے۔ اسلام مجھے ایسا ہی سبق دیتا ہے لہٰذا میں نے اس نیت سے اس کی خدمت نہیں کی کہ آپ سے انعام لوں بلکہ اس خدمت کا تعلق اسلام اور خدا سے ہے۔"

یہ کہہ کر واپس آ گئے۔

مولانا عبدالجبار غزنوی کی عمر ان دنوں انیس برس کے قریب تھی۔ یہ قافلہ پھرتا پھراتا امرتسر آکر مقیم ہو گیا۔ یہیں مولانا داؤد غزنوی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے خاندان کے رواج کے مطابق گھر میں حاصل کی اور دہلی جامعہ مسجد فتح پوری میں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی سے باقی علوم دینی سے فیض یاب ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد امرتسر کٹڑہ مہاسنگھ کوچہ غزنویاں میں اپنی مسجد کے مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے۔

خلافتِ عثمانیہ ان دنوں فرنگی سیاستدانوں کے گھیرے میں تھی۔ بلقانی ریاستوں پر یونانیوں کے ظلم و جور کے مہیب بادل گھر آئے تھے۔ اقوامِ یورپ نے ٹرکی کو مردِ بیمار سمجھ کر موت کی نیند سلا دینا چاہا تھا۔ مظلوم ترکوں کی چیخ و پکار سمندروں کو چیرتی ہوئی جب ہندوستان پہنچی تو یہاں کا مسلمان آپے سے باہر ہو کر ترکوں کی امداد کو نکل آیا۔

غلاموں کی آواز آقاؤں کے حصار سے باہر نہیں جا سکتی۔ غلام کے خون کی نہریں تو بہہ سکتی ہیں۔ مگر برسر اقتدار قوم کا ایک آنسو بھی ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ انسانوں کا یہ دستور آئینِ فطرت کے خلاف بغاوت کا داعی ہے۔ مگر یہ بات کون کہہ سکتا ہے۔ حالات آلات سے مسلح مظلوموں کے راستے کی دیوار بن جاتے ہیں۔ لیکن جب غلام اپنے یقین محکم سے آراستہ ہو کر ان دیواروں کو گرانا چاہے تو پھر پہاڑ بھی ان کا راستہ نہیں روک سکتے۔

ہندوستان کے غلام مسلمان نے اپنی زنجیروں سمیت ترکوں کی حمایت میں نظامِ فرنگی پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ایوانِ فرنگ کی دیواریں کانپ اٹھیں۔ یہی آگ روشن تھی جب مولانا سید داؤد غزنوی نے اس آلاؤ میں چھلانگ لگائی۔ زندہ ضمیر اور بیدار احساس کے ساتھ جب وہ نظامِ فرنگی سے ٹکرائے تو واقعات نے ہر آن اُن سے تعاون کیا۔ یہ ۲۱-۱۹۲۰ء کا ہنگامی دور ہے۔ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکات نے غیر مسلموں کو بھی خلافتِ عثمانیہ کے زوال سے ہمدردی پیدا کر دی تھی۔ مولانا داؤد غزنوی امرتسر کے بازاروں میں حکومتِ برطانیہ کے خلاف بغاوت کا علم اٹھائے گھوم پھر رہے تھے اور انہی مسموم ہواؤں میں آپ نے حضرت امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو اپنا ہمنوا بنا کر اس خارزار میں اپنے ساتھ کھینچ لیا۔

آخر کو اسی سال دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت گرفتار ہوئے اور تین سال قید با مشقت کی سزا ملی۔ قید کا یہ زمانہ آپ نے میانوالی جیل میں گزارا۔

رہا ہوئے تو لاہور چینیاں والی مسجد کی امامت سنبھال لی۔ اور اس طرح آپ نے امرتسر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

۱۹۲۹ء میں مجلس احرار کی ابتدائی کارروائی میں شریک کار رہے۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک آزادیٔ وطن میں گرفتار ہو کر گجرات جیل میں رہے۔ ۱۹۳۱ء میں مجلس احرار کے پہلے ناظم اعلےٰ مقرر ہوئے۔

شیخ حسام الدین

پنجاب کے جن قدیم اور عظیم شہروں کو ۱۹۴۷ء کے فسادات نے اپنی سیاست کی بھینٹ چڑھایا۔ امرتسر ان میں ایک ایسا شہر تھا۔ جس کی بہاروں سے سارے پنجاب کو جوانی میسر آئی تھی۔ اس کے لہلہاتے ہوئے باغات اور نہریں کنوارے حسن کی طرح ہر نگاہ کو دعوت نظر دیتے تھے۔ اس کی آغوش میں پرورش پانے والے جوانوں نے ماجھے کے جاٹ کی زندگی سنوار دی۔ جب وہ دیوالی اور بیساکھی کے میلوں میں رنگا رنگ پگڑیاں باندھے ڈھولک اور چمٹے پر پنجابی گیت گاتے ہوئے شریک ہوتے تو فضاؤں میں نیا ارتعاش پیدا ہوتا۔ ان کے بھنگڑے کی ایک ایک لَے میں کئی ہیریں اور سوہنیاں اپنے رانجھوں اور مہینوالوں کی باہوں میں باہیں ڈال کر کبھی چناب کے اس کنارے ناچتیں اور کبھی اس کنارے۔

اس بکھری ہوئی حسین فضاؤں کا امرتسر جب سے ویران ہوا ہے۔ پنجاب کی ساری ثقافت روٹھ گئی۔ اس کے مردہ تمدن کے آنسوؤں میں اب کوئی چناب نہیں بہے گا کہ کوئی سوہنی اپنے مہینوال کی تلاش میں کچے گھڑے کا سہارا لے کر اپنے پختہ یقین کے ساتھ ڈوب مرے اور نہ ہی اب اس کی فضاؤں میں وہ رومان باقی رہا کہ تخت ہزارے کا کوئی البیلا جھنگ کی وادیوں میں اپنی بنسری کی مرلی تان سے کسی ہیر کی سیج کو خراب کر سکے گا۔

گورو رام داس کی یہ نگری ایک طرف دریائے بیاس کی حفاظت میں تھی اور دوسری طرف دریائے راوی کی موجیں اس کی نگہداشت کرتی تھیں۔ امرتسر روحانی اور سیاسی اعتبار

سے بڑا مالدار شہر تھا۔ دربار صاحب اگر سکھوں کا مذہبی استھان ہوتے ہوئے ایک مرکزی اہمیت کا حامل تھا تو ڈاکٹر سیف الدین کچلو، خواجہ عبدالرحمٰن غازی، سید عطا اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین حکیم سکندر خضر، منشی احمد دین اور خواجہ عبدالرحیم عاجز ایسے لوگ تھے کہ جن پر امرتسر کو ہمیشہ ناز رہیگا۔

شیخ حسام الدین اسی بارونق شہر میں یکم جون ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ عزیز الدین اپنے خاندان سمیت کشمیر سے آکر امرتسر میں آباد ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد شیخ صاحب نے امرتسر خالصہ کالج سے بی۔اے کیا اور ۱۹۲۱ء میں تعلیم سے فارغ ہوئے تو پنجاب مارشل لاء کی زد میں تھا۔ حادثہ جلیانوالہ باغ نے دلوں کو انگریزی وقار سے محیط کیا ہوا تھا۔ تاہم خلافت اور ترکِ موالات کی ہنگامہ آرائی بعض دلوں سے یہ داغ مٹا چکی تھی۔ جلوس اور جلسوں کی ہماہمی نے جوان خون کو اس حد تک گرما دیا تھا کہ ان کی تپش سے غیر ملکی سامراج کو ہندوستان کی غلامی کی زنجیریں ڈھلتی نظر آئیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ پرامن اور عدم تشدد کے ذریعے انقلاب کی عوامی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ شیخ حسام الدین کالج کی آزاد فضاؤں سے نکل کر جدوجہد آزادی میں شریک ہوئے۔ جوانی کی آرزوئیں اور والدین کی خواہشات کچھ اور تقاضہ کرتی تھیں۔ لیکن وطن عزیز اپنے جوانوں کو پکار رہا تھا۔ غیر ملکی غلامی کی گرہیں آئے دن مضبوط ہوتی جا رہی تھیں۔ سات ہزار میل سے آئے ہوئے مٹھی بھر حکمران تیس کروڑ انسانوں کے سروں پر راج سنگھاسن بچھائے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے ہر نوجوان کی طرح شیخ حسام الدین گھر کی آسائش چھوڑ کر مصائب و آلام کے لیے آمادۂ پیکار ہو گئے

امرتسر خلافت کمیٹی نے انہیں شہری کور کا کپتان مقرر کر دیا۔ اسی حیثیت سے وہ دسمبر ۱۹۲۱ء کو احمد آباد کانگرس اور خلافت کے مشترک سالانہ اجلاسوں میں شریک ہوئے یہیں گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف سول نافرمانی کا فیصلہ کیا گیا۔ ہر سیاسی کارکن احمد آباد سے اپنی انفرادی ذمہ داریوں کے ساتھ واپس آیا۔

شیخ حسام الدین گٹھیلے جسم اور چہرے کے کشمیری رنگ و روغن کے ساتھ جب خلافت کمیٹی کی سبز وردی پہن کر بحیثیت کیپٹن اپنی کور کے ساتھ امرتسر کے بازاروں میں مارچ کرتے تو ایسا لگتا جیسے کوئی ترک فوج کا افسر گیلی پولی کے محاذ پر جا رہا ہو۔ ان کی یہ سج دھج شہر کے نوجوانوں کی توجہ

کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ حکومت کو شیخ صاحب کی یہ ادا پسند نہ آئی اور اس نے ۷ جنوری ۱۹۲۲ کو خلافت کمیٹی کے دفتر پر قبضہ کر کے دوسرے دن (۸۔ جنوری) شیخ صاحب کو گرفتار کر لیا۔

ہر والدین اپنی اولاد کا بہتر مستقبل سوچتا ہے۔ اسی طرح شیخ صاحب کے والدین کا ارادہ تھا کہ حسام الدین سیشن جج بنے اور وہ اس کی آئندہ تعلیم کے منصوبے بنا رہے تھے کہ بیٹا جیل چلا گیا۔ گھر والوں کو جب اس کی اطلاع ملی تو والد صاحب بیٹے سے ملنے کو توالی آئے۔

شیخ حسام الدین کہتے ہیں کہ "جب والد صاحب مجھے ملنے آئے تو میرا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ خدا جانے کیا کہیں گے جبکہ انہیں پولیس سپرنٹنڈنٹ مسٹر بی۔ ٹی خود مجھ سے ملانے لائے میری نگاہیں جھکی رہیں اور وہ میری طرف دیکھتے رہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد والد صاحب نے کہا۔

" برخوردار تم نے جوانی کے جذبات کے زیر اثر آنکھیں بند کر کے اس زندگی میں حصہ لینا پسند کیا ہے حالانکہ ہم لوگ اتنی جلدی تمہاری ناتجربہ کاری کی وجہ سے عملی شرکت پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن تم نے ہماری نصیحت کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ ہم لوگ تحریک کے مخالف نہیں تھے بلکہ ہم تو صرف یہ چاہتے تھے کہ تم پہلے عملی زندگی کا کسی قدر تجربہ حاصل کر لیتے۔ اس کے بعد سوچ سمجھ کر حصہ لیتے تو ہمیں خوشی ہوتی۔

خیر جو ہونا تھا سو ہوا، تقدیر میں یہی تھا۔ لیکن اب تم ملک اور قوم کے نام پر گرفتار کیے جا چکے ہو۔ تمہارا معاملہ ذاتی نہیں رہا۔ نیز تمہارے ہر عمل کا اثر قوم پر پڑے گا۔ اس لیے حوصلہ نہ ہارنا اور شیخ سعدی کے اس قول کو کبھی نہ بھولنا۔

؎ بر سر اولاد آدم ہر چہ آید بگذرد"

والد صاحب کی یہ نصیحت سن کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ خوشی کے آنسو پلکوں تک آن پہنچے۔ بزرگوں کی ناراضگی کا خیال ایک بوجھ تھا جو یکایک میرے سینے سے اتر گیا۔

پہلی سزا

قانون نے اپنا منشا پورا کیا اور مختصر عدالتی کارروائی کے بعد ۱۔ جنوری ۱۹۲۲ء کو شیخ صاحب کو کرمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کے تحت ڈیڑھ سال قید با مشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ عدم ادائیگی جرمانہ مزید چھ ماہ قید کی سزا ہوئی۔

اس سزا کے بعد انہیں انبالہ جیل لے جایا گیا۔ جہاں ان کی ملاقات چودھری افضل حق سے ہوئی۔ اس جیل میں دوسری خرابیوں کے علاوہ پانی کی بے حد قلت تھی۔ ہفتہ میں ایک دن نہانے کا پانی ملتا۔ نیز بعض قیدیوں کو یہاں کی آب و ہوا بھی راس نہ آئی۔ ان میں شیخ صاحب بھی تھے۔ چنانچہ انہیں دھرم سالہ ضلع پٹھانکوٹ کی سب جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں پیشتر سے لالہ لاجپت رائے اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی میعادِ اسیری گزار رہے تھے۔ شیخ صاحب نے بھی باقی سزا انہی کے ساتھ گزاری۔

رہا ہوئے تو ذوقِ جرم اس حد تک بڑھا کر حالات نے شیخ صاحب کو اس میدان کا پختہ کار سپاہی بنا دیا۔ ۱۹۲۴ء کا سال ہندوستان کی دو غالب قوموں کے درمیان منافرت کا سال تھا۔ اس سال کا ایک ایک دن ہزاروں انسانوں کے خون سے رنگین ہے۔ دو سال پیشتر جن قوموں نے ایک دوسرے کا جوٹھا پانی پیا تھا غیر ملکی حکمت عملی نے ان کی محبت میں ایسی دراڑ ڈالی کہ باہم خون کے پیاسے ہو گئے۔ امرتسر میں اناج کی منڈی پر چونکہ ہندو قابض تھے لہٰذا ۱۹۲۴ء میں فسادات کے دنوں شیخ حسام الدین نے امرتسر میں مسلم اناج منڈی کی بنیاد رکھی۔ کٹڑہ کرم سنگھ ڈھاب تیلی جہاں اس منڈی کا مرکز تھا مشہور سوشلسٹ رہنما منشی احمد دین شیخ صاحب کی دکان پر بطور منشی پہلے پہل ملازم ہوئے اور یہیں سے وہ منشی احمد دین کے نام سے معروف ہوئے اور تادم واپسیں وہ اسی نام سے مشہور رہے۔

مسلم اناج منڈی سے اگر امرتسر کا ہندو اقتصادی طور پر کمزور رہا تو مسلمان کے لیے یہ منڈی بڑی مفید رہی۔ گو کاروباری اعتبار سے شیخ صاحب کو اس میں خاصا خسارہ رہا۔ خاندانی پونجی قریباً ختم ہو گئی۔ تاہم حالات کا مقابلہ خوب رہا۔

وقت کے ساتھ ساتھ حالات نے نئی کروٹ لی اور ۱۹۳۰ء کا زمانہ آن پہنچا۔ شیخ صاحب کو نمک ستیہ گرہ میں گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال قید محض کی سزا ہوئی۔ یہ قید آپ نے گجرات سپیشل جیل میں مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، خان عبدالغفار خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور غازی عبدالرحمٰن کے ساتھ گزاری۔ گاندھی اروِن پیکٹ میں رہا ہوئے تو جولائی ۱۹۳۱ء میں مجلس احرار میں شامل ہو گئے۔

فارم رکنیت

مجلس احرار السلام کے مقاصد جنگ میں شریک جماعتوں کے اغراض و مقاصد بڑے ہی مختصر ہوتے ہیں۔ البتہ جب وہ عنانِ اقتدار سنبھالتی ہیں تو حکومت کی طرز فعال کے نقشے لکیرنے پڑتے ہیں تاکہ عوام کو مطمئن کر سکیں مجلس احرار کی اُٹھان غیر ملکی حکمرانوں سے لڑائی کی بنیاد پر تھی۔ لہٰذا ان دنوں کے اغراض و مقاصد اور فارم رکنیت ایک ساتھ ہوتے تھے۔ جیسے کہ حسب ذیل رکنیت فارم ہے۔

اقرار نامہ چندہ ماہوار

مجلس احرار اسلام ہند کے مقاصد

۱۔ ہندوستان کے لیے پرامن ذرائع سے کامل آزادی حاصل کرنا۔

۲۔ سیاسیات ہند میں مسلمانوں کی صحیح سیاسی رہنمائی کرنا

۳۔ مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے لیے کوشش کرنا

میں نے مجلس احرار السلام ہند کے مقاصد معلوم کر لیے ہیں۔ اور مجھے ان سے پورا اتفاق ہے۔ میں مجلس احرار اسلام ہند کو ——— ماہوار چندہ ادا کیا کروں گا اور اقرار کرتا ہوں کہ مجلس کے قواعد کا پابند ہوں گا۔

نام ——————— ولدیت ———————

عمر ——————— پورا پتہ ———————

ماہوار چندہ — — — — — — — — —

دستخط یا انگوٹھا — — — — — — — —

معرفت ———————

جنرل سیکرٹری ———————

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جیوش احرار اسلام ہند

مقصد

مسلمانان ہند کی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے لیے جو پروگرام مجلس مرکزیہ احرار اسلام ہند نے تجویز کیا ہے یا آئندہ کرے گی اس کو کامیاب بنانے کے لیے اپنی خدمات پیش کرنا

اقرار

جیوشِ احرار اسلام کے مقاصد سے مجھے پورا اتفاق ہے اور میں اقرار کرتا ہوں کہ اس مقصد کی تکمیل کیلئے میں ہر طرح پرامن رہونگا اور جو بھی تکلیف اس راستے میں آئیگی اسے برداشت کرونگا اور اپنے افسران کے احکام کی بلا چون وچرا تعمیل کرونگا اور جیوش کے دستور العمل کی مطابعت کرونگا اور اپنے یا اپنے اہل وعیال کیلئے کسی قسم کی مالی مدد کا مطالبہ نہیں کرونگا۔

درخواست

اس لیے میں مسمی ______ ولد ______ عمر ______ درخواست کرتا ہوں کہ مجھے جیش احرار اسلام میں بطور رضاکار داخل کیا جائے۔ فیس داخلہ موازی ایک آنہ داخل کر رہا ہوں۔

پورا پتہ ______

تاریخ ______

دستخط / نشان انگوٹھا ______

دستخط تصدیق کنندہ عہدہ دار انچارج ______

دفتر جیوش احرار اسلام صوبہ ______

رضاکار کا نمبر ______

اندراج مورخہ ______

دستخط نائب سالار اعظم ______

جیوش احرار الاسلام کے مقاصد

وردی جیوش احرار الاسلام رضاکار۔ خاکی شلوار، سرخ قمیض، پاؤں میں پشاوری طرز کی چپل یا بوٹ، سر پر بخاری کیپ۔

سالار۔ خاکی پتلون، سرخ قمیض، سر پر فوجی طرز کی پھندنادار ٹوپی۔ پاؤں میں بوٹ۔

پرچم مجلس احرار جماعت اپنے امتیازی نشان کے بغیر بے معنی ہوتی ہے۔ لہٰذا مجلس احرار الاسلام نے مقاصد اور وردی کے بعد اپنے پرچم کی طرف خصوصی توجہ دی اور اس پر ورکنگ کمیٹی نے چوبیس گھنٹے مسلسل بحث کے بعد فیصلہ کیا کہ ۲۳۔ اپریل ۱۹۳۰ء کو قصہ خوانی بازار پشاور کے شہدائے وطن کی یاد میں مجلس احرار کے پرچم کا رنگ سرخ اور اس پر سفید چاند تارا ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہی طے پایا۔

سرخپوش جیوش احرار کی وردی میں گو صرف قمیض کا رنگ سرخ تھا تاہم عوام کی زبان میں انہیں سرخ پوش کہا گیا۔ یا کبھی کبھار احرار سرخپوش بھی کہا جاتا تھا۔

احرار رہنماؤں نے اپنے رضاکاروں کے لیے یہ رنگ سرحد سرخپوشوں کے اعزاز میں منتخب کیا تھا۔ شمال مغربی صوبہ سرحد میں ان دنوں یہ جماعت خدائی خدمت گار کے نام سے معروف تھی۔ جسے خان عبدالغفار خاں نے ۱۹۲۲ء میں قائم کیا تھا۔ اپنے دوسرے عقائد کے علاوہ سیاسیات میں اس جماعت کو انڈین نیشنل کانگریس کا ہمیشہ قرب حاصل رہا۔ جبکہ مجلس احرار الاسلام کانگریس سے الگ اپنا سیاسی نظام جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر قائم کر چکی تھی۔

ہر خدائی خدمتگار رضاکار سر سے پا تا سرخ لباس پہنتا تھا۔ اس ہلکی سی مشابہت کے باعث جو مجلس احرار اور شمال مغربی صوبہ سرحد کے سرخپوشوں کے درمیان تھی سیاسیات میں مجلس احرار سے اختلاف رکھنے والے رجعت پسند مسلمانوں نے مجلس احرار سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلائیں اور اپنے افسانوں میں ایسا رنگ بھرا کہ حقیقت بھی فریب کھا گئی۔

باب ۔ ۲

نیا راستہ

بہار جب اپنے ابھار پر ہو تو گل بوٹے بھی اپنا نکھار دکھاتے ہیں۔ ہواؤں سے بے حجابی کرتے ہیں۔ وہ پتوں کے نقاب الٹ کر کلیوں کے دامن کی اوٹ سے اس طرح جھانکتے ہیں کہ نسیم سحر جھوم جھوم اٹھتی ہے۔ لالہ رخ سورج مکھی ہو کر دیکھنے لگتے ہیں۔ ہر روش راستوں کے سنگھار میں بہاروں کے پاؤں لیتی ہے۔ ایسے دنوں میں چمن سے بے رخی بدذوقی کی علامت کہلاتی ہے۔

احرار رہناؤں نے جب ملت اسلامیہ کی فلاح کے لیے کانگریس سے اپنا ناطہ توڑا تو یہ دن ان کی توقیر کے بہترین دن تھے۔ برادرِ وطن انہیں دیوتاؤں کی طرح پوجتے، ان کے چرن چھونا پاپ کا کھنڈن سمجھا جاتا تھا۔ وہ جن راہوں سے گزرتے منوں پھول نچھاور ہوتے۔ حسن بے نقاب ہو کر ان کے راستے روکتا۔ لیکن درویش منش لوگ نیچی نگاہیں کیے اپنی منزل پر رواں دواں رہے۔ مگر آہ! ذرا سے تغیر نے پھولوں بھری راہوں کو کانٹوں سے بھر دیا۔ کلیوں نے رخ پھیر لیے۔ سرو وسمن کے سائے ڈھل کر دھوپ کی تمازت کے لیے راہیں ہموار کرنے لگے۔ لالہ رخوں نے بادِ سموم کو ہوا دی صحن چمن کی ہر روش بادِ صبا کو سمیٹ کر بیٹھ گئی تاکہ اس راہ کے مسافروں کو سکون میسر نہ رہے۔

مجلس احرار کے قیام نے ہندو اخبارات کی پالیسی بدل دی۔ گزرے ہوئے کل اگر وہ احرار رہناؤں کو ان کی حب الوطنی پر دادِ تحسین کے ڈونگرے برساتے تھے تو آج انہیں وطن دشمن قرار دینے لگے۔ کانگریس کے نزدیک احرار زعماء گردن زدنی سمجھے جانے لگے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کی پالیسی کیا وضع کی کہ احرار نے ساری ہندو قوم کا اعتاب اپنے اوپر لے لیا۔ لیکن مجاہد اپنے لیے جو راہ منتخب کرتا ہے۔ سمندروں کے پانی اور پہاڑوں کی بلندیاں بھی پھر اس راہ کی روک نہیں بن سکتیں۔

احرار کے جواب میں احرار کانفرنس کے اختتام کو ابھی چند گھنٹے ہی گذرے تھے کہ کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ نے احرار کے آخری اجلاس کی دوسری قرارداد کے جواب میں حسب ذیل بیان دیا جو ۱۴-جولائی ۱۹۳۱ء کے اخبارات میں شائع ہوا۔

"میری مدت سے یہ خواہش رہی ہے کہ میری رعایا کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرقہ وارانہ جھگڑا پیدا نہ ہو۔ اور اگر کوئی باہم غلط فہمی پیدا ہو تو اول آپس میں بیٹھ کر طے کریں یا پھر میرے دروازے میری رعایا کے لیے کھلے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی بیرونی مداخلت ہرگز برداشت نہیں کی جائے گی۔

ریاست کے اندر گاؤ کشی اسی طرح ممنوع رہے گی جس طرح پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ ملازمتیں حسب سابق انہی لوگوں کو ملیں گی جو پشتنی اس کے حقدار چلے آ رہے ہیں۔ اگر کسی نے حکومت کے خلاف ریاست کے اندر بیرونی تعاون سے کسی قسم کی کوئی تحریک چلائی یا سازش کرنے کی کوشش کی تو میرے اہلکار جن میں مجسٹریٹ اور پولیس شامل ہے ریاست کے اندرونی امن کو قائم رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔"

اقتدار خواہ چند گز زمین پر ہی ہو لیکن اس کا وارث جب زبان کھولتا ہے تو ساری کائنات کا خالق ہو کر بولتا ہے۔ انجام سے غافل انسان اپنی تھوڑی سی پونجی پر بھی اس قدر مان کرتا ہے کہ جیسے یہ سورج ہمیشہ اسی کے منڈیر پر رہے گا۔ اور اس کے سائے کبھی نہیں ڈھلیں گے۔ ناہموار زمین کے مختصر ٹکڑے پر راج کرنے والا ظلم کے پہاڑ پر کھڑا مہاراج کس انداز سے بول رہا ہے۔ غریب اور مظلوم رعایا کا راجہ، نہتی اور بے بس مخلوق کا حکمران سونے کے سنگھاسن پر بیٹھ کر بھوکے عوام پر کیسی تیراندازی کر رہا ہے۔

توپوں، بندوقوں اور سنگینوں سے مسلح ڈوگرہ شاہی بتیس لاکھ کشمیریوں کو حق خود ارادیت سے محروم رکھنے کے لیے کیسے کیسے بہانے تراش رہی ہے ——— غرور کی یہی وہ آواز ہے، جسے فطرت بڑے نزدیک سے سنتی ہے۔ راعی اور رعایا کے مابین تصادم کا آغاز مہاراجہ کے اسی بیان سے ہوا۔

مجلس احرار کی بنیادی قرارداد کے جواب میں کانگریس کمیٹی نے ۲۰۔جولائی ۱۹۳۱ء کو فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لیے چند تجاویز کے ساتھ حسب ذیل بیان دیا۔

۱۔ (ا) دستور اساسی میں بنیادی حقوق کے سلسلے میں جو دفعات ہوں گی ان میں مختلف قوموں کو ان کی تہذیب و تمدن، زبان، رسم الخط، تعلیم، پیشوں، مذہبی اعمال اور مذہبی اوقاف کے متعلق اطمینان دلایا جائے گا۔

(ب) مختلف صوبوں میں اقلیتوں کے سیاسی اور دیگر حقوق کا تحفظ مرکزی حکومت کے ذمہ اور اس کے محیط اقتدار میں ہوگا۔

۲۔ تمام بالغوں کو حق رائے دہی حاصل ہوگا۔ جس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوں گے۔

(تشریح) کانگریس کی مجلس عاملہ کراچی کانگریس کی ایک قرارداد کے مطابق بالغوں کے حق رائے دہی کی پابند ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تاہم اس خیال سے بعض حلقوں میں اس کے متعلق شک ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کو صاف کرنے کی غرض سے مجلس عاملہ یہ بتا دینا چاہتی ہے کہ جس وقت بھی معیار رائے دہی میں توسیع کی جائے گی اس وقت اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ یہ توسیع دو چیزوں کو لیے ہوئے ہو۔ ایک تو یہ کہ معیار رائے دہی تمام فرقوں کے لیے مساوی ہو اور دوسری یہ کہ ہر فرقہ کی آبادی کے تناسب سے اس کے رائے دہندوں کی فہرست مرتب ہو۔

۳۔ (ا) ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی میں مخلوط انتخاب نمائندگی کی اساس اور بنیاد ہوگا۔

(ب) ہندوؤں کے لیے سندھ میں، مسلمانوں کے لیے آسام میں۔ سکھوں کے لیے پنجاب اور سرحد میں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ہر اس صوبے میں جہاں ان کی تعداد پچیس فیصد سے کم ہو۔ ہندوستان کی مرکزی مجلس اور اسی طرح صوبجاتی مجالس قانون ساز میں آبادی کے تناسب سے ان کی نشستیں محفوظ ہوں

گی۔ اور انہیں علاوہ محفوظ نشستوں کے باقی ماندہ نشستوں میں بھی عام انتخاب کے وقت مقابلے کا حق ہوگا۔

۴۔ ملازمتیں ایک غیر جانبدار پبلک سروس کمیشن کے سپرد کردی جائیں گی۔ جو قابلیت کا کم ازکم معیار مقرر کرے گا اور تمام فرقوں کو ملک کی ملازمتوں میں منصفانہ حصہ حاصل کرنے کے مساوی مواقع دلائے گا۔

۵۔ مرکزی اور صوبجاتی وزارتوں کی ترتیب و تشکیل میں کونشن (مختلف پارٹیوں کے لیڈرز کے ساتھ وزیراعظم کی مجلس مشاورت وزارتوں کے مرتب کرنے کے لیے) کے ذریعے اقلیتوں کے حقوق کی نمائندگی ہوا کرے گی۔

۶۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے مساوی آئینِ حکومت حاصل ہوگا۔

۷۔ سندھ کو اس شرط پر علیحدہ صوبہ بنایا جائے گا کہ وہاں کے باشندے صوبے کے مصارف برداشت کرنے کو تیار ہوں۔

۸۔ ملک کا آئندہ دستور اساسی ترکیبی (فیڈرل) ہوگا۔ اور باقی ماندہ یا مصرحہ اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں گے۔ سوائے اس کے کہ مزید تجربہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ صورت ملک کے بہترین مفاد کے خلاف ہے۔

مجلس احرار کا جواب

کانگریس کی اس قرارداد کے جواب میں مجلس احرار نے ۲۲۔ جولائی ۱۹۳۱ء کو اپنا ایک ہنگامی اجلاس منعقد کیا۔ جس میں حسب ذیل رہنما شامل ہوئے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی۔ امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری۔ چودھری افضل حق۔ مولانا مظہر علی اظہر، شیخ حسام الدین، مولانا احمد علی اور ڈاکٹر عبدالقوی۔

مجلس احرار کی مجلس عاملہ نے کانگریس فارمولا کی مختلف دفعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جواب میں حسب ذیل قرارداد پریس کو دی۔

۱۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے یہ تو مان لیا ہے کہ ہندوستان کا آئندہ دستور ترکیبی (فیڈرل) ہو۔ لیکن اقلیتوں کے مسائل کو براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت رکھ کر اس نظام ترکیبی کی حقیقی حیثیت بالکل بدل ڈالی ہے۔ باقی ماندہ اختیارات بھی مشروط طریق پر صوبوں

کے حوالے کیے گئے ہیں اور لکھ دیا گیا ہے کہ اگر مزید تحقیق پر ضرورت سمجھی گئی تو انہیں مرکزی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ گویا مجوزہ دستور اگرچہ بظاہر فیڈرل ہوگا لیکن حقیقتاً باعتبارِ عمل اسے یونٹری سمجھا جائے گا۔ سارے اختیارات مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوں گے۔ جہاں ہندوؤں کو ہمیشہ اکثریت حاصل رہے گی۔

۲۔ بالغوں کی رائے دہی کو غیر اہم بنا دیا گیا ہے اور نہرو رپورٹ کی طرح اسے دستور اساسی کا بنیادی پتھر نہیں سمجھا گیا۔ ایک متبادل سکیم بھی پیش کر دی گئی ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ معیار رائے دہی سب کے لیے یکساں ہوگا۔ لیکن مختلف اقوام کے تناسب آبادی کو تناسب رائے دہندگان میں منعکس کیا جائے گا۔ اس متبادل سکیم سے بالغوں کے رائے کے مطالبے کا سارا زور جاتا رہا ہے۔ لہٰذا اس سکیم پر عمل کرنا بالکل غیر ممکن ہے۔ کوئی ایسا یکساں معیار رائے دہی تجویز نہیں کیا جا سکتا جس کے ذریعے سے آبادیوں کا تناسب ووٹروں کے تناسب میں منعکس ہو جائے۔

۳۔ کانگریس نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوؤں کے لیے سندھ میں، مسلمانوں کے لیے آسام میں سکھوں کے لیے پنجاب اور سرحد میں اور ہندو اور مسلمانوں کے لیے ہر اس صوبے میں جہاں ان کی آبادی پچیس فیصد سے کم ہو نشستیں آبادی کی بنا پر مخصوص کر دی جائیں گی اور انہیں مزید نشستوں کے مقابلے کا حق حاصل رہے گا۔

یہ تجویز بالکل لغو ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ پنجاب کے سوا ہندوستان کے ہر حصہ میں نہرو رپورٹ والی صورت قائم رہے گی۔ نہرو رپورٹ کے ماتحت پنجاب کے لیے نشستیں مخصوص نہیں کی گئی تھیں۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے صاف صاف یہ نہیں کہا کہ پنڈت مالویہ، مہاتما گاندھی اور اس دماغ کے دوسرے احباب کے نظریات قبول کر کے پنجاب میں سکھوں کے لیے مسلمانوں کے نقصان پر رعایت کا بندوبست کیا گیا ہے بلکہ یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ہندوؤں کے لیے سندھ میں اور مسلمانوں کیلئے آسام میں نشستیں مخصوص ہوں گی۔ گویا ایک نیا توازن قائم کیا جا رہا ہے۔ اور سکھوں کو پنجاب میں جو کچھ دیا جا رہا ہے وہ مسلمانانِ آسام کے معاوضہ میں دیا جا رہا ہے۔ مشہور سکھ لیڈر

گیانی شیر سنگھ نے حال ہی میں جو اعلان شائع کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی نے گیانی صاحب کو بتایا کہ پنجاب دسرمد میں دو انتخاب ہوں گے۔ اولاً آبادی کی بنا پر سکھوں کی مخصوص نشستوں کے لیے علیحدہ انتخاب ہوگا جس میں ووٹروں کی حیثیت سے ہندو اور مسلمان بھی شریک ہوں گے۔ لیکن امیدوار صرف سکھ کھڑے ہوں گے۔ اس انتخاب کی تکمیل کے بعد عام انتخاب ہوگا جس میں سکھ مزید نشستوں کے لیے مقابلہ کر سکیں گے اور اپنی تعداد بڑھا سکیں گے۔ اس طرح سکھوں کو کونسل میں دو مرتبہ نمائندے بھیجنے کا موقع مل جائے گا اور مسلمانوں کے لیے اپنی معمولی اور عددی اکثریت قائم رکھنے کا خفیف سا امکان بھی باقی نہیں رہے گا۔

۴۔ علیحدگی سندھ کو بدستور مشروط رکھا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ اگر باشندگان سندھ خرچ برداشت کرنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اگر سندھ کے ہندو زائد خرچ برداشت کرنے سے انکار کریں گے تو کیا ہوگا۔ نہ یہ بتایا گیا ہے کہ کون اس بات پر فیصلہ کرے گا۔ کہ اہل سندھ خرچ برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔ یہ تجویز تو گول میز کانفرنس کی سندھ کمیٹی کی تجویز سے بھی پیچھے ہٹ گئی ہے۔ اس لیے سندھ کمیٹی نے علیحدگی کا اصول تسلیم کر لیا تھا۔ صرف شرط یہ لگائی تھی کہ علیحدگی کی صورت میں خسارہ کا اندیشہ ہو تو نمائندگان سندھ کو اس خسارے کے پورا ہو جانے کے متعلق اطمینان دلانے کا موقع دیا جائے۔

۵۔ مرکزی حکومت میں مسلمانوں کو برطانوی ہند کی نشستوں میں سے ⅓ حصہ نہیں دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے قول کے مطابق اس مسئلہ کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے لیکن اس فارمولا کے مطابق مسلمانوں کو وہ تناسب حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا جا سکے گا جو انہیں اب حاصل ہے اور مرکز میں ان کی پوزیشن بالکل کمزور ہو جائیگی۔

۶۔ پرسنل لا وغیرہ کے متعلق جو تحفظات تجویز کیے گئے ہیں وہ جمعیۃ علمائے ہند کے نزدیک غیر تسلی بخش ہیں اور جمعیۃ اپنی رائے ظاہر کر چکی ہے۔

غرض کانگریس کی مجلس عاملہ کی سکیم گاندھی جی، ہندو مہاسبھا اور سکھ لیگ کے

درمیان مفاہمت کے سوا کچھ نہیں۔ مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے طبقے کو ان تجاویز پر رضامند کر لیا گیا ہے جو مسلمانوں کے مطالبات کے مترادف نہیں اور جن کے ذریعے ہندو اور سکھوں کو مرکز میں تمام بڑے بڑے صوبوں میں عام اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ جس مسلمان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں اور اس کا دل ہندوؤں کے پروپیگنڈے کی قوت سے متاثر نہ ہو۔ ان تجاویز کو قبول نہیں کر سکتا، جو ملّت اسلامیہ کی سیاسی ہستی کو فنا کر دینے والی ہیں۔

سالِ رواں کا یہ مہینہ وقت کے سیاسی جوار بھاٹا میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یورپین سیاستدان، ہندو دانشور اور مسلمان رہنما اپنی اپنی بساط پر مہروں کو گھٹا اور بڑھا رہے تھے۔

مہاتما گاندھی باوجود کہ دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کا فیصلہ کر چکے تھے۔ تاہم ان کے ہاتھ میں اقلیتوں کے تحفظ کے حقوق کی کوئی مستند دستاویز نہیں تھی۔ گو اپریل ۱۹۳۱ء میں سرعلی امام ایسے لوگوں نے لکھنؤ سے انہیں چند نیشنلسٹ مسلمانوں کی بیٹھک کے ذریعے ایک سند دے دی تھی۔ لیکن سر آغا خاں کی مسلم لیگ اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ یہ کشمکش زوروں پر تھی کہ ۸۔ اگست ۱۹۳۱ء کو مسٹر محمد علی جناح (قائداعظم) ایک ذاتی کام کے سلسلے میں انگلستان سے ہندوستان آئے اور انہوں نے الٰہ آباد (یوپی) مسلم کانفرنس کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

"میرے نزدیک سب سے اہم مسئلہ ہندو مسلم سمجھوتے کا ہے۔ اس بارے میں میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ ہندوؤں کو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کا اصول تسلیم کر لینا چاہیے۔ اگر ہندو اس بات پر آمادہ ہو جائیں تو بہت جلد سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلم اکثریت جداگانہ انتخاب کے ذریعے کامیاب ہو یا مخلوط طرز انتخاب کے ذریعے؟ آپ میں سے اکثر صاحبان کو علم ہے کہ میں ذاتی طور پر مخلوط انتخاب کی بنیاد پر پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریتوں کی نشستوں کا تعین پسند کروں گا۔ لیکن مسلمانوں کی بھاری اکثریت جداگانہ طرز انتخاب پر اصرار کرتی ہے۔ اگر سمجھوتہ اس کے بغیر نہ ہو سکے تو پھر سمجھوتے کی خاطر جداگانہ انتخاب کو قبول کر لے

سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے - اور اس بات پر بھروسہ رکھنا چاہیے کہ آزادی کے بعد جب ہندو اور مسلمانوں کو مل جل کر آئین چلانا پڑے گا تو ان کی بدگمانی ختم ہو جائیگی اور جداگانہ انتخاب بھی ختم ہو جائیں گے۔"

(قائدِ اعظم)

اس تقریر سے تھوڑے دنوں بعد بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر محمد علی جناح نے کہا،

"میں اول ہندوستانی ہوں اور اس کے بعد مسلمان ہوں۔ لیکن کوئی ہندوستانی مسلمانوں کو نظر انداز کر کے اپنے وطن کی صحیح خدمت نہیں کر سکتا۔ میری نظر کسی پارٹی پر نہیں ہے نہ مجھے ہر دل عزیزی کی بھوک ہے لیکن مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ہندوؤں نے اس وقت جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ سراسر احمقانہ ہے۔ مہاتما گاندھی نے آخری گول میز کانفرنس میں جانا منظور کر لیا ہے۔ میں تو بھی اس میں شرکت کروں گا۔ لیکن وہاں کیا ہوگا؟ حکومت برطانیہ فوراً کہہ دے گی کہ آپ لوگوں میں بنیادی اتحاد ہی نہیں۔ لہٰذا آپ آزادی کا آئین کس طرح چلائیں گے۔

(ص ۱۳۴ - مارشل لا سے مارشل لا تک)

مسٹر محمد علی جناح کے ان نظریات کی سزا انہیں پہلی گول میز کانفرنس میں مل چکی تھی۔ جیسے کہ میاں سر فضل حسین کے مندرجہ ذیل خط سے ظاہر ہے۔ جو انہوں نے ۱۰ مئی ۱۹۳۰ء کو یو پی کے سر میلکم ہیلی کو لکھا۔

"صاف صاف بات یہ ہے کہ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کانفرنس میں صرف جناح تقریریں کرے اور اسے ٹوکنے والا کوئی نہ ہو۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اگر جناح اپنی تقریروں میں ایسے خیالات کا اظہار کرنے لگ جائے جو محض اس کے ذاتی خیالات ہوں اور جس سے ہندوستانی مسلمان قطعاً متفق نہیں تو پھر کانفرنس میں ایک آدھا ایسا مضبوط اور نڈر آدمی ضرور ہونا چاہیے، جو کھڑا ہو کر جناح کو دو بدو جواب دے سکے اور یہ کہہ سکے کہ جناح کے خیالات ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات نہیں ہیں۔

بلاشبہ یہ کام مشکل بھی ہے اور ناگوار بھی۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ اس نمائندے کی، جس کے خیالات کی تردید منظور ہے، حیثیت بہت بلند ہے۔

مجھے یقین ہے کہ شفاعت احمد اور ظفر اللہ اس فرض کی بجا آوری سے قطعاً دریغ نہیں کریں گے شفیع کے متعلق مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اس نے جناح کی مخالفت میں کچھ کہا تو مبادا اسے ذاتی رقابت پر محمول کیا جائے۔ (اقبال کے آخری دو سال ص ۲۱۴-۱۵)

اس طرح سے ہندوستان کا مسلمان چار دھڑوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ اول مسلمانوں کا وہ گروہ جو نیشلسٹ کہلاتا تھا۔ جس میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر محمد عالم، مولانا عبداللہ قصوری، ملک برکت علی ایڈووکیٹ اور مولانا ظفر علیخاں شامل تھے۔ دوسرا مسلم لیگ کا وہ فریق تھا جس میں سر آغا خاں، چودھری سر ظفر اللہ خاں، سر فضل حسین، ڈاکٹر سر محمد اقبال، سر محمد شفیع، ڈاکٹر شفاعت احمد نمایاں تھے۔ تیسرے درجے پر تنہا مسٹر محمد علی جناح تھے جو اپنی انفرادی رائے کے باعث رجعت پسند مسلمانوں میں غیر مقبول ہو چکے تھے اور اپنے چودہ نکات پیش کرنے کے جرم میں ہندوؤں کے معتوب تھے۔ چوتھا اور آخری ٹولہ احرار رہنماؤں کا تھا۔ جنہوں نے ۲۳۔ جولائی (۱۹۳۱ء) کی قرارداد منظور کر کے ایک طرف مہاتما گاندھی کو سارے ہندوستان کی نمائندگی سے محروم کر دیا تو دوسری طرف کے ٹوڈی قسم کے مسلمان بھی ان سے ناراض ہوئے۔

انگلستان میں لیبرل پارٹی جب مسٹر چرچل کی کنزرویٹو پارٹی کو انتخابات میں شکست دے کر برسر اقتدار آئی تو اس کے وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈونلڈ کی خواہش تھی کہ پہلی گول میز کانفرنس کی طرح دوسری گول میز کانفرنس بھی جو آئندہ ماہ انگلستان میں ہو رہی ہے ناکام رہے! اور اس کی ذمہ داری برطانیہ کی بجائے ہندوستان پر رہے۔ چنانچہ اس کام کے لیے ہندو کے علاوہ ہندوستان کا ٹوڈی مسلمان جس کی باگ ڈور اس وقت سر آغا خاں کے ہاتھ میں تھی بہت مفید ثابت ہوا۔

لہٰذا احرار کی کانگریس کے جواب میں ۲۳۔ جولائی کی قرارداد وقت کی اہم ترین قرارداد تھی۔ جسے ہندو اور انگریز تو بہر حال پسند کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن رجعت پسند مسلمانوں کو بھی یہ قرارداد ناگوار گذری۔

احرار کی پہلی عوامی تحریک

تحریک خلافت اور ترک موالات کو سبوتاژ کرنے کے لیے ہندو مہاسبھا نے غیر ملکی حکومت کی شہ پر ۱۹۲۳ء میں جو فرقہ وارانہ فسادات کی رو ہندوستان میں اٹھائی تھی اس میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا منصوبہ بھی تھا۔ چنانچہ ان دنوں دہلی

جہلم، کیمبلپور، کراچی اور کلکتہ میں بے شمار ایسے واقعات ہوئے کہ ہندوؤں اور سکھوں نے خاتم الانبیاء کی توہین کی اور وہ مسلمان نوجوانوں کے ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچے۔

انہی دنوں لاہور میکلیگن انجینئرنگ کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر ولیکر نے بھی یہ چاؤ پورا کرنا چاہا۔ اور اس نے دورانِ تعلیم کلاس میں طالب علموں سے کچھ ایسی باتیں کیں جس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے واضح پہلو نکلتے تھے۔ انگریز پرنسپل کے یہ الفاظ ہنوز کالج کی چار دیواری میں تھے کہ احرار ہائی کمان نے نے قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے ساتھ راقم (جانباز مرزا) کو منتخب کیا کہ ہم شمالی پنجاب میں ابتدائی مجلسِ احرار کے دفاتر قائم کریں۔ یہ اگست ۱۹۳۱ء کا ذکر ہے۔

مجلسِ احرار کا یہ وفد لاہور سے راولپنڈی تک گیا۔ وقت کی سیاسی ضرورت کی روشنی میں عوام کو مجلسِ احرار کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے کانگریس کی ہندو نوازی اور جداگانہ انتخاب کے فوائد سے آگاہ کیا۔ نیز مہاراجہ کشمیر اپنی رعایا کے ساتھ جو ناانصافیاں کر رہا تھا۔ ان دنوں کے اخبارات میں یہ چرچا بھی عام تھا۔ مجلس احرار کے وفد نے عوام کو ڈوگرہ شاہی کے ان مظالم کی داستان بھی سنائی اور دعوت دی کہ بتیس لاکھ کشمیریوں کے لیے آنے والے کل کو اگر قربانی و ایثار کی ضرورت پڑی تو وہ اس سے پہلوتہی نہیں کریں گے۔

اس جماعتی سفر میں لاہور کے بعد گوجرانوالہ، سیالکوٹ، ڈسکہ، چونڈہ، پسرور، نارووال، لائلپور وزیرآباد، جہلم اور راولپنڈی سے متعدد مخلص کارکنوں کی ایک کھیپ مجلس احرار کو میسر آئی۔ جن میں اکثر لوگ آگے چل کر بین الاقوامی شہرت کے مالک بنے۔

ان دنوں مہاتما گاندھی دوسری گول میز کانفرنس کے لیے فرنگی سیاستدانوں کی دعوت قبول کر چکے تھے۔ تاہم وہ اس تذبذب میں تھے کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمان انہیں اپنی نمائندگی نہیں سونپ رہے۔ اسی کشمکش کے دوران لاہور میکلیگن انجینئرنگ کالج کا واقعہ ایک نئے ہنگامے کی صورت اختیار کر گیا۔ کالج سے نکل کر یہ تحریک عوامی غصے کا محور بننے لگی۔ یہاں تک کہ لاہور موچی دروازے کے باغ تک آن پہنچی۔ سروں اور خان بہادروں سے مایوس ہو کر کالج کمیٹی کے ارکان نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کے مشورہ پر ۸۔ ستمبر ۱۹۳۱ء کو مجلسِ احرار سے درخواست کی کہ وہ کالج تحریک کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ کمیٹی ہذا کی رائے تھی کہ

"پنجاب میں مجلسِ احرار ہی ایک ایسی منظم اور فعال جماعت ہے جو کامیابی سے اس ایجی ٹیشن کو چلا سکتی ہے۔"

طلباء کی اس درخواست پر ۹۔ستمبر کو احرار ورکنگ کمیٹی نے کالج تحریک کو سنبھال لیا چنانچہ ۱۱۔ستمبر کو موچی دروازہ کے باغ میں مجلسِ احرار کا پہلا اجتماع ہوا۔ جس میں مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ مسٹر ڈٹیکر کو کالج سے نکال دیا جائے گا۔ لیکن اس نے اپنے وعدے کا پاس نہیں کیا۔ اب ہم اس تحریک کو اپنے ہاتھ میں لے چکے ہیں۔ اور حکومت سے کہتے ہیں۔ کہ وہ طلباء کے تمام مطالبات مان لے۔ ورنہ مسلمان مجبور ہوں گے کہ وہ کالج کے سامنے پکٹنگ کریں اور یہ پکٹنگ پہلے کی طرح نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ احرار کی پکٹنگ ہوگی۔ اور اس سلسلے میں ہم حکومت کو صرف کل کے دن کی مہلت دیتے ہیں۔

اس دوران اخبارات کے ذریعے یہ تحریک سارے پنجاب میں پھیل چکی تھی۔ اور مجلسِ احرار کے قافلے لاہور آنا شروع ہو گئے تھے۔ ادھر احرار رہنما کشمیر میں ہر روز بگڑتے ہوئے حالات سے بھی غافل نہیں تھے۔ ۲۔ستمبر ۱۹۳۱ء کو مجلس کا ایک وفد مولانا مظہر علی اظہر کی قیادت میں مہاراجہ کشمیر کے ۱۴۔جولائی کے بیان کے باوجود کشمیر روانہ ہو چکا تھا۔ جس میں مولانا کے علاوہ چودھری افضل حق، خواجہ غلام محمد اور رانا آفتاب احمد شامل تھے۔

اس مصروفیت کے باوجود احرار رہنما کالج ایجی ٹیشن سے نبرد آزما تھے۔ مسلمانان لاہور کے جذبات انگریز پرنسپل کے خلاف مشتعل ہو چکے تھے۔ اگر اس تحریک سے پہلو تہی کی جاتی تو شاتمِ رسول کے حوصلے جوان ہونے کا احتمال تھا۔ انگریز پرست مسلمان اس تحریک کو بدست بچگان سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں تھے۔

احرار کے نزدیک مسٹر ڈٹیکر کا یہ فعل تحریک شاتمِ رسول کی ایک اہم کڑی تھا۔ اگر آج اس کے الفاظ کی گرفت نہ کی جاتی تو ہندوؤں کی طرح عیسائی پادری بھی خاتم الانبیا کے دامنِ اطہر پر گندگی اچھالنے سے باز نہ رہتے۔ بہر حال حالات و واقعات میں تغیر اس تیزی سے رونما ہوا کہ نہ تو کشمیر کے مسلمانوں

کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی کالج کے پرنسپل کی گستاخی نظر انداز کی جا سکتی تھی۔ احرار کے سوا پنجاب میں کوئی جماعت ایسی نہیں تھی جو اس قسم کی لڑائی لڑ سکتی یا حکومت سے الجھاؤ پیدا کرتی لیڈر مالی اعتبار سے بھی تہی دامن تھے۔ وہ بیک وقت دو تحریکوں کو چلانے کے متحمل بھی نہ تھے تاہم مسلمان عوام کی نگاہیں احرار پر تھیں۔ اور احرار رہنما مسلمانوں کے اس اعتماد کو زخمی کرنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے۔

آخر ۱۶ ستمبر (۱۹۳۱ء) کا وہ دن آیا جب مجلس احرار نے حکومت پنجاب کی بے اعتنائی کو اپنے لیے چیلنج سمجھ کر موچی دروازہ کے باغ میں جلسہ عام کا اعلان کر دیا۔ اس طرح میکلیگن کالج کے انگریز پرنسپل کے خلاف مجلس احرار نے اپنی عملی تحریک کا آغاز کیا۔

۱۷ ستمبر میکلیگن کالج کے لڑکوں کے امتحان کا دن تھا۔ احرار اس دن اس اہم کارروائی میں رکاوٹ ڈالنا چاہتی تھی۔ اور اس کے لیے اس نے کالج کے دروازے پر پکٹنگ کرنے کا پروگرام بنایا تاکہ کوئی طالبعلم کالج میں داخل نہ ہو سکے اور اس طرح کالج کی منتظمہ کو شکست دی جائے حکومت پنجاب بھی مقابلے کے لیے تیار تھی اور کالج کی منتظمہ بھی اپنے وقار کے لیے اپنی جگہ مستحکم تھی۔ احرار رہنما بھی آنے والے وقت سے بے خبر نہیں تھے۔ چنانچہ ۱۶ اور ۱۷ ستمبر کی درمیانی رات دو بجے حکومت پنجاب، کالج سٹاف اور مجلس احرار کے مابین عملی کشمکش شروع ہوئی۔ پچاس ہزار انسانوں کا کھولتا ہوا سمندر جو جلسے میں موجود تھا۔ انگریز پرنسپل کے غلط وقار جس کی پشت پر انگریز گورنر کی پوری طاقت کارفرما تھی، نیچا دکھانے کے لیے امیر شریعت کی رہنمائی میں منگلپورہ میکلیگن کالج کی طرف روانہ ہوا۔

رات اپنے سفر کی دوسری منزل میں تھی۔ آسمان پرستاروں کے ہجوم تھک ہار کر اونگھ رہے تھے۔ زہرہ اور مشتری اپنی قندیلیں مدھم کر رہے تھے اور آسمان کی سیاہی پر روشنی کے داغ ابھرنے لگے تھے۔ جب عصمتِ انبیا کے وارث پچاس ہزار مسلمانوں کے ہمرکاب عیسائی قوم کے ایک فرد کو اس کی غیر ذمہ داری کا احساس دلانے چلے تھے۔ راستے کی ہر چیز نے ان کے قدم لیے۔ رات کی اندھیری چادر نے اس قافلے کو اس طرح چھپا لیا جس طرح خالق اپنی مخلوق کے گناہ چھپا لیتا ہے۔ جیسے جیسے ہجوم میکلیگن کالج کی طرف بڑھتا گیا۔ انگریزی وقار کے وارث ٹوڈی مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی چلی گئیں۔ وہ کباب سیخاں کی طرح اپنے بستروں پر کروٹیں بدلنے

لگے۔ یہ رات سیاہ ناگن کی طرح انہیں ڈسنے کو دوڑ رہی تھی۔

اس سے پیشتر کہ میکلیگن کالج کے دروازے پر صبح کو پکٹنگ کرنے والا یہ ہجوم منزل مقصود پر پہنچتا۔ گورنر اور ٹوڈی مسلمانوں کے باہم مشورے پر پولیس نے مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری، مولانا غلام مرشد اور مولانا داؤد غزنوی کو نقض امن کے تحت رات تین بجے گرفتار کر لیا۔

رات کے دم توڑتے ہوئے ماحول میں رائج الوقت حکومت نے ان قدموں میں قانون کی زنجیریں پہنا دیں۔ جن سے انگریز پرنسپل کے وقار کو خطرہ تھا۔ ان مسلمانوں کو پابجولاں کر دیا جن کے سروں پر کفن بندھے ہوئے تھے۔ جو موت کو اس زندگی سے زیادہ قیمتی سمجھتے تھے جو سرورِ کائنات کی حفاظت میں آ گئے۔

اب رات کے تاریک سائے نظامِ کائنات کو دن کے حوالے کر رہے تھے۔ مسجدوں کے مینار اذانوں سے باطل دلوں کی طرح کانپ رہے تھے۔ صبح صادق کے دامن پر رات کے مسافروں نے کالج کی عمارت سے ذرا دور نماز ادا کی اور اپنے پروردگار کے حضور سجدہ ریز ہو کر کامیابی کی دعائیں مانگیں۔

رہنماؤں کی گرفتاریوں نے تحریک کو ایک نیا موڑ دیا اور جذبات جو پہلے ہی مشتعل تھے ان پر مزید تیل ڈال دیا اور یہ آگ اس حد تک شعلے دینے لگی کہ فرنگی پرنسپل کے ساتھ فرنگی وقار بھی جلتا دکھائی دینے لگا۔

مجلسِ احرار کے پروگرام کے مطابق کالج کے دروازے پر پکٹنگ کے لیے رضا کاروں کا تعین کر دیا گیا اور ان کی گرفتاریاں بھی شروع ہو گئیں۔ جو رضا کار گرفتار ہوتے ان کی جگہ دوسرے رضا کار سنبھال لیتے۔ سول نافرمانی کا یہ سلسلہ شروع تھا کہ راقم کو مجلسِ احرار کی طرف سے حکم ہوا کہ ان رضا کاروں کو جو صبح کسی طرح کالج کے ابتدائی گیٹ سے اندر جانے میں کامیاب ہو گئے تھے، اور وہ بھوکے ڈیوٹی دے رہے تھے، بھنے ہوئے چنے دے آؤں۔ لیکن جیسے ہی راقم کالج کے پہلے دروازے پر پہنچا۔ پولیس نے روک لیا۔ اب میرے اور پولیس کے درمیان کشمکش شروع ہوئی۔ میرا اصرار تھا کہ میں بہرحال رضا کاروں تک پہنچوں۔ اور پولیس مجھے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ اس جھگڑے میں جیسے ہی میں آگے بڑھا، پولیس کے ایک سپاہی نے بید کی لاٹھی میرے دائیں بائیں پر اس زور سے رسید کی کہ میرے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہ چوٹ لگنا تھی کہ میں بے ہوش ہو گیا۔

ہوش سنبھالا تو میں دفتر احرار میں پڑا تھا۔ اور میرے ہاتھ کے نیچے اوپر لکڑی کی تختیاں رکھ

پٹی بندھی ہوئی تھی۔

اس واقعہ پر سے چالیس برس گزر چکے ہیں لیکن دائیں ہاتھ کی ہڈی ہنوز ابھری ہوئی ہے۔ اس بازو پر یہ دوسری چوٹ تھی۔ پہلی ضرب ۱۹۳۰ء میں تحریک آزادئ وطن میں پولیس کی لاٹھی چارج سے آئی تھی۔ اس کا نشان بھی باقی ہے کہ میرا دایاں کندھا جسم کے زاویے سے قدرے ابھرا ہوا ہے۔

مولانا مظہر علی اظہر کی واپسی

احرار رہنماؤں اور رضاکاروں کی گرفتاریوں سے حالات کا سکون بگڑ چکا تھا۔ پنجاب کے اخبارات نے اس تحریک کو شہ سرخیوں سے سجا رکھا تھا۔ حکومت پنجاب کو واقعات کے اس حد تک بگاڑ کا یقین نہیں تھا۔ لیکن عوام کے جذبات تھے کہ بہار کی طرح ابھر کر سامنے آ چکے تھے۔ اس دوران مولانا مظہر علی اظہر جو ۲۔ستمبر کو ایک وفد کی قیادت کرتے ہوئے مہاراجہ کشمیر سے ملنے گئے تھے۔ واقعات کی اطلاع پا کر ۱۹ ستمبر کو لاہور پہنچ گئے۔ اسی روز کے اخبارات میں جمعیتہ علمائے ہند کا ایک تار شائع ہوا جو انہوں نے وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن کو دیا تھا۔

"احرار رہنماؤں کو جنہیں میکلیگن کالج تحریک کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اگر رہا نہ کیا گیا تو حالات مزید بگڑ جائیں گے جس کی ذمہ داری حکومت پر ہوگی۔"

مولانا مظہر علی اظہر لاہور پہنچ کر حالات و واقعات پر حکام بالا سے گفتگو کا ارادہ کر رہے تھے کہ کالج کمیٹی کا ایک وفد، جس کی قیادت میکلیگن کالج کے ایک طالبعلم مظہر نواز خاں (ملتان) کر رہے تھے۔ مولانا مظہر علی اظہر سے ملنے آیا۔ انہوں نے کہا، کہ

"ہم آپ سے اس لیے ملنے آئے ہیں کہ موجودہ تحریک اس حد تک آگے جا چکی ہے کہ ہمیں اس کا امکان نہیں تھا۔ ہماری خواہش صرف یہ تھی کہ ڈاکٹر اقبال ہماری سرپرستی کریں اور کالج ہذا کے پرنسپل سے مل کر کوئی باعزت تدبیر کریں۔ تاکہ کالج اور طالب علموں کے درمیان سمجھوتہ ہو جاتے۔ لیکن رہنماؤں کی گرفتاریوں سے بات دور نکل گئی ہے اور ادھر ڈاکٹر اقبال حکومت کی دعوت پر دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے لندن جا رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بلا کر کہا ہے کہ میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ احرار والوں سے مل کر اپنی کوئی بات طے کرا لیں۔ لہٰذا اب جیسے بھی ہو آپ لوگ یہ قضیہ

ختم کرانے کی کوشش کریں۔"

طالب علموں کی یہ بات سن کر دفتر کے سب لوگ حیران ہوئے اور دوسرے دن میاں عبدالعزیز بیرسٹر، صدر بلدیہ لاہور، خلیفہ شجاع الدین اور مولانا مظہر علی اظہر ایک وفد کی صورت میں حکومت پنجاب سے ملنے شملہ روانہ ہو گئے۔ وہاں ان کی ملاقات سر ہنری کریگ فنانشل ممبر حکومت پنجاب سے ہوئی۔

حکومت کا خمار آدمی کے حواس کھو دیتا ہے، اور وہ ایسی گفتگو کرتا ہے، جس کے پاؤں تلے زمین نہیں ہوتی، یہی بے بنیاد باتیں بعض دفعہ حکومتوں کے زوال کا باعث بنتی ہیں۔

وفد کے قائد میاں عبدالعزیز نے فنانشل ممبر سے اپنی آمد کا مدعا بیان کیا تو ہنری کریگ نے غصے میں کہا۔

"تم لوگوں نے ذرا سی بات کو ہوا دے کر پنجاب میں جو فساد مچا رکھا ہے ہم اس کو ختم کر دے گا۔ حکومت کے ہاتھ بڑے مضبوط ہیں۔ اس کے پاس ایسے ایسے ذرائع ہیں کہ تمہارے ایسے لوگوں کو فوراً درست کیا جا سکتا ہے۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔ میرے پاس تم جیسے لوگوں کی بیکار باتیں سننے کا کوئی وقت نہیں۔"

مولانا مظہر علی اظہر جو بادلِ نخواستہ وفد کے ساتھ گئے تھے۔ اس گفتگو کے دوران خاموش بیٹھے رہے اور جب یہ لوگ فنانشل کمشنر کے دفتر سے اپنا سا منہ لے کر نکلے تو مولانا مظہر علی اظہر شملے سے اکیلے واپس آئے۔ کیونکہ دونوں حضرات (میاں عبدالعزیز اور خلیفہ شجاع الدین) نے عوام سے اپنی خفت چھپانے کے لئے کچھ دن شملہ میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مولانا مظہر علی اظہر نے دفتر احرار میں تار دیا کہ گفتگو ناکام ہو چکی ہے۔ اور میں پرسوں کالکا ایکسپریس کے ذریعہ لاہور پہنچوں گا۔

اس عرصہ میں دوسری گول میز کانفرنس کے نامزد ممبران لندن روانہ ہو چکے تھے۔ علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبال بھی انہی میں شامل تھے۔ پہلی گول میز کانفرنس میں ڈاکٹر اقبال مدعو نہیں تھے جس کا انہیں بے حد قلق تھا۔ جب تمام برطانوی ذہنیت یافتہ حضرات کو پہلی گول میز کانفرنس میں لندن بلوایا گیا تو ڈاکٹر سر محمد اقبال کو کیوں نہیں؟

۱۹۳۰ء کا الہ آباد کا خطبہ شاید اسی کا ردِ عمل تھا جیسے کہ اس خطبے کے حسب ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے۔

"انگریزوں نے والیانِ ریاست کو فیڈریشن میں شریک ہونے کی دعوت دی اور ہندو چپ چاپ اس پر رضامند ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ والیانِ ریاست کی شرکت سے جن میں مسلمانوں کی تعداد نہایت کم ہے۔ دو مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک طرف وہ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے تسلسل میں مدد دیں گے۔ دوسری طرف ہندوؤں کو فیڈرل اسمبلی میں ان کی بدولت اکثریت حاصل ہو جائے گی۔

میرا خیال ہے کہ مرکزی حکومت کی شکل کے متعلق ہندو اور مسلمانوں میں جو اختلاف موجود ہے۔ انگریز مدبرین والیان ریاست کے ذریعے نہایت چالاکی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ خود والیانِ ریاست بھی یہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ اس اسکیم کے تحت ان کی مستبدانہ حکومت اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ اگر مسلمانوں نے اس اسکیم کو خاموشی کے ساتھ منظور کر لیا تو ان کا سیاسی وجود تھوڑے ہی عرصے میں کالعدم ہو جائے گا۔ کیونکہ اس قسم کے فیڈریشن میں ہندو والیانِ ریاست کی اکثریت ہوگی اور وہی حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے۔ اگر دولت برطانیہ کے مفاد کا سوال در پیش ہوگا تو حکومت انگلستان کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جہاں تک ملک کے اندرونی نظم و نسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کا تسلط اور اقتدار قائم رکھیں گے۔ بالفاظ دیگر یہ اسکیم برطانوی حکومت اور ہندو ہندوستان کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہے۔ یعنی اگر تم میرا اقتدار ہندوستان میں قائم رکھو تو میں تمہیں ایک ایسی حکومت قائم کرنے میں مدد دوں گا جس میں تمہارا (یعنی ہندوؤں کا) غلبہ ہوگا۔ اگر برطانوی ہندوستان کے تمام صوبے حقیقتاً خود مختار ریاستوں کی صورت اختیار نہ کر لیں تو پھر فیڈریشن میں والیانِ ریاست کی شرکت کا مطلب صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ انگریز مدبرین اپنے اختیارات سے دست بردار ہوئے بغیر نہایت چالاکی کے ساتھ تمام جماعتوں کو خوش کر دینا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کو لفظ فیڈریشن، ہندوؤں کو مرکز میں اکثریت اور انگریز حامیانِ سلطنت کو خواہ وہ ٹوڈی جماعت سے ہوں یا مزید جماعت سے حقیقی اختیارات کی قوت سے ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد اسلامی ریاستوں سے کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا یہ دیکھنا باقی ہے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ انہیں مرکزی فیڈرل اسمبلی میں ۳۳ فیصدی

نشستیں حاصل ہوں۔ اس ایک ایوان یا ایوانات میں کیونکر پورا کیا جائے گا۔ جو دیسی ریاستوں اور برطانوی ہندوستان دونوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان ہندوبین فیڈرل حکومت کے اس مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جیسا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں اس پر غور وخوض ہو رہا ہے۔ (حرف اقبال ص ۳۶ تا ۳۸)

علامہ اقبال چونکہ فرنگی دانشوروں کے ناخن تدبیر سے آشنا تھے لہٰذا انہوں نے پہلی گول میز کانفرنس کے دوران مندرجہ بالا بیان سے فرنگی کی تمام سازش کو بے نقاب کر دیا تھا۔ فرنگی سیاستدانوں کو اقبال کی یہ ادا پسند نہ آئی اور انہوں نے قیاس کیا کہ الٰہ آباد کا خطبہ گول میز کانفرنس میں اقبال کو دعوت نہ دینے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ دوسری گول میز کانفرنس میں علامہ سر محمد اقبال کو دعوت دے دی گئی اور وہ میکلیگن کالج تحریک کو درمیان میں چھوڑ کر انگلستان چلے گئے۔

تاہم تحریک زوروں پر تھی۔ گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور لاہور بورسٹل جیل میں رہنماؤں کو مسٹر ڈرنی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر کے انہیں پچیس پچیس ہزار کی ضمانت دینے کو کہا گیا۔ لیکن تمام گرفتار شدگان نے عدالت کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

مولانا مظہر علی اظہر شملہ سے جب واپس لاہور اسٹیشن پر اترے تو لاہور کے سٹی مجسٹریٹ لالہ نتھورام مولانا کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ معلوم ہوا مولانا مظہر علی اظہر کا تار جو انہوں نے شملہ سے دفتر احرار میں اپنی آمد اور گفتگو کی ناکامی کے سلسلے میں دیا تھا، دفتر کی بجائے حکومت پنجاب کے ہاتھ آگیا تھا۔

لالہ نتھورام نے اسٹیشن پر مولانا سے درخواست کی کہ آپ میرے گھر چلیں تاکہ کالج کے سلسلے میں کوئی بات طے کی جائے۔ چنانچہ مجسٹریٹ کے مکان پر دیر تک بات چلتی رہی اور اسی شام کو دوسرا اجلاس ہوا۔ جس میں مولانا مظہر علی کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر عبدالقوی، سر مراتب علی، عبدالمجید سالک مدیر روزنامہ انقلاب لاہور موجود تھے۔ اور فیصلہ ہوا کہ اگر کالج کا پرنسپل اپنے الفاظ واپس لے لے۔ نیز تمام طلباء کو غیر مشروط داخلہ مل جائے تو تحریک واپس لے لی جائے گی۔ اور تمام قیدی رہا کر دیے جائیں۔

اس فیصلے کے پیش نظر ۲۴ ستمبر ۱۹۳۱ء کو حکومت پنجاب کے ایماء پر لالہ نتھورام کے مکان پر مندرجہ بالا حضرات کی موجودگی میں میکلیگن کالج کے پرنسپل مسٹر ڈیکر نے حسب ذیل بیان (انگریزی)

میں پڑھا۔

"میرا ہرگز یہ مدعا نہیں تھا اور یہ بات میرے ذہن میں بھی نہیں تھی کہ میں کوئی ایسا لفظ کہوں جس سے پیغمبر اسلام کی توہین مقصود ہو۔ لیکن اس کے باوجود اگر میرے کسی لفظ سے یہ مطلب لیا گیا ہے تو میں مسلمانانِ ہندوستان سے معذرت خواہ ہوں اور معافی مانگتا ہوں"۔

اس بیان کے بعد مسلم زعماء کی موجودگی میں مسٹر ڈٹیکر کو معاف کر دیا گیا۔ اور تحریک واپس لے لی گئی۔ اسی شام بورسٹل جیل لاہور سے تمام قیدی رہا کر دیے گئے اور ساتھ ہی کالج کے تمام طلباءً کو کالج میں داخل کر لیا گیا۔ اس پر مولانا ظفر علی خاں نے مندرجہ ذیل اشعار کہے۔

مسلمانوں کی قربانی کا ثمر مل گیا ان کو ۔ حکومت جھک گئی پیغمبر اسلام کے آگے

ہوئی تسلیم بے چون و چرا جھٹکی بجاتے ہیں ۔ شرائط ہم نے جتنی پیش کیں حکام کے آگے

کیا وہ کام جب ہم نے خدا خوشنود ہو جس سے ۔ ہوئی دنیا کی گردن خم ہمارے نام کے آگے

سپر انگریز نے ہندوستان میں ڈال دی آخر ۔ بصد زاری خدا کے آخری پیغام کے آگے

اس طرح مجلس احرار کو انفرادی جدوجہد میں یہ پہلی کامیابی حاصل ہوئی۔

سیاسی جماعتوں کی طرح تعلیمی درسگاہوں کا ماحول بھی صاف ستھرا نہیں رہا تعلیم کے دوران نوجوانوں کا لا اُبالی پن یہاں بھی کھیل کود میں مصروف رہتا ہے۔ اس طرح کبھی وہ اپنی ضرورت کے کھلونے خود ڈھالتے ہیں اور کبھی انہیں آپ کھلونا بننا پڑتا ہے۔

بادی النظر میں لاہور انجینئرنگ میکلیگن کالج کی تحریک اس سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی کہ یہ بھی ایک سکینڈل تھا لیکن احرار کے نزدیک یہ تحریک کالج پرنسپل کے ان الفاظ کے خلاف جہاد تھا جو اس نے حضور سرور کائنات کے خلاف کہے تھے۔

انگریز پرنسپل کی یہ جسارت ایسے وقت میں تھی جب سارے ہندوستان کا ہندو ایک اسکیم کے تحت خاتم الانبیاؐ کی توہین کا مرتکب ہو رہا تھا۔ اگر احرار کالج تحریک کو محض کالج کی تحریک سمجھ کر الگ رہتے تو عیسائی مشنریوں کے منہ بھی داعیٔ اسلام کے خلاف کھل جاتے۔ لہٰذا زعمائے احرار کا اس تحریک کو اپنے ہاتھ میں لینا نہ تو ہنگامی تھا اور نہ وقتی جذبہ۔

کشمیر

خزاں سے اکتائی ہوئی بہاروں نے جب امان چاہی اور بادِ سموم سے اپنے کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنا چاہا تو کشمیر کی گل پوش وادیوں، پہاڑوں اور چنار کے درختوں نے انہیں اپنے ہاں بلا لیا۔ دریائے جہلم نے بہاروں کو خزاں کے خوف سے ہمیشہ کے لیے بے خوف کر دیا۔ نشاط باغ اور اننت ناگ کے خوبصورت نظاروں نے بہاروں کو حیاتِ جاوداں بخش دی۔ گل مرگ کے وسیع میدان بادِ صبا نے مخملی سبز پوشوں سے ایسے آراستہ کیے کہ بہاریں اٹھکیلیاں کرتی پھریں۔ نکہت بادِ بہاری سے زعفران کے لہلہاتے کھیتوں نے بہاروں کو خوش آمدید کہا اور ایسی جنت آراستہ کر دی کہ ابنِ آدم کو اخراجِ جنت کا کھٹکا باقی نہ رہا۔

یہی وہ خطہ ہے جس پر کبھی کبھار جنتِ ارضی کا گمان گزرتا ہے۔ کارِ جہاں کے بوجھ تلے دبا ہوا انسان جب اس سرزمین کی عطر بیز ہواؤں اور خوش آب سے کیف آور ہوتا ہے تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔ ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

گذشتہ ربع صدی سے یہ بہاروں کی زمین خونِ انسانیت سے سیراب ہو رہی ہے۔ رخِ لالہ سورج مکھی کی طرح آسمانوں کی طرف نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ دریائے جہلم کی ابھرتی موجیں آنے والے طوفان کے ڈر سے سہم کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اننت ناگ کے بہتے چشمے اس قدر روئے ہیں کہ خشک ہو چکے ہیں۔ نشاط باغ کی بہاریں اپنی ویرانیوں کے ماتم پر بیٹھی ہیں۔ برف سے لدی ہوئی پہاڑوں کی چوٹیاں اس دلہن کی طرح اپنے جوبن کا ابھار ضائع کر چکی ہیں۔ جس کا سہاگ شبِ عروسی سے پہلے اجڑ گیا ہو۔

کشمیر کے کوچہ و بازار ظلم و جور کی ایک ایسی داستان بن گئے ہیں۔ جن کے پتھروں سے بھی خون ٹپکنے لگا ہے۔

اس خطہ کے بازاروں میں انسانی قدم خوف و ہراس سے ڈگمگا رہے ہیں۔ دلوں کی دھڑکنیں ڈوگرہ شاہی اور بھارتی سنگینوں کے خوف سے ہر گھڑی رک رک جاتی ہیں۔

وہ بہاریں جو دامنِ کوہ میں امان ڈھونڈنے سمٹ آئی تھیں، بادِ سموم کے ہاتھوں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو چکی ہیں۔

یہ ہے وہ کشمیر جو ۱۹۳۱ء سے اپنی زیبائش، اپنا حسن، اپنی رعنائی جسے مشاطۂ فطرت نے سنوارا تھا، اپنے حکمرانوں کی ضد اور سیاسی ضرورت کے تحت ضائع کر چکا ہے۔

پنجاب میں جتنا عرصہ سکھوں کو اقتدار حاصل رہا ان کی خانہ جنگی نے پانچ دریاؤں کی سرزمین کو چین نہیں لینے دیا۔ خصوصاً مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد تو واقعات میں اس تیزی سے ردوبدل ہوا کہ وارثان رنجیت سنگھ نے برطانیہ سے آئے ہوئے حکمرانوں کو پنجاب حوالے کرنے میں دیر نہیں کی۔ ان دنوں سکھ افواج میں دیگر افسروں کے علاوہ گلاب سنگھ نامی جرنیل نے ایسا مرکزی کردار ادا کیا کہ انگریزوں کو پنجاب سنبھالنے میں دقت نہیں ہوئی۔ گلاب سنگھ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور اقتدار میں اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ انہی حرکات کے باعث وہ پنجاب میں سکھ دربار کا وزیر اعظم مقرر ہونے میں بھی کامیاب ہو چکا تھا۔ اور اس طرح سے اس نے سکھوں کے شاہی خاندان میں افتراق پیدا کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ اس دوران وہ فرنگی حکمرانوں سے سازش کرتا رہا تاآنکہ ایک دن ایسا آیا کہ جرنل گلاب سنگھ نے سکھ افواج کو فریب میں رکھ کر انگریزوں سے کشمیر کا سودا چکالیا۔ یہ نومبر ۱۸۴۵ء کا واقعہ ہے۔

جس تیزی اور فریب سے جنرل گلاب سنگھ نے سکھوں کو شکست دلا کر پنجاب انگریزوں کی سپرداری میں دیا۔ انگریزوں نے اُسی تیزی کے ساتھ جنرل گلاب سنگھ کو اس کی اپنی قوم سے غداری کے صلہ میں منہ مانگا انعام دیا۔

چنانچہ ۹۔ مارچ ۱۸۴۶ء کو سکھوں کے ساتھ انگریزوں کا معاہدہ ہوا۔ اور ۱۵۔ مارچ ۱۸۴۶ء کو گلاب سنگھ نے انگریزوں سے کشمیر سے متعلق ایک الگ معاہدہ کر لیا۔ اور یہی وہ معاہدہ ہے جو آئندہ بیعہ نامہ امرتسر کے نام سے مشہور رہا۔

معاہدہ

یہ معاہدہ ایک طرف حکومت برطانیہ اور دوسری طرف مہاراجہ گلاب سنگھ آف جموں کے مابین برطانوی حکومت کی جانب سے فریڈرک کیوری اور بریٹ ہنری منٹگمری لارنس کے ذریعے رائٹ آنریبل سرہنری ہارڈنگس۔ جی۔ سی۔ بی برطانوی منبر عظمیٰ۔ آنریبل پریوی کونسل گورنر جنرل مقرر شدہ آنریبل کمپنی برائے ایسٹ انڈیز کے تمام معاملات کی رہنمائی کرنے اور کنٹرول کرنے کے حکم پر مہاراجہ گلاب سنگھ کی بنفس نفیس موجودگی میں طے پایا۔

دفعہ ۱: برطانوی حکومت تمام پہاڑی علاقہ بمعہ تمام آزادی کے دریائے سندھ کے مشرق۔ راوی کے مغرب بمعہ چنبہ اور بغیر لاہور (جو کہ ۹۔ مارچ ۱۸۴۶ء کے لاہور کے صلحنامہ

کی دفعہ ۴ کی رو سے ریاست لاہور کو دے دیا گیا ہے) مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کی اولاد نرینہ کے قبضہ میں تبدیل کرتی ہے۔

دفعہ ۲ :۔ خطۂ زمین کی مشرقی سرحد کو جو مندرجہ بالا دفعہ کے تحت مہاراجہ گلاب سنگھ کے نام منتقل کیا گیا ہے برطانوی حکومت اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے اس مقصد کے لیے مقرر کیے ہوئے علی الترتیب کمشنران سروے کرنے کے بعد ایک علیحدہ ملاقات میں بنائیں گے۔

دفعہ ۳ :۔ مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے وارث کے نام مندرجہ بالا دفعات کی رو سے انتقال ریاست کے عوض مہاراجہ گلاب سنگھ برطانیہ کو پچھتر لاکھ روپیہ (نانک شاہی) پچاس لاکھ اس صلحنامہ کے شروع ہوتے وقت اور پچیس لاکھ یکم اکتوبر ۱۸۴۶ء کو یا اس سے پہلے دے دیں۔

دفعہ ۴ :۔ ان علاقوں کی سرحدیں مہاراجہ گلاب سنگھ کبھی کسی وقت بھی برطانوی حکومت کی رضی کے بغیر تبدیل نہیں کر سکیں گے۔

دفعہ ۵ :۔ کوئی مسئلہ متنازعہ جو مہاراجہ گلاب سنگھ اور حکومت لاہور یا کسی اور پڑوسی ریاست کے درمیان اٹھ کھڑا ہو اسے طے کرنے کے لیے انہیں برطانیہ کو ثالث مقرر کرنا ہوگا۔ اور وہ برطانوی حکومت کے فیصلے کو تسلیم کریں گے۔

دفعہ ۶ :۔ مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے جانشین اپنی تمام تر قوت کے ساتھ برطانوی سپاہیوں کو مل جائیں گے جبکہ وہ پہاڑوں پر یا ان کے مقبوضہ علاقوں کے پڑوس میں ہوں گے۔

دفعہ ۷ :۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کسی برطانوی باشندے یا یورپین باشندے یا امریکہ کی ریاست کے باشندے کو اپنے یہاں ملازمت کرنے یا خدمت لینے کی غرض سے بغیر برطانوی حکومت کی اجازت سے نہیں رکھیں گے۔

دفعہ ۸ :۔ مہاراجہ گلاب سنگھ خطۂ زمین کے انتقال کے عوض جو کہ انہیں ملی ہے۔ برطانوی حکومت اور لاہور دربار کے درمیان علیحدہ صلحنامہ جو بتاریخ ۱۱۔ مارچ ۱۸۴۶ء کو ہوا اس کی دفعہ ۵ - ۶ اور ۷ کی عزت کریں گے۔

دفعہ ۹ :۔ برطانوی حکومت مہاراجہ گلاب سنگھ کو بیرونی دشمن حملہ آور سے بچانے میں ان کی

مدد کرے گی۔

دفعہ نمبر ۱۰۔ مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔ اور اس اطاعت کے صلہ میں برطانوی حکومت کو ہر سال ایک گھوڑا۔ بارہ بکریاں۔ چھ بکرے اور تین جوڑے کشمیری شال کے پیش کریں گے۔

یہ صلحنامہ جس میں مندرجہ بالا دفعات شامل ہیں آج کے روز فریڈرک کیوری اور برنیٹ میجر منٹگمری لارنس کے ذریعے سر ہنری ہارڈنگس۔ جی۔ سی۔ بی گورنر جنرل کے حکم سے برطانوی حکومت اور بہ نفسِ نفیس مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان طے ہوا۔ اور آج کے روز رائیٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگس جی۔ سی۔ بی گورنر جنرل کی مہر ثبت ہو کر منظور رہا۔

امرتسر میں ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء یعنی ربیع الاول کے ۱۷ ویں دن ۱۲۶۲ھ کو لکھا گیا۔

انگریز اور گلاب سنگھ کے درمیان مندرجہ بالا تحریر پچھتر لاکھ سکہ رائج الوقت کے عوض وجود میں آئی۔ اور اس طرح گلاب سنگھ کو راجہ گلاب سنگھ بنا دیا گیا۔

کشمیر کے نئے وارثوں سے پیشتر یہاں کا حاکم اعلیٰ امام دین تھا۔ ڈوگرہ فوج جب کشمیر میں قبضہ کے لیے داخل ہوئی تو گورنر امام دین کی فوج سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی۔ ڈوگرہ فوج شکست کھا کر لاہور پہنچی۔ نئے معاہدے کے تحت انگریزوں نے امام دین کے مقابلے کے لیے گلاب سنگھ کو فوجی امداد دی۔ لیکن گورنر امام دین کو نئے معاہدے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اور اس نے لڑائی کو مفید نہ سمجھ کر کشمیر گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا۔

راجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کے اردگرد چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں کو کشمیر میں ضم کر لیا۔ اور اب وہ راجہ سے مہاراجہ بن گیا۔ پھر کیا ہوا؟ یہ سوال تاریخ کے جواب دینے کا ہے کہ ۱۸۴۶ء کے بعد کشمیر جنت نظیر وہاں کی انسانی آبادی کے لیے جہنم کی آگ کیوں اگلنے لگی؟ پھر جب مہاراجہ گلاب سنگھ نے استحکام راج کے لیے کشمیر میں مندرجہ ذیل آئین مسلط کیے تو انسانوں پر کیا گذری؟

آئینِ کشمیر

۱۔ اگر کوئی غیر مسلم اپنا آبائی مذہب تبدیل کر کے (یعنی مسلمان ہو جائے)، تو اس کی تمام جائیداد بحق مہاراجہ ضبط کر لی جائے گی۔ اور وہ اپنے خاندانی حقوق سے محروم سمجھا جائے گا۔ اس ضمن میں وہ شخص بھی سزاوار ہوگا جو کسی غیر مسلم کو

اسلام کی تبلیغ کرے۔ یا مسلمان ہونے کی ترغیب دے۔

۲۔ مسلمان نہ تو قلم کے ذریعے اپنا مؤقف بیان کر سکتے ہیں۔ اور نہ ہی انہیں زبان کی آزادی حاصل ہو گی۔

۳۔ فوج اور دوسرے سرکاری محکموں میں بھی مسلمانوں کو ان کی تعداد کے باوجود کم عمل دخل ہو گا۔

۴۔ زمینوں کی مالیت کے حقوق کی وارث ریاست ہو گی۔ زمیندار اپنی اراضی کے تمام حقوق سے محروم ہوں گے۔ یہاں تک کہ زمینوں میں قدرتی اگے ہوئے درخت بھی سرکاری سمجھے جائیں گے۔ اور نہ ہی کوئی اس زمین پر اپنا رہائشی مکان تعمیر کر سکتا ہے بغیر ریاست کی اجازت کے۔

۵۔ ٹیکس بحیثیت حکومت الگ ہوں گے۔ اور زمیندار سے اس کی پیداوار کا معقول حصہ بطور لگان کے بھی سرکار وصول کرے گی۔ نیز زمیندار کی بقایا پیداوار بھی ریاست خود اپنے مقرر کردہ بھاؤ پر خریدے گی اور پھر ریاست ہی اس جنس کو اپنے بھاؤ پر فروخت کرے گی۔

۶۔ بھیڑ بڑی ہو یا بچہ، بکری بڑی ہو یا بچہ دو روپے سات آنے فی جانور وصول کیا جائے گا۔ جبکہ غیر مسلم دہی پرانا ٹیکس ادا کریں۔ یعنی تین آنے فی جانور (مگر چونکہ یہ دھندہ زیادہ تر مسلمان ہی کرتے ہیں۔ اس لیے ٹیکس کا بوجھ ان پر ہے)

۷۔ تعلیمی امور شہروں میں سکول اور مدارس کا انتظام بھی معقول نہیں تاہم جو ہے، اس کا فائدہ بھی صرف غیر مسلم شہری آبادی کو پہنچتا ہے۔ لیکن غریب رعایا جو دیہات میں آباد ہے۔ ان کے لیے تعلیم کا کوئی انتظام نہیں (حالانکہ ٹیکس کا بوجھ زیادہ ان پر ہے)

۸۔ ریاست کی حدود میں گاؤ کشی جرم ہے۔ جو کوئی ایسا کرے گا وہ سات سال قید اور جرمانہ کی سزا کا مستحق ہو گا۔ اس طرح کا وصول کردہ جرمانہ سرکاری خزانے میں نہیں بلکہ گؤ شالا میں دیا جاتا ہے۔

۹۔ ریاست میں اگر کسی غیر مسلم کے ہاں لڑکی پیدا ہو تو اسے انعام دیا جاتا ہے اور کچھ اراضی بھی ریاست کی طرف سے لڑکی کے والدین کو بطور انعام دی جاتی ہے۔

۱۰۔ کشمیری فوج کے اندر ریاست کی اکثریت کی آبادی کو اس انداز سے محروم کیا گیا کہ اس کے تمام تر فوائد غیر مسلم آبادی کو حاصل رہیں۔ ریاستی قانون کے موجب مسلمان فوج میں بھرتی نہیں ہو سکتا۔ جموں میں صرف ایک فوجی ٹریننگ کالج ہے۔ اس میں بھی اسی قانون کے تحت مسلمانوں پر پابندی ہے۔

۱۱۔ کشمیر میں قانون اسلحہ کے سلسلہ میں مسلمان بہت کم فائدہ اٹھا سکتے ہیں یہاں تک کہ جنگلات میں وحشی درندوں سے خود حفاظتی کے طور پر بھی وہ اسلحہ سے محروم ہیں۔

۱۲۔ جنگلات کا قانون بھی مسلمانوں کے لیے مصیبت کا باعث بنا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ریاست کا اکثر حصہ جنگلات پر مشتمل ہے۔ جنگلات سے کسی قسم کی لکڑی کاٹ کر یا گری ہوئی اٹھانا جرم ہے (اس جرم میں روزانہ غریب دیہاتی مسلمانوں کو سزائیں ملتی ہیں لیکن جنگلات میں اگر اتفاقاً آگ لگ جائے تو اس کو بجھانے کی ذمہ داری علاقہ کے غریب مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر انکار کرے تو اس پر مقدمہ دائر کر دیا جاتا ہے)۔

۱۳۔ اس طرح ریاست میں بیگار عام لی جاتی ہے۔ ریاست کا ہر زمیندار سرکاری اہلکاروں کے رحم و کرم پر ہے۔ (اس پر نہ کوئی فریاد سنی جاتی ہے۔ اور نہ ہی قانون غریب مسلمان کی حمایت کرتا ہے۔

۱۴۔ ریاست میں رشوت کا بازار اس قدر تیز ہے کہ اس سے بھی غریب مسلمان کا خون چوسنے میں ریاستی حکام کو مزا آتا ہے۔

یہ ہیں وہ ظالمانہ قوانین جس کے بوجھ تلے کشمیر کے بتیس لاکھ مظلوم قریباً ایک صدی سے دبے ہوئے ہیں۔

راعی اور رعایا کے مابین جب الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ تو اکثر نہ انصاف مورخین کا قلم اس موڑ پر شاہی سنگھاسن کا وکیل صفائی بن کر رعایا کے خونِ ناحق کے چھینٹوں کو اپنی سیاہی سے مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور حقیقت کو اس انداز میں پیٹتا ہے کہ مظلوم کا خون پانی پانی ہو کر رہ جاتا ہے۔

ڈوگرہ شاہی کے خود ساختہ آئین نے کشمیر کی غلام رعایا کو ایک سو سال تک جس حال میں جکڑے رکھا۔ آخر وقت آیا کہ غلام نے انگڑائی لی اور اس جال کا ایک ایک دھاگہ تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹنے لگا۔

۱۳۔ جولائی ۱۹۳۱ء کا دن تاریخ آزادیٔ کشمیر کا سنگِ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب ۱۸۴۶ء کا خریدا ہوا غلام اپنی زنجیریں توڑ کر بندوقوں اور سنگینوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اور اس نے انقلاب زندہ باد کے نعروں سے قصرِ شاہی کو متزلزل کر دیا۔

تحریکِ کشمیر اور اس کا پس منظر

اس بغاوت کے محرکات کیا ہیں۔ چوراسی ہزار مربع میل کی یہ ریاست (جموں و کشمیر) آن واحد میں آگ اور خون سے کیسے کھیلنے لگی؟۔ بظاہر ان میں حسب ذیل واقعات شامل ہیں۔

۱۔ جموں میں ۶۔ جون ۱۹۳۱ء کو قرآن کریم کی توہین اور خطبۂ عید پر پابندی۔

۲۔ سری نگر میں ۲۶۔ جون ۱۹۳۱ء کو عبدالقدیر کی گرفتاری۔ (یہ ایک انگریز آفیسر کا خانساماں تھا۔ جو سیر و تفریح کے لیے کشمیر آیا ہوا تھا)۔

۳۔ ۱۳۔ جولائی کو گولی چلنے کے واقعات اور مسلمانوں کی شہادت۔

غیر ملکی اقتدار میں متحدہ ہندوستان کی وہ کون سی ریاست تھی جس میں راعی اور رعایا کے جھگڑے دیکھنے اور سننے میں نہیں آتے رہے۔ اگر ریاست کا رئیس ہندو ہے تو مسلمان اس سے مطمئن نہیں تھے اور اگر حکمران مسلمان ہے تو غیر مسلم رعایا اس سے نالاں تھی۔ مگر ان جھگڑوں کی نوعیت عارضی اور مقامی ہوا کرتی تھی۔ نواب اور راجے ایوان برطانیہ کے ستون تھے اور فرنگی حکمرانوں کی حکمت عملی بھی اسی میں رہی کہ وہ ریاستوں میں امن برائے امن حاکم بنے رہیں۔ اور جہاں دیکھا کہ بکری سینگ سے رسی نکال رہی ہے فوراً برائے انصاف آگے بڑھ کر حالات کو اپنے ڈھب پر لے آئے۔ لیکن کشمیر کا مسئلہ ایسا کیوں الجھا؟ کہ انگریز ایسا سیاستدان یہ سارا کچھ دیکھتا ہوا تماشائی بنا رہا۔ یہ سوال آج بھی سامنے ہے اور آنے والے کل کو بھی سامنے رہے گا۔

ایک قوم دوسری قوم سے جب اپنے انتقام کا فیصلہ کرتی ہے تو اس پر برسوں پہلے غور ہوتا ہے۔ اور سہل انگار قومیں دشمن کی منصوبہ بندی سے ایسی گھائل ہوتی ہیں کہ دھرتی کی کوکھ سے

ان کا نشان تک مٹ جاتا ہے۔

حسب ذیل شواہد جو ریاست کشمیر کی بربادی کا باعث بنے غور طلب ہیں۔

۱۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کا ۱۸۵۷ء میں انتقال ہوا۔ تو اس کی جگہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ حاکم بنا دیا گیا۔ پھر ۱۹۲۵ء میں یہ بھی لاولد فوت ہوا تو راج گدی مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے بھتیجے سر ہری سنگھ کو سونپ دی گئی۔ آخرالذکر مہاراجہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ پیرس میں تھے کہ ان کے قدم شاہی ذمہ داریوں سے بھٹک کر جوانی کی ناہموار شاہراہوں پر چلنے لگے اور اس بازار میں ان کی ملاقات پیرس کی ایک اوباش عورت سے ہوئی۔ اس ملاپ کے نتیجے میں عورت امید سے ہو گئی۔ پیرس کے اخبارات نے اس واقعہ کو ایسی ہوا دی کہ والئی کشمیر کا دامن خارزار میں الجھ گیا۔ اور انہیں نجات کی کوئی راہ سجھائی نہ دی۔ اس معاشقے کو فرانس کے اخبارات نے مہاراجہ ہری سنگھ کی بجائے مسٹر۔ ۔ کے نام سے مشہور کیا۔ آخر بات عدالت تک پہنچی اور بائیس ۲۲ لاکھ روپیہ عورت کو دے کر مہاراجہ نے اپنی جان چھڑائی۔ اس واقعہ سے غصہ کھا کر مہاراجہ ہری سنگھ نے پیرس سے آتے ہی ریاست کے انگریز ریذیڈنٹ کو یونین جیک سمیت ریاست سے نکال دیا۔

یہی وہ موڑ ہے جہاں سے انگریز اور مہاراجہ کشمیر کے مابین ٹکراؤ کا آغاز ہوتا ہے۔

۲۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو انقلاب روس کے بعد وسط ایشیا میں روسی اقتدار کا خوف اس قدر بڑھا کہ برطانیہ کو ہندوستان بھی ہاتھ سے جاتا دکھائی دینے لگا۔ روس کے لیے افغانستان، ایران اور چین کے شمالی حصوں پر قابض ہونے کے بعد چین کے شہر سنکیانگ کے راستے وادئ کشمیر پر حملہ آور ہونا کوئی مشکل نہیں تھا۔ اس سلسلے میں برطانوی پالیسی یہ تھی کہ کسی طرح روس کو ان راستوں کی طرف بڑھنے سے روکا جائے۔ چنانچہ اس خیال سے برصغیر کے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے اہم مقامات پر برطانوی چوکیاں قائم کی گئیں۔ اور اس خطرے کے پیش نظر برطانیہ نے ۱۹۱۹ء میں افغانستان سے تیسری جنگ لڑی۔ اس سے قبل ابتدائی جدوجہد میں روس نے جب سمرقند، تاشقند اور وادئ جیحوں وسیحوں کے علاقے پر قبضہ جما لیا تو برطانوی خدشات کو مزید عمل ملی اور انہوں نے اپنی فوج کا ایک قابل اعتماد حصہ جموں و کشمیر کے شمالی علاقہ پر متعین کر دیا۔

برطانیہ کو ایشیا اور وسط ایشیا میں اگر اشتراکی روس کا خطرہ تھا تو روس کے لیے بھی برطانوی اقتدار

کو ختم کرنا وقتی ضرورت کے لیے نہیں بلکہ سامراج کا یورپ میں مستقل سدباب اشتراکی انقلاب کی اہم ترین خواہش تھی۔

انہی دنوں پہلی بڑی لڑائی کے بعد برصغیر میں برطانوی اقتدار سے گلوخلاصی کیلئے سیاسی تحریکات زور پکڑ رہی تھیں۔ دوسری طرف فرنگی سیاستدانوں نے کرنل لارنس کے ذریعے عرب ریاستوں میں ترکوں کے خون سے مڈل ایسٹ (وسط ایشیا) کی تاریخ میں جس خونی باب کا اضافہ کیا عرب اور ترکوں کے درمیان جنگ کا تماشہ دیکھا اور آخر میں شریف حسین والئ مکہ کے ساتھ برطانوی وزیراعظم مسٹر لارڈ جارج نے جو مذاق کیا عرب حکمران اس کے باعث برطانیہ سے ناراض ہو چکے تھے۔

افغانستان میں مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے رفقاء نے روس اور ترک جرنیلوں سے ہندوستان کی آزادی کے لیے بات چکائی تھی۔ روس کے پاس بھی برطانیہ کے خلاف یہی سب سے بڑا ہتھیار تھا کہ وہ ان ممالک میں تحریک آزادی کو ہوا دے کر وسط ایشیا اور ہندوستان میں برطانوی پوزیشن کو کمزور کرے۔

ان سب خطرات کا تقاضا تھا کہ برطانیہ کسی نہ کسی بہانے کشمیر پر از سر نو قبضہ جمائے تاکہ دشمن کے تمام دروازے بند ہو جائیں۔ چونکہ روس اور چین سے ملحقہ علاقے جو ریاست جموں اور کشمیر کی حدود میں تھے، برطانیہ کے لیے معاہدہ امرتسر کے بعد براہ راست اپنے قبضے میں لینا مشکل تھے۔ اور خود مہاراجہ بھی اپنی ایک انچ زمین سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ ریاست کشمیر کی مسلم رعایا نے ڈوگرہ شاہی کے تشدد سے تنگ آ کر اگر کبھی برطانوی حکومت کو اپنی دادرسی کے لیے پکارا تو برطانوی حکمرانوں نے معاہدہ امرتسر کا جواز پیش کر کے دامن چھڑا لیا۔ لیکن وقت کی ضرورت نے ایسی بساط بچھائی کہ برطانوی کھلاڑی اپنے مہرے لے کر آن موجود ہوئے اور کشمیر ان کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔

اگرچہ دوسری جنگ عظیم کے بادل افق یورپ پر ہنوز آوارہ تھے لیکن پہلی جنگ عظیم میں جرمن کی شکست اور معاہدہ ورسلیز کے بعد جرمن قوم کی ذلت اسے کسی وقت بھی برطانوی اقتدار سے الجھنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ مستقبل کے اس جنگی خطرے کے پیش نظر برطانیہ کے لیے مزید ضروری تھا کہ وہ مخدوش راستوں پر اپنے عسکری دشمن کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائے۔

۳۔ ۱۹۳۱ء کے وسط تک بین الاقوامی حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ کشمیر کی آئندہ سیاسی جدوجہد کو سمجھنے کے لیے ریاست کے اندرونی حالات کا جائزہ لینا بھی ضروری اور اہم ہے۔ بساط کشمیر

پر فرنگی کھلاڑی جب ذہنی طور پر مات کھا چکے تو ان کی سیاست نے ایک اور رخ اختیار کیا کہ ریاست کے وزیر اعظم سر بینرجی کی جگہ کرنل کالون کو کشمیر کا وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ انہی دنوں کشمیر میں محکمہ تعلیم کے انسپکٹر خواجہ جمال الدین تھے۔ (یہ خواجہ کمال الدین لاہوری مرزائی کے برادر حقیقی تھے) اس طرح کشمیر میں قادیانی اور لاہوری مرزائیوں کا محکمہ تعلیم پر خاصہ عمل دخل تھا۔

۴۔ ۲۶۔ جون ۱۹۳۱ء کو عبدالقدیر کی گرفتاری بھی ایک عجیب معمہ ہے۔ جو کشمیر کی تحریک کو سمجھنے اور اس پر فکر کی دعوت دیتا ہے

ایک انگریز سیر و تفریح کے لیے سری نگر آکر ٹھہرا۔ اس کا خانساماں (عبدالقدیر) جو ریاست کے اندرونی حالات اور واقعات سے قطعاً ناآشنا تھا۔ یکایک سری نگر جامع مسجد کے اجتماع میں پہنچ جاتا ہے اور ایسی اشتعال انگیز تقریر کرتا ہے کہ حکومت اسے گرفتار کر لیتی ہے۔ اس پر مقدمہ چلا۔ ۱۳۔ جولائی کو جب اسے ہری پربت جیل میں سزا سنائی گئی تو عوام میں اشتعال پیدا ہوا جس کے نتیجے میں فوج کو ہجوم پر گولی چلانا پڑی جس سے کئی مسلمان شہید ہوئے۔

اس ایک واقعہ کے بعد تاریخ کشمیر کے کسی حصہ پر عبدالقدیر کا نام سننے اور پڑھنے میں نہیں آیا اور نہ ہی اس انگریز کا کہیں پتہ چلا جس کا عبدالقدیر ملازم تھا۔

۵۔ اس سے پیشتر ۶۔ جون ۱۹۳۱ء کو جموں میں ایک دکاندار قرآن کریم پڑھ رہا تھا۔ کہ بلا کسی وجہ کے ایک ہندو پولیس آفیسر نے قرآن کریم اس کے ہاتھ سے چھین کر زمین پر پھینک دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے شہر میں اشتعال پیدا ہوا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ متعلقہ آفیسر کو جس کی وجہ سے ریاست میں فرقہ وارانہ انتشار پیدا ہوا سخت سزا دی جاتی۔ لیکن انگریز وزیر اعظم نے اسے قبل از وقت پنشن دے کر ملازمت سے فارغ کر دیا اور بس۔

۶۔ آخری بات جس سے تحریک کشمیر سمجھنے میں مزید آسانی ہو گی۔ تاریخ کا اہم ترین باب ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ

حالانکہ انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا۔ لیکن ان کو اشتباہ ہو گیا اور جن لوگوں نے

اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا
اس کے بارے میں اختلاف کیا دراصل شک میں مبتلا ہیں۔ ان کے پاس بھی اس معاملہ میں کوئی
اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ اِلَيْهِ وَ
یقین نہیں محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ انہوں نے یقیناً مسیح کو قتل نہیں کیا بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھا
كَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ وَاِن مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا
لیا ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ اور اہل کتاب میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو
لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ
اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لائے گا۔ اور قیامت کے دن وہ ان پر
شَهِيدًا (پ۶، سورہ نساء) گواہ ہے۔

گواہ ہے۔

خاتم الانبیا فرماتے ہیں۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِي
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے قسم ہے اس
نَفْسِي بِيَدِهٖ لَيُوشِكَنَّ اَنْ يَّنْزِلَ فِيكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا
ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے ضرور ضرور تم میں ابن مریم نزول فرمائیں گے جو ایک عادل
فَيَكْسِرُ الصَّلِيبَ وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيرَ وَيَضَعُ الْجِزْيَةَ وَيَفِيضُ
حاکم ہوں گے۔ صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کر ڈالیں گے اور جزیہ کو موقوف کریں گے اور
الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهُ اَحَدٌ حَتّٰى تَكُونَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ
مال کو پانی کی طرح بہائیں گے یہاں تک کہ کوئی قبول کرنے والا نہیں ہوگا یہاں تک کہ ایک سجدہ
خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا۔

دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔ (اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے)

اس کے برعکس مرزا غلام احمد قادیانی اپنی کتاب "کشتی نوح" کے صفحہ ۵۔ اور ۶۹ پر کہتا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم فوت ہو گیا ہے۔ اور کشمیر سرینگر محلہ خانیار میں اس کی قبر ہے۔"

جب تک کشمیر پر قادیانی قابض نہ ہوں۔ ان کا یہ دعویٰ صحیح ثابت نہیں ہو سکتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں (نعوذ باللہ) اور ان کی قبر کشمیر میں ہے۔

۷۔ ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس کے آخری اجلاس میں وزیر ہند نے اپنی تقریر کے دوران کہا

"ہندوستان کے باہم فرقہ وارانہ جھگڑوں نے برطانوی حکومت کو مشکل میں ڈال رکھا ہے"۔

اس فقرے پر فوراً مہاراجہ الیور نے بر سر اجلاس وزیر ہند کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ جھگڑے BRITISH INDIA میں ہیں۔ ریاستوں میں ایسا کوئی جھگڑا نہیں"۔

مہاراجہ الیور کا یہ فقرہ بھی برطانوی سلطنت کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ آگے چل کر ریاستوں میں جو فرقہ وارانہ فساد ہوئے۔ یہ اسی کی صدائے بازگشت تھی۔

واقعات کی ان مسلسل کڑیوں کو ایک ساتھ جوڑ کر دیکھئے کہ آئندہ تحریک کشمیر کیونکر اور کیسے شروع ہوئی۔

برطانوی سامراج نے متحدہ ہندوستان کے دورِ غلامی میں جن اطوار سے اپنی عمر بڑھائی اور اپنی گرفت کو مضبوط کیا ان میں ایسی ہی سیاسی حرکات تھیں جن کا ہلکا سا نقشہ مندرجہ بالا سطور میں دکھایا جا چکا ہے۔

نوٹ بھارت ریڈیو نے ۱۶۔ دسمبر ۱۹۶۷ء کو اعلان کیا اور اسی اعلان کو پاکستان کے معروف اخبار روزنامہ جنگ نے ۱۷۔ دسمبر ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں درج کیا تھا کہ۔

"حضرت عیسیٰؑ مقبوضہ کشمیر میں دفن نہیں"۔

ظفر اللہ خاں کے بیان کی تردید۔

"بھارت لوک سبھا میں کل اس بات کی تردید کی گئی کہ عیسیٰ علیہ السلام مقبوضہ کشمیر میں دفن کیے گئے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کے مطابق یہ بات لوک سبھا کے ممبر نے پاکستان کے سابق وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان سے منسوب کی تھی اور اس کی تصدیق چاہی تھی کہ کیا حضرت عیسیٰؑ کو مقبوضہ کشمیر میں دفن کیا گیا تھا؟ ممبر کو بتایا گیا کہ یہ بات صحیح نہیں ہے ممبر نے کہا کہ یہ بات سر ظفر اللہ نے اپنے ایک بیان میں کی تھی"۔

جب کشمیر کے اندرونی حالات یہاں تک پہنچے اور خطرہ بڑھا کہ پنجاب کا مسلمان کشمیری بھائیوں کی امداد کے لیے سربکف ہو کر نکل آئے جس سے انگریز کی بنی بنائی سکیم ظاہر ہو جائے۔ کیونکہ انگریز ریاست کے اندر کی خلفشار کو ریاست کی حدود تک رکھنا چاہتا تھا۔ اور جیسے ہی اسے ہواؤں میں خطرات کی بو آنے لگی تو ۲۵- جولائی ۱۹۳۱ء کو برطانوی ہند کے رجعت پسند مسلمان میاں سر فضل حسین کی دعوت پر شملہ میں جمع ہوئے۔ ان میں نواب ذوالفقار علی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، نواب ابراہیم علی خاں والئی کنج، خواجہ حسن نظامی، خان بہادر رحیم بخش، سید محسن علی شاہ ایڈووکیٹ لاہور، مولانا محمد اسماعیل غزنوی، مولانا سید حبیب ایڈیٹر روزنامہ سیاست لاہور، مولوی نور الحق ایڈیٹر مسلم آؤٹ لک لاہور اور مرزا بشیر الدین محمود قادیانی نمایاں تھے۔ ان سب نے مل کر یہیں پر کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی اور اس کا صدر مرزا بشیر الدین محمود اور جنرل سیکرٹری عبدالرحیم درد (مرزائی) کو مقرر کیا۔ نیز ۱۴ اگست کو یوم کشمیر منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ شملہ کی اس کارروائی کو مزید مؤثر بنانے کیلئے برطانوی حکومت نے ایک قدم یہ اٹھایا کہ گلانسی کمیشن مقرر کیا۔ جس کے نتیجے میں انگریز وزیر اعظم کرنل کالون کی جگہ سر ہری کشن کول کو وزیر اعظم بنا دیا۔

مجلس احرار کا مؤقف کشمیر کمیٹی کی تشکیل ہوتے ہی قادیان کے خلیفہ بشیر الدین محمود نے اپنے عاجلانہ فیصلے کے تحت ہندوستان کے ان مسلمان رہنماؤں کو جو شملہ کے اجلاس میں شامل نہیں تھے، اطلاع بھیج دی کہ آپ کو کشمیر کمیٹی کا رکن نامزد کر لیا گیا ہے۔ علامہ سر محمد اقبال بھی اس کمیٹی میں شامل ہیں۔

شملہ میں کشمیر کمیٹی کی بنیاد کو انگریز نے اپنے نقطہ نگاہ سے اور بشیر الدین محمود نے اپنے خیال سے دیکھا اور جانچا۔ انگریز سیاستدانوں نے اس بساط پر ہندوستانی رجعت پسند مسلمانوں کے علاوہ قادیانی مہرہ اس انداز سے پھینکا کہ دونوں طرح سے جیت انگریز کی تھی۔ لیکن مجلس احرار نے اسلام اور ہندوستان کی آزادی کے لیے دونوں کو ضرر رساں خیال کیا۔ اگر کشمیر پر انگریز کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے تو ہندوستان کی غلامی کے ساتھ دوسری بڑی جنگ میں خدانخواستہ اگر انگریز فتحیاب ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں وسط ایشیا کی عرب ریاستوں پر بھی سامراجی قوتوں کا اقتدار ہمیشہ کے لیے مضبوط ہو جائے گا۔ اس لیے وقت کی سیاست متقاضی تھی کہ انگریز دانشوروں کو اس محاذ پر بھی ذہنی شکست دی جائے۔ تاکہ ایک طرف کشمیر کا بتیس لاکھ مسلمان دوہری غلامی سے نجات پا لے

تو دوسری طرف ڈوگرہ شاہی کا خاتمہ ہو جائے۔

قادیانی مذہب کے لباس میں وہی کھیل کھیلتا ہے۔ جسے وہ غیر ملکی حکومت کے لیے مفید یا کارآمد سمجھتا ہے۔ چنانچہ خود مرزا غلام احمد اپنی کتاب "شہادت القرآن" کے ص۶ اور ۹ پر اپنے ماننے والوں کے ایک سوال کے جواب میں کہتا ہے، کہ

"سو یاد رہے کہ سوال ان کا نہایت ہی حماقت کا ہے، کیونکہ جس کے احسانات کا شکر کرنا عین فرض اور واجب ہے۔ اس سے جہاد کیسا؟

میں سچ سچ کہتا ہوں کہ محسن کی بدخواہی کرنا ایک حرامی اور بدکار آدمی کا کام ہے۔ سو میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں، یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں ایک یہ کہ خدا کی اطاعت کریں اور دوسری اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا ہے۔ سو وہ سلطنت حکومت برطانیہ ہے۔"

اس مذہبی عقیدہ کی موجودگی میں اگر بشیر الدین محمود کی قیادت کو تسلیم کر لیا جاتا۔ تو صرف کشمیر کے بتیس لاکھ مسلمانوں کے ایمان ہی ضائع نہ ہو۔ بلکہ بیرون ہند کے مسلمان بھی اس اثر کو قبول کرتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ قادیانیت اسلام کو اپنے کفر کی لپیٹ میں لے لیتی

احرار رہنماؤں کو کشمیر کمیٹی کی تشکیل کا علم ہوا۔ تو فوراً ایک وفد کی صورت میں ڈاکٹر اقبال سے ملے۔ اس وفد میں چودھری افضل حق، مولانا داؤد غزنوی اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری شامل تھے۔ وفد نے اقبال سے کہا۔

"کیا آپ نے بھی قادیانی قیادت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اگر آپ کی دیکھا دیکھی کشمیر کے بتیس لاکھ مسلمان قادیانی ہو گئے تو قیامت کے دن اللہ تعالٰے کے ہاں آپ مجرم ہوں گے۔ نیز قادیانی دوسرے اسلامی مسلمانوں پر بھی گمراہ کن اثر کریں گے۔ لہٰذا آپ ان سے علیحدگی کا اعلان کریں۔"

چنانچہ اس سے دوسرے روز لاہور برکت علی ہال میں کشمیر کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا۔ جس میں چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا داؤد غزنوی بغیر کسی دعوت کے جا شریک ہوئے۔ چونکہ ڈاکٹر اقبال حالات سے آگاہ تھے۔ انہوں نے قادیانیوں کے علاوہ باقی شرکاء اجلاس پر اپنا اثر استعمال کر کے

بشیر الدین محمود کو کشمیر کمیٹی سے الگ کر دیا۔ اور صدارت خود سنبھال لی۔ جس سے وہ ۳۔ اگست ۱۹۳۱ء کو الگ ہو گئے اور کشمیر تحریک کی تمام تر ذمہ داری احرار کے سپرد کر دی گئی۔

تحریک کشمیر کی براہ راست ذمہ داری آنے پر مجلس احرار نے ۱۸۔ اگست ۱۹۳۱ء کو اپنی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس لاہور میں حسب ذیل قرارداد منظور کی

"۱۔ مجلس احرار کشمیر ایجی ٹیشن کو ہندو مسلم مسئلہ تصور نہیں کرتی۔ کشمیر کے کسانوں اور مزدوروں کی حالت ایسی تباہ کن اور دردناک ہے کہ ہندوستان میں بھی کسی مزدور اور کسان کی نہ ہوگی۔ تمام صاحب الرائے اشخاص کی دلی ہمدردی خواہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں ان کے ساتھ ہونی چاہیے۔ محض اس وجہ سے نہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ ایسے نازک وقت میں ان کی امداد کرنے سے کسی کو پہلوتہی نہیں کرنی چاہیے۔

اگر کسی وجہ سے ہندوؤں اور سکھوں کا شرانگیز طبقہ اس بات پر تل جائے کہ مسلمانان کشمیر پر ظلم برپا کیے جائیں جو پہلے سے ستم رسیدہ ہیں۔ اس ایجی ٹیشن کو فرقہ وار مسئلہ بنائے تو یہ مجلس محض کذب اور غلط نام کی خاطر ایسے متکبر، وحشی اور محروم انسانیت اور بے روح طبقہ کی حمایت پر تیار نہ ہوگی۔

لہٰذا یہ مجلس تمام غیر مسلم جماعتوں کو اتحاد عمل کی دعوت دیتی ہے اور ان کی امداد خوشی سے قبول کرے گی جو کشمیر کے مظلوم باشندوں کی امداد کے لیے ہاتھ بڑھائیں۔

۲۔ مجلس احرار کا یہ ہرگز ارادہ نہیں کہ ہز ہائی نس مہاراجہ کشمیر کو گدی سے اتارا دیا جائے۔ اور نہ ان علاقوں میں مسلم راج قائم کرنا مقصود ہے۔ اس مجلس کے خیال میں تمام ایجی ٹیشن مجلس احرار یا دوسری مسلم جماعت پر جو اس قسم کے الزامات لگانے کی خاطر کی جاتی ہے محض شرارت پر مبنی ہے اور دانستہ کی جا رہی ہے۔

۳۔ مجلس احرار ریاستی معاملات میں برطانوی مداخلت کو دعوت دینے کے لیے تیار نہیں اور چاہتی ہے کہ اس سلسلے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں ان سب کو دور کر دے۔ برخلاف اس کے یہ مجلس خیال کرتی ہے کہ اہل کشمیر کو موجودہ مصیبت میں مبتلا کرنے میں حکومت برطانیہ بھی ذمہ دار ہے۔

۴۔ احرار حکومت کشمیر کو انسانوں کا نظام بنانے اور موجودہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پرامن اور جائز ذرائع اختیار کرے گی۔

۵۔ عملی کام شروع کرنے کے لیے مجلس احرار مولانا مظہر علی اظہر کو تحقیقاتی کمیٹی کا قائد مقرر کرتی ہے۔ تاکہ وہ سری نگر جا کر وہاں کے مسلمانوں کی شکایات اور موجودہ فسادات کی تحقیقات کریں۔ نیز وہ وسائل اور ذرائع دریافت کریں جو مسلمانان کشمیر کی حالت کو درست کرنے کے لیے ضروری ہوں۔

اور جو ملک میں پرامن ترقی اور نظام حکومت اور باشندوں کے درمیان مصالحانہ تعلق پیدا کرنے کے موجب ہوں۔ اس کمیٹی کے باقی ارکان کے ناموں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

۶۔ مجلس احرار ۱۹۔ اگست سے ۲۵۔ اگست تک ہفتہ کشمیر مقرر کرتی ہے جسے ہندوستان بھر میں منایا جائے۔

۷۔ اس ہفتے کے فوراً بعد تحقیقاتی وفد سری نگر روانہ کیا جائے گا۔ اگر ارکان کمیٹی کو ریاست میں داخل نہ ہونے دیا یا انہیں گرفتار کر لیا گیا تو فوراً سول نافرمانی شروع کر دی جائے گی۔

دستخط

حبیب الرحمٰن۔ افضل حق۔ مظہر علی اظہر۔ داؤد غزنوی۔

جاری کردہ:۔ دفتر مجلس احرار اسلام

۰۔ اگست۔ ۱۹۳۱ء لاہور

اس سے پیشتر ۵۔ اگست کو وزیر اعظم کشمیر نے اعلان کیا۔

"چونکہ حکومتِ کشمیر کی طرف سے تحقیقاتی کمیشن مقرر کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا مہاراجہ کی حکومت ریاست سے کسی فرد یا جماعت کو ریاستی معاملات میں دخل کی اجازت نہیں دے سکتا۔

حکومت کشمیر کے اس اعلان کے بعد ۰۔ اگست کو مجلس احرار کا پہلا عوامی اجتماع چودھری افضل حق کی صدارت میں دہلی دروازہ کے باہر منعقد ہوا۔ جس میں ریاستی حکام کے اس اعلان کو

مسلمانوں کے لیے چیلنج سمجھتے ہوئے اس پر شدید احتجاج کیا گیا۔

۱۴۔ اگست کو کشمیر کمیٹی کے مقرر کردہ اجتماعات پر سارے پنجاب میں مجلس احرار کے رضاکاروں نے (BY FORCE) قبضہ کر لیا۔ اسی دن (۱۴۔ اگست) مسلمانان لاہور کا ایک عظیم اجلاس ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کی۔ مجلس احرار سے مطالبہ کیا، کہ

"کشمیر کے وزیر اعظم نے اپنے ۵۔ اگست کے اعلان میں یہ کہہ کر مسلمانان عالم کی توہین کی ہے۔ کہ ریاست سے باہر کا کوئی مسلمان یا کوئی مسلم جماعت ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دے سکتا۔ بنابریں یہ اجلاس مجلس احرار سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کشمیر کے مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے کر حکومت کشمیر کو اس کے چیلنج کا جواب دے۔"

۱۵۔ اگست کو مولانا احمد علی لاہوری کی صدارت میں مقامی مجلس احرار کا اجلاس ہوا جس میں مرکزی مجلس احرار سے درخواست کی گئی کہ وہ۔

"کشمیر کی موجودہ صورت حال اور مسلمانان کشمیر کی ہمدردی میں مسلمانوں کی راہنمائی کرے"۔

مجلس احرار کی ۱۸۔ اگست ۱۹۳۱ء کی مندرجہ بالا قرارداد انہی جذبات کا نتیجہ تھی۔

۲۱۔ اگست کو مجلس احرار اسلام نے سارے ہندوستان میں یوم دعا منایا۔ جس میں مسلمانوں کو تاکید کی کہ۔

"تحریک کشمیر کو ہر قسم کے تشدد سے پاک رکھیں۔ نیز کسی مسلمان کی زبان اپنے مخالف پر نہ کھلے اور نہ ہی کوئی ہاتھ اپنے ہم وطن غیر مسلم پر اٹھنے پائے۔ جس سے تحریک کو شدید نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔"

مجلس احرار کا وفد کشمیر کے بگڑتے ہوئے حالات نے جب ہندوستان اور خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا تو مجلس احرار نے جو کشمیر ایجی ٹیشن کی ذمہ دار تھی، اعلان کیا کہ ۲۔ ستمبر ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار کا ایک وفد مہاراجہ سے ملنے کے لیے کشمیر جائے گا۔ اس وفد کے قائد مولانا مظہر علی اظہر ہوں گے جبکہ باقی ارکان میں چوہدری افضل حق، خواجہ غلام محمد اور رانا آفتاب احمد بطور (اسٹینو) شامل ہیں۔

مجلس احرار کا یہ اعلان ۲۵۔ اگست کے اخبارات میں شائع ہوا۔

عارضی صلح حالات یہاں تک پہنچے تھے کہ ریاستی حکام جنہیں واقعات کی رفتار کا ہنوز احساس نہیں ہوا تھا۔ جب مجلس احرار نے اپنا وفد بھیجنے کا اعلان کیا تو ۳۰۔ اگست کے اخبارات میں مندرجہ ذیل خبر شائع ہوئی۔

"ریاستی باشندوں اور مہاراجہ کے درمیان عارضی صلح ہوگئی ہے جس کی بنا پر تمام گرفتار شدگان کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔"

اس عارضی صلح اور ریاست کے کشمیری رہنماؤں کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا گیا اور ان کے اس اقدام کی سخت مذمت کی گئی۔

دوسری گول میز کانفرنس ۲۹۔ اگست ۱۹۳۱ء کو مہاتما گاندھی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن روانہ ہونے لگے تو احرار رہنما سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے ساحل بمبئی پر انہیں منع کیا۔ ×

"آپ لندن نہ جائیں۔ آپ کا یہ طویل سفر تضیع اوقات ہوگا۔ انگریز اپنی پالیسی سے ہندوستان کو مزید غلام رکھنے کے لیے یہ سارا کھیل کھیل رہا ہے۔ اگر برطانیہ کی نیت درست ہوتی تو پہلی گول میز کانفرنس پر ہی بات ختم ہو جاتی۔"

لیکن کانگریس کا رہنما احرار زعماء کے مشورے کو اپنی ہلکی سی مسکراہٹ سے ٹال کر لندن روانہ ہو گیا۔

آخر کو ہندوستان کا سیاسی آفتاب ایوان برطانیہ میں ایسا غروب ہوا کہ اس کی ساری روشنی دانشواران افرنگ نے ڈوبتے سورج کی طرح سمیٹ لی۔ دریائے ستلج کی موجوں نے بھی کہا، جلیانوالہ باغ اور قصہ خوانی بازار سے بھی صدائیں اٹھیں لیکن ہندوستان کا لیڈر، اہنسا کا دیوتا، برطانوی سامراج سے اپنی آزادی کی بھیک مانگنے چلا ہی گیا۔ کس قدر آشائیں اس کے ساتھ تھیں اس کا شمار مستقبل کا مؤرخ کرے گا۔ البتہ ۲۹۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جب وہ خالی جھولی ہندوستان کے ساحل پر اترا تو اس کی تھکان پر احرار رہنما مسکرا رہے تھے۔

وفد کی روانگی ۲۔ ستمبر ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار کا وفد مولانا مظہر علی کی قیادت میں کشمیر کے لیے روانہ ہوا۔ تہی دامن فقیروں کا ٹولہ کشمیر کی ڈوگرہ شاہی سے نبرد آزما ہونے کے لیے گھر

سے نکلا تو سارا پنجاب ان راستوں پر چشم براہ تھا جن راہوں کی خاک نے ان کے قدم لیئے تھے۔ موسم نے اپنی تمام بہاریں ان مجاہدوں کے قدموں پر ڈھیر کر دیں جہاں سے ان کا گذر ہوتا تھا۔ کشمیر کی گل پوش وادیوں نے ایڑیوں کے بل ہو کر اپنے محسنوں کو دیکھا۔ زعفران کے کھیتوں نے احرار رضا کاروں کے لیے اپنا خون نچوڑ دیا۔ سرخ لباس انہیں بھلا معلوم ہوتا ہے۔

احرار کا وفد ابھی گوجرانوالہ میں تھا کہ مولانا مظہر علی کے نام وزیر اعظم کشمیر کا تار آیا۔

"میرا نمائندہ آپ سے سیالکوٹ میں ملاقات کرنا چاہتا ہے"

اس پر ۳۔ ستمبر کو سیالکوٹ میں احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اور اسی روز ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کی کوٹھی میں مولانا مظہر علی اظہر اور جموں کے گورنر اور ڈی۔ آئی۔ جی کے ابین ایک گھنٹہ گفتگو ہوئی جس میں ریاست کے سیاسی حالات پر بحث کی گئی۔ اور ان شرائط پر احرار کو کشمیر جانے کی اجازت دی گئی۔

۱۔ ریاست کے اندر کسی قسم کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔

۲۔ ریاستی معاملات کی تحقیقات غیر جانبدارانہ ہو۔

۳۔ احرار رہنما ریاست کے مہمان ہوں گے۔

احرار وفد کے قائد نے ریاستی حکام کی ان شرائط کو صرف اس لیے منظور کر لیا کہ بہر حال کشمیر کے حالات تو دیکھے جا سکیں کہ مظلوم کشمیریوں سے ڈوگرہ شاہی کا برتاؤ کیا ہے۔

اس طرح ۴ ستمبر ۱۹۳۱ء کو جموں کے راستے احرار کا پہلا وفد کشمیر میں داخل ہوا۔

احرار وفد کے استقبال کے لیے جموں کے مسلمان آنکھوں میں مسرت کے آنسو، دلوں میں جذبہ حریت اور ہاتھوں میں عقیدت کے پھول لیے ہزاروں کی تعداد میں ریلوے اسٹیشن جموں پر موجود تھے۔ وفد شہر میں داخل ہوا تو سارا جموں خوبصورت دروازوں اور محرابوں سے آراستہ تھا۔ جگہ جگہ احرار رہنماؤں پر منوں پھولوں کی بارش کی گئی۔ میزبانوں نے اپنے مہمانوں کے لیے ہر گھر کا دروازہ کھول دیا۔ تاہم مخصوص حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض بھی ہوا کہ

"احرار رہنماؤں نے حکومت کشمیر کی میزبانی کیوں قبول کی؟"

جواب میں قائد وفد نے کہا کہ

"اگر حکومت کی یہ شرط ہم منظور نہ کرتے تو ممکن ہے۔ حکومت ہمیں کشمیر آنے کی اجازت نہ دیتی۔"

نماز جمعہ کے بعد احرار رہنماؤں نے جموں جامعہ مسجد میں پہلی تقریر کی۔ جس میں اپنا موقف واضح کرتے ہوئے مولانا مظہر علی اظہر نے کہا،

"میں جماعت کی ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کے مطابق یہاں آیا ہوں۔ میں پیغام جنگ نہیں صلح کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ ہمارا کام یہاں کے حالات کی آزادانہ تحقیقات کرنا ہے۔ اور ریاست کے اندرونی حالات کو خوشگوار بنانا ہے۔ مسلمانوں کے جائز حقوق سے مہاراجہ کو آگاہ کرنا ہے۔"

آخر میں اعلان کیا، کہ

"دو روز تک ڈاک بنگلے میں اکر آپ لوگ ہمیں واقعات پر شہادت دیں۔"

۷۔ ستمبر کو احرار کا وفد سرینگر کے لیے روانہ ہوا۔ سرکاری کار کا ڈرائیور غیر مسلم تھا۔ اس پر مولانا مظہر علی اظہر نے معترضین سے کہا، کہ

"اب آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا کہ اگر ہم سرکاری مہمان نہ ہوتے تو یہی ڈرائیور یا کوئی دوسرا ڈرائیور حکومت کے مشورے پر ہماری گاڑی پہاڑ کی کسی گہری غار میں یا کسی پ، رسے ٹکرا دیتا۔ لیکن اب ہماری تمام تر ذمہ داری حکومت پر ہے۔ اگر ہمیں خراش تک بھی آئی تو حکومت کشمیر بدنام ہو جائے گی۔"

اپنے سوال کا یہ جواب سن کر عوام مطمئن ہو گئے۔

سرینگر میں

احرار کا وفد سرینگر پہنچا تو مقامی رہنماؤں میں سے کوئی فرد بھی ان کے استقبال کے لیے موجود نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ شیخ محمد عبداللہ وزیر اعظم ہری کرشن کول سے ملنے گئے ہیں اور باقی کارکن بھی انہی کے تحت ہیں۔

احرار رہنماؤں کو سرکاری ہاؤس بوٹ میں ٹھہرا دیا گیا۔ لیکن انہیں نہ تو کشمیری رہنما ملنے آئے اور نہ ہی وفد کے کسی فرد کو ہاؤس بوٹ سے باہر نکل کر عوام سے ملنے یا گفتگو کرنے کی اجازت تھی۔ اگر کوئی آیا بھی تو اس نے یہی اعتراض کیا کہ آپ نے سرکاری مہمان بننا کیوں قبول کیا؟

جس پر مولانا مظہر علی اظہر نے کہا، کہ اگر آپ لوگ ہمیں اپنے ہاں ٹھہرانا پسند کریں تو ہم تیار ہیں۔ لیکن اس پر بھی کسی نے حامی نہ بھری۔ قیام کے دوران مہاراجہ کشمیر اور وزیر اعظم سے وفد کی ملاقات ہوئی مگر کشمیری رہنماؤں کے عدم تعاون کے باعث حکومت کشمیر کے حوصلے بلند تھے۔

انہی دنوں سرینگر اور اننت ناگ میں اکثر گولیاں چلیں جس سے انیس مسلمان شہید ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی احرار رہنماؤں کو ہاؤس بوٹ سے نکال کر حکومت نے فتح کدل کے ایک مکان میں فوج کے پہرے میں نظر بند کر دیا۔ اور ڈاک پر سنسر لگ گئی۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس سال کی تحریک کشمیر کو جسے مجلس احرار نے شروع کیا تھا، سمجھنے کے لیے اگر ان واقعات کو سمجھ لیا جائے کہ احرار رہنماؤں سے کشمیری لیڈروں نے جموں اور سرینگر میں اسقدر بے اعتنائی کیوں کی تو تاریخ کشمیر کے مؤرخ کو بڑی آسانی ہوگی۔

خود غرض افراد اور تن آسان قومیں ملک وملت کے لیے اسی طرح ضرر رساں ہوتے ہیں جس طرح بہار کے لیے باد سموم۔ دونوں اپنے اپنے مفاد کی سوچتے ہیں۔ اور اس موڑ پر حکمران ٹولہ اپنے مقدر کی نیو اٹھاتا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ اس عمارت میں مخلص کا خون گارے کی مانند کام آیا۔ اور پھر شاہی وقار خود چل کر ان قوموں یا افراد کو مبارک باد دینے جاتا ہے، جنہوں نے ایسی حرکات سے اپنے لیے غلامی کا تانا بانا تیار کیا۔ ۵

شریک حکم، غلاموں کو کر نہیں سکتے — خریدتے ہیں فقط ان کا جوہر ادراک

کشمیری رہنما اور ڈوگرہ شاہی کے درمیان جس عارضی صلح کی خبر ۳۰۔ اگست کے اخبارات میں شائع ہوئی۔ اس صلح نے کشمیری لیڈروں کے ضمیر پر شاہی رشوت کی ایسی مہر ثبت کی، کہ بتیس لاکھ غلام کشمیریوں کا لہو بھی انہیں زندگی نہ دے سکا۔ اور ان کی مصلحت ان کے ایمان کی موت بن کر رہ گئی۔

کشمیر کے دونوں حصوں کے مسلمان رہنماؤں میں باہم بیگانگی پائی جاتی تھی۔ جموں میں چودھری غلام عباس کے والد چودھری نواب خاں لاہوری مرزائی تھے اور ان کے ساتھی مستری یعقوب علی قادیانی۔ اس ماحول میں چودھری غلام عباس نے گھٹن محسوس کرتے ہوئے احرار وفد سے کھل کر بات نہ کی اور اس کے برعکس چودھری اللہ رکھا ساغر، سردار گوہر رحمٰن احرار کے ممنون تھے۔

چنانچہ جموں میں احرار رہنماؤں کی پذیرائی میں آخرالذکر کا پورا پورا ہاتھ رہا اور اوّل الذکر معترض تھا۔ کہ احرار حکومت کے مہمان کیوں ہوئے۔

سرینگر میں شیخ محمد عبداللہ کے مشیر انجمن احمدیہ سرینگر کا صدر مولوی عبداللہ اور غلام نبی گلکار قادیانی تھے۔ ان کے مقابل مولانا محمد یوسف میر واعظ کا گروہ تھا۔ جنہیں یہ کہہ کر احرار سے بدظن کر دیا گیا کہ اگر احرار کے وفد کو اہمیت دی گئی تو حکومت ناراض ہو جائے گی، جس سے کشمیر کے کاز کو نقصان پہنچے گا۔ ایسے میں مرزائیت کا مرکز قادیان کیونکر خاموش رہ سکتا تھا۔ احرار وفد کے کشمیر پہنچنے کے ساتھ ہی قادیانیوں نے دوہری گیم کھیلی۔ ایک طرف ۲۲ ستمبر ۱۹۳۱ء کے "اخبار انقلاب" کے مطابق جماعت احمدیہ نے ایک سرکلر کے ذریعے اپنے کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ کشمیر کے معاملے میں احرار سے تعاون کریں اور اندر ہی اندر سینکڑوں بہتی پیغام پہنچائے گئے کہ

> "اب ریاست میں ہر طرح کا امن و امان ہے لہٰذا باہر سے اگر یہاں کسی قسم کی کوئی تحریک نہ چلائی جائے۔"

اس خفیہ حرکات کی تائید مندرجہ ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے، جو کشمیر کمیٹی کے جنرل سیکرٹری مسٹر عبدالرحیم درد (مرزائی)، نے قادیان سے ۱۵ ستمبر ۱۹۳۱ء کے اخبارات میں برائے اشاعت دیا:

> "۱۲-۱۳ ستمبر ۱۹۳۱ء کو سیالکوٹ میں کشمیر کمیٹی کا ایک اہم اجلاس منعقد ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ اس امر کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ حال میں مسلم نمائندگان اور ریاست کشمیر کے درمیان جو فیصلہ (عارضی صلح) ہو چکا ہے۔ کشمیر کے تمام بہی خواہ اور ہمدردوں کو اس عہد کی پابندی کرنی چاہیے جو مسلم نمائندگاں کر چکے ہیں۔ اور اس قسم کے افعال سے اجتناب کریں۔ جن سے پرامن فضا میں خلل پیدا ہونے کا امکان ہو۔"

قادیانیوں کے انہی ہتھکنڈوں نے احرار کو نہیں بلکہ کشمیر کے بتیس لاکھ غلاموں کو انگریز اور ڈوگرہ شاہی کی دوہری غلامی میں الجھائے رکھا۔ ان حرکات کا نتیجہ نکلا کہ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۱ء رات نو بجے کے بعد ڈوگرہ فوج کے انگریز کرنل آر۔ او۔ سیدرلینڈ نے سرینگر میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ نوٹیفکیشن م۱۹ ایل کے تحت، اعلان کیے۔

۱۔ جملہ دکانداران شہر سرینگر کو جن کی دکانیں اندرونِ حدود میونسپل کمیٹی واقع ہیں۔ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی دکانیں کل دس اسوج ۱۹۸۸ (بکرمی) صبح نو بجے سے پہلے پہلے کھول دیں۔ اگر نو بجے صبح کے بعد کوئی دکان بند پائی گئی تو دکاندار مذکور زیر نوٹیفکیشن ۱۹۔ اپریل کے موجب سزا کا مستحق ہوگا۔ جو چھ ماہ قید یا تیس بید یا دونوں سزائیں ہو سکتی ہیں۔

۲۔ جملہ اہلیانِ سرینگر اندرون میونسپل کمیٹی جن کے قبضے میں کسی قسم کا ہتھیار ہو۔ وہ نزدیک کے تھانہ پولیس میں پیش کریں۔ اگر کسی شخص کے قبضے میں دس اسوج سمت ۱۹۸۸ مطابق ۲۶ ستمبر ۱۹۳۱ء رات نو بجے کے بعد کوئی ہتھیار پایا گیا، وہ مستحق سزا ہوگا۔

افسران، میونسپل کمشنران اور دوسرے حکام اس حکم سے مستثنیٰ ہوں گے۔ ہتھیار کی تعریف میں بندوق، پستول یا کوئی اور پھٹنے والا یا اڑانے والا مادہ نیز کماندار چھری اور تلوار آسکتے ہیں۔ قصابوں کی چھریاں، بیتر دھاروں کے نیزے اور سکھوں کی کرپانیں جو ان کی جائز ضرورت سے زائد نہ ہوں اپنے قبضے میں مستغنا ہیں۔

۳۔ پانچ یا پانچ سے زائد اشخاص کا کوئی مجمع کسی عام گذرگاہ یا مقامِ عام پایا گیا تو یہ مجمع خلافِ قانون تصور ہوگا۔ پرائیویٹ زمین یا مکان کے اندر بھی پانچ سے زائد اشخاص کا جمع ہونا بھی ناجائز تصور ہوگا۔ مگر اراکینِ کنبہ اور مہمان جن کی تعداد دس سے زائد نہ ہو اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

۴۔ کسی قسم کا نعرہ یا آواز ماسوائے نعرہ ہائے وفاداری ممنوع قرار دیا گیا ہے اور خلاف ورزی کرنے والا مستحق سزا ہوگا۔

۵۔ کوئی شخص بعد از دس بجے رات اور قبل از پانچ بجے صبح شاہراہِ عام پر چلتا پایا گیا۔ مستحق سزا ہوگا۔ یورپین اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

۶۔ پتھروں یا کسی اور قسم کی اشیاء ضرب کا پبلک یا ملازمین سرکار پر پھینکنا

جرم قرار دیا جاتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے والا مستحق سزا ہوگا۔

۷۔ یورپین صاحبان کو سرینگر میں داخل ہوتے یا باہر جانے کے لیے کسی قسم کے پاس وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن ان کے ملازمین ان سے مستثنیٰ نہیں ہوں گے۔ ان کے لیے پاس حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ باقی ہندوستانی اور دوسرے اشخاص اپنے لیے پاس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

دستخط (انگریزی) آر۔ او۔ سیدر لینڈ

مارشل لا کے ساتھ ہی سرینگر کے ہر چوک، گلی، بازار میں ٹکٹکیاں لگا دی گئیں۔ ڈوگرہ فوج کے ساتھ یورپین فوج بھی عوام پر ظلم و تشدد کرنے میں برابر کے شریک رہے۔

۲۴۔ ستمبر کو احرار رہنما مولانا مظہر علی اظہر، چودھری افضل حق اور خواجہ غلام محمد کو حکومت کشمیر نے عملاً نظر بند کر دیا تو لاہور سے مولانا حبیب الرحمٰن صدر مرکزیہ مجلس احرار نے وزیر اعظم کشمیر کو تار دیا۔

"کیا احرار کا وفد گرفتار کر لیا گیا ہے"؟

وزیر اعظم کشمیر کا جواب:۔

"آپ کا تار ملا۔ یہ خبر غلط ہے کہ آپ کے وفد کو گرفتار کر لیا گیا ہے"۔

مولانا حبیب الرحمٰن کا تار وزیر اعظم کشمیر کے نام

"آپ کا تار ملا۔ اطمینان دلانے کا شکریہ۔ کشمیریوں پر فوج کے انسانیت سوز مظالم کی وجہ سے عوام بے حد مشتعل ہیں۔ ان کے اطمینان کے لیے کشمیر کی فضا کو بہتر بنانے کی کوشش کریں"۔

تازیانوں کی وحشتناک سزائیں فوراً بند کرائیں۔ میرے اطمینان کے لیے مولانا مظہر علی اظہر سے تار دلوائیں۔

اسی روز لاہور کے پبلک اجتماع میں مطالبہ کیا گیا کہ وزیر اعظم کشمیر سر ہری کشن کول کو اس کی ذمہ داریوں سے فوراً الگ کر دیا جائے۔ اس قرارداد کی تائید میں لندن سے ڈاکٹر سر محمد اقبال نے جو ان دنوں دوسری گول میز کانفرنس میں شامل تھے۔ وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن اور مہاراجہ کشمیر

کو تار دیئے۔ جو ۳۰ ستمبر ۱۹۳۱ء کے اخبارات میں شائع ہوئے۔

مولانا مظہر علی اظہر کا تار | قائد وفد مولانا مظہر علی اظہر نے صدر مرکزیہ مولانا حبیب الرحمن کو تار دیا۔

"وزیر اعظم کے نام آپ کا تار وصول ہوا۔ ریاست پر فوج کا بدستور قبضہ ہے۔ باعزت سمجھوتے کی کوئی امید نہیں۔ میں عنقریب واپس آجاؤں گا۔"

مولانا مظہر علی اظہر کے اس برقی پیغام کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی کا فوری اور ہنگامی اجلاس لاہور میں ہوا۔ جس میں قائد وفد کے تار کی روشنی میں کشمیر کے حالات پر غور کرنے کے بعد،

"کشمیر میں سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔"

وفد کی واپسی | ۲۔ستمبر ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار کا جو وفد کشمیر کے حالات کا جائزہ لینے گیا تھا۔ وہ ۲۔اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ریاستی لیڈروں، قادیانیوں اور انگریزوں کی سیاسی پالیسی کے باعث بغیر کسی نتیجے کے واپس آگیا۔ نیز مجلس احرار نے اعلان کیا۔

"چونکہ کشمیری عوام پر حکومت کشمیر کے مظالم ناقابل برداشت ہوگئے ہیں۔ لہٰذا احرار کا وفد جو آزادانہ تحقیقات کے لیے گیا تھا وہ واپس آگیا ہے بدیں حالات مجلس احرار ریاست کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے بڑھتے ہوئے مظالم کے خلاف باقاعدہ سول نافرمانی کی تحریک شروع کر رہی ہے۔

مولانا مظہر علی اظہر اس تحریک کے پہلے ڈکٹیٹر ہوں گے۔ اور انہیں اختیار ہوگا کہ وہ اپنے بعد جسے مناسب سمجھیں اپنا جانشین مقرر کریں۔"

وفد نے کشمیر سے واپسی سے ایک روز پیشتر چوہدری افضل حق نے وزیر اعظم کشمیر کو مندرجہ ذیل خط ان کے پرائیوٹ سیکرٹری کے ہاتھ بھیجا۔

عزت مآب جناب وزیر اعظم جموں و کشمیر! آداب عرض۔

احرار کا جو وفد آپ کی مسلم رعایا کے حالات معلوم کرنے کے ساتھ آپ کی حکومت سے آپ کی رعایا کے متعلق تصفیہ طلب امور کے جذبات لے کر آیا تھا۔

کل واپس چلا جائے گا۔

ریاست میں جو کچھ ہو رہا ہے انسانی اعتبار سے بھی اطمینان بخش نہیں۔ ان حالات میں چند گذارشات ہیں۔ اگر مناسب ہو تو ان پر توجہ دیں۔ آپ کا صادق

افضل حق۔ ہاؤس بوٹ سرینگر۔ ۲۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء

پبلک کی ایجی ٹیشن کو روکنے کے دو ذرائع عمل میں لائے جاتے ہیں۔

۱۔ تشدد آمیز پالیسی جس کے اختیار کرنے سے لوگوں پر دہشت طاری ہو جائے۔

۲۔ صلح و آشتی جس سے عوام کے قلوب مطمئن ہو جائیں۔

تشدد کی پالیسی کب کامیاب ہوتی ہے

تحریک جب ابتدائی مراحل سے گذر رہی ہو۔ اور ابھی اس کا اثر عوام پر زیادہ نہ ہوا ہو۔ ایسے حالات میں سخت پالیسی اور دہشت انگیزی عارضی طور سے تحریک کو دبا دیتی ہے۔ لیکن کلیتہً فنا نہیں کر سکتی لیکن تحریک جب انتہائی منازل پر پہنچ جائے۔ تو ہر طبقہ کے لیڈروں سے صلح کر لینا ہی عین مصلحت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے جہاد حریت کو جس کی ابتدا ر ۱۹۰۷ء میں ہوئی حکومت کی سخت پالیسی نے ایک ہفتہ میں دبا لیا۔ یہی تحریک ۱۹۱۸ء میں رونما ہوئی جو جلدی دبا دی گئی۔ ۱۹۲۱ء میں خلافت ایجی ٹیشن کے سلسلے میں بروئے کار آئی۔ گو تھوڑی سی قوت سے اس پر قابو پا لیا گیا۔ لیکن اس کے عالمگیر اثرات سے ڈر کر حکومت برطانیہ نے بعض لیڈروں کو وزارتیں پیش کر کے اپنے ساتھ ملانے میں ہی مصلحت سمجھی۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی کو شروع ہوئے بمشکل سے ایک سال بھی نہ ہوا تھا۔ کہ برٹش گورنمنٹ جیسی طاقتور حکومت بالآخر انتہا پسند طبقہ کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور ہو گئی۔

تحریک کشمیر نہایت ہی قلیل عرصہ میں ان تمام ابتدائی منازل پر پہنچ چکی ہے۔ عوام لیڈروں سے زیادہ اپنے اندر سیاسی زندگی رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہاں کے لیڈر لوگوں کی تکالیف کو اس شدت سے محسوس نہیں کرتے جیسے کہ عوام اپنی مصیبتوں کو محسوس کر رہے ہیں۔ باوجود رواجی تعلیم کی کمی کے لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ اور لوگ اپنی تلخ زندگی کی نسبت موت کو زیادہ خوشگوار سمجھتے ہیں۔ اس ساری ہل چل کی تہ میں ایک تو سیاسی اور اقتصادی زبوں حالی ہے۔ دوئم یہ خیال کہ کشمیر میں اسلام خطرے میں ہے۔ پہلی وجہ تو ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔

لیکن دوسری شق کی جادو داثری کو ایک غیر سیاستدان مسلم سمجھنے سے قاصر ہے۔ مذہبی توہین ایک ایسی چیز ہے جو ہر مسلم کو تڑپا دیتی ہے۔ طاقت کا استعمال ٹھنڈا کرنے کی بجائے لوگوں کو زیادہ بھڑکا دیتا ہے۔ سیاسی اور اقتصادی مصیبتوں کے علاوہ مسلمانان کشمیر کے دل میں یہ خیال قوت پکڑ رہا ہے کہ ریاست میں اسلام خطرے میں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگ موجودہ زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی خطرناک صورت ہے جسے نظر انداز کرنا مصلحت نہیں۔ بدقسمتی سے دربار کشمیر نے ان تمام تلخ حقیقتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سختی کی پالیسی سے تحریک کو دبانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ پالیسی لوگوں کو اور بھڑکا دینے کا باعث ہوگی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ دربار نے غلط طور سے یہ سمجھ لیا ہے۔ کہ کشمیری بالفطرت بزدل ہے۔ حالانکہ حقیقت حال یہ نہیں۔ وہ انگریز سے زیادہ باتدبیر اور ترک سے زیادہ دلیر و بہادر ہے۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان کے سب بڑے بڑے لیڈر عام اس کے کہ وہ ہندو ہوں۔ یا مسلم کشمیری نسل سے تعلق رکھتے ہیں اندرون ریاست کے کشمیریوں کی دماغی قابلیتوں کے تو اب بھی لوگ قائل ہیں۔ مگر موجودہ حکومت کے تشدد ہی نے ان میں یک بیک مدافعت کی قوت پیدا کر دی۔ اور صدیوں کی غلامی کا ردعمل اب سختی سے شروع ہو چکا ہے۔ اور عالمگیر جوش پیدا ہو گیا ہے۔ اس جوش کو قابو میں رکھنے کے لیے ایک ایسے سیاستدان کی ضرورت ہے۔ جس پر لوگوں کو پورا پورا بھروسہ ہو اور وہ ان کی صحیح رہنمائی کرے۔ اگر ایسا لیڈر موجود بھی نہ ہو تو حکومت کے لیے لازمی ہے۔ کہ کسی اچھے شخص کی حوصلہ افزائی کرے۔ اور لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ملک خطہ میں بہت جلد انارکزم پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ انقلاب ہے۔ اگر محض تشدد کی پالیسی پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ تو جوں جوں حکومت تحریک کے لیڈروں کو گرفتار کرے گی لیڈروں کی عدم موجودگی میں لوگ انارکزم کی طرف متوجہ ہوتے جائیں گے۔ میری رائے میں گورنمنٹ کشمیر کے لیے موجودہ پالیسی کو روک دینا ہی مصلحت ہے۔

دربار کشمیر کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں۔ کہ وہ انتہا پسند لیڈروں سے صلح کر کے امن کو بحال کرے۔

۲۔ اس امر میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ کہ ہماری پالٹی ریاست کشمیر میں انگریزی اقتدار کا زیادہ

بڑھنا کسی طرح پسند نہ کرے گی۔ لیکن کوئی سیاستدان اس امر کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتا کہ برٹش حکومت ہندوستان میں حاکم اعلیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو حالات پے در پے رونما ہو رہے ہیں کسی انصاف پسند ہندوستانی کی ضمیر اس کو برداشت نہیں کر سکتی۔ گولی چلائے جانے، عورتوں اور بچوں پر لاٹھی برسانے اور مارشل لا کے اجراء کو کسی طرح بھی برداشت نہیں کیا جائے گا۔ برٹش حکومت اپنی آٹھ کروڑ آبادی کے جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔ ایک چیز چاہے مطلوب نہ بھی ہو۔ لیکن اس کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر چند میں اور میرے دوست چاہیں گے۔ کہ انگریزی حکومت ریاست میں مداخلت نہ کرے۔ مگر برٹش حکومت کو بحالات موجودہ مداخلت کے سوا کچھ بن نہ آئے گی۔ وہ اس تشدد کی موجودگی میں کب تک خاموش بیٹھی رہے گی۔

جو حالات اس وقت تک گزر چکے ہیں۔ ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ہم ان تمام واقعات کو اپنی پارٹی اور عوام الناس کے سامنے بیان کر دیں۔ ہمیں آپ کے ہاؤس بوٹ میں بیٹھے ہوئے اس صداقت کا بے باک اظہار کر دینا چاہیے کہ ہم یہاں کے حالات اور واقعات سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ اور اس تشدد کو کسی طرح حق بجانب قرار نہیں دے سکتے۔ اگر ہم اپنے تاثرات کو بیان کرنے پر مجبور ہوئے۔ تو یقیناً برطانوی مداخلت کے خلاف ہم اپنی زبان بند پائیں گے۔ کیونکہ ہمارے پاس ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ کشمیر کے حالات کو اگر ہم بہتر بنانے سے قاصر رہے۔ تو انگریزی مداخلت کو روکنے کی کوشش کرنا ہماری بددیانتی پر محمول کیا جائے گا۔ یہ خیال کرنا ایک وہم ہے کہ ریاست میں انگریز مداخلت نہ کریں گے۔ جس ریاست میں مسلسل گولیاں چل رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ برٹش حکومت وہاں مداخلت کیوں نہ کرے گی۔

حکومت کا وقار

حکومت اور رعایا میں ایک دفعہ کشیدگی کے بعد جو امر صلح میں مانع ہوتا ہے۔ وہ حکومت کا وقار ہے۔ لیکن مدبرین کی نگاہ میں رائج شدہ قانون کا احترام ہی اس کا وقار ہے۔ بات بات پر حکومت کے وقار کا خیال رکھنا بالآخر وقار کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ انگریزی حکومت کے استحکام کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ انگریز مدبرین وقار اور اقتدار کا ایک حد تک خیال تو ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن جب وقار کا خیال سلطنت کے ضعف کا باعث بننے والا ہو۔ تو اپنے بدترین دشمن

کی طرف بھی خود بخود صلح کا ہاتھ بڑھا دیتے ہیں۔جن صاحبان تدبیر کے لیے یہ نوٹ تیار ہو رہا ہے۔وہ خود انگریزی کی عظیم الشان سلطنت کے کاروبار کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔آئرلینڈ اور ہندوستان کی تحریکوں کے لیڈروں کے ساتھ برطانوی مدبرین کا بار بار صلح کرنا۔انگریزی دماغ کی عظمت کی دلیل ہے۔میری رائے میں کشمیر کی موجودہ حالت میں دربار کا اقتدار و وقار کشمیر کی تحریک کے لیڈروں سے صلح کرنے سے ہی بچ سکتا ہے۔مسٹر برک کا مشہور مقولہ ہے۔کہ بڑی سلطنت چھوٹے دل کے ساتھ نہیں چلا کرتی۔دل بڑا کر کے لوگوں سے صلح کر لینا چاہیے۔تاکہ ریاست میں امن بحال ہو۔ابھی وقت ہے کہ لوگوں کی تالیف قلوب کے لیے کوئی موثر اقدام کیا جائے۔سب سے پہلے لوگوں کو یقین دلایا جائے۔

۱۔کہ ریاست میں مذہب کا احترام کیا جائے گا۔

۲۔تشدد کو قطعی طور سے روک دیا جائے۔کیونکہ عوام کا پیمانہ صبر اب بالکل لبریز ہو گیا ہے۔لوگوں نے بدقسمتی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ دربار سے اب انصاف کی کوئی توقع نہیں۔میری ناقص رائے میں اسمبلی کے ...... قیام کے بغیر آپ ان حالات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔اس لیے میری صاف تجویز یہ ہے کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ ریفارم کی طرف بڑے سے بڑا قدم اٹھائے۔اب لوگوں کو معمولی اصلاحات دے کر ٹال دینے سے کام نہ بنے گا۔

ہر مدبر کی یہ قدرتی خواہش ہوتی ہے۔کہ اس کے زمانۂ اقتدار میں کوئی ایسا بابرکت کام ہو جائے۔جس سے نسل انسانی مشکور رہے۔اس نیک جذبہ کو مدنظر رکھتے ہوئے جو ہر پاکیزہ خیال مدبر کے دل میں پرورش پاتا ہے۔میں امید کرتا ہوں کہ پرائم منسٹر اور ہز ہائی نس مہاراجہ بہادر وقت کی نزاکت کو مدنظر رکھ کر ناخن تدبیر سے اس گتھی کو سلجھا کر امن پیدا کریں گے۔

نئے سفر کا آغاز سات ہزار میل سے آئی سفید فام قوم نے اٹھارہ لاکھ مربع میل پر قابض ہو کر ڈیڑھ سو سال تک اقوام ہند سے جو سلوک کیا اس کے خلاف جہاد میں جن عناصر نے شرکت لی ان کے جذبات شفاف پانی کی طرح نکھرے ہوئے تھے۔آزادئ وطن کے لیے جب وہ فرنگی آئین سے ٹکرائے تو ان کا عزم و ایمان پہاڑ بن کر غیر ملکی سامراج کے آڑے آیا اور اسے بری طرح شکست دی کہ آفتاب بھی اس نظارے کی تاب نہ لا سکا۔

اس گروہ کو یقین تھا کہ پانچ سو سے زائد ہندوستانی ریاستوں کا وجود برطانوی اقتدار کا آخری سہارا ہے۔ اور اس دیوار کو بھی گرا دینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ غیر ملکی اقتدار سے گلوخلاصی کے لیے جس جماعت (انڈین نیشنل کانگریس) سے ہم آہنگی پیدا کی۔ وطن عزیز کی آزادی کے لیے ان سے پینگیں بڑھائیں۔ انہی کے سینوں سے سینے ملا کر انگریز کی گولیاں کھائیں۔ قفس کی تیلیوں کی اوٹ میں بہاروں سے خزاں تک آن پہنچے۔ اول الذکر گروہ کو توقع تھی کہ ریاست کشمیر کے بتیس لاکھ غلاموں کے لیے جب وہ ریاست کے رئیس سے وہی مانگ کریں گے جو کانگریس ہندوستان کے لیے کر رہی ہے تو ہمارے بازو مضبوط ہوں گے۔ ہمارے قدموں کی چاپ سے ڈوگرہ راج کی طنابیں مل جائیں گی۔ آزاد ہندوستان کی طرح کشمیر کا مسلمان بھی آزادی کا سانس لے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ مجلس احرار السلام اس میدان میں یک و تنہا رہ گئی۔

کانگریس، مہاراجہ کشمیر، انگریز، قادیانی، پنجاب کا ہندو پریس اور ہندوستان کا رجعت پسند مسلمان بھی مجلس احرار کے جہاد کشمیر کے خلاف علم بغاوت لے کر سامنے آکھڑا ہوا۔

جماعتی فیصلے کے تحت ۳۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو قائد وفد مولانا مظہر علی اظہر نے کشمیر سے آتے ہی تحریک سول نافرمانی کا آغاز کر دیا۔ ۱۳ مجاہدین پر مشتمل قافلہ کے رہنما کی حیثیت سے سچیت گڑھ کے راستے ریاست کشمیر میں داخل ہونے کے لیے روانہ ہو گئے۔ روانگی سے پیشتر انہوں نے اعلان کیا

"اگر مجھے بمعہ میرے ساتھیوں کے ریاست کشمیر میں داخل ہونے سے روک دیا گیا تو میں پھر کوشش کروں گا کہ ریاستی حکام کے حکم کی خلاف ورزی کروں! اس دوران اگر مجھے گرفتار کر لیا گیا تو میرے بعد شیخ حسام الدین ڈکٹیٹر ہوں گے اور تحریک آزادی کشمیر کو پر امن ذرائع سے جاری رکھیں گے۔"

شہر سے دو میل دور چھاؤنی کے نزدیک ریلوے اسٹیشن ڈالووال پر انگریزی پولیس نے صرف مولانا مظہر علی اظہر کو دفعہ ۱۰۷ کے تحت گرفتار کر لیا۔ بعد میں اس قافلہ کے سردار ولی محمد خاں مقرر ہوئے آخر یہ قافلہ گرفتار کر لیا گیا۔

۴۔ اکتوبر کو شیخ حسام الدین نے سول نافرمانی جاری رکھی۔ اور ان کے حکم سے پنجاب کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے رضا کاروں کے قافلے سچیت گڑھ (سیالکوٹ سے سات یا نو میل کے فاصلے

پرواقع ہے۔ جہاں سے ریاست کی حدود شروع ہوتی ہے) کے راستے جموں میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے گرفتار ہونے لگے۔

مجلس عاملہ کی قرارداد "دربار کشمیر نے اپنی ریاست میں جو صورت حال پیدا کر دی ہے اس کے پیش نظر مولانا مظہر علی اظہر نے بحیثیت ڈکٹیٹر اول سول نافرمانی کا جو اقدام کیا ہے۔ احرار کی مجلس عاملہ اس کی کامل تائید اور تصدیق کرتی ہے اور انصاف پسند انسانوں اور بالعموم مسلمان سے بالیقین امید کرتی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور رضاکاروں کی بھرتی اور احرار کی مالی امداد کریں"۔

۵۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار کی طرف سے کشمیر کے موجودہ حالات پر چودھری افضل حق نے لندن میں سر آغا خاں اور مہاتما گاندھی کو حسب ذیل تار دیے۔

"مجلس احرار کا جو وفد ۲ ستمبر کو تحقیقات کے لیے کشمیر گیا تھا۔ واپس آگیا ہے ریاست میں مسلمان بے دردی سے قتل کیے جا رہے ہیں۔ عورتوں کی بے عزتی کی جا رہی ہے۔ اور ان پر کھلم کھلا حملے کیے جا رہے ہیں۔ ریاست میں مارشل لا جاری ہے۔ ان واقعات کے باعث ہندوستان میں بے حد اشتعال پیدا ہو رہا ہے۔ توجہ کریں۔

مارشل لا واپس لے لیا احرار کی سول نافرمانی کا تیسرا روز تھا کہ مہاراجہ سر ہری سنگھ نے ۵۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو اپنی چھتیسویں سالگرہ کے موقعہ پر اعلان کے ذریعے ریاست بھر سے مارشل لا ختم کر کے ریاست کے تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے اور زیر سماعت مقدمے واپس لے لیے۔

اس اعلان کے ساتھ ہی مولانا مظہر علی اظہر اور دیگر احرار رضا کار بھی رہا کر دیے گئے جو اس وقت تک سول نافرمانی کے سلسلے میں گرفتار ہوئے تھے۔

تین دن کی تحریک سول نافرمانی میں مجلس احرار کے قریباً $2\frac{1}{2}$ ہزار رضا کار گرفتار ہوئے اس عرصہ میں خواجہ غلام محمد کی سرکردگی میں کوہالہ کے پل پر احرار رضا کاروں کا مکمل قبضہ رہا۔ جس سے کشمیر اور انگریزی علاقہ میں ذرائع آمد و رفت منقطع رہے۔ جس کی وجہ سے حکومت کشمیر کو

اندازاً بتیس ہزار روپے کا نقصان ہوا۔

مہاراجہ کے اعلان کے ساتھ ہی مجلس احرار نے تحریک سول نافرمانی عارضی طور پر ملتوی کر دی۔

مہاراجہ کے جواب میں مولانا مظہر علی اظہر اور دیگر احرار رضا کاروں کی رہائی پر احرار کی مجلس عاملہ نے سیالکوٹ میں ۷۔ اکتوبر کو اپنے خصوصی اجلاس کے بعد اعلان کیا۔

"مولانا مظہر علی ڈکٹیٹر اول مجلس احرار کو بمعہ رضا کاروں کے آج رہا کر دیا گیا ہے۔ اس سے عوام کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ احرار کا کام ختم ہو گیا ہے۔ بلکہ جنگ کی ابتدا تو اب ہوئی ہے۔ مجلس احرار کا صرف ایک ہی مطالبہ ہے کہ مہاراجہ کشمیر ریاست میں ہر بالغ کو ووٹ دینے کی بنیاد پر ذمہ دار اور خود مختار اسمبلی کا اعلان کریں۔ جب تک مجلس احرار کا یہ مطالبہ پورا نہیں ہوتا ہماری لڑائی جاری رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی ماتحت مجالس کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی تنظیم اور رضا کاروں کی بھرتی جاری رکھیں۔"

اس اعلان کے دوسرے روز وزیر اعظم کشمیر سر ہری کشن کول کا مولانا مظہر علی اظہر کے نام حسب ذیل دعوت نامہ آیا۔

"باہم بیٹھ کر معاملہ طے کر لیا جائے۔ اس سلسلہ میں مَیں آپ کو کشمیر آنے کی دعوت دیتا ہوں۔

(وزیر اعظم کشمیر - ۸۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء)

وزیر اعظم کے برقی پیغام پر مجلس عاملہ احرار نے ایک ہنگامی اجلاس میں فیصلہ کیا۔

"جب تک وزیر اعظم کشمیر کی طرف سے معقول جواب نہیں آتا۔ احرار کا وفد کشمیر نہیں جائے گا اور تحریک جاری رہے گی۔"

اس اعلان کے فوراً بعد سر ہری کشن کا دوسرا تار آیا۔ جس میں احرار کے فیصلے کے مطابق دعوت دی گئی۔ اس پر مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس قریباً بارہ گھنٹے تک جاری رہا جس کے نتیجے میں اعلان کیا گیا۔

"چونکہ دربار کشمیر نے ریاست کے متعلق گفت و شنید کی تمام شرائط کو جو مجلس احرار نے پیش کی تھیں، منظور کر لیا ہے۔ لہٰذا مجلس احرار کا وفد سرینگر روانہ کیا جائے گا۔ جو حسب ذیل ارکان پر مشتمل ہو گا۔"

۱۔ مولانا مظہر علی اظہر رئیس وفد۔ باقی ارکان ہیں شیخ حسام الدین۔ چودھری افضل حق۔ اور وفد کے سیکرٹری خواجہ غلام محمد ہوں گے۔

اس فیصلے کی وضاحت میں صدر مجلس احرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے پریس میں حسب ذیل بیان دیا۔

"حکومت کشمیر کو گمان تھا کہ مسلمان سول نافرمانی کی کوئی قوت نہیں رکھتے۔ ان کی یہ دھمکیاں صرف زبانی ہیں۔ اس لیے اس نے احرار کے تحقیقاتی وفد کے نیک مشوروں پر بھی کان نہ دھرا۔ لیکن جب ۳۔ اکتوبر کو مولانا مظہر علی اظہر نے ۱۱۳ رضاکاروں کی معیت میں سول نافرمانی کا آغاز کیا اور پہلے دن ہی سینکڑوں دوسرے رضاکار کشمیر کی سرحد کی طرف بڑھے اور ڈوگرہ شاہی نے رضاکاروں پر گھوڑے دوڑائے انہیں نیزوں اور بندوقوں کی سنگینوں سے زخمی کیا۔ مگر وہ پھر بھی آگے ہی بڑھتے گئے۔ تو حکومت کشمیر کو تین دن کے اندر ہوش آگیا۔ اور اس نے گھبرا کر مجلس احرار کے ساتھ صلح کی گفت و شنید شروع کی ہے۔ مجلس احرار کی طرف سے صلح کے لیے جس قدر شرائط پیش کی گئیں وہ بلاکم و کاست قبول کر لی گئیں۔

ایسے حالات میں مجلس کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس پرامن جنگ کو ملتوی نہ کر دے تاکہ سمجھدار دنیا یہ نہ کہے کہ جب احرار کی تمام شرائط دربار کشمیر نے قبول کر لی ہیں تو انہوں نے جنگ کیوں جاری رکھی۔

مگر میں دربار کشمیر کے وزراء کی سیاسی عیاریوں سے خوب واقف ہوں۔ جس کی ابتداء انہوں نے ابھی سے شروع کر دی ہے۔ کہ کشمیر کے حالات میں مسلمانوں کے اندر اختلاف پیدا کیا جائے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ احرار کو ایک دفعہ صلح کی گفت و شنید کو منقطع کرنا پڑے گا۔ لیکن مجھے خدا تعالیٰ اور مسلمانوں کی متحدہ قوت پر یقین ہے کہ آخرکار دربار کشمیر کو مسلمانان کشمیر کے تمام مطالبات منظور کرنا پڑیں گے۔"

ایک المیہ

قوموں کی کشمکش میں اکثر راستوں پر بعض ایسے افراد ملتے ہیں۔ جن کی ذاتی منفعت نے ملت کے دامن کو داغدار کرنے میں مہینوں کا راستہ منٹوں میں طے کیا۔ اور مستقبل

کے راستے میں ایسے کانٹے بکھیرے کہ اس راہ کا کوئی مسافر ایسا نہیں جس کے تلوے زخمی نہ ہوئے ہوں۔ ایسے لوگوں کی فہرست میں مولانا ظفر علیخاں کے فرزند اختر علی خاں کا نام بھی ملتا ہے۔ ان کی اکثر کوتاہیوں کے باعث ان کے عظیم باپ کو گاہے خفت اٹھانا پڑی۔ اور گاہے وہ ان کے چکائے ہوئے سودوں کے ترازو میں برابر کے تول تل گئے۔

تحریک کشمیر کے پس منظر میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ریاست کشمیر میں پھول اور کانٹے باہم کیونکر دست و گریباں ہیں۔ باد نسیم باد سموم سے کیونکر الجھی ہوئی ہے۔ دریائے جہلم کا پانی طوفانوں اور نہنگوں کی چپقلش سے گدلا ہو گیا ہے۔ کشمیر کی برف پوش چوٹیاں ہواؤں کے خوف سے پانی پانی ہو رہی ہیں۔ انسانی خون اس وادی کے منہ میں ایسا لگتا ہے کہ لالہ و نرگس کے چہرے سورج مکھی کی طرح پیلے پڑ چکے ہیں۔ مگر نکہتِ باد بہاری ہے کہ بجلیوں سے بغل گیر ہو کر نشیمن کو تنکا تنکا کرنے کی قسم کھائے ہوئے ہے۔

مجلس احرار کی لڑائی بتیس لاکھ کشمیریوں کی آزادی کی تحریک تھی۔ جسے پنجاب کا مسلمان خصوصاً اپنے جذبۂ ایمان سے لڑ رہا تھا۔ کشمیر کی پچانوے فیصد مسلمان آبادی ہندو راجہ سے اپنے پیدائشی حقوق کی طالب تھی۔ اور محض اس جرم میں غیر مسلم حکمران اپنی رعایا کو گولیوں کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اول انسان اور پھر مسلمان کی حیثیت سے مجلس احرار نے کشمیر کے مظلوموں کی حمایت کا بیڑہ اٹھایا۔ عین انہی دنوں جب احرار اور مہاراجہ کے درمیان یہ جنگ ہو رہی تھی۔ مولانا ظفر علیخاں کے صاحبزادے اختر علیخان نے دربار کشمیر سے راہ و رسم بڑھائے اور اپنے والد محترم (ظفر علیخاں) کو بھی اس سان پر لگا دیا۔ چنانچہ انہی دنوں مولانا ظفر علیخان کی حسب ذیل نظم "مہاراجہ ہری سنگھ فرمانروائے کشمیر سے خطاب" کے عنوان سے روزنامہ زمیندار لاہور میں شائع کی۔

اے جواں سال مہاراجہ کہ بزمِ کشمیر ۔ گونجتی ہے ترے اخلاص کے افسانوں سے
اے کہ آراستہ ہے نامۂ عظمت تیرا ۔ بخت و دولت کے چمکتے ہوئے عنوانوں سے
ہے یہی میری تمنا کہ تشکر کی زباں ۔ نہ کبھی عہدہ برآ ہو ترے احسانوں سے
پنجۂ ظلم کو فریاد ترے عدل سے ہو ۔ کہ وہ ہے دور غریبوں کے گریبانوں سے

تو ہو اس آہِ جہاں سوز کی جتنی تاثیر ۔ جو نکلتی ہے غریبوں کے سیہ خانوں سے
تو رعایا تیری حاجب ہو تیرے ایواں کی ۔ تاکہ مظلوم ہراساں نہ ہو تو دربانوں سے
نہ مسلماں کو برہمن سے رہے کوئی گلہ ۔ نہ برہمن کو شکایت ہو مسلمانوں سے
گر مساجد سے ہو آوازۂ تلطّف کا بلند ۔ تو مدارا کا پیام آئے صنم خانوں سے
ہندوؤں سے ہے یقیناً تیرے گھر کی رونق ۔ تیری طاقت ہے مگر آج مسلمانوں سے
جن کی دیوانگی سیزدہ صد سالہ کا جوش ۔ داد لینے کو ہے آفاق کے فرزانوں سے
یہ جنون کیا ہے فقط اس مئے باقی کا سرور ۔ جو چھلکتی ہے مساوات کے پیمانوں سے
وہ مساوات کہ ہے حاصل آزادیٔ فکر ۔ نئی تہذیب نے جو چھین لی انسانوں سے
شرطِ اسلام ہے تسلیم و رضا صلح و سلام ۔ یہ سبق سیکھ لے توحید کے دیوانوں سے
لطفِ شاہانہ تیرا چھین لے گر دل ان کا ۔ تجھ پہ قربان دلوں سے وہ ہوں دل و جانوں سے

یہ وہ سر بیچنے والے ہیں کہ تو ان کا ہو
تو نہ کچھ بھی تجھے اندیشہ ہو بیگانوں سے

(نگارستان ۔ مجموعہ کلام مولانا ظفر علیخاں ص ۸۱-۸۲)

اس نظم کا "زمیندار" میں چھپنا تھا کہ دوسرے روز احرار کے مقابل سرکاری سطح پر ایک اور وفد کے کشمیر جانے کا اعلان اخبارات میں شائع ہوا۔ یہ وفد خواجہ عبدالرحمن غازی اور مولانا ظفر علیخاں پر مشتمل تھا۔ متذکرہ حضرات ذہناً انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ تھے اور احرار کانگریس سے الگ ہو چکے تھے لہٰذا اس وفد کی تشکیل میں یہ کشمکش بھی کارفرما تھی۔

دوسرے وفد کی روانگی ۹۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سیالکوٹ سے مجلس احرار کا دوسرا وفد روانہ ہوا۔ ۱۰۔ اکتوبر کو جب یہ وفد سرینگر پہنچا تو اس سے پیشتر متذکرہ بالا وفد سرکاری ہاؤس بوٹ میں موجود تھا۔

بظاہر سرینگر سے مارشل لا اٹھا لیا گیا تھا لیکن ڈوگرہ اور انگریزی افواج کا تشدد کشمیریوں پر بدستور جاری تھا۔ احرار وفد کے پہنچنے سے پیشتر سرینگر کے حالات نئی کروٹ لے چکے تھے۔ ریاستی پولیس کا تمام نظام ایک انگریز آفیسر مسٹر لوتھر کو ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس سے ترقی دے

کر انسپکٹر جنرل پولیس بنا کر اس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ عوام باوجود انتہائی تشدد کے اپنی غلامی کے خلاف ڈوگرہ سامراج سے برسر پیکار تھے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے چودھری افضل حق نے وزیر اعظم کشمیر سے ملاقات کر کے انہیں مشورہ دیا کہ

"تشدد سے کشمیر میں امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا۔ بیداری کی جو روح عوام میں پیدا ہو چکی ہے اُسے آپ کا تشدد اب کسی صورت بھی دبا نہیں سکتا۔ اگر آپ اپنے ملک کو اس کی ضرورت کے مطابق اصلاحات دے دیں جس سے کشمیری عوام کو کشمیر کے اندر حکومت میں جائز جگہ مل سکے تو صورت حال بہتر ہو جائے گی اور کشمیر میں مستقل امن قائم ہو جائے گا۔"

احرار کا وفد حکومت سے اس طرح کے مذاکرات میں مصروف تھا کہ شیخ محمد عبداللہ کی سرکردگی میں کشمیریوں کا ایک وفد خواجہ عبدالرحمٰن غازی سے سرکاری ہاؤس بوٹ میں ملا۔ جو دوسرے وفد کے رہنما تھے۔ انہوں نے کہا "آپ لوگ (وفد کے ارکان) باہر سے آکر ہمارے معاملات میں دخل نہ دیں ہم حکومت سے خود نپٹ لیں گے۔ اس پر خواجہ عبدالرحمٰن غازی نے کہا۔

"چلو! ہم آپ کے معاملات میں دخیل نہیں ہوتے۔ لیکن کیا آپ لوگوں نے اپنے کوئی مطالبات مرتب کیے ہیں جو آپ حکومت کو پیش کریں گے؟"

شیخ عبداللہ: "جی ہاں"

یہ سن کر غازی عبدالرحمٰن نے خواجہ غلام محمد سے کہا کہ میرے اٹیچی کیس میں پڑے ہوئے کاغذات اٹھا لائیں۔

یہ کاغذاتِ جن میں انگریزی میں ٹائپ کیے ہوئے مطالبات تھے۔ مولوی اسماعیل غزنوی مرزا بشیر الدین محمود کی میز سے چوری اٹھا کر لائے تھے۔

یہ کاغذات جب غازی صاحب نے شیخ عبداللہ کے سامنے پیش کر کے کہا،

"یہ مطالبات تو نہیں جو آپ پیش کر رہے ہیں۔"

شیخ عبداللہ کا رنگ اڑ گیا اور کہنے لگے۔

"یہ آپ کے پاس کیسے پہنچ گئے؟"

اس پر غازی صاحب نے جواب دیا۔

"جہاں سے آپ کے پاس پہنچے ہیں"

یہ مطالبات سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا نے شملہ میں مرتب کیے تھے۔ جنہیں ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۳۱ کو قادیانیوں نے مسلمانانِ کشمیر کی طرف سے دربارِ کشمیر کے روبرو پیش کیا تھا۔

۱۔ کشمیر میں ایک مشاورتی مجلس قانون ساز مقرر کی جائے جس کی ترتیب کچھ انتخاب سے اور کچھ نامزدگی یا بلاواسطہ انتخاب سے عمل میں آئے۔

۲۔ تعلیم کے معیار اور اس کے ذرائع کی ترقی پر توجہ دی جائے۔

۳۔ ریاست کے تمام باشندوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جائے۔

۴۔ پولیس از سرِ نو منظم کی جائے۔

۵۔ فی الحال ریاستی کابینہ میں ایک برطانوی وزیر رکھا جائے۔

۶۔ ترقی کی حکمت عملی کے متعلق ایک اعلان کیا جائے۔"

گو احرار رہنماؤں کی گفتگو کبھی ایوانِ ڈوگرہ شاہی میں اور کبھی سرکاری ہاؤس بوٹ میں ہوتی رہی۔ لیکن شملہ سے مرتب ہو کر آئے ہوئے مطالبات پیش ہونے کے بعد حکومت کشمیر کے تیور کچھ اس انداز سے بدلے کہ احرار وفد کا وہاں ٹھہرنا تضیع اوقات کے مترادف تھا۔ چنانچہ ۲۳۔ اکتوبر (۱۹۳۱) کو دونوں وفود واپس آ گئے۔ احرار وفد کے رہنما شیخ حسام الدین نے اپنی ناکام واپسی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

> "ہمارے سرینگر پہنچنے سے پیشتر قادیانی مطالبات کا مسودہ جو شملہ میں تیار کیا جا چکا تھا۔ جس کا مدعا یا نصب العین اہل کشمیر کے لیے ایسی بحث و تمحیص کرنے والی اسمبلی حاصل کرنا ہے۔ جس کے فیصلوں پر عمل درآمد کرنے کی کوئی ضمانت حاصل نہ ہو۔ لیکن حالات بدل گئے۔ کشمیر میں ایسا جوش اور اشتعال پیدا ہو گیا ہے۔ جس کی بنا پر ہمارے وفد کے لیے وہاں ٹھہرنا اور کام کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس اثنا میں اخبار سٹیسمین (لاہور) نے قادیانی مطالبات برائے کشمیر شائع کر دیے۔ جس میں ایک اسمبلی کی سکیم پیش کی گئی۔ جس کا کام صرف بحث کرنا ہوگا۔

ان واقعات کی موجودگی میں ہم نے اپنا فرض سمجھا کہ اپنا زاویہ نگاہ حکومت کشمیر کے سامنے پیش کر دیں۔ چنانچہ ایسا کرنے کی ہم نے پوری کوشش کی۔ لیکن ہمارے ذرائع بالکل محدود تھے۔ حکومت اور قادیانیوں کے ایجنٹوں نے ہمارے کام کو ناممکن بنا دیا۔

قادیانی اور ان کے حامیوں کی ایک جماعت نے اپنے طریق پر وہاں کام شروع کر دیا ہے۔ نیز مشہور کیا گیا کہ قادیان کا مسودہ جسے حکومت کے ذمہ دار آفیسروں نے تیار کیا ہے۔ رائے عامہ پر اثر ڈالنے کے لیے نام بھی استعمال کیے گئے اور یہ بھی کہا گیا کہ ابھی وہ حکومت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ انہیں ایسے سخت مطالبات نہیں کرنے چاہییں، جنہیں وہ سنبھال نہیں سکتے۔

کشمیری نمائندوں اور احرار کے درمیان غیر رسمی گفتگو ہوئی۔ اور ہماری چند تجاویز بھی مطالبات میں شریک کی گئیں۔ لیکن ذمہ دار حکومت کا مطالبہ جو تمام مطالبات کی روح ہے اسے دانستہ نظر انداز کر دیا گیا۔

ہم ایک ایسی منتخب اسمبلی کو جسے کوئی ذمہ داری اور اختیار حاصل نہ ہوں۔ بے حقیقت اور نمائشی جماعت سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ یہ ان شہداء وطن کے قیمتی خون کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی جو کشمیر کی آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ انہیں حقیقی اصلاحات ملنی چاہییں۔ نہ کہ اصلاحات کا فقط نام۔

ہمیں یقین ہے کہ جو مطالبات مہاراجہ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔ ان سے کشمیر کے مصائب کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ اس قسم کے ناخوشگوار سمجھوتے سے یقیناً بدامنی پھوٹ پڑنے کا ہر وقت خطرہ لگا رہے گا۔ جس سے راعی اور رعایا پر بے حد مصیبت نازل ہوتی رہے گی۔ تو پھر کیوں نہ راعی اور رعایا کے درمیان مستقل مفاہمت کی کوشش کی جائے۔ بالفاظ دیگر ایسی منصفانہ اصلاحات ریاست میں نافذ کرائی جائیں۔ جن سے یہاں کے عوام کو ذمہ دار حکومت مل جائے پھر انشاء اللہ فتنہ و فساد کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہ موقع ضائع ہو

گیا تو دوبارہ فتنہ و فساد پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا تمام مصائب کا علاج صرف اور صرف یہ ہے کہ کشمیری عوام کو ذمہ دار اسمبلی بنانے کا حق دے دیا جائے۔ ورنہ دوسری کوئی چیز کشمیری عوام کو مطمئن نہیں کر سکتی۔

ان حالات و واقعات کی موجودگی میں ہم واپس آگئے ہیں۔ کیونکہ ہماری رائے میں قادیانیوں کی طرف سے شملہ میں بیٹھ کر جو مطالبات مسلمانان کشمیر کیلئے مرتب کر کے مہاراجہ کے سامنے پیش کیے گئے۔ وہ تمام کے تمام ناکافی ہیں۔

لہٰذا آئندہ کے لیے عملی کارروائی کی سکیم مجلس عاملہ احرار کے اجلاس میں طے کی جائے گی۔ اور وقت پر اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔

(شیخ حسام الدین۔ رکن وفد احرار۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء)

قوموں کی تاریخ کبھی میدان جنگ اور کبھی صرف سیاست سے ترتیب پاتی ہے۔ سپاہی کا قدم اور ادیب کا قلم اگر وقت پر حرکت نہیں کرتے تو دونوں جگہوں پر مات کھا جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

جرنیل جنگ کے نقشے پر اور سیاستدان فکر کی جولانگاہ میں اگر کامیاب نہیں تو قوموں کے مقدر کا فیصلہ ان کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔

مجلس احرار کے رہنما جو پیشتر ازیں فرنگی حکمرانوں سے آزادی وطن کے لیے جنگ آزما تھے۔ اور پینتیس کروڑ ہندوستانی عوام کے مادری حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اپنے ہی مؤقف کے تحت اگر انہوں نے بتیس لاکھ ریاستی مخلوق کی آزادی کے لیے ڈوگرہ سامراج سے ٹکرانا اہم اور ضروری سمجھا تو ان کے ضمیر، دماغ اور دل کے لیے لازم تھا کہ وہ گھنٹوں نہیں دنوں اس پر بحث کرتے، سوچتے، اپنے اردگرد کے حالات پر تبصرہ کرتے۔ اس ناہموار وادی کے حکمرانوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے دلوں کو ٹٹولتے۔ اپنے قدموں کی رفتار کا جائزہ لیتے جو خیر ملکی حکمرانوں سے ایک طویل لڑائی کے بعد تھکن محسوس کر رہے تھے۔ لیکن سپاہی میدان کارزار ہی میں زیب دیتا ہے۔ احرار ورکنگ کمیٹی نے ۲۳۔ اکتوبر سے ۲۹۔ اکتوبر (۱۹۳۱ء) تک ایک طرف جنگ کے نشیب و فراز کا جائزہ لیا۔ ریاستی حکام کے مزاج کو سمجھا۔ کشمیر سے متعلق برطانوی

پالیسی بھی زیر بحث رہی تو ساتھ ہی ساتھ رضا کاروں کی بھرتی اور محاذ جنگ کہاں کہاں کھولنا ہے۔ اس پر بھی غور ہوتا رہا۔

ریاستی حکام احرار کی طاقت سے خائف نہیں تو غیر مطمئن ضرور تھے۔ چنانچہ ہر مورچہ پر ڈوگرہ فوج بندوقوں اور سنگینوں سے لیس احرار رضا کاروں کا انتظار کرنے لگی۔

لڑائی شروع کرنے سے پیشتر احرار رہنماؤں نے اپنا مرکزی دفتر لاہور سے سیالکوٹ منتقل کر لیا۔ اس دوران ۲۷۔ اکتوبر کو حکومت کشمیر کا نمائندہ احرار سے ملنے سیالکوٹ آیا۔ لیکن کوئی بات طے نہ ہو سکی۔ کیونکہ احرار کشمیریوں کی ڈوگرہ شاہی سے نجات کے لیے صرف خود مختار اسمبلی کے قیام پر مصر تھے۔ جس کے لیے حکومت کشمیر آمادہ نہیں تھی۔ یہ احرار اور حکومت کشمیر کے ابین آخری آئینی گفتگو تھی۔

احرار ورکنگ کمیٹی نے کشمیر پر تین طرفہ یلغار کا فیصلہ کیا۔ سیالکوٹ سے سچیت گڑھ کے راستے جموں میں۔ جہلم سے پیرازغیب کا پتن جو شہر سے قریباً چھ میل کے فاصلے پر تھا یہاں ریاست کا کسٹم ہاؤس ہے۔ اس سے آگے ریاستی علاقہ ہے۔ دریائے جہلم عبور کر کے میرپور میں اور راولپنڈی سے براستہ کوہالہ۔ ان ہر سہ مقامات سے ریاستی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ سیالکوٹ مرکز کے انتظام میں رہا۔ جبکہ جہلم کے مقامی رہنما ڈاکٹر نذر محمد۔ شیخ فضل کریم شیخ فضل حسین، ٹھیکیدار چودھری حسین بخش کے علاوہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی، شیخ محمد اشرف عطا اور راقم کو متعین کیا گیا۔ راولپنڈی کا محاذ صوفی عنایت محمد پسروری، حکیم فضل کریم، حکیم عبدالغنی اور مولانا اسماعیل سجادہ نشین کے سپرد ہوا۔ ہر محاذ پر سینکڑوں رضاکار جمع کر دیے گئے۔ تاکہ اپنے اپنے وقت پر قافلوں کی صورت میں ریاست کی حدود میں داخل ہونے کی کوشش کریں۔ ان ابتدائی مگر اہم انتظامات سے فراغت کے بعد احرار ورکنگ کمیٹی کا آئینی ڈھانچہ توڑ کر اس کی جگہ وار کونسل قائم کر دی گئی۔ اور پہلے ڈکٹیٹر مولانا مظہر علی اظہر مقرر ہوئے۔

لڑائی کا آغاز

۳۰۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء تاریخ کشمیر کا ایک ایسا دن ہے۔ جب پنجاب کے مسلمانوں نے کشمیر کے غلام مسلمانوں کو ڈوگرہ شاہی سے نجات کے لیے

غیر آئینی تحریک کا سیالکوٹ سے آغاز کیا۔ مولانا مظہر علی اظہر ایک سو رضا کار لے کر کشمیر کی حدود میں داخل ہونے کے لیے سچیت گڑھ روانہ ہوئے۔ اس طرح ۳۰ اکتوبر کو صوفی عنایت محمد پسروری نے ایک سو رضا کاروں کا قافلہ لے کر کوہالہ کی طرف مارچ کیا۔ جہلم سے امرتسر اور جہلم کے مشترک نوجوانوں پر مشتمل ایک قافلہ میرپور روانہ ہوا۔

مولانا مظہر علی اظہر اور ان کے تمام ساتھی سچیت گڑھ سے ایک میل ورے گرفتار کر لیے گئے۔ اس طرح عام محاذوں پر گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ متعینہ تعداد کے علاوہ سینکڑوں دوسرے لوگ بھی اپنے طور پر گرفتار ہونا شروع ہو گئے۔

مولانا مظہر علی اظہر کی گرفتاری کے بعد شیخ حسام الدین دوسرے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے۔

جموں سے تحریک کا آغاز احرار سول نافرمانی کا دوسرا روز تھا کہ ریاست جموں میں چودھری اللہ رکھا ساغر نے ۱۳ اکتوبر کو مسلمانان جموں کی طرف سے مہاراجہ کشمیر کو چوبیس گھنٹے کے نوٹس میں کہا۔

"کشمیر میں ذمہ دار اسمبلی کے قیام کا فوراً اعلان کیا جائے۔ احرار رہنماؤں اور رضا کاروں کو رہا کر دیا جائے۔ ورنہ میں سول نافرمانی شروع کروں گا۔"

آزادی کشمیر کا پہلا شہید جہلم کا محاذ شیخ محمد اشرف عطار جو بعد میں روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی (جنہیں خطیب پاکستان کا خطاب ملا) اور راقم کی ذمہ داری میں تھا۔ سول نافرمانی شروع ہوتے ہی اول الذکر دونوں حضرات کو مرکز کے حکم پر رضا کاروں کی بھرتی اور فراہمی زر کیلئے پنجاب کے دوسرے اضلاع میں بھیج دیا گیا۔ اس طرح اس محاذ کی تمام تر ذمہ داری راقم کے سر آن پڑی۔ میرے فرائض میں تھا کہ باہر سے آئے ہوئے قافلوں کو ترتیب دیتا۔ اور انہیں رخصت کر کے پتن تک جاتا۔

یکم نومبر (۱۹۳۱ء) کو چنیوٹ سے آئے تیس رضا کاروں کی محاذ پر جانے کی باری تھی۔ چنانچہ حسب معمول نماز ظہر کے بعد چنیوٹ کا قافلہ جس کی قیادت شیخ الٰہی بخش کر رہے تھے۔ سینکڑوں لوگوں کے ہجوم میں جہلم شہر سے محاذ پر روانہ ہوا۔ کچھ لوگ پیدل، کچھ تانگوں اور لاریوں کے ذریعے پتن تک قافلے کے ساتھ گئے۔ دریا اپنے پورے بہاؤ پر تھا۔ پتھروں سے سر پٹکتا ہوا پانی چیخ چیخ کر کہہ رہا

تھا کہ آج دشمن کا ارادہ نیک نہیں۔ ڈوگرہ شاہی کی سنگینیں مسلمان کے خون کی پیاسی ہیں۔ ہندو سامراج فرزندانِ اسلام سے آج اپنا انتقام لے گا۔ لیکن دریا کی یہ زبان کون سمجھتا تھا پھر جبکہ رضا کار کفن بردوش ہو۔ ایسی ترشی سے شہادت کا نشہ کہاں اتر سکتا ہے۔

قافلہ پہنچنے سے پیشتر کوہالہ غیب کے پتن پر انگریزی علاقے کی پولیس مجسٹریٹ اور دوسرے حکام موجود تھے۔ ان کی ہدایت پر پتن کی تمام کشتیاں کنارے سے ہٹالی گئی تھیں۔ لیکن رضا کاروں کے عزمِ شہادت نے دریائے جہلم کی طغیانی کو شکست دینے کے لیے بے خطر دریا میں چھلانگیں لگا دیں

دشت تو دشت رہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

اس نظارے کو سرکاری حکام اور سینکڑوں دوسرے عوام نے حیرت اور جرأت کے ملے جلے جذبات سے دیکھا۔ کنارے پہنچ کر قافلہ سالار شیخ الٰہی بخش نے بھیگے ہوئے سرخ کپڑوں کے باوجود تمام رضا کاروں کو از سر نو منظم کیا۔ یہ قافلہ کسٹم ہاؤس سے گزر کر جب کشمیر کی حدود میں داخل ہوا۔ اور ایک چھوٹی سی خشک نہر کا پل عبور کرنے کو بڑھا ہی تھا کہ ریاستی پولیس کے ایک دستے نے جس کی کمان پنڈت وشوامتر کورٹ انسپکٹر کے ہاتھ میں تھی۔ آگے بڑھ کر اور خود انسپکٹر مذکور نے اچانک ایک جھاڑی سے نکل کر شیخ الٰہی بخش پر اپنی سنگین کا ایسا مہلک وار کیا کہ راقم کے دیکھتے ہی دیکھتے اس بہادر جانباز نے جامِ شہادت نوش کیا۔ غیر کشمیری مسلمان کا کشمیر کی سرزمین پر یہ پہلا خون تھا۔ جو اپنے کشمیری مسلمان بھائی کو ایک ظالم حکمران سے نجات دلانے کے لیے گرا تھا۔ الٰہی بخش کی شہادت نے کشمیر کو نئی زندگی دی۔ اور یہی وہ خون تھا جس نے زعفران کے کھیتوں کو پھر سے رنگ و روغن بخشا۔

سالار قافلہ کی شہادت کے باوجود یہ قافلہ حافظ دوست محمد جو چنیوٹ سے قافلے کے ساتھ آئے تھے کی قیادت میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

درمیانہ قد، گھٹیلا جسم، گندمی رنگ کے خوبصورت چہرے پر سیاہ داڑھی۔ یہ تھے شیخ الٰہی بخش جو یکم جولائی ۱۹۰۰ء کو شیخ کریم بخش تجار کے گھر چنیوٹ میں پیدا ہوئے۔

اسی طرح دوسرے محاذوں پر بھی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ پنجاب کے علاوہ دوسرے

صوبوں سے بھی رضاکار سیالکوٹ، جہلم اور راولپنڈی پہنچنے لگے۔ اور ریاست کے اندر جموں میں بھی تحریک سول نافرمانی شروع ہو گئی اور شیخ اللہ رکھا ساغر پہلے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے۔

تحریک احرار اور مخالفین جنگ ہتھیاروں سے لڑی جائے یا سیاست سے، عوام کا تعاون بے حد ضروری ہے۔

مجلس احرار نے اپنی تہی دامنی کے باوجود صرف اللہ کے سہارے کشمیریوں کی امداد کے لیے لڑائی چھیڑی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ہر انصاف پسند اس لڑائی میں احرار کا معاون ہوگا لیکن جنگ شروع ہوئے ابھی چھتیس گھنٹے ہوئے تھے کہ پنجاب کا ہندو پریس اور ٹوڈی مسلمان برابر کی صف میں کھڑے ہو کر احرار کی تحریک سول نافرمانی کی مخالفت کرنے لگے۔ ہندو پریس کی مخالفت تو سمجھ میں آسکتی تھی۔ لیکن رجعت مسلمان کا احرار کے خلاف صف آرا ہونا بعید از قیاس تھا۔ احرار کی مہاراجہ سے جنگ، ریاست کی اکثریتی آبادی کے حقوق کی جنگ تھی۔ اور یہ آبادی مسلمان کی تھی۔ پھر جبکہ ۲۶۔ جولائی ۱۹۳۱ء کو شملہ میں کشمیر کمیٹی کی بنیاد بھی انہی سرکار پرست مسلمانوں نے اٹھائی۔ تو ایسے حالات میں مجلس احرار کی مخالفت انگریز کے اشارۂ ابرو پر ہی سمجھی جا سکتی تھی۔ باوجودیکہ انگریز کشمیر میں تحریک کا حامی تھا لیکن یہ تحریک صرف ریاستی حدود تک محدود رہنی چاہیے تھی۔ مگر واقعات انگریز کی منشا کے خلاف ہوئے تو اسے روایتی ہتھکنڈوں سے کام لینا پڑا۔ تاہم مسلمان عوام اپنے جذبات کے اس موڑ پر آن پہنچا تھا کہ ہندو پریس کی آواز اور ٹوڈی مسلمان کا واویلہ بیکار ثابت ہوا۔ اور ہزار ہا مسلمان جیل خانوں میں پہنچ چکے تھے۔

برطانوی مداخلت احرار کی سول نافرمانی کی آگ پنجاب سے نکل کر ہندوستان کے ساحل تک پہنچ چکی تھی۔ ہر جگہ کا مسلمان شوق شہادت سے سرشار قافلوں کی صورت میں جنگ کے مختلف محاذوں پر پہنچ رہا تھا۔ علی گڑھ، مراد آباد، دہلی کے قافلے مرکز کے حکم پر لاہور میں قیام پذیر تھے کہ ۴۔ نومبر ۱۹۳۱ء کے اخبارات میں گورنر جنرل ہند کی طرف سے احرار کے قافلوں کو روکنے کے لیے ایک آرڈیننس شائع ہوا جس کی رو سے حکومت پنجاب کو ریاست کشمیر کی حدود میں احرار قافلوں کا داخلہ بند کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اس آرڈیننس کی وضاحت میں صرف اتنا کہا گیا۔

"حکومت ہند کو یقین ہے کہ یہ تدبیر برطانوی رعایا اور ریاست کشمیر کی تمام اقوام کے لیے مفید ہوگی۔

اس آرڈیننس کا نفاذ ہوتے ہی ۵۔نومبر کو مہاراجہ کشمیر نے انگریزی فوج کو ریاست کشمیر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی اور بعض اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں کو بھی کشمیر بلالیا۔

مولانا مظہر علی اظہر کی گرفتاری

مولانا مظہر علی اظہر جنہیں ۳۰۔اکتوبر کو سچیت گڑھ کے محاذ سے ایک سو رضاکاروں سمیت گرفتار کیا گیا تھا۔ جموں سنٹرل جیل میں ۶۔نومبر ۱۹۳۱ء کو دو سال قید سخت کی سزا دی گئی اور باقی ساتھیوں کو ایک ایک سال قید کی سزا ہوئی۔

مولانا مظہر علی اظہر کی گرفتاری، وائسرائے ہند کا آرڈیننس، کشمیر میں انگریزی فوج کا داخلہ ان امور کی وضاحت کے لیے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ۹۔نومبر کو حسب ذیل طویل بیان پریس کو دیا۔

"حکومت ہند نے ایک آرڈیننس جاری کیا ہے کہ مجلس احرار کے بڑھتے ہوئے قافلے روک دیے جائیں۔ ہماری کشمیر کی آزادی کے لیے جنگ نہ تو ہندو کے خلاف ہے۔ نہ سکھوں اور نہ ہی انگریزوں کے خلاف۔ یہ جنگ بتیس لاکھ مظلوم کشمیریوں کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے شروع کی گئی ہے۔ نہ کہ انگریز کے قیام کے لیے۔ ایک ہفتہ کے اندر سات ہزار فرزندانِ توحید پرامن طریق پر جیلوں میں پہنچ گئے ہیں۔ مجلس احرار نہایت غریب افراد پر مشتمل ہے۔ لیکن خدا کی نصرت ان کے ساتھ تھی۔ اس لیے تمام دنیا کے دلوں پر اس کا نظام اور قربانیوں کا سکہ بیٹھ گیا ہے۔

جب کشمیر کے مظلوموں پر تشدد شروع ہوا تو ہم نے تمام جماعتوں اور ہمسایہ قوموں کو ہمدردی کے لیے پکارا۔ اور درخواست کی لیکن کسی نے ہماری آواز پر کان نہ دھرا بلکہ تمام ہندو پریس اور ہندو قوم کے علاوہ رجعت پسند مسلمان بھی ہماری مخالفت کے لیے آکھڑا ہوا۔

اب وزیراعظم سرہری کشن کول کو چاہیے کہ وہ کشمیر کے لیے آزاد ذمہ دار اسمبلی کا اعلان کریں۔ ورنہ انگریزی فوج سے ڈر کر ہماری تحریک بند نہیں ہوگی۔ ہم جنگ کے میدان میں نکلے ہیں۔ گولی گورے کی ہو یا ڈوگرے کی ہماری پیش قدمی کو نہیں روک سکتی۔

جو پرامن جنگ کشمیری مسلمانوں کی حمایت میں مجلس احرار نے شروع کی ہے وہ اس لیے بند نہیں کی جا سکتی کہ اب کشمیر پر انگریزی فوجوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ بلکہ ہماری یہ پرامن جنگ اس وقت تک جاری رہے گی۔ جب تک کشمیریوں کو ذمہ دار حکومت نہ مل جائے۔

حکومت کو بھی اس مسئلے پر پورے تدبر سے غور کرنا چاہیے۔ مجلس احرار نے انگریزوں سے خود کوئی جھگڑا مول نہیں لیا۔ لیکن اس کے باوجود برطانوی حکومت نے مسلمان قوم کو خود چیلنج دیا ہے۔ گویا آرڈیننس کے ذریعے مسلمان کی سیاسی زندگی کو موت کا پیغام دیا ہے۔ لیکن برطانیہ اور مہاراجہ ہری سنگھ کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمان وہ ہے جو نہ ڈوگرے سے ڈرے نہ گورے سے۔

انگریزی حکومت نے مجلس احرار کے خلاف آرڈیننس صرف اس لیے جاری نہیں کیا کہ وہ کشمیر میں رضاکاروں کے دستے بھیج رہی ہے بلکہ یہ ساری حرکت اس لیے کی گئی ہے کہ آئندہ کو ہندوستان مسلمان انگریزی حکومت کے سامنے آکر اپنے جائز حقوق کی جنگ شروع نہ کر دے۔

جو مسلمان انگریزی حکومت پر اعتماد رکھتے ہیں۔ وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ چونکہ انگریزی فوجیں کشمیر میں چلی گئی ہیں لہٰذا احرار کو چاہیے کہ وہ اپنی پرامن جنگ کو روک دے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں۔ کہ چند دنوں کے اندر گول میز کانفرنس میں انگریزی حکومت نے مسلمانوں کے مشہور چودہ مطالبات رد نہیں کیے؟ جن کے منظور ہونے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تو کیا اس وقت بھی مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا جائے گا کہ وہ انگریزی حکومت کی فوجوں سے خائف ہو کر اپنی سیاسی

موت کے فتوئی پر دستخط کردے اور ہمیشہ کے لیے اچھوتوں کی سی زندگی بسر کرنے پر قانع ہو جائیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً ہر غیرت مند مسلمان اس کا جواب نفی میں دے گا تو میں مسلمانوں کو بتلا دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ نے چند دنوں کے بعد ہندوستان میں اپنے حقوق کی جنگ انگریزی حکومت سے لڑنے کا ارادہ کیا ہے تو آج ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس پر امن جنگ کو کامیاب بنانے کے لیے ہر قسم کی امداد کریں۔

انگریزی فوج کا خوف دلوں سے نکال دینا چاہیے۔ بلکہ ہر کمزور سے کمزور اور اعتدال پسند مسلمان کو بھی مجلس احرار کی اتنی امداد ضرور کرنی چاہیے کہ وہ اپنی زبان کو مجلس احرار کے خلاف بند رکھے۔ یہ امداد کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اس وقت بہادر اور غیور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ مجلس احرار کی اس پر امن جنگ کو جاری رکھنے کے لیے پوری سرفروشی سے کام کریں۔

بہت ممکن ہے کہ مجلس احرار کے تمام رہنماؤں کو دو ایک دنوں میں گرفتار کر لیا جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مجلس احرار کو خلافِ قانون قرار دے دیا جائے۔ اس لیے ہمارے بعد ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہر جگہ اس جذبہ حریت کو برقرار رکھنے کے لیے پوری ذمہ داری سے کام کرے۔ اور مجلس احرار کو کسی قانون کے خوف سے نہ مٹنے دے۔

ہر شہر میں کارکنوں کے نام منتخب کر لیے جائیں جو یکے بعد دیگرے ڈکٹیٹر بن کر گرفتاری کے لیے اپنے کو پیش کریں۔ اس کے لیے دولت مند اور صاحب علم حضرات کی ضرورت نہیں۔ بلکہ مجلس احرار کو بہادر اور مخلص ورکروں کی ضرورت ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن کا یہ بیان جب پوسٹر کی صورت میں شائع کیا گیا تو حکومت برطانیہ نے پوسٹر ضبط کر لیا۔ نیز یہی بیان ۸۔ نومبر ۱۹۳۱ء کے روزنامہ انقلاب لاہور میں شائع ہوا تو یہ پرچہ بھی ضبط کر لیا گیا۔

یوم الٰہی بخش شہید ۶۔ نومبر ۱۹۳۱ء شہید الٰہی بخش کا یادگار دن سارے ہندوستان میں منایا

گیا۔ اس روز ۹۔ کروڑ مسلمانوں نے اس بہادر سپوت کے خون کی قسم کھائی کہ ہم اپنے کشمیری بھائیوں کی آزادی کے لیے آخری دم تک جدوجہد کرتے رہیں گے۔

شیخ حسام الدین کی زبان بندی اور خواجہ غلام محمد کی گرفتاری

برطانوی مداخلت کے باوجود تحریک احرار شہروں سے نکل کر قصبوں اور دیہاتوں تک پھیل گئی۔ اب تک دس ہزار کے قریب مسلمان پنجاب کی مختلف جیلوں میں پہنچ چکے تھے۔ یہ تعداد صرف متعینہ محاذ کے احرار دفاتر کے رجسٹروں میں درج تھی۔ اس کے علاوہ جذبات سے سرشار ہزاروں مسلمان بغیر نام درج کرائے قید خانوں میں چلے گئے تھے۔

۷۔ نومبر کو تحریک حریت کے دوسرے ڈکٹیٹر شیخ حسام الدین کو سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر نے پندرہ دن کی زبان بندی کا نوٹس دیا۔ اسی تاریخ کو کوہالہ کے پل پر خواجہ غلام محمد کو معہ تمام رضاکاروں کے گرفتار کر لیا گیا۔

خواجہ غلام محمد جو پہلے اور دوسرے احرار وفد کے ساتھ حکومت کشمیر سے گفتگو کرنے گئے تھے سول نافرمانی کی ابتدائی تاریخ سے ۷۔ نومبر تک کوہالہ کے پل پر اپنے رضاکاروں سمیت قابض رہے اس دوران نہ تو کشمیر کا مال برطانوی علاقے میں داخل ہو سکا اور نہ ہی سرکاری علاقے کی کوئی چیز کشمیر جا سکی۔ تقریباً دس دن کے اس تعطل کے باعث کشمیری حکومت کو پچاس ہزار سے زائد روپے کا مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ راولپنڈی کے تمام احرار ورکرز ایک ایک کر کے گرفتار ہو چکے تھے۔ اب یہاں کی تحریک سول نافرمانی کی باگ ڈور عوام کے ہاتھوں میں تھی۔ جہلم میں مقامی کارکن اور رہنما بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ صرف راقم سارے شہر اور اس کے گرد و نواح میں تحریک کی ذمہ داری اٹھائے ہوئے تھا۔

۱۰۔ نومبر کو شیخ حسام الدین نے ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے سے پیشتر مولانا حبیب الرحمٰن کو اپنے بعد ڈکٹیٹر مقرر کیا اور رام تلائی میں حکومت کے نوٹس کے پرزے اڑا دیے۔ اس پر شیخ صاحب کو گرفتار کر لیا۔ اور اسی روز ایک سال قید اور پانچ سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔

گول میز کانفرنس دہقان ہل چلانے اور بیج بکھیرنے سے کئی روز پیشتر سوچتا ہے۔ موسموں کے

جوار بھاٹا پر غور کرتا ہے۔ برسات کے بعد دھرتی کی نمی کا جائزہ لیتا ہے۔ جب اسے اپنی محنت کے ثمر آور ہونے کا پختہ یقین ہو جائے۔ تو ہل پنجالی لے کر کھیتوں میں آجاتا ہے۔

سیاستدان بھی اسی طرح ذہنوں کی پرورش کرتے ہیں۔ دل اور ضمیر ٹٹولتے ہیں۔ پھر ان کا سودا چکاتے ہیں۔ منڈی میں فروخت ہونے والے مال کی طرح اس بازار میں بھی ہلکے اور بھاری سودے ہوتے ہیں۔

انگریز ایسا پولیٹیشن جس کے دل اور دماغ کے پرزے سیاسی اعتبار سے زبان اور ضمیر کے ترجمان نہیں ہوتے۔ جب یہ بازار سیاست میں سوداگری کرتا ہے تو اس کی نظریں انسانی دلوں کا ایکسرے کرتی ہیں اور یہی موقعہ اس کی خرید و فروخت کا ہوتا ہے۔

پہلی اور دوسری گول میز کانفرنس کے موقعہ پر فرنگی دانشوروں نے جس چابکدستی سے ہندوستانی باشندوں سے سیاسی مذاق کیا اس بساط پر اپنے مہرے جس انداز میں بکھیرے ایشیا کے سیاسی کھلاڑی اس محفل میں بری طرح مات کھا گئے۔ اس پر طرہ یہ کہ برطانوی حکمرانوں نے لندن کے ان تاریخی اجتماعات کی ناکامی کی تمام تر ذمہ داری ہندوستانی راہنماؤں پر ڈال دی۔

متحدہ ہندوستان کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی کی تاریخ گواہ ہے کہ برطانوی سامراج نے DEVIDE AND RULE کی پالیسی پر اقوامِ ہند میں نفرت کا جو بیج بویا یہ اس کا ثمرہ تھا کہ گول میز کانفرنس کو اس اطوار سے سجایا گیا کہ ہندوستان کے سیاسی رہنما جنہیں صرف ہندوستان کے مسائل کے لیے بلایا گیا تھا۔ الگ الگ کرسیوں پر بیٹھ کر جدا جدا مسائل پر سوچنے لگے۔ ؂

نیند سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر - پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

جنہیں غیر ملکی غلامی سے نجات کے لیے سوچنا تھا۔ وہ برطانوی تارِ عنکبوت میں بری طرح الجھ گئے۔ پانچ سو سے زائد ہندوستانی ریاستیں اپنے تحفظ کے حصار تعمیر کرنے لگیں۔ ہندو قوم ہندوستان کی غالب اقلیت پر رحم کھانے کو تیار نہیں تھی۔ مہاتما گاندھی اچھوتوں پر مندروں کے دروازے نہ کھلنے پر اپنی قوم سے ناراض ہو سکتے تھے لیکن مسلمان قوم کے لیے اس کے ضمیر کے دروازے بند ہو چکے تھے۔

گول میز کانفرنس کے دوران مسٹر محمد علی جناح نے اپنے یہ چودہ نکات پیش کیے۔

۱- آئندہ کانسی ٹیوشن فیڈرل ہوگی۔ جس میں تمام غیر معینہ معاملات صوبہ جات سے متعلق ہوں گے۔

۲- تمام صوبہ جات کو مساوی اختیارات دیے جائیں گے۔

۳- تمام مجالس قانون ساز اور دیگر مجالس جو انتخابات کے ذریعے بنتی ہیں۔ وہ دوبارہ بنائی جائیں گی۔ جن میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ٹھیک کیا جائے گا۔ لیکن کسی اکثریت کو اقلیت میں یا برابری میں تبدیل نہیں کیا جائے گا۔

۴- مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی سے کم نہ ہوگی۔

۵- انتخاب جداگانہ جیسے فی الحال ہیں وہ قائم رہیں گے۔ لیکن کمیونٹی کو اختیار ہوگا کہ جب وہ چاہے انتخاب جداگانہ ترک کر کے انتخاب مشترک اختیار کرے۔

۶- اگر موجودہ صوبائی علاقوں میں کوئی ردوبدل اراضی کی گئی تو اس طرح ہوگی کہ اس کا اثر مسلم اکثریت پنجاب و بنگال اور صوبہ سرحد پر نہ ہوگا۔

۷- مکمل مذہبی آزادی یعنی آزادیٔ عقائد۔ عبادت، مذہبی طریقوں پر عمل، اشاعت تقریر مجالس و تعلیم ہر کمیونٹی کے لیے محفوظ کیے جائیں گے۔

۸- کوئی مسودۂ قانون یا ریزولیشن کسی مجلس قانون ساز میں یا کسی منتخب شدہ ادارہ میں پیش نہ ہو سکے گا۔ اگر کسی کمیونٹی کے چوتھائی ممبر یہ کہیں کہ یہ ان کے واسطے مضر ہے۔ اور اگر ضرورت ہوئی تو ان کا حل معلوم کیا جائے گا، جو پسندیدہ ہو۔

۹- سندھ کو صوبہ بمبئی سے جدا کیا جائے۔

۱۰- صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ریفارم اس طرح ہو جیسے دوسرے صوبوں میں۔

۱۱- کانسٹی ٹیوشن میں دفعہ ہو کہ مسلمانوں کو بشرط قابلیت تمام سرکاری و نیم سرکاری محکمہ جات میں کافی ملازمتیں دی جائیں گی۔

۱۲- کانسٹی ٹیوشن میں اس کا کافی تحفظ ہو۔ جس سے مسلمانوں کے مذہب، کلچر ذاتی قانون کا تحفظ ہو۔ اور مسلمانوں کی تعلیم میں ترقی ہو۔ اور ان کی زبان، مذہب پرسنل لا، اوقاف کا تحفظ ہو۔ اور گورنمنٹ و نیم سرکاری محکمہ جات سے

مسلمان اداروں کو ان کی حصہ رسد امداد ملتی رہے۔

۱۳۔ کوئی مرکزی یا صوبائی وزارت اس وقت تک نہ بنے گی۔ جب تک کہ اس میں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی نہ ہو۔

۱۴۔ مرکزی مجلس قانون ساز کو کانسٹی ٹیوشن میں تبدیلی کرنے کا حق اس وقت تک نہ ہوگا۔ جب تک سارے صوبے جو فیڈریشن میں شامل ہوں اپنی رضامندی نہ دیں۔"

یہ چودہ نکات انہوں نے مارچ ۱۹۲۹ء میں تیار کیے تھے۔ اور ان دنوں مسٹر محمد علی جناح (قائداعظم) نے اپنی مسلم لیگ کی میٹنگ دہلی میں بلائی تھی۔ جس میں وہ اپنے چودہ نکات کی منظوری چاہتے تھے۔ لیکن اس سے پیشتر سر آغاخاں کی صدارت میں مسلم لیگ کا اجلاس ہو چکا تھا۔ جس کے اکثر محرک مسٹر جناح کے مخالف تھے۔ ان دنوں مخلوط اور جداگانہ انتخابات پر جھگڑا اچل رہا تھا۔ کانگریس کے حامی مسلمان جن میں چودھری خلیق الزمان، ڈاکٹر محمد عالم، رفیع احمد قدوائی، خواجہ عبدالحمید پیش پیش تھے، مخلوط انتخابات کے حامی تھے۔ اور دوسرے لوگ تعداد میں کم ہونے کے باعث اور خود مسٹر جناح کے اس اجلاس میں ٹھیک وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور اس طرح مسٹر جناح کے چودہ نکات والا ریزولیشن آگ کی نذر ہو چکا تھا۔ بنابریں وہ اپنے چودہ نکات مسلم لیگ کے سامنے پیش نہ کر سکے۔ مگر ہندوستان کے اخبارات نے انہیں خوب ہوا دی۔

یہی چودہ نکات جب انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے گول میز کانفرنس کے موقعہ پر گاندھی جی کے سامنے رکھے تو انہوں نے جواب میں کہا۔ اسے ہم سر محمد یامین (ممبر ایگزیکٹو کونسل وائسرائے ہند) کی کتاب اعمال کے صفحہ ۳۹۵ سے نقل کرتے ہیں۔

"چونکہ مسٹر جناح نے مسلمانوں کو قوم نہیں کہا تھا بلکہ ایک فرقہ کہا تھا۔ مہاتما گاندھی نے مسٹر جناح سے کہا، میں اپنا دستخطی چیک آپ کو دیتا ہوں، رقم آپ جو چاہیں بھر لیں۔ یعنی سادہ کاغذ پر دستخط کر کے دے دیں گے اور مسٹر جناح جو چاہیں اس میں شرط بھر لیں۔ لیکن مسٹر جناح نے اپنے چودہ نکات پیش کیے کہ ان کو کانگریس

کی طرف سے منظور کر کے دستخط کریں تو مہاتما گاندھی نے وہیں سے ٹوٹنی لگا دی۔ اور کہا میں اپنی ذاتی حیثیت سے ہر چیز منظور کرنے کو تیار ہوں لیکن کانگریس کی طرف سے کوئی منظوری نہیں دے سکتا۔

یہ عجیب بات تھی کہ کانگریس نے اپنے متفقہ مشورے سے گاندھی کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ وہ اس کو منظور کر کے لندن گئے تھے۔ ان حالات کے مطابق مجلس احرار کے تیسرے ڈکٹیٹر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ۱۲۔نومبر ۱۹۳۱ء کو پریس کے ذریعے اخبارات کو حسب ذیل بیان دیا۔

"یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے چودہ مطالبات منظور نہیں کیے جائیں گے۔ کیونکہ حکومت ہند، ہندو اور کانگریس سے خائف ہے اور وہ دونوں کو ایک ہی نظام سمجھتی ہے۔ انگریز سمجھتا ہے کہ ہندو ہمارے نظام حکومت کو درہم برہم کر دے گا اور اسی سے ہندو کا خوف انگریزوں کے دل میں پیدا ہو گیا ہے اور وہ دیکھ رہا ہے کہ ہندو ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہے۔ اور مسلمانوں کی نسبت انگریز کے دل میں یقین پیدا ہو گیا ہے کہ ان میں کوئی ایسی سرفروش جماعت نہیں جو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے انگریزی نظام حکومت سے ٹکرا سکے۔

گاندھی، سر تیج بہادر اور مالویہ نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں برطانوی حکومت کو دھمکی دی ہے۔ اگر اس نے کانگریس کی بات نہ سنی تو ہندوستان میں سول نافرمانی شروع کر دی جائے گی۔

ایسی دھمکیوں کا انگریزوں کے دماغوں پر لازمی اثر ہوا ہوگا۔ کیونکہ گزشتہ تحریک نمک ستیہ گرہ میں وہ اپنے آپ کو ثابت کر چکے ہیں۔ اس کے برعکس گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کا ایک بھی نمائندہ ایسا نہیں جو حکومت برطانیہ کو دھمکی دے سکے۔ بلکہ ایسا بھی نہیں کہ جس کی نسبت برطانیہ کو کوئی شبہ یا خدشہ ہو کہ اگر ہم نے مسلمانوں کے مطالبات منظور نہ کیے تو وہ ہندوستان میں سول نافرمانی شروع کر دیں گے۔ یا کم از کم اپنی

قوم کو ایسا کرنے کا مشورہ بھی دے سکے گا۔

یہ خبر اخبارات میں آچکی ہے کہ وائسرائے نے گورنمنٹ برطانیہ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی پرواہ کیے بغیر ہندو لیڈروں سے صلح کر لے۔

اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وائسرائے مسلمان قوم کو مردہ تصور کرتا ہے۔ بنابریں میں ہندوستان کے مسلمانوں کو پیغام دینا چاہتا ہوں کہ وہ حالات پر بہادری اور دیانتداری سے غور کریں۔ نیز اگر وہ اپنی آئندہ نسلوں کو اچھوت بننے سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ان کا دیانتداری سے یہ فرض ہے کہ وہ آج سے مجلس احرار کے جھنڈے تلے آکر اپنی قربانی پیش کریں۔ جسے دیکھ کر حکومت اور ہندوستان کی دوسری قومیں مسلمان کو ایک زندہ قوم سمجھیں۔"

اس بیان کے فوراً بعد (۱۲-نومبر) مولانا حبیب الرحمٰن اور ان کے ساتھی لاہور مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ماسٹر محمد شفیع کو رات بارہ بجے دفعہ ۱۲۱، ۱۲۳ اور ۱۰۸ کے تحت گرفتار کر لیا۔ دفتر مرکزیہ کی حدبندی کر کے تلاشی لی گئی اور تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں کر کے دفتر کو مقفل کر دیا۔ اسی رات مرکزی جنرل سیکرٹری مولانا محمد داؤد غزنوی کو ان کے مکان سے دفعہ ۱۱۷ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔

گلینسی کمیشن کا تقرر

تحریک پر برطانوی قبضہ اور احرار رہنماؤں کی گرفتاریوں کے بعد مہاراجہ نے انگریز کی سازش سے ایک اور اعلان کیا۔

۱۳-نومبر ۱۹۳۱ء کو گلینسی کمیشن کا اعلان کرتے ہوئے مہاراجہ کشمیر نے کہا۔

"کمیشن میں اہل کشمیر کے منتخب نمائندے شامل کیے جائیں گے۔

کشمیریوں کو ان کے ابتدائی حقوق کے لیے بحث کا فوراً آغاز ہوگا۔

مذہبی شکایات کا تدارک کیا جائے گا۔

تعلیم کے متعلق مالی امداد دی جائے گی۔ لیکن آئینی حقوق کا فیصلہ ایک کانفرنس کرے

گی۔ (مہاراجہ نے یہ حکم بھی دیا کہ) کشمیر کے لوگ گلینسی کمیشن کے سامنے حالات کی تحقیقات کے لیے آئیں اور تمام حالات پر غور کر کے رپورٹ میرے سامنے بھیجیں۔"

اس اعلان کے دوسرے روز سر سکندر حیات خاں جو ان دنوں حکومت پنجاب کے ذمہ دار رکن تھے، حالات کشمیر سے آشنا ہونے کے باوجود سرکاری مصلحت کے پیش نظر اس سے چشم پوشی کر رہے تھے۔ ان کی کوٹھی میں سرکاری اور غیر سرکاری احباب کی ایک UN-OFFICIAL میٹنگ ہوئی۔ جس میں احرار کی طرف سے چودھری افضل حق۔ مسلم لیگ کی طرف ملک برکت علی۔ اور کشمیر کمیٹی کی طرف سے مرزا البشیر الدین شامل ہوئے۔ اس اجلاس میں ریاستی معاملات پر بحث کے شروع میں چودھری افضل حق نے کہا "احرار چاہتے ہیں کہ پنجاب کی طرح کشمیر میں آئین نافذ کیا جائے۔ وہاں کے باشندوں کو ان کی رائے کے مطابق ووٹ دینے کا حق دیا جائے۔ کشمیریوں کی مشکلات کا حل اس کے بغیر دوسرا نہیں۔"

اس پر مرزا البشیر الدین محمود نے کہا "کشمیر کا مسلمان ابھی آئین قبول کرنے کے حق میں نہیں ہے۔"

اس غیر سرکاری اجتماع میں کافی بحث کے بعد قرار پایا کہ ریاست کشمیر میں پنجاب کا سا آئین نافذ کر دیا جائے۔ لیکن مرزا البشیر الدین محمود نے اس قرارداد کو نامنظور کرتے ہوئے۔ گلینسی کمیشن کے تقرر کو حق بجانب قرار دیا۔ جبکہ چودھری افضل حق نے گلینسی کمیشن کے کسی بھی فیصلے کی تائید نہ کرتے ہوئے اس کے تقرر کو کشمیریوں کے لیے غیر مفید قرار دیا۔ اسی بعد شیخ عبداللہ نے کشمیر سے اپنے ایک بیان کے ذریعے گلینسی کمیشن کو منظور کر لیا۔

ان حالات کے بعد احرار کی سول نافرمانی نے ایک نیا رخ لیا۔ اور اب یہ لڑائی مہاراجہ کشمیر کے علاوہ ہندو پریس، ٹوڈی مسلمان، مرزائی اور برطانیہ سے براہ راست لڑی جانے لگی۔

احرار چونکہ انگریز کی حکمت عملی سے آشنا ہو چکے تھے لہٰذا امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے سارے ہندوستان میں برطانوی پالیسی کو اپنی تقریروں میں اس طرح پیش کیا کہ حکومت ہند نے ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو دفعہ ۱۲۴ الف (حکومت برطانیہ کے خلاف بغاوت) کے تحت انہیں دہلی سے گرفتار کر لیا۔ اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مولانا مظہر علی اظہر ڈکٹیٹر اول نے ۱۸۔ اکتوبر کو حسب ذیل مکتوب وائسرائے ہند کو لکھا۔

"عام طور پر خیال کیا جا رہا ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے خلاف جو دفعہ ۱۲۴ لگائی گئی ہے اس میں مرزا بشیرالدین محمود کا بھی ہاتھ ہے۔ میری اطلاع ہے کہ شاہ جی کے خلاف کارروائی کرنے کی منظوری دینے کی ذمہ دار صرف حکومت دہلی ہی نہیں ہے۔

بہرحال حکومت ہند اور حکومت پنجاب کی پوزیشن خواہ کچھ ہی ہو۔ عام تاثر یہی ہے کہ حکومت پنجاب نے دوسری پارٹی (مرزائی) کی حوصلہ افزائی کی خاطر ایک پارٹی کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ ہماری جماعت (احرار) کے لوگ کسی سیاسی مقصد کے حصول کے لیے جیل خانے سے نہیں ڈرتے۔ ایک دوسری جماعت کی خاطر احرار کو تختۂ مشق بنانا کسی طرح فضا کو ساز گار نہیں کر سکتا۔ سرکاری اعلان یا کسی دوسرے ذرائع سے اس امر کی تردید کافی نہ ہو گی۔ اگر حکومت رائے عامہ کو مطمئن کرنا چاہتی ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے وہ کہ مقدمہ واپس لے لے اور اگر کسی صوبے کی حکومت سید عطاء اللہ شاہ کو محبوسِ زندان کرنے کی مشتاق ہے تو وہ اس کے لیے دوسرے مواقع تلاش کر سکتی ہے۔"

مولانا مظہر علی اظہر کے اس مکتوب کے جواب میں حکومت خاموش رہی۔ اور بالآخر اس مقدمہ میں امیر شریعت کو ڈیڑھ سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔

اس وقت تک چودھری افضل حق کے علاوہ احرار ورکنگ کمیٹی کے تمام ارکان گرفتار ہو چکے تھے۔ برطانوی پالیسی ریاست کشمیر کا احاطہ کر چکی تھی۔ جیسے ہی احرار نے گلینسی کمشن کے مقاطع کا اعلان کیا۔ اندرونِ کشمیر ایک نیا جذبہ پیدا ہوا۔ حکومت نے ہر آزاد خیال کشمیری کو احرار کا ممبر ہونے کا الزام دے کر گلینسی کمیشن کے سامنے برائے شہادت پیش ہونے سے روک دیا۔ شیخ عبداللہ ۱۲ ستمبر کو گرفتار کر لیے گئے تھے اور ریاست کے اندر عام بغاوت پھیل چکی تھی۔ اور ساتھ ہی پنجاب کے جیل خانوں میں احرار قیدیوں پر تشدد کا نیا دور شروع ہوا۔ خوراک میں کئی کئی سالوں کی بوسیدہ سبزیوں کے ساتھ کولہو، خراس، چکی پیسنے کی مشقت عام لی جاتی۔ کاغذ کی جگالی (کاغذ کا ملیدہ) اٹھارہ سیر گندم پیسنا، مونجھ کوٹنا، بان بانٹنا۔ اس قسم کی ظالمانہ مشقتیں جو پیشتر ازیں کانگریس تحریک کے دنوں بھی جیلوں میں قیدیوں سے نامناسب سمجھی جاتی رہیں۔ احرار قیدیوں سے

ان کا حصول جائز قرار دیا گیا۔ کسی قیدی کے ہلکے سے سوال پر اس قدر پیٹا جاتا کہ وہ بے ہوش ہو جاتا۔ کولہو اور کنوئیں کے آگے بیلوں کی جگہ احرار قیدیوں کو جوتا جا رہا تھا۔ کھڑی ہتھکڑی، بیڑی، ڈنڈ بیڑی ٹاٹ وردی اور سرائی موسم میں رات کے باسی پانی میں کاغذ کا ملیدہ کرنا جیسی بے رحمانہ مشقتیں لے کر ہندو اور انگریز آفیسروں نے احرار قیدیوں سے اپنا مذہبی اور سیاسی انتقام لیا۔

برطانوی جیل خانوں کے علاوہ ریاست کی ستواری جموں جیل کے سپرنٹنڈنٹ سید حبیب اللہ شاہ (مرزا بشیر الدین محمود کے قریب ترین عزیز) نے سول نافرمانی کے قیدیوں پر اس قدر تشدد کیا کہ وہ بھوک ہڑتال پر مجبور ہو گئے۔ اور اس حالت میں ان پر ڈوگرہ فوج نے حملہ کر دیا جس سے سینکڑوں قیدی زخمی ہوئے۔ اور ان میں بعض تو اس تشدد کے باعث زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔

اس ظلم و جور کی صدائے بازگشت جب جیل خانوں کی اونچی دیواروں سے گزر کر عام فضاؤں میں تحلیل ہوئی تو انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی۔ بتیس لاکھ کشمیریوں کی آزادی کے لیے قربان ہونے والے جانثاروں کو جب چوراڈا کو اور قاتلوں کی زنجیروں سے باندھا گیا تو کانگریس نیتاؤں کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں۔ جو کانگریسی قیدی کی ذراسی تکلیف پر آسمان سر پر اٹھا لیتے تھے۔ انہوں نے احرار قیدیوں کے تشدد پر ایسی خاموشی اختیار کی، جیسے ان زبانوں پر سانپ بیٹھ گئے ہوں۔ JAILMANUAL جسے خود برطانوی دانشوروں نے مرتب کیا تھا۔ اس کے پرزے اڑتے دیکھ کر ان پیشانیوں پر کوئی شکن نہیں پڑی۔ ہاں البتہ ہندوستان کی بتیس کروڑ کی آبادی میں سے صرف جمعیۃ علمائے ہند کے صدر مولانا مفتی کفایت اللہ نے ۱۹۔ نومبر ۱۹۳۱ء کو اپنے ایک پریس بیان میں کہا۔

"مجھے معلوم کر کے بڑا دکھ ہوا کہ پنجاب کی مختلف جیلوں میں احرار رضا کاروں کے ساتھ نہایت بے رحمانہ سلوک کیا جا رہا ہے۔ سردی کے موسم میں ان کے لیے نہ تو بستروں کا انتظام ہے اور نہ ہی انہیں خوراک بہتر دی جاتی ہے۔ بلکہ جو کھانا ان قیدیوں کو دیا جا رہا ہے اسے کسی صورت بھی انسانی خوراک نہیں کہا جا سکتا۔ تیرہ تیرہ چودہ سو روپیہ انکم ٹیکس دینے والوں کو بھی سی کلاس میں رکھا گیا ہے۔

ایسے میں کونسل اسمبلی کے مسلم ارکان کا فرض ہے کہ وہ خود پنجاب کی جیلوں میں جا کر رضا کاروں کی حالت کا بچشم خود معائنہ کریں۔ اور حکومت سے پوچھیں کہ وہ احرار

رضاکاروں سے اس قدر بے رحمانہ سلوک کیوں کر رہی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ سرفروش مسلمان ان سختیوں سے دل برداشتہ نہیں ہوں گے اور جس بلند مقاصد کو لے کر وہ گھر سے نکلے ہیں۔ اس کے لیے ان تمام مشکلات کو برداشت کریں گے۔"

اس سے پیشتر ۱۵۔ نومبر کو آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے دہلی کے اجلاس میں جموں و کشمیر کی آزادی کے لیے پرامن جدوجہد کرنے والوں پر قید خانوں میں بے پناہ مظالم کے خلاف اظہار ہمدردی کیا۔

ان دنوں احرار تحریک کے چوتھے ڈکٹیٹر مولانا احمد علی (لاہوری) تھے۔

مولانا احمد علی کو ۱۳۔ نومبر ۱۹۳۱ء کو رات دو بجے ان کے گھر شیرانوالہ گیٹ سے گرفتار کر لیا گیا اس وقت سول نافرمانی کے سلسلے میں پندرہ ہزار سے زائد رضاکار گرفتار ہو چکے تھے۔ نیز گورداسپور اور گجرات کے راستے دو محاذ اور کھول دیے گئے تھے۔ سیالکوٹ، جہلم، راولپنڈی کے بعد گورداسپور اور گجرات کے نئے محاذوں نے برطانوی حکومت کے لیے پریشانی کے نئے دروازے کھول دیے۔

احرار تحریک کی صدائے بازگشت

مولانا احمد علی کی گرفتاری کے بعد گوجرانوالہ کے مولوی محمد چراغ پانچویں ڈکٹیٹر تھے۔ ان کی گرفتاری پر مولانا عبدالحنان چھٹے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے۔

تحریک جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی سامراجی قوتیں اپنی موت کے خوف سے لرزنے لگیں۔ جیل خانوں کی لامحدود بیرکیں اور تنہائی کو ٹھڑیاں احرار قیدیوں سے تنگی محسوس کرنے لگیں۔ پنجاب سے نکل کر یہ تحریک سارے ہندوستان کی توجہ کا مرکز بن چکی تھی۔ سرخ وردیاں پہنے احرار رضاکار جب گنگا و جمنا کے شفاف پانیوں سے گزر کر ستلج اور بیاس سے ٹکراتے راوی جہلم۔ چناب کی موجوں سے کھیلتے ہوئے دریائے اٹک کی ہنگامہ خیزیوں سے نبرد آزما ہوتے تو یوں لگتا جیسے ساون بھادوں کے دنوں بیر بہوٹیاں شفق کی سرخیوں سے خون آشام جنگ لڑ رہی ہوں۔

خلافت تحریک کے بعد احرار سول نافرمانی کی یہ دوسری سیاسی تحریک تھی جسے ہندوستان کے مسلمان نے تنہا اپنی قوت ایمانی کے سہارے لڑا تھا۔ جبکہ انگریز، ہندو، قادیانی اور ٹوڈی مسلمان احرار کے راستے میں دیواریں بن رہے تھے۔ لیکن احرار کے سرخ پرچم کی اڑانیں یونین جیک سے متصادم

ہو کر باطل قوتوں کو شکست دے رہی تھیں۔ انہی دنوں لندن میں دوسری گول میز کانفرنس میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے والوں نے جب غلام کشمیریوں کی زنجیریں ٹوٹنے کی صدائے بازگشت سنی تو ایوان برطانیہ کی میز پر بیٹھنے والے ٹھٹھک کر رہ گئے۔ اور انہی دنوں میاں سر محمد شفیع نے جو دوسری گول میز کانفرنس میں ہندی مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے تھے فخر سے کانفرنس کے ایک اجلاس میں کہا

"کانگریس کو اگر اپنی قوت اور سول نافرمانی پر ناز ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی مجلس احرار ایسی بہادر اور باطل شکن جماعت پر فخر ہے۔"

اس کے جواب میں گاندھی جی نے کہا کہ احرار تحریک ہندوستان میں انگریزی اقتدار کی عمر بڑھانے کا بہانہ بنے گی۔

برطانوی سیاستدانوں نے پہلی اور دوسری گول میز کانفرنس میں جو کھیل کھیلا اور جس انداز سے اپنے گناہ اور فریب کی تمام تر ذمہ داری ہندوستانی رہنماؤں پر ڈال کر اس ڈرامہ کا ڈراپ سین کیا۔ احرار رہنما یہ سارا کچھ پہلے سے سمجھ رہے تھے۔ اور اسی بنا پر گاندھی جی کو ساحل بمبئی پر جب وہ لندن جانے کے لیے جہاز پر سوار ہو رہے تھے، مولانا حبیب الرحمٰن اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے انہیں کہا تھا۔

"مہاتما جی! آپ لندن جا کر اپنا اور ہندوستان کا وقت ضائع کریں گے۔ انگریز ایسا سمجھدار سیاستدان آپ کی جھولی میں اتنی آسانی سے سوراج کا ٹکڑا نہیں ڈال سکتا اس کے لیے تو بڑے انقلاب کی ضرورت ہے۔"

لیکن گاندھی جی نے زعمائے احرار کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے ٹال دیا تھا۔ آخر وہی ہوا کہ ۲۹۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو اپنی آشاؤں کی خالی جھولی لے کر ہندوستان واپس آگئے۔ اس طرح دوسری گول میز کانفرنس کا تماشہ بھی ختم ہو گیا۔

احرار سے مصالحت کی گفتگو

احرار سول نافرمانی شروع ہوئے بیس روز ہو چکے تھے۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق بیس ہزار اور غیر دفتری اطلاع کے مطابق اٹھارہ ہزار رضاکار جیلوں میں جا چکے تھے۔ پشاور سے کلکتہ اور کراچی سے دہلی تک کے قافلے

مختلف محاذوں پر پہنچ کر اپنے کو گرفتاری کے لیے پیش کر رہے تھے۔ سیالکوٹ سے ایک دن میں ساٹ ڈکٹیٹر گرفتار ہوئے۔ ہزاروں مسلمان نام درج کرائے بغیر قافلوں کے ساتھ روانہ ہو رہے تھے۔ گوجرانوالہ سے رستم ہند رحیم پہلوان سلطانی والا کرم الٰہی جیسے نامور پہلوان تحریک میں شامل ہو چکے تھے۔ گوجرانوالہ کے عوام نے قافلوں کے ساتھ جانے والے شہر کے جیالے نوجوانوں کے سینوں پر سونے کے تمغے آویزاں کیے۔

انگریز اور مہاراجہ کو تحریک سول نافرمانی کی کامیابی کا یہاں تک یقین نہیں تھا۔ ان کی رائے تھی کہ احرار والے بڑا تیر ماریں گے تو پانچ ہزار سے زائد آدمی قید نہیں کرا سکتے۔ مگر حالات نے دونوں حکومتوں کی رائے کو شکست دے دی۔ جیل خانوں کی وسعت محدود ہوتے دیکھ کر شاہی قلعے بطور جیل خانہ استعمال کرنے پڑے۔ چنانچہ اٹک کا قلعہ بھی انہی دنوں احرار قیدیوں کے لیے استعمال کیا گیا۔ واقعات یہاں تک پہنچ پائے تھے کہ مہاراجہ اور انگریز دونوں نے احرار کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔

حکومتیں طاقت کے سامنے جھکتی ہیں یا پھر ضرورت انہیں اپنے سے کمزور کے دروازے پر لے جاتی ہے۔ مجلس احرار کی عوامی طاقت نے ڈوگرہ شاہی اور برطانیہ ایسی سلطنت کو صرف بیس روز کی ایجی ٹیشن نے مصالحت کے لیے مجبور کر دیا۔ حالانکہ احرار فقیروں کا ایک حقیر ٹولہ تھا جس کے پاس نہ دولت اور نہ ہی پریس کی آواز تھی۔ اس پر اپنے پرائے بادِ سموم کی طرح دلوں کو جلا رہے تھے۔ لیکن ارادے کی قوت مضبوط ہو۔ ایمان اور عزم میں ہمالیہ کی سی بلندی ہو تو راستے آپ سے آپ صاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔

گو حکومتیں براہ راست گفتگو، مصالحت کے لیے سامنے نہیں آئیں۔ تاہم اندرونِ خانہ نواب اسماعیل خاں اور خواجہ عبدالرحمٰن غازی وائسرائے ہند سے مل رہے تھے۔ اور اسی بنیاد پر ۲۰۔ نومبر ۱۹۳۱ء کو جمعیۃ علمائے ہند کے صدر مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، چوہدری افضل حق خواجہ عبدالرحمٰن غازی، رانا فیروزالدین وکیل اور شیخ محمد صادق ایم۔ ایل۔ سی نے احرار تحریک کے دوسرے ڈکٹیٹر شیخ حسام الدین سے سیالکوٹ جیل میں ملاقات کی۔ یہ خفیہ اور اہم ملاقات چار بجے شام سے رات نو بجے تک جاری رہی، حکومت کا موقف تھا۔

”حکومت احرار کی ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہے۔ لیکن وہ قافلوں کی روانگی فوراً بند کر دے۔“

لیکن احرار“ حکومت کی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔ اس گفتگو کے ناکام ہونے پر ۲۵ نومبر ۱۹۳۱ء کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی۔ ”حکومت ہند نے سرکاری وضع کے چند لوگوں کا ایک وفد مرتب کیا ہے۔ جس میں اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے مسلمان ممبران شامل ہیں کہ وہ احرار اور انگریزوں کے درمیان مصالحت کی کوئی صورت نکالیں اور اس سلسلے میں یہ حضرات عنقریب کوئی عملی اقدام کریں گے۔ آنریبل سید حسن امام۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، شیخ صادق حسن اور سیٹھ عبداللہ ہارون“۔ اس ضمن میں احرار نے اعلان کیا۔

”جب تک ریاست کشمیر سے انگریزی فوجیں نہیں نکال لی جاتیں۔ احرار کسی مصالحتی گفتگو میں شریک نہیں ہوں گے۔“

اس اعلان کے فوراً بعد کشمیری مرزائیوں کی ذیلی تنظیم ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن نے مہاراجہ کو تار دیا۔

”ابھی برطانوی فوجوں کو سرینگر سے واپس نہ کیا جائے۔“

اس کی تائید میں کشمیر کمیٹی کے سیکرٹری مسٹر عبدالرحیم درد (مرزائی) نے حکومت ہند کو تار دیا۔ جس کا متن ۲۲۔ نومبر کے انگریزی اخبار اسٹیسمین لاہور میں شائع ہوا۔

”چونکہ احرار کا ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ کشمیر سے گورا فوج کو فوراً واپس بلا لیا جائے۔ لہٰذا ہماری درخواست ہے کہ ایسا ہرگز نہ کیا جائے۔“

سیالکوٹ ڈے

۲۰۔ اکتوبر کو مجلس احرار نے اپنی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ ۲۰۔ نومبر ۱۹۳۱ء کو احرار نے فیصلہ کیا کہ اس روز ”یوم سیالکوٹ“ منایا جائے۔ اس دن سول نافرمانی کو شروع ہوئے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اس دوران اٹھارہ ہزار آٹھ سو اٹھتر رضاکار گرفتار ہو چکے تھے۔ علاوہ ریاستی قیدیوں کے ان میں صرف سیالکوٹ کے نو ہزار دو سو تیس رضاکار تھے۔ سیالکوٹ ایسا صنعتی شہر احرار تحریک کی چھاؤنی بن چکا تھا۔ کوئی گھر ایسا نہیں تھا جس کے تمام افراد جیلوں میں نہ جا چکے ہوں۔ دس دس سال کے بچے ماؤں نے اپنی گودوں سے اٹھا

کر جیلوں میں بھیج دیے تھے۔ درسگاہیں بند ہو چکی تھیں۔ اس شہر کی مستورات بھی سرخ دوپٹے اور سرخ قمیضیں پہن کر رضاکاروں کے کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔ اس جذبے اور قربانی کے پیش نظر احرار نے ہندوستان بھر میں سیالکوٹ ڈے منانے کا فیصلہ کیا۔ جس سے تحریک میں نئی روح آ گئی۔

سکھ بھی بولے

۲۴۔ نومبر ۱۹۳۱ء کو سکھ پولیٹیکل کانفرنس کے صدر سردار سنت سنگھ ایم ایل اے نے ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ میں اپنے خطبۂ صدارت میں کہا۔

"کشمیر کے لیے احرار کی تحریک ہندو اور سکھوں کے خلاف چلائی گئی ہے۔ لہٰذا سکھ پنتھ کا فرض ہے کہ اس تحریک کا پوری جرأت سے مقابلہ کریں۔"

قادیانیوں کی نئی شرارت

تحریک احرار اس موڑ پر تھی کہ کشمیر کے قادیانیوں کو نئی شرارت سوجھی۔ ۳۰۔ نومبر ۱۹۳۱ء کو بغیر کسی اطلاع کے مظفر آباد کے ایک قادیانی احمد یار نامی نے اعلان کیا۔

"ہماری تحریک سبز پوشوں کا کسی بیرونی تحریک سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ہم ریاست سے باہر کی کسی تحریک کو ریاستی معاملات میں پسند کرتے ہیں۔ ویسے ہم کشمیر سے باہر کی انجمنوں کی قربانیوں کی قدر کرتے ہیں۔ لیکن ان کے پروگرام سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔"

گو مندرجہ بالا تحریک احرار سول نافرمانی کے سامنے پرکاہ کی طرح اڑ گئی۔ لیکن مہاراجہ کشمیر اور انگریزوں کے ایجنٹوں نے یہ شرارت ایسے وقت میں کی جب برطانوی نظام حکومت اور مہاراجہ کشمیر احرار کے سامنے سپر انداز ہو رہے تھے۔

احرار اور حکومت کشمیر کے درمیان مصالحت

دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی پر برطانوی حکومت کو شبہ ہونے لگا کہ لندن سے واپسی پر کانگریس اور حکومت ہند کے مابین سول نافرمانی کی لڑائی ناگزیر ہے۔ لہٰذا دوسرے اہم انتظام کے ساتھ جیل خانوں کا فارغ ہونا بھی ضروری تھا۔ پنجاب کے تمام جیل خانے ان دنوں احرار قیدیوں سے بھرے پڑے تھے۔ جس کے باعث خوراک اور دوسرے موسمی انتظامات کے

ناقص ہونے کی شکایت اخبارات میں عام ہو رہی تھی۔ چنانچہ حکومت ہند نے آنے والے خطرے کے پیش نظر مہاراجہ پر زور دیا کہ وہ احرار سے بہر طور مصالحت کرے۔

حالات کے اس پس منظر میں بغیر کسی تحریک کے چند غیر معروف لوگوں کے توسط سے مہاراجہ کشمیر کی جانب سے ۲۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو حسب ذیل دعوت نامہ مولانا مفتی کفایت اللہ صدر جمیعۃ علمائے ہند اور مولانا احمد سعید کے نام آیا۔

"ہز ہائی نس مہاراجہ کشمیر کی طرف سے دعوت خط بنام مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب!

کشمیر ہاؤس دہلی۔ ۲۔ دسمبر ۱۹۳۱ء

جناب محترم! میں نہایت خوشی کے ساتھ یہ بات جناب کے علم میں لاتا ہوں۔ کہ آج سہ پہر کے وقت ۵ اور ۶ بجے کے درمیان ہز ہائی نس مہاراجہ بہادر آف کشمیر آپ سے اور مولانا احمد سعید صاحب سے ملاقات کی مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بالکل صحیح ٹائم بعد میں ٹیلی فون پر عرض کر دیا جائے گا

آپ کا نیاز مند: ہری کشن کول۔ وزیر اعظم جموں و کشمیر"

اس خط کی بنا پر حضرت مفتی صاحب اور مولانا احمد سعید نے ۲۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو کشمیر ہاؤس دہلی میں ہز ہائی نس سے ملاقات کی۔

ہز ہائی نس اخلاق و احترام سے پیش آئے اور فرمایا کہ "میں آپ کی تکلیف فرمائی کا ممنون ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ آپ بزرگان کی کوشش سے اس تلخی کو جو کشمیر اور احرار میں پیدا ہو کر دونوں کے لیے پریشانی اور تکلیف کا سبب بن رہی ہے۔ ختم کرنے میں کامیابی ہو گی"

مفتی صاحب نے فرمایا کہ "میں آپ کی اس مہربانی کا کہ آپ نے ہمیں یاد فرمایا ممنون ہوں۔ اور جس امر کا آپ نے ذکر فرمایا میں اس کو انسانی خدمت کے لحاظ سے ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن ہز ہائی نس کو معلوم ہے۔ کہ معاملہ کی باگ ڈور مجلس احرار کے ہاتھ میں ہے۔ مجلس احرار کے کئی رہنما قید ہو چکے ہیں۔ اگر ہز ہائی نس احرار لیڈروں کو جو مختلف جیلوں میں قید ہیں ایک جیل میں جمع کرا دینے کا انتظام کرا دیں اور ہم دونوں کو اس کا موقعہ دیں کہ ہم ان احرار رہنماؤں کو ساتھ لے کر جو ابھی قید نہیں ہوئے ہیں۔ اسیر رہنماؤں سے ملاقات اور گفتگو کریں۔ اگر ایسا موقعہ بہم پہنچایا گیا تو ہمیں

امید ہے کہ ایک باعزت مفاہمت کرا دینے میں ہم کامیاب ہو جائیں گے۔

اس دوران وزیر اعظم نے دریافت کیا کہ باہر سے کن اصحاب کو اندر لے جانا آپ مناسب سمجھتے ہیں۔ مفتی صاحب نے چودھری افضل حق، خواجہ عبدالرحمٰن غازی کے اسمائے گرامی بتائے اور ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر دی کہ یہ حضرات اگر کسی اور شخص کو اپنے ساتھ لے جانا ضروری سمجھیں تو اس کو لے جانے کی اجازت ہونی چاہیے۔ نیز وزیر اعظم نے دریافت کیا۔

ان اسیر رہنماؤں کے نام کیا ہیں جنہیں آپ ایک جیل میں جمع کرانا چاہتے ہیں۔ مفتی صاحب نے مولانا مظہر علی اظہر، مولانا احمد علی، مولانا محمد چراغ، مولانا داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ماسٹر محمد شفیع کے نام لکھوائے۔

مفتی صاحب کی اس تجویز کو ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب نے منظور کر لیا۔ ہری کشن کول نے کہا، "مولانا مظہر علی اظہر تو ہمارے جموں جیل میں ہیں انہیں ہم بلا توقف جہاں چاہیں منتقل کر سکتے ہیں البتہ احرار لیڈرز جو انگریزی حکومت کے قیدی اور پنجاب کی مختلف جیلوں میں ہیں ان کو ایک جیل میں جمع کرنے کے لیے حکومت پنجاب سے کہنا ہوگا مگر یہ کوئی دقت طلب بات نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا انتظام آسانی سے اور جلد ہو جائے گا۔ میں آج یا کل لاہور جاؤں گا اور حکومت پنجاب کے ذمہ دار افسروں سے گفتگو کروں گا۔ ۴ یا ۵ دسمبر تک آپ کو اطلاع دوں گا۔

آپ کے خیال میں یہ اجتماع کس جگہ مناسب ہوگا؟ مفتی صاحب نے کہا "میری رائے میں اگر لاہور ہو تو بہتر۔ تاہم ہمیں اس پر کوئی اصرار نہیں کہ لاہور ہی میں ہو۔ جہاں بھی ہو ہم وہیں جا سکتے ہیں۔

وزیر اعظم نے کہا۔ ہاں میرے خیال میں بھی لاہور میں جمع کرنا اچھا ہے۔ پنجاب گورنمنٹ کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

بہر حال اجتماع لاہور میں ہو تو جس وقت آپ لاہور پہنچیں مجھے اطلاع کر دیں تاکہ اگر میں خود لاہور موجود نہ ہوں تو کوئی ذمہ دار شخص معاملات پر گفتگو کرنے کے لیے لاہور میں موجود رہے گا۔

اس گفتگو اور قرارداد کے بعد مفتی صاحب اور مولانا احمد سعید ہز ہائی نس سے رخصت ہو آئے اور وزیر اعظم کی دوسری اطلاع کے منتظر رہے۔

وزیر اعظم کشمیر کا تار

جموں۔ ۶۔ دسمبر ۱۹۳۱ء

مفتی کفایت اللہ پریذیڈنٹ جمعیۃ علمائے ہند کے نام

" حکومت پنجاب سے ملاقات ہو چکی ہے۔ اراکین کو ایک جگہ مجتمع کرنے میں چند یوم کا عرصہ لگے گا۔ اس مدت میں براہ کرم حضرات کو لاہور میں اپنی رائے سے مطلع کر دیجئے۔ اور اس کی ایک کاپی میرے پاس بھیج دیجئے۔ میں آپ کو خط بھیج رہا ہوں۔

وزیر اعظم

مفتی صاحب کا تار

دہلی۔ ۷۔ دسمبر ۱۹۳۱ء

جناب مکرم وزیر اعظم ریاست جموں و کشمیر

" تسلیم! جناب کا تار وصول ہوا۔ شکریہ! میرے خیال میں ممبران ورکنگ کمیٹی احرار کے اجتماع میں کوئی دقت نہیں۔ ان کے اجتماع اور میرے ان سے مشورہ کرنے سے پہلے نہ میں کوئی تجویز مرتب کر سکتا ہوں۔ اور نہ ہی کوئی ایسی تجویز مفید ہوگی۔ براہ کرم ان کے اجتماع کا انتظام جلد کر دیجئے "

محمد کفایت اللہ

میاں سر فضل حسین کی ملاقات

۱۰۔ دسمبر کو خواجہ حسن نظامی نے مولانا احمد سعید کو مطلع کیا کہ " آنریبل سر فضل حسین مفتی صاحب اور آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ اگر آپ حضرات آج چار بجے ان کی کوٹھی پر تشریف لائیں تو مہربانی ہوگی " مولانا احمد سعید نے مفتی صاحب سے مشورے کے بعد خواجہ حسن نظامی سے کہا کہ " ہم دونوں وقت مقررہ پر میاں صاحب کی کوٹھی پہنچ جائیں گے۔ حسب وعدہ دونوں حضرات وقت مقررہ پر سر فضل حسین کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ ملاقات کے وقت خواجہ حسن نظامی اور سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون بھی موجود تھے۔

دوران گفتگو سر فضل حسین نے مجلس احرار کے اقدام کا بھی تذکرہ کیا۔ مفتی صاحب نے جواب میں کہا۔ مجلس احرار باعزت مفاہمت کی متمنی ہے اور اسی طرح باعزت مفاہمت کرانے کے لیے ہم بھی اپنی خدمات میں پس و پیش نہیں کریں گے۔ چونکہ یہ اقدام مجلس احرار کی طرف سے ہوا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ احرار رہنماؤں سے مشورے کے بعد ہی کوئی شرائط مرتب کی جائیں

گی۔ بنا بریں احرار رہنماؤں کو ایک جیل میں جمع کیا جائے۔ نیز ان سے آزادانہ ملاقات اور مشورے کا موقعہ دیا جائے۔ اس پر میاں صاحب نے اسیر رہنماؤں کے نام دریافت کیے اور آزاد ارکان کے نام بھی پوچھے۔ چنانچہ اسیروں اور باہر سے جانے والوں کی فہرست لکھوادی۔ یہ وہی نام تھے جو پیشتر ازیں وزیراعظم کشمیر کو لکھوائے گئے تھے۔ نیز یہ بھی طے کر لیا گیا کہ ان کے علاوہ دوسرے ارکان کی ضرورت ہو تو ان کو بھی ساتھ لے جانے کی اجازت ہوگی۔ جسے میاں سرفضل حسین نے منظور کر لیا۔ اور کہا، میں کل یا پرسوں لاہور جا کر چودھری افضل حق سے براہ راست گفتگو کروں گا اگر انہوں نے پسند کیا تو یہ بہت اچھا ہوگا۔

روزنامہ احرار کا اجراء احرار سول نافرمانی شروع ہوتے ہی غیر مسلم اخبارات کے علاوہ مسلم اخبارات میں سے "زمیندار" اور روزنامہ "سیاست" بھی احرار کی مخالفت میں ہندو اخبارات سے ہم آہنگ ہو گئے۔ تاہم روزنامہ انقلاب لاہور کشمیر تحریک میں احرار کا پورا معاون رہا۔ لیکن جیسے ہی ۸۔ ستمبر ۱۹۳۱ء کو مدیر اعلیٰ روزنامہ انقلاب مولانا غلام رسول مہر۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے ساتھ دوسری گول میز کانفرنس کے لیے لندن روانہ ہوئے تو روزنامہ انقلاب کی پالیسی مولانا عبدالمجید سالک کی سپردداری میں آ گئی۔

سالک صاحب کے والد چونکہ قادیانی تھے لہٰذا سالک صاحب کو بدیں وجہ روزنامہ انقلاب کی پالیسی احرار کے خلاف مرتب کرنی پڑی۔ ان حالات میں مجلس احرار نے اپنے اخبار کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور روزنامہ احرار کا ڈیکلریشن داخل کر دیا۔ اس دوران روزنامہ زمیندار نے کاروباری نہج پر احرار سول نافرمانی کی خبریں شائع کرنا شروع کر دیں۔ اس پر روزنامہ "انقلاب نے ادارتی نوٹ میں لکھا۔

> "مولانا ظفر علی خاں کا خمیر کچھ ایسی مسلم آزار مٹی سے اٹھایا گیا ہے کہ اس کی ہر حرکت اور فعل میں مسلمانوں کی بربادی کے ہزار سامان موجود ہیں۔
>
> اس شخص کی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس اکیلے سے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا ہے اس کے مقابل اغیار کی متحدہ مسلم آزاریاں ہیچ ہیں۔"

(روزنامہ انقلاب لاہور۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۱ء صـ۳ ۔ آخری کالم)

یہ صحافت کی کشمکش تھی جس کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ تاہم واقعات کو صحافت کی اس تلخی سے بھی گزرنا پڑا۔

۱۱۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار کا اپنا آرگن روزنامہ "احرار" کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ اس کے صفحہ اول پر مولانا ظفر علیخاں کی یہ نظم درج تھی۔

اگر اک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوئے ۔ تو وہ اس عہد میں پنجاب کے احرار ہوئے
خیلِ باطل سے اگر برسر پیکار ہوئے ۔ تو وہ اسلام کے جانباز رضاکار ہوئے
پردۂ موت سے نکلے گی حیاتِ جاوید ۔ کہ مسلمان شہادت کے طلبگار ہوئے
جس نے ڈھایا تھا کبھی ظلم کی بنیادوں کو ۔ پھر مسلمان اس جذبے سے سرشار ہوئے
ہڈیاں جن کی ہیں چونا تو لہو ہے گارہ ۔ قصرِ آزادیٔ کشمیر کے معمار ہوئے

کیوں نہ ہوں آج اس اخبار کے گھر گھر چرچے
جس کے اوراق کی زینت مرے اشعار ہوئے

مولانا حبیب الرحمٰن کا پیغام

لاہور۔ ۱۲ دسمبر اسیر افرنگ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جو صبح دس بجے سید بشیر حیدر مجسٹریٹ کی عدالت میں بغرض مقدمہ تشریف لائے۔ انہوں نے روزنامہ انقلاب کے نمائندہ کو روزنامہ "احرار" کے اجرا پر حسب ذیل پیغام دیا۔

"اخبار احرار کے اجرا کا سن کر بہت خوش ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ خداوند کریم اس کی اشاعت۔ توسیع اور درازیٔ عمر میں اضافہ کرے۔ نیز احرار اخبار کے کارکنوں سے امید رکھتا ہوں کہ وہ ذاتی کاوشوں کو اخبار میں جگہ نہ دیں گے اور جہاں تک ہو سکے صلح و آشتی کو اپنا مسلک بنائیں گے۔"

ہفتۂ احرار

۱۲: دسمبر ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار نے شہر قصبات اور گاؤں میں اپنے جماعتی کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ مقررہ تاریخ کو ہفتۂ احرار مندرجہ ذیل طریق پر منائیں۔

۱۔ شہر میں سوائے ڈکٹیٹر کے باقی تمام کارکن اپنے ضلع کے گاؤں میں پراپیگنڈہ کے لیے جائیں۔

۲۔ کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی مظلومیت اور مجلس احرار کی سرگرمیوں کو واضح کیا جائے۔

۳۔ رضاکار بھرتی کیے جائیں۔ اور سرمایہ کی فراہمی کو جاری رکھا جائے۔

۴۔ ہر گاؤں اور قصبہ میں احرار کے دفاتر قائم کیے جائیں۔

(نوٹ) مگر اس کے باوجود رضاکاروں کے دستے محاذ کشمیر کی طرف روانہ کیے جائیں۔ ان میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ آنے پائے۔"

(مولانا) عبدالحنان ڈکٹیٹر مجلس احرار اسلام پنجاب

مفتی صاحب کا تار

دہلی۔ ۱۴۔ دسمبر ۱۹۳۱ء

آنریبل میاں سر فضل حسین صاحب

"جناب نے متعلقہ اشخاص سے گفتگو کے بعد اجتماع کا انتظام کر دیا ہوگا۔ مہربانی فرما کر بذریعہ تار مطلع کریں۔"

محمد کفایت اللہ۔

سر فضل حسین کا خط

۹۔ کنگ ایڈورڈ روڈ نیو دہلی۔ ۱۴۔ دسمبر ۱۹۳۱ء

محترم مولوی صاحب!

آپ کا تار مورخہ ۱۴۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو وصول ہوا۔ میں چودھری افضل حق اور دیگر متعلقہ اشخاص سے گفتگو کر چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔"

آپکا مخلص۔ فضل حسین

جیل میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس

مجلس احرار کو تحریک شروع کیے ترپن[۵۳] دن ہوئے تھے اور اس وقت تک بائیس ہزار آٹھ سو انچاس رضاکار گرفتار ہو چکے تھے اور شہداء کی تعداد گیارہ تک پہنچ چکی تھی۔ کہ مہاراجہ کشمیر کی دعوت پر احرار اور دربار کشمیر کے درمیان صلح کی گفتگو کا عملی آغاز لاہور بورسٹل جیل کے احاطہ بارڈر لائن میں ہوا۔ اس سے پیشتر سولہ دسمبر تک پنجاب کی مختلف جیلوں سے احرار رہنماؤں کو بورسٹل جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ مگر اس پر بھی انہیں الگ الگ بیرکوں میں رکھا گیا۔ جس کے باعث وہ باہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے کہ گفتگو کا انداز کیا ہو۔

کانگریس کی تحریک ستیہ گرہ کے بعد تاریخ ہندوستان میں یہ دوسرا واقعہ تھا کہ کسی سیاسی پارٹی کے رہنماؤں سے حکومت جیل خانے میں صلح کی گفتگو کرے۔

۲۲۔ دسمبر ۱۹۳۱ء دن کے گیارہ بجے مولانا مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ علمائے ہند اور

مولانا احمد سعید ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند، خواجہ عبدالرحمٰن غازی اور چودھری افضل حق بورسٹل جیل میں زعمائے احرار سے گفتگو کے لیے پہنچے۔ مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا احمد علی اور خواجہ غلام محمد نے اس گفتگو میں حصہ لیا۔ چونکہ احرار رہنماؤں کو مجوزہ گفتگو سے پیشتر باہمی مشورہ کا موقعہ نہیں دیا گیا تھا لہٰذا پانچ گھنٹے کی مسلسل بات چیت بغیر کسی نتیجے کے ملتوی کردی گئی۔

۲۳ دسمبر کو لاہور سے مفتی کفایت اللہ نے وزیر اعظم کشمیر کو اس گفتگو کے متعلق حسب ذیل مراسلہ ارسال کیا۔

لاہور۔ ۲۳۔ دسمبر ۱۹۳۱ء

بخدمت جناب پرائم منسٹر صاحب جموں و کشمیر

تسلیم! کل ۲۲۔ کو میں اور مولانا احمد سعید صاحب، چودھری افضل حق اور عبدالرحمٰن غازی صاحب بورسٹل جیل میں احرار لیڈرز سے ملے۔ احرار لیڈرز میں مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا مظہر علی اظہر، شیخ حسام الدین، مولانا احمد علی، مولانا سید محمد داؤد صاحب، مولانا عطاء اللہ صاحب، خواجہ غلام محمد اور مولانا محمد چراغ موجود تھے۔ سب سے پہلے ہمیں اس ناگوار حقیقت کا علم ہوا کہ احرار لیڈرز کو باوجود اس کے کہ باہم مل کر گفتگو اور تبادلہ خیالات کرنے کے لیے ہی جمع کیا گیا تھا۔ بورسٹل جیل میں ان کو باہم ملنے اور مشورہ کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ سب کو علیحدہ علیحدہ رکھا گیا ہے۔

اور ہمارے ساتھ ملنے سے پہلے ان کو آپس میں ملنے اور مشورہ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ طرز عمل ایسا تھا کہ احرار لیڈرز کوئی گفتگو نہ کرتے تو حق بجانب ہوتے لیکن انہوں نے خالی الذہن ہونے کے باوجود با عزت صلح سے اعراض کرنے سے احتراز کیا اور ابتدائی مراحل پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔

ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کا مقصد مسلمانانِ کشمیر کے لیے انصاف حاصل کرنے میں مدد دینا اور آئندہ ان کے لیے امن و ترقی کی راہ نکالنا ہے

اور اس کے لیے وہ ذمہ دار حکومت کے قیام کو ضروری سمجھتے ہیں اور اسی بنیاد پر صلح کی گفتگو کرنے کو تیار ہیں۔ دوسرے یہ کہ گفتگوئے صلح ذمہ دارانہ طریقہ پر ہو یعنی کوئی نمائندہ دربار کی طرف سے ذمہ داری کے ساتھ گفتگو کرے۔ اس لیے میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں باتوں کے متعلق مناسب صورت نکالیں اور مجھے مطلع فرمائیں۔"

محمد کفایت اللہ

ریاست کشمیر میں تحریک کا آغاز مجلس احرار کی تحریک ہنوز اس نہج پر تھی کہ کشمیر کے مسلمانوں نے جو ایک مدت سے قادیانیوں کی حرکات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے کہ ہر موڑ پر وہ مہاراجہ کشمیر کی خوشنودی کے علاوہ اپنی اور انگریز کی خواہشات کو بہر حال مقدم سمجھتے ہوئے سری نگر میں کسی طرح کی تحریک اٹھانے کے خلاف ہیں جبکہ پنجاب کے ہزاروں مسلمان کشمیری بھائیوں کی امداد کے لیے مصائب جھیل رہے ہیں۔ آخر ۲۵۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جموں کے مسلمانوں نے بادشاہی مسجد میں سردار گوہر الرحمٰن کی رہنمائی میں "عدم ادائیگی مالیہ" کی تحریک شروع کی۔

تحریک شروع کرنے سے پیشتر سردار گوہر الرحمٰن نے بحیثیت ڈکٹیٹر اول حسب ذیل بیان حکومت کشمیر اور پریس کے حوالے کیا۔

"کشمیر کے مسلمانوں پر گذشتہ پانچ ماہ سے جو ظلم ہو رہے ہیں اگر ان کی تفصیل میں جاؤں تو ایک دفتر کی ضرورت ہو گی۔ مختصراً یہ ہے۔

جموں میں خطبہ عید بند کیا گیا۔ قرآن کریم کی توہین کی گئی۔ مسجدیں شہید کیں۔ قربانیاں بند کرنے کا حکم دیا گیا۔ ان واقعات کے خلاف احتجاج کرنے والوں کو جیل خانوں میں ٹھونسا گیا۔ مگر ان ظالموں کو کوئی سزا نہیں دی گئی۔ جنہوں نے یہ سارا کچھ کیا۔ پیغمبر خدا کی توہین کی گئی۔ انہیں گالیاں دی گئیں۔ ان واقعات کی موجودگی میں اللہ رکھا ساغر کو معہ ان کے ساتھیوں کے گرفتار کیا گیا۔ جموں کے مسلمانوں پر ہندوؤں نے بے پناہ مظالم کیے لیکن اس پر بھی کوئی باز پرس نہیں کی گئی۔ الٹا مسلمانوں کو گرفتار کیا گیا۔ اس پر بھی ہم نے گلینسی کمیشن سے

تعاون کیا۔ لیکن جب وہاں سے بھی مایوسی ہوئی تو اب میں مجبور ہوا ہوں۔

اگرچہ اس سے پیشتر میں نے حکومت کو نوٹس دیا تھا کہ ریاست کے تمام سیاسی قیدیوں کو غیر مشروط رہا کر دیا جائے۔ اس نوٹس کی میعاد ۲۳۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو ختم ہو چکی ہے لیکن حکومت ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ لہٰذا آج میں حکومت کشمیر کے قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہوں۔ اور اعلان کرتا ہوں کہ مالیہ کی عدم ادائیگی کی سول نافرمانی کی جائے۔

میرا پروگرام عدم ادائیگی مالیہ تک ہوگا۔ میں تحصیل میرپور کو فی الحال عدم ادائیگی مالیہ کی مہم جاری کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ اگر میں گرفتار ہو گیا تو میرے بعد حافظ محمد صاحب اور جموں کے لیے شیخ غلام قادر کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔"

۲۵۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو وزیر اعظم کشمیر نے مفتی کفایت اللہ صاحب کو حسب ذیل خط تحریر کیا۔

وزیر اعظم آفس۔ جموں۔ ۲۵۔ دسمبر ۱۹۳۱ء

محترمی جناب مفتی صاحب!

آپ کے مکتوب مؤرخہ ۲۳۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ احرار لیڈرز سے جو ملاقات ہو رہی ہے وہ پنجاب گورنمنٹ کے زیر نگرانی ہے۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ پنجاب گورنمنٹ کے ذمہ دار افسروں سے گفت و شنید کریں۔ اگر ضروری سمجھا گیا تو یہی آفیسر ہم سے خط و کتابت کر سکتے ہیں۔

اگر یہ اجتماع یہاں ہوتا تو کشمیر گورنمنٹ کے کسی ذمہ دار افسر کے لیے یہ امر درست ہو سکتا تھا کہ وہ احرار لیڈرز کے ساتھ اس گفت و شنید میں اس غرض سے حصہ لیتا۔ کہ ایسے ذرائع تلاش کیے جائیں جو احرار لیڈرز کو اس تحریک کے روک دینے پر آمادہ کریں جسے ہم قطعاً نادرست خیال کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ پنجاب گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہے اور میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ نواب سکندر حیات اور سر ہنری کریک (گورنر پنجاب) سے تعلق پیدا کریں۔

مجھے یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں آپ کی اس تکلیف فرمائی کا بہت

زیادہ شکر گزار ہوں۔ کہ آپ نے لاہور کا سفر اختیار کیا۔ اور امید کرتا ہوں کہ آپ اس تحریک کو جس سے متعدد فریق مشکلات میں مبتلا ہیں ختم کرانے کی سعی میں کامیاب ہوں گے۔ آپکا مخلص۔ ہری کشن کول۔

مسلم لیگ کا قادیانی صدر قادیانی پارٹی کے مذہبی فریب نے مسلم عوام کو خصوصاً اسلام کے بنیادی اصولوں سے ناآشنا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو ایسا الجھایا ہے کہ ان کے ذہن بہار و خزاں کے درمیان امتیاز کر ہی نہیں سکتے۔ پھول اور کانٹے ایک ساتھ جھولی میں ڈالنے سے دامن اور پھول دونوں زخمی ہو سکتے ہیں۔

خزاں کے دنوں صحن چمن سے گزرنے والے پھول کی پتی سے بھی خوف کھا جاتے ہیں۔ لیکن بہاروں سے آشنا جب کانٹوں سے دست و گریباں ہوتے ہیں تو لالہ و گل میں بہار پیدا کرتے ہیں۔

۲۵۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جب آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے دہلی کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے چودھری سر ظفر اللہ خاں قادیانی کو منتخب کیا تو ایمانی بصیرت رکھنے مسلمانوں نے مسلم لیگ کے رہنماؤں کو ان کو اس حرکت پر ٹوکا لیکن ان دنوں کی مسلم لیگ انگریز پرست لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور انہوں نے ایمان کی بات کو کفر کی حمایت میں اس طرح ٹال دیا جیسے باد سموم آوارہ پتوں کو سمیٹ کرلے جاتی ہے۔ مگر ایمان کا بوجھل پتھر جب عزم و ارادے سے حملہ آور ہو تو کفر کا حصار ریزہ ریزہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

چودھری ظفر اللہ جو دوسری گول میز کانفرنس سے مسلم لیگ کی صدارت کرنے کی خوشی میں لندن سے فوراً بھاگ کر دہلی آئے تھے۔ جب دہلی ریلوے اسٹیشن پر اترے تو مجلس احرار نے ان کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کیا۔ مسلمانوں کی اس ایمانی حرارت سے مسلم لیگیوں کے حوصلے اس قدر پست ہوئے کہ مسلم لیگ کا مجوزہ اجلاس جو فتح پوری مسجد کے ہال میں ہو رہا تھا، ہجوم کے مشتعل جذبات نے انہیں وہاں ٹھہرنے اور اجلاس کرنے کی اجازت نہ دی۔ آخر یہ اجلاس خان نواب علی کے مکان پر سخت رازداری میں ہوا۔ اگر عوام کو اس ٹھکانے کا علم ہو جاتا تو شاید یہ کوشش بھی رائیگاں جاتی۔ یہیں سے مسلم لیگ کے دو دھڑے ہو گئے۔ ایک سر ظفر اللہ کے

ساتھ چلا گیا اور دوسرے گروہ نے دعویٰ کیا کہ مقررہ جگہ سے بھاگ کر خفیہ مقام پر مسلم لیگ کا اجلاس جو کیا گیا وہ دراصل مسلم لیگ نہیں ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ ہم ہیں۔ اور ہمارا اجلاس مقررہ پروگرام کے تحت فتح پوری مسجد کے ہال میں ہوگا۔ چنانچہ اس اجلاس کی صدارت کے لیے پشاور کے عبدالعزیز بیرسٹر کو منتخب کیا گیا۔

اس طرح کاغذ پر دو مسلم لیگیں قائم ہو گئیں۔ آگے چل کر سر ظفر اللہ اپنے لیے مسلم لیگ میں کوئی مقام نہ پا کر بھاگ نکلے۔ کئی سال بعد اس مسلم لیگ کو توڑنے کے لیے پھر میاں سر فضل حسین نے سر فیروز خاں نون کو تیار کیا۔ لیکن وہ بھی اس مقصد میں کامیاب نہ ہوئے۔ عبدالعزیز کی مسلم لیگ کے مقابل کلکتہ میں ایک اور مسلم لیگ قائم ہوئی (یہ مسلم لیگ ہی پائیدار ۱۹۳۴ء تک رہی) انہی دنوں (کشمیر) مظفر آباد کے مسلمانوں نے جن کی رہنمائی پیر حسام الدین کر رہے تھے۔ مجلس احرار سے مطالبہ کیا کہ وہ گفتگو کے دوران ذمہ دار اسمبلی سے کم کسی چیز پر سمجھوتہ نہ کریں۔

لندن سے گاندھی جی کی واپسی

آل انڈیا نیشنل کانگریس کے رہنما کرم چند موہن لال گاندھی ۲۱۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو دوسری گول میز کانفرنس سے ناکام واپس آئے تو ہندوستان کے سیاسی حالات پھر سے گدلے ہو چکے تھے۔ گاندھی جی کے لندن جانے پر ان کی جماعت میں مختلف رائیں تھیں۔ ایک گروہ جن میں ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ پنڈت مدھن موہن مالوی اور مس سروجنی نیڈو شامل تھیں۔ گول میز کانفرنس میں شمولیت کے حق میں تھا۔ جبکہ پنڈت جواہر لال نہرو، سردار واب بھائی پٹیل اس رائے کے خلاف تھے۔ اس دوران ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ارون کی جگہ لارڈ ولنگڈن نے سنبھال لی تھی۔ شخصیت کے ساتھ پالیسی بھی بدل گئی۔ بنگال صوبجاتِ متحدہ اور شمالی صوبہ سرحد کے ہنگامی حالات نے حکومت اور کانگریس کو ۴۔ مارچ ۱۹۳۰ء کی پوزیشن میں لا کھڑا کیا۔

لڑائی لڑنی ہو تو سینکڑوں بہانے بنائے بنائے جا سکتے ہیں۔ گاندھی جی نے جہاز سے اترتے ہی وائسرائے ہند کو اطلاع دی جس میں بنگال، صوبجات متحدہ اور شمالی صوبہ سرحد کے عوام پر تشدد کے کئی الزام لگائے اور ساتھ ہی کانگریس ورکرز کو ہدایت کی کہ وہ نمک پر محصول ادا نہ کریں۔ جلوس نکالیں، ولائتی کپڑے پر پکٹنگ کریں وغیرہ۔ ان احکامات سے ملک بھر

میں انفرادی ستیہ گرہ کی مہم شروع کر دی گئی۔ اس کے مقابل حکومت نے قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو قید و جرمانہ کی سزا کے ساتھ ان کی تمام جائیداد ضبط کرنے کا آرڈی ننس جاری کر دیا۔ اس نئی کشمکش نے برطانوی حکومت کو دوگونہ مشکلات میں ڈال دیا تھا۔ ایک طرف احرار کی دربارِ کشمیر سے لڑائی جسے انگریز اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ دوسری طرف کانگریس سے اس کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔

ان دنوں تحریک کشمیر کو شروع ہوئے ساٹھ روز ہو چکے تھے۔ چوبیس ہزار ایک سو پینتالیس رضاکار قید ہو چکے تھے اور شہدار کی تعداد چودہ تھی۔

۲۹۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو مفتی کفایت اللہ نے وزیر اعظم کشمیر کو حسب ذیل خط ارسال کیا۔

جناب محترم پرائم منسٹر صاحب ریاست جموں و کشمیر

جناب کے مراسلہ ۲۵۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کے لیے دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ جیسا کہ جناب پر روشن ہے کہ احرار لیڈرز کو ایک جیل میں جمع کرنے اور ہمارے لیے ان کے ساتھ گفتگو کا موقعہ بہم پہنچانے کی قرارداد ہز ہائی نس مہاراجہ جموں و کشمیر اور آپ کے ساتھ ۲۰۔ دسمبر کو دہلی میں طے ہوئی تھی اور آپ نے فرمایا تھا کہ دوران گفتگو ریاست کا کوئی معتمد لاہور میں رہے گا یا مراسلت کا کافی انتظام کر دیا جائے گا۔

جناب کا تار وصول ہونے پر میں اس قرارداد کے بموجب لاہور آیا اور ۲۲۔ دسمبر کو بورسٹل جیل میں احرار لیڈرز سے ملاقات کی۔ میں نے قاعدے کے مطابق ابتدائی مراحل طے کرنے کے لیے ۲۳۔ دسمبر کو جناب کو مراسلہ لکھا۔ جس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ معاملہ اب گورنمنٹ (پنجاب) کے ہاتھ میں ہے اور مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں نواب سر سکندر حیات خاں اور سر ہنری سے ملوں۔

چونکہ اس وقت تک اس معاملے میں پنجاب گورنمنٹ سے میری کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی۔ اور باوجود جیل کی ملاقات کو سات دن ہو گئے۔ مجھے

گورنمنٹ کی طرف سے کوئی اطلاع وصول نہیں ہوئی کہ مجھے کس افسر سے کب گفتگو کرنی چاہیے۔ اس لیے براہ کرم مجھے بواپسی مطلع فرمائیں کہ کیا آپ نے نواب سرسکندر حیات خاں اور سرہنری کریک کو بھی مراسلے کی نقل بھیج دی ہے تاکہ میں ان کی طرف سے ملاقات کی تاریخ اور وقت کی اطلاع کا انتظار کر لوں۔ آخر میں مکرر آپ کے عنایت نامے کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص۔ محمد کفایت اللہ

وزیر اعظم کا تار | ہز ہائی نس گورنمنٹ جموں وکشمیر۔ پرائم منسٹر آفس۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۱ء

مکرمی مفتی صاحب۔

آپ کا مراسلہ مورخہ ۲۹۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو ملا۔ مشکور ہوں۔ میں آپ کے مراسلہ اور اس کے جواب کا جو میں نے ۲۵۔ دسمبر کو آپ کی خدمت میں بھیجا تھا ان کی نقلیں آنریبل سرہنری کریک اور آنریبل نواب سکندر حیات خاں کی خدمت میں بھیج چکا ہوں۔ آپ براہ راست نواب سرسکندر حیات خاں سے ملاقات فرما سکتے ہیں۔ میرے ایما پر آپ کا دہلی سے یہاں تشریف لانے کے لیے میں ممنون ہوں۔ اگر بفضل کوئی نتیجہ نیک پیدا ہوا۔ تو گورنمنٹ ہم لوگوں کو باقاعدہ اطلاع دے گی۔

آپکا صادق۔ ہری کشن کول۔

اس پر مولانا مفتی کفایت اللہ نے نواب سرسکندر حیات کو حسب ذیل مراسلہ لکھا

لاہور۔ دفتر مجلس خدام الدین۔ ۳۱۔ دسمبر۔ ۱۹۳۱ء

بخدمت جناب آنریبل نواب سرسکندر حیات خاں صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

وزیر اعظم ریاست جموں وکشمیر کی اس اطلاع پر کہ قرارداد کے موافق احرار لیڈرز کو بورسٹل جیل لاہور میں جمع کر دیا گیا ہے۔ آپ ان سے ملاقات کریں۔ میں اور مولانا احمد سعید دہلی سے لاہور آئے۔ اور ۲۲۔ دسمبر کو احرار ورکنگ کمیٹی کی معیت میں احرار لیڈرز سے جیل میں ملاقات کی اور بعض مبادیات کے تصفیہ

کے لیے ہم نے وزیر اعظم کو مراسلہ لکھا ۔ اس کے جواب میں وزیر اعظم نے ہمیں اطلاع دی کہ معاملہ پنجاب گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ انھوں نے آپ کو میری اور اپنی خط و کتابت کی اطلاع کر دی ہے ۔ اور آئندہ گفتگو کا سلسلہ جناب سے متعلق رہے گا ۔ اس لیے برائے کرم گفتگو کے وقت اور مقام سے مطلع فرما کر منت پذیری کا موقعہ عنایت فرماویں ۔ میرے ساتھ مولانا احمد سعید صاحب ہوں گے ۔

اگر یکم جنوری تجویز فرمائیں ۔ تو ایک بجے سے قبل یا چار بجے کے بعد کا وقت مقرر فرمائیں ۔ محمد کفایت اللہ ۔ پریذیڈنٹ جمعیۃ علمائے ہند

سر سکندر حیات کا جواب

لاہور ۔ ۴ ۔ جنوری ۱۹۳۲ء

مکرمی جناب مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب زاد عنایتہ !

سلام مسنون ! آپ کا عنایت نامہ محررہ ۳۱ ۔ دسمبر ۱۹۳۱ء مجھے ۲ ۔ جنوری ۱۹۳۲ء شام کو ملا ۔ آپ نے ملاقات کے متعلق دریافت فرمایا ہے ۔ جواباً عرض ہے کہ مجھے مسرت ہوگی اگر آپ اور مولانا احمد سعید صاحب کل مورخہ ۵ ۔ جنوری ۱۹۳۲ء کو چار بجے شام بندہ کے مکان ۱۲ ۔ لوئر مال پر تشریف لے آئیں ۔ خاکسار بخلائق

سکندر حیات ۔ عفی عنہ

۵ ۔ جنوری ۱۹۳۲ء کو مولانا مفتی کفایت اللہ بمعہ مولانا احمد سعید نواب سر سکندر حیات سے ملاقات کرنے گئے ۔ دوران گفتگو سکندر حیات نے کہا کہ میں آپ سے گفتگو نجی حیثیت سے کر سکتا ہوں ۔ سرکاری حیثیت سے نہیں ۔ کیونکہ یہ معاملہ حکومت کشمیر کا ہے اور اس کا کوئی نمائندہ یہاں موجود نہیں ۔ اس ملاقات کے نتیجے میں ۶ ۔ جنوری ۱۹۳۲ء کو چودھری افضل حق کو ساتھ لے کر مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید نے احرار رہنماؤں کو سکندر حیات کی پوزیشن اور وزیر اعظم کشمیر کے حالات واضح کر دیے ۔ اس پر احرار رہنماؤں نے جب یہ حالات معلوم کیے تو کہا کہ "جب تک بنیادی امور کی تکمیل نہ ہو جائے اس وقت تک یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھایا جا سکتا" چنانچہ مفتی کفایت اللہ نے سر سکندر حیات کی پوزیشن اور احرار رہنماؤں کے جواب کی تمام کیفیت پرائم منسٹر کشمیر

کو حسب ذیل مراسلہ کے ذریعے واضح کر دی۔

مراسلہ مفتی صاحب بنام وزیر اعظم

لاہور۔ ۶ جنوری ۱۹۳۲ء

مکرمی جناب راجہ ہری کشن صاحب پرائم منسٹر ریاست جموں و کشمیر

تسلیم! جناب کی اس اطلاع پر کہ معاملہ اب پنجاب گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ اور آپ نے میری اور اپنی مراسلت کی نقلیں آنریبل نواب سکندر حیات خاں صاحب ممبر ریونیو۔ پنجاب گورنمنٹ کو بھیج دی ہیں اور مجھے ان سے گفتگو کرنی چاہیے" کل میں نے بمعیت مولانا احمد سعید صاحب، آنریبل نواب سکندر حیات خاں صاحب سے ملاقات کی۔ نواب صاحب ممدوح یوں تو مکارم اخلاق سے پیش آئے لیکن میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے یہ فرمایا کہ میں نے ذاتی حیثیت سے آپ کی ملاقات کی مسرت حاصل کی ہے۔ سرکاری حیثیت سے میں اس پر گفتگو نہیں کر سکتا۔

جب میں نے ان سے یہ کہا کہ پرائم منسٹر صاحب نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اب معاملہ پنجاب گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس معاملہ میں آپ یا سر ہنری کریک گفتگو کریں گے تو انہوں نے فرمایا کہ پنجاب گورنمنٹ کا اس گفتگو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پنجاب گورنمنٹ کا کام صرف اس قدر تھا کہ اس نے احرار ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو ایک جیل میں کر دیا اور آپ کے لیے ان سے ملنے اور گفتگو کرنے کی سہولت بہم پہنچا دی۔ میں جس طرح اس امر کا یقین کرنے سے قاصر ہوں کہ آپ نے پنجاب گورنمنٹ سے یہ طے کیے بغیر کہ وہ معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر تصفیہ کرا دے یہ فقرہ (اب معاملہ پنجاب گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہے) مجھے لکھ کر سر ہنری کریک یا نواب سکندر حیات سے ملنے کے لیے تحریر فرما دیا۔

اسی طرح میں اس بات کا یقین کرنے کی وجہ بھی نہیں پاتا کہ پنجاب گورنمنٹ کا کا ایک ذمہ دار افسر اس کے بعد کہ معاملہ پنجاب گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہو، اس طرح صاف انکار کر دے۔

جناب کو معلوم ہے کہ میں نے ہز ہائی نس مہاراجہ کی دعوت پر ۲۔ دسمبر کو دہلی میں

ہز ہائی نس سے ملاقات کی تھی۔ ہز ہائی نس کی گفتگو اور اس خط و کتابت کی بنا پر جو میرے اور دربار کشمیر کے درمیان ہوتی رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ ہز ہائی نس اس کشمکش کو انصاف اور رعیت پروری و الطاف شاہانہ کی بنا پر ختم کرنے کا تہیہ فرما چکے ہیں۔ اور اسی خیال پر اس گتھی کو سلجھانے کے لیے میں نے ہز ہائی نس کے ارشاد پر اپنی خدمات پیش کرنے میں کوئی عذر نہیں کیا۔ اور ۲۔ دسمبر کو دربار کے تار پر لاہور آیا اور ۵۔ جنوری تک اس خیال و یقین کی بنا پر مقیم رہا کہ دربار کشمیر نے گفتگوئے مفاہمت کے لیے کافی انتظام کر دیا ہوگا اور مفاہمت کو کامیاب کرنے کے لیے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جائے گی۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ آنریبل نواب سکندر حیات خاں صاحب سے ملاقات کرنے کے بعد مجھے یہ افسوس ہو رہا ہے۔ کہ ۲۔ دسمبر سے ۵۔ جنوری تک کا طویل زمانہ گذرنے اور ۲۲۔ دسمبر سے ۵ جنوری تک لاہور میں قیام کرنے کے باوجود مفاہمت کے لیے کوئی صحیح اور مفید طریقہ بہم نہیں پہنچایا گیا۔ چونکہ لاہور میں طویل قیام کے باعث میرے دوسرے ضروری مشاغل کا بہت حرج ہوا ہے۔ اس لیے میں اب دہلی جا رہا ہوں اور ہز ہائی نس کی خدمت میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ راعی کا رعایا کے ساتھ ایسا تعلق ہونا چاہیے جیسا کہ باپ کا اولاد سے ہوتا ہے۔ ہز ہائی نس اگر تھوڑی سی توجہ سے کام لیں تو یہ گتھی جو امتداد مدت کی وجہ سے زیادہ الجھتی جا رہی ہے آسانی سے سلجھ سکتی ہے۔ آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ مجلس احرار اور اس کے ذمہ دار رکن جو اس تحریک کے اصل چلانے والے ہیں۔ اس لیے آئندہ سلسلہ گفتگو براہ راست ان کے ساتھ قائم کیا جائے۔ اور جس قدر جلد ممکن ہو کوئی ذمہ دار آفیسر گفتگوئے مصالحت کے لیے مقرر کر کے مطلع فرمایا جائے۔ میں ممنون ہوں گا۔ اگر جناب والا دہلی کے پتہ سے جواب عنایت فرمائیں گے تو ممنون ہوں گا۔

خط و کتابت کی اشاعت سے پہلے جناب کے جواب کا انتظار کروں گا۔"

آپ کا مخلص ۔ محمد کفایت اللہ

۱۹۳۲ء

سال ہوں ۔ دن ہوں یا مہینے ، قوموں کی تاریخ میں ان کی اہمیت مورخ کے لیے ہمیشہ سنگ میل کی طرح نمایاں رہتی ہے ۔ آئندہ نسلیں اسی آئینے میں اپنے آباؤ اجداد کے نقش ونگار تلاش کرتی ہیں اور اپنے مقصود کے لیے انہی لکیروں پر سفر کرتی ہیں ۔ اگر ماضی کے سن وسال تاریخ کے سپرد کرتے وقت احتیاط کا دامن چھوٹ جائے تو پھر یہ اوراق قوموں کے مقدر کو پریشان کر دیتے ہیں اور اسی ایک ٹھوکر سے مستقبل کی ساری عمارت ڈھیر ہو جاتی ہے ۔

۱۹۳۱ء کے زوال پذیر آفتاب نے کشمیر کی پہاڑیوں کی اوٹ سے دیکھا ہوگا کہ لالہ وگل کی سرزمین انسانوں کے خون سے کس طرح تر بتر ہے ۔ زعفران کے کھیت اپنے ہی خون سے نہا کر سورج مکھی کے زرد چہروں کا کیوں کر مذاق اڑاتے ہیں ۔ دریائے جہلم کی ایک ایک موج مظلوم کشمیریوں کے آنسوؤں پر مسکراتی کس طرح گذر رہی ہیں ۔ ۱۹۳۱ء کے آخری لمحات نے حسن کشمیر پر خزاں کے بادوں کا جھرمٹ بھی دیکھا ہوگا ۔ اور اسی جھرمٹ میں ڈوگرہ شاہی کی برق تپاں کی جلن بھی محسوس کی ہوگی ۔ ۱۹۳۱ء کے عروج نے ایسے دن بھی دیکھے جب غلام ہندوستان اپنے اجنبی آقاؤں کی غلامی سے بیزار ہو کر بغاوت پر اتر آیا تو اس آگ کو کس قدر انسانوں نے اپنے خون سے روشن کیا تھا ۔ اسی الاؤ سے پھر ایوانِ برطانیہ کے جلنے کی بو بھی اٹھی اور سر ہری سنگھ کا تاج بھی اسی آگ کی نذر ہو گیا ۔

ایسی ہی خون آشام پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا ۔ ۱۹۳۱ء کا سال ۱۹۳۲ء کو آئندہ کی ذمہ داریاں سونپ کر رخصت ہو گیا ۔

وزیر اعظم کشمیر کا خط مولانا مفتی کفایت اللہ کے نام

پرائم منسٹر ہاؤس جموں۔ ۹۔ جنوری ۱۹۳۲ء

کرمفرمائے من مفتی صاحب!

تسلیم! آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۶۔ جنوری کو پہنچا مشکور ہوں۔ اثنائے گفتگو دہلی میں آپ کے امید دلانے پر کہ اگر احرار لیڈران مقید جیل کو ایک جگہ پر اکٹھا کیا جائے جس سے آپ کو اور آزاد لیڈران احرار کو تبادلہ خیالات کرنے کا موقع دیا جا سکے تو کوئی ایسی صورت نکل سکتی ہے کہ جس سے تحریک احرار ختم ہو جائے۔ میں نے افسران پنجاب گورنمنٹ سے تذکرہ کیا۔ چنانچہ میرے ایما سے پنجاب گورنمنٹ نے لیڈران مذکور کو بورسٹل جیل میں یکجا کرنے کا انتظام کر دیا اور یہاں سے مولانا مظہر علی اظہر کو بھی لاہور بھجوا دیا گیا اور اطلاع آپ صاحبان کو دی گئی۔ لیکن چونکہ گفت و شنید پنجاب کی ایک جیل میں ہوئی تھی اور قیدیان مذکور بھی زیر اہتمام پنجاب گورنمنٹ تھے۔ اس لیے گورنمنٹ کشمیر کا کوئی دخل گفت و شنید میں نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے سابقہ خط میں آپ کو یہ تحریر کیا کہ آپ نتیجہ تبادلہ خیالات کے متعلق گفت و شنید افسران ذمہ دار پنجاب گورنمنٹ کے ساتھ کریں! اور آنریبل سر ہربرٹ ایمرسن اور آنریبل نواب سکندر حیات خاں صاحب کی خدمت میں بھی ایسا ہی تحریر کیا۔ خیال یہ تھا کہ اگر کوئی نتیجہ ایسا برآمد ہو سکے کہ جس پر گورنمنٹ کشمیر کے لیے عمل کرنا ناممکن نہیں اور تحریک بند ہو جائے تو پنجاب گورنمنٹ اس نتیجے کی اطلاع گورنمنٹ کشمیر کو دینے میں سہولت پیدا کرے گی۔ ممکن ہے کہ آنریبل نواب سکندر حیات خاں صاحب کو کوئی ایسی صورت نظر نہ آئی ہو۔ اس وجہ سے انہوں نے سرکاری طور پر گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ گو صاحب موصوف کی جانب سے کوئی اطلاع اب تک مجھے آپ کی اور ان کی ۵۔ جنوری کی گفتگو کے متعلق موصول نہیں ہوئی۔ بہر حال میں آپ کا اور مولانا احمد سعید صاحب کا لاہور تشریف لانے اور قیام رکھنے نیز لیڈران احرار کے ساتھ گفتگو کر کے معاملات سلجھانے کی کوشش کرنے کے لیے نہایت مشکور ہوں اور توقع

کرتا ہوں کہ جو دلچسپی آپ نے اس معاملے میں لی ہے اس کو آپ بغرض حصول نتیجہ نیک جاری رکھیں گے۔

آپ نواب سکندر حیات صاحب سے ملاقات کرنے کے بعد اگر مجھے اطلاع دیتے کہ آپ کا ارادہ گفتگو بند کر کے دہلی چلے جانے کا ہے تو میں فوراً آپ کو صلاح دیتا کہ آپ مجھ سے آکر مل جائیے۔

کل ہی ایک دو اصحاب نے ایک ذریعہ سے متعلقہ احرار سے گفتگو کی ہے۔ اگر اس میں کوئی صورت سہولت پیدا ہونے کی نظر آئے تو بشرطِ ضرورت آپ صاحبان کو پھر تکلیف دوں گا۔ آپ کا صادق۔ ہری کشن

اسس خط کے جواب میں ۲۰۔جنوری ۱۹۳۲ء کو مفتی صاحب نے وزیر اعظم کشمیر کو حسب ذیل آخری خط لکھا۔

دہلی۔ ۲۰۔جنوری۔ ۱۹۳۲ء

جناب مکرم، راجہ ہری کشن کول وزیر اعظم ریاست جموں وکشمیر

۹۔جنوری۔۱۹۳۲ء اور اس کے پیشتر کے عنایت ناموں کا شکریہ قبول فرمائیے۔ جواب کی تاخیر معاف فرمائیں۔ ۵۔جنوری کو آنریبل سکندر حیات خاں صاحب سے ملاقات کرنے کے بعد ۶۔جنوری کو اسیران احرار سے ملاقات اس غرض سے کی گئی تھی کہ ان کو اس کارروائی کی اطلاع دے دی جائے جو ۲۲۔دسمبر ۱۹۳۱ء (جبکہ پہلی ملاقات ہوئی تھی) اور ۵۔جنوری ۱۹۳۲ء کے درمیان حکومت کشمیر اور حکومت پنجاب کی طرف سے ہوئی۔ ۲۲۔دسمبر ۱۹۳۱ء کی ملاقات کے بعد میں نے اپنے مراسلہ ۲۳۔دسمبر میں احرار لیڈرز کی طرف سے باعزت مفاہمت کے لیے آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے گفتگو کی ابتدا کرنے کے لیے تین باتیں تحریر کی تھیں۔ پہلی بات یہ تھی کہ اسیر رہنماؤں کو جیل میں باہم ملنے اور تبادلہ خیالات کرنے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ یہ شکایت ۵۔جنوری تک بحالہ قائم تھی۔

دوسری بات یہ تھی کہ مصالحت کی بنیاد اس امر پر ہوگی کہ کشمیر میں ذمہ دار

حکومت کے قیام پر غور کیا جائے۔ اس کے متعلق حکومت کشمیر نے کوئی تصریح نہیں کی بلکہ معاملہ کو پنجاب گورنمنٹ کی طرف محول کر دیا۔ حالانکہ یہ امر ظاہر ہے کہ یہ معاملہ ہز ہائی نس مہاراجہ کشمیر کے طے کرنے کا ہے۔ نہ کہ حکومت پنجاب کا۔

تیسری بات یہ تھی کہ مفاہمت کی گفتگو کے لیے کوئی ذمہ دار آفیسر کشمیر گورنمنٹ کی طرف سے مقرر کیا جائے۔ اس کا نتیجہ اس وقت تک یہی تھا کہ کشمیر گورنمنٹ نے کوئی ذمہ دار آفیسر مقرر نہیں کیا۔ بلکہ پنجاب گورنمنٹ کی طرف محول کیا تھا اور پنجاب گورنمنٹ کے ریونیو ممبر جن سے ملاقات کرنے کی آپ نے اپنے مکتوب مورخہ ۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۱ء میں ہدایت کی تھی سرکاری حیثیت سے گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر نہیں فرمائی تھی۔

میں نے ۶۔ جنوری کو احرار لیڈرز سے ملاقات کر کے یہ تمام پوزیشن ان پر واضح کر دی اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ گفتگوئے مصالحت کو آگے بڑھانے سے پہلے مذکورہ بالا بنیادی امور کی تکمیل کا انتظار کرنے میں حق بجانب ہیں۔

چونکہ ۹۔ جنوری کے خط میں جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ دو شخصیتوں نے احرار کے متعلق آپ سے گفتگو شروع کی ہے۔ اس لیے میں بھی دعا کر رہا ہوں کہ حق تعالے اس کو نیک نتیجہ پر منتج فرمائے اور جلد از جلد باعزت سمجھوتہ ہو جائے۔

آپ کا مخلص ۔ محمد کفایت اللہ

۶۔ دسمبر ۱۹۳۱ء سے ۲۰۔ جنوری ۱۹۳۲ء تک کشمیر اور مجلس احرار کی تحریک کے سلسلے میں مولانا مفتی کفایت اللہ ناظم جمعیۃ علمائے ہند اور وزیر اعظم کشمیر ہری کشن کول کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی وہ ۴۔ فروری ۱۹۳۲ء کو برائے اشاعت پریس کے حوالے کر دی گئی۔

گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

دوسری گول میز کانفرنس کے آخری اجلاسوں میں میاں سر محمد شفیع نے کانگریسی نمائندوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا

"اگر کانگریس کو اپنی تحریک ستیہ گرہ پر ناز ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی مجلس احرار پر فخر ہے۔" میاں سر محمد شفیع کا یہ فقرہ ان کے دل کا آئینہ دار تھا۔ لیکن اسی ایک فقرے نے ہندوستان

اور خاص کر پنجاب کے ٹوڈی مسلمان کے دلوں میں کئی طرح کے وسوسے ڈال دیے۔

اس کے بعد ۲۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جب مہاراجہ کشمیر نے پریذیڈنٹ جمعیتہ علمائے ہند کو دہلی میں دعوت دے کر ان کے ذمہ لگایا کہ وہ مجلس احرار اور دربارِ کشمیر کے درمیان باعزت مفاہمت کرائیں تو ٹوڈی مسلمانوں کے خدشات سائے کی طرح پھیلنے لگے اور ان کے دل دم توڑتے انسان کی طرح دھڑکنے لگے پھر جیسے ہی ۲۲۔ دسمبر کو احرار ورکنگ کمیٹی سے جیل میں صلح کی گفتگو شروع ہوئی اور سیاسی تاریخ میں ایک نئے واقعہ نے جنم لیا۔ تو سرکار پرست مسلمان اور قادیانیوں کے رہے سہے حواس بھی اڑ گئے۔

خلافت کی تحریک برصغیر کی سب سے بڑی سیاسی تحریک تھی جس میں ترکِ موالات کی تحریک بھی شامل تھی۔ ہندو اور مسلمان مشترک اس تحریک کے ذمہ دار تھے۔ ہزاروں لوگ جیل خانوں میں گئے لیکن یہ اعزاز صرف مجلس احرار کو حاصل رہا کہ اس کے رہنماؤں سے جیل میں حکومت برطانیہ کے ایماء پر دربار کشمیر سے صلح کی گفتگو کی۔ ظاہر تھا کہ آگے چل کر احرار کو ایسا مقام حاصل ہو جاتا کہ وہ پنجاب اور باقی ہندوستان کی سیاست میں براہ راست دخیل رہتے۔ لیکن رجعت پسند مسلمان اور مرزائی طاقتیں اپنے مستقبل کے لیے احرار کو یہ مقام کیسے حاصل کرنے دیتیں۔ آخر ۵۔ جنوری ۱۹۳۲ء کو مفتی کفایت اللہ اور سکندر حیات کی ملاقات سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ سکندر حیات نے کس انداز سے ریاستی ذمہ داری لینے سے انکار کیا۔ آخر کیوں؟ جبکہ وزیر اعظم کشمیر خود انہیں اس کے لیے تجویز کرتے ہیں۔ اس کے بعد سکندر حیات کا یہ کہنا کہ میں ذاتی حیثیت سے بات کروں گا، اس کی واضح دلیل نہیں کہ سر فضل حسین نے ۱۹۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جنوبی افریقہ جانے سے پیشتر یہ سارا منصوبہ بنایا تھا کہ احرار کو یہ مقام حاصل نہیں ہونے دینا جس کی تکمیل بعد میں سر سکندر حیات نے کی۔

مجلس احرار کا دوسرا جرم گلینسی کمیشن کا انکار تھا۔ انگریز اس پر بھی تاؤ کھائے بیٹھا تھا۔ گلینسی کمیشن کا تقرر مسلمانانِ کشمیر کے لیے ایک خوبصورت فریب تھا جسے مجلس احرار نے قبول نہیں کیا تھا۔

ان تمام واقعات نے مجتمع ہو کر مجلس احرار اور حکومت کشمیر کے مابین صلح کی گفتگو کو

ناکام بنا دیا۔

راستہ کٹھن ہو یا سہل تن آسان اُمراء منزل کی طرف قدم اٹھانے سے پیشتر کئی بار سوچتے ہیں۔ لیکن ناتواں، اللہ کے سہارے کشتی کو موجوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ طوفان آئیں نہنگوں سے الجھنا پڑے، پتوار ٹوٹ جائے۔ لیکن ناخدا، خدا سے لو لگائے ہوئے ساحل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔

احرار رہنماؤں کو اپنی تہی دامنی کا احساس ضرور تھا لیکن انہیں یہ توقع نہ تھی کہ جب وہ میدانِ کارزار میں ڈوگرہ شاہی سے برسرِ پیکار ہوں گے تو اپنے پرائے ہو جائیں گے۔

پنجاب کے مخصوص سرکاری خطاب یافتہ رؤسا نے غریبوں کی تحریک کو سبوتاژ کیا۔ یہ تحریک مجلسِ احرار کی ذاتی تحریک نہیں تھی۔ بلکہ کشمیر کے بتیس لاکھ مسلمانوں کی آزادی کی تحریک تھی۔ جو پوری ایک صدی سے ڈوگرہ سامراج کے پاؤں تلے دبے ہوئے تھے مگر آہ! ؎

وائے ناکامی، فلک نے تاک کر توڑا اُسے۔ میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کے لیے۔

تحریک کا نیا رُخ

آئینی اعتبار سے حالات نے جب یہ رخ اختیار کیا۔ تو احرار رہنماؤں نے ریاست سے باہر تحریک کو قدرے روک کر ریاست کے اندر آئینی اور غیر آئینی تحریک کو منظم کیا۔ سرینگر میں اس تحریک کی ذمہ داری ماسٹر تاج الدین انصاری کی سپرداری میں تھی۔ جبکہ جموں میں سردار گوہر الرحمان عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک شروع کر چکے تھے۔

۲۹۔ جنوری ۱۹۳۲ء کو میر پور اور پونچھ سے اس تحریک کا آغاز کیا گیا۔ دونوں تحصیلوں کے نمبردار اندرونِ خانہ حکومت کے خلاف تحریک کے معاون تھے۔

اس سے پیشتر ۴۔ جنوری کو حکومت کشمیر نے آرڈی ننس واپس لے لیا۔ مگر ۵۔ جنوری کو بغیر کسی سیاسی ہنگامہ آرائی کے اس آئین کا از سرِ نو نفاذ کر دیا۔ اور ریاست میں بعض سیاسی افراد کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ اس کے ساتھ ہی پنجاب کے حالات میں تغیر آیا۔

۱۴۔ جنوری کو حکومت ہند نے انڈین نیشنل کانگریس کو خلافِ قانون قرار دیا۔ اور ۱۹۔ جنوری کو ہندوستان کے اخبارات کو سرکاری طور پر ہدایت کر دی گئی کہ کانگریس کی خلافِ آئین سرگرمیوں کو شائع نہ کریں۔ تحریک احرار بھی اس کی زد میں آ گئی۔ اور اس کی تمام سیاسی سرگرمیاں

عوام سے اوجھل ہوگئیں۔ اس وقت مجلس احرار کے چھبیس ہزار چھ سو گیارہ رضاکار گرفتار ہو چکے تھے۔ اور شہدار کی تعداد چودہ تھی۔

میرپور محاذ پر احرار قافلوں کے روکنے کا سرکاری انتظام اس قدر منظم تھا۔ کہ پرندے کے پھڑپھڑانے پر بھی حکام چونک پڑتے تھے۔ دریائے جہلم کے اس پتن کی تمام کشتیوں اور ملاحوں پر حکومت کا قبضہ تھا۔ اس صورت میں مجھے اس محاذ پر شکست کا شبہ ہوا۔ تو میں نے کارکنوں کے ایک قافلے کو برات کی صورت میں منظم کیا۔ بینڈ باجا اور گھوڑی کا باقاعدہ انتظام کیا۔ رضاکاروں کو سرخ کپڑوں کی جگہ براتیوں کا لباس پہنایا گیا۔ اور قافلہ سالار کو دولھا کی طرح سہرا باندھ کر گھوڑی پر سوار کیا گیا۔ لیکن یہ سارا کچھ اس طرح خفیہ طریق پر ہوا کہ مخصوص کارکنوں کے سوا کسی کو کانوں کان اس ڈرامے کی خبر نہ ہو سکی۔ قافلہ برات کی طرح جہلم کے بازاروں سے گذرا اور میرپور پتن جانے کے لیے تانگوں پر سوار ہوا۔ یہاں تک کہ بینڈ باجا بھی پتن تک گیا۔ پولیس اور ریاستی حکام کو ذرا برابر بھی شبہ نہ ہوا۔ کہ یہ احرار کا قافلہ ہے۔ یا واقعی کوئی برات۔ بلکہ انہوں نے برات کے لیے کشتیاں دوسرے کنارے سے خود مہیا کیں۔

یہی وہ قافلہ ہے جو ۱۲۔ جنوری کو ریاستی حکام کی آنکھوں میں دھول جھونک کر میرپور میں داخل ہوا۔ اور سرکاری عمارات کو نذر آتش کرنے کے ساتھ ساتھ علاقہ میں عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک کو فروغ دیا۔

تحریک مالیہ زور پکڑتی جا رہی تھی۔ جموں میں پہلی دفعہ احرار کا قیام انہی دنوں ہوا۔ اس کے پہلے صدر شیخ عبدالمجید ایڈووکیٹ مقرر ہوئے۔

۱۲۔ جنوری کو میرپور بغاوت کے کچلنے کے لیے ریاستی حکام نے عوام پر گولی چلائی۔ جس سے مشتعل ہو کر دیہاتی لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لے کر حکام پر ٹوٹ پڑے اور اس طرح یہ بغاوت عام پھیل گئی۔

اس ہنگامہ آرائی سے متاثر ہو کر ۱۴۔ جنوری ۱۹۳۲ء کو گورنر جموں نے حسب ذیل اعلان کیا۔

۱۔ چونکہ ہمارے نوٹس میں آیا ہے کہ علاقہ میرپور میں باہر سے مفسد پرداز اشخاص نے اس علاقہ میں بغاوت کرادی ہے۔ جس کے سبب لوگ کثیر تعداد میں جمع ہو کر

ریاستی قانون کو ناممکن بنانے اور اس پر عمل کرنے میں مشکلات ڈال رہے ہیں۔
اس سلسلے میں انہوں نے اکثر فوج اور پولیس پر بھی حملہ کیا۔ اور سرکاری عمارات
کو نقصان پہنچایا۔

ان واقعات اور خلافِ قانون حرکات کو روکنے کے لیے ہمیں فوج استعمال
کرنی پڑے گی۔ اس کا انتہائی نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمیں گولی چلانی پڑے گی۔

لوگوں کو واضح کیا جاتا ہے کہ قانون پر بہر حال عمل کریں۔ اور امن عامہ
میں خلل نہ ڈالیں۔

۲۔ جو گاؤں موجب ہمارے حکم چار دن کے اندر مالیہ ادا نہ کرے گا وہ سرکاری طور
پر مالیہ کی رعایت کا ہرگز مستحق نہیں ہو گا۔

۳۔ جس گاؤں میں شورش فوراً بند نہ ہو گی یا جس گاؤں کے باشندے شورش میں
شامل ہوں گے اس گاؤں پر تعزیری چوکی پولیس لگا دی جائے گی۔

۴۔ ہرگاہ تمام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ وہ فسادی لوگوں کے کہنے میں نہ آئیں اور
نہ ہی سرکاری عمارات کو نقصان پہنچائیں۔

گورنر کے مجوزہ اعلان اور حکام کے دوسرے تشدد کے باوجود تحریک عدم ادائیگی مالیہ
جموں کے مضافات سے لے کر بارہ مولہ اور سرینگر کے قرب و جوار تک پھیلتی چلی گئی۔

۲۲۔ جنوری کو مرکزی مجلسِ احرار نے یوم میرپور منایا اور اس روز سارے ہندوستان میں
اس تحریک کے حق میں جلوس نکالے گئے اور جلسے کیے گئے۔

اس تحریک سے شیخ عبداللہ نے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے حکام کشمیر کو حسب ذیل خط تحریر
کیا۔ جو ۲۳۔ جنوری ۱۹۳۲ء کو روزنامہ "انقلاب" میں شائع ہوا۔

"جناب والا! میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے اعلان کے باوجود ملک میں افواہیں پھیلائی
جا رہی ہیں کہ میں نے عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک شروع کر رکھی ہے یا شروع کرنے
والا ہوں۔

میں اس خطرناک اور مکروہ ذہنیت پر بے حد افسوس کا اظہار کرتا ہوں۔ اس

قسم کی افواہیں پھیلا کر غریب کسانوں کو عام طور پر مصائب میں مبتلا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ گولا گام ، بارہ مولا کے غریب مزدوروں کو بالخصوص تکلیف میں مبتلا کرنے کی کوشش جاری ہے۔

بدقسمتی سے ریاست کے ارباب اس قسم کی افواہوں پر اعتبار کر لیتے ہیں جو عدم ادائیگی مالیہ کے متعلق اڑائی جا رہی ہیں۔ اور اس تحریک کے متعلق پھر وہ اپنا رویہ سخت کر لیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مالیہ کی وصولی میں کچھ دقتیں اور مشکلات پیش آ رہی ہیں لیکن اس کی وجہ ایسے حالات ہیں جن پر کسی کو قابو حاصل نہیں۔ امسال بارش نہ ہونے اور ایسی ہی دوسری وجوہ کی بنا پر فصلیں ناکام رہی ہیں۔ پیداوار اتنی قلیل ہے جو مالیہ کی ادائیگی کے لیے ناکافی ہے۔ لہٰذا کاشتکاروں کے لیے صرف ایک ہی چارہ ہے کہ وہ مالیہ نقد ادا کریں جیسے گزشتہ سال تھا۔ میں حقیقی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ زمیندار نقد مالیہ ادا کرنے پر رضا مند ہو جائیں گے۔ اس کے باوجود انہیں جیل خانوں میں ٹھونس دیا گیا ہے۔

اس موقعہ پر میں الاعلان کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانان کشمیر سول نافرمانی کے پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں اور وہ عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک کے مخالف ہیں۔ لہٰذا میں آپ پر یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انتظامیہ کے افسروں کو ہدایت کر دیں کہ ان افواہوں پر پریشان نہ ہوں اور خود غرض مفسد پردازوں کی اڑائی ہوئی افواہوں اور رعوبہ بازوں سے متاثر نہ ہوں۔ میں ریاست میں امن وامان کا آرزومند ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میری بات پر یقین کر لیا جائے گا۔"

آپ کا۔ ایس۔ ایم۔ عبداللہ

شیخ عبداللہ کی حکام کشمیر کو اس یقین دہانی کے بعد کشمیر کمیٹی کے سیکرٹری شمس کاشمیری نے حکومت سے شکایت کی۔

"حکومت کو ہم یقین دلا چکے ہیں کہ ہماری طرف سے ریاست میں کسی قسم کی کوئی

شرارت نہیں ہو رہی۔ اور نہ ہی ہمارا کوئی ارادہ ہے۔ اس کے برعکس مجلس احرار کے کارکن بلا روک ٹوک جموں اور کشمیر میں گھوم پھر رہے ہیں۔ جبکہ ہماری کوشش یہ ہے کہ میرپور اور راجوڑی وغیرہ میں تحریک مالیہ کی عدم ادائگی کے سلسلے میں جو ادھم مچا رکھا ہے اور اس کے مقابل سرینگر میں بالکل امن اور سکون رہے یہاں تک کہ کشمیر کے معتدل اور مسلم لیڈر شیخ عبداللہ صاحب نے بھی حکومت کشمیر کو یقین دلایا ہے کہ سرینگر میں سول نافرمانی کا کوئی امکان نہیں۔

۲۵- جنوری کے روزنامہ "زمیندار" اور روزنامہ "انقلاب" میں شیخ عبداللہ کا اور بیان شائع ہوا۔ شیخ صاحب نے اپنے متعلق چند سوالات کے جواب دیتے ہوئے کہا:-

"میرے متعلق یہ افواہ بھی ہے کہ میں کشمیر کمیٹی کا تنخواہ دار ہوں۔ اس کے متعلق میں کہنا چاہتا ہوں۔ کہ یہ الزام سراسر غلط اور جھوٹ ہے۔ البتہ مجھے اس جماعت کی سرکردگی کا فخر حاصل ہے۔ جو غیر فرقہ وارانہ رنگ سے الگ ہو کر قوم کی خدمت کر رہی ہے۔"

۲۳- جنوری کو پنجاب گورنمنٹ نے احرار رہنماؤں کو جنہیں حکومت کشمیر سے صلح کی گفتگو کے لیے لاہور بورسٹل جیل میں لایا گیا تھا۔ ماندہ میعاد اسیری گذارنے کے لیے نیو سنٹرل جیل ملتان منتقل کر دیا۔ اس جیل میں ان دنوں کانگریس سول نافرمانی کے معزز رہنما بھی تھے۔ جن کے ساتھ اکثر سیاسی نوک جھونک رہتی۔ اور ان دنوں کی مشترک سیاسی، ادبی اور مذہبی قسم کی محفلیں قابل ذکر ہیں۔ کاش انہیں محفوظ کر لیا جاتا۔

شیخ عبداللہ کی گرفتاری

ہر طرح کی یقین دہانی کے باوجود حکومت کشمیر نے ۲۰ جنوری کو شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لیا۔ اور ۲۸ جنوری کو انہیں چھ ماہ کی قید کا حکم دیا گیا۔ شیخ عبداللہ نے عدالت کا فیصلہ سنتے ہی کہا۔

" میری کوئی حرکت سیاسی نہیں تھی۔ اور نہ ہی میں نے کسی قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے سزا دی گئی ہے "

سُرخ رنگ بزدل حاکم اور بددیانت لیڈر قوم اور ملک دونوں کو لے ڈوبتے ہیں مہاراجہ کشمیر جس کے آباؤ اجداد نے کشمیر میدان دغا میں نہیں بلکہ اپنے آقاؤں سے غداری کے صلہ میں غیر ملکی حکمرانوں سے خریدا تھا۔ جب سونے کے سنگھاسن پر براجمان ہوا تو غریب رعایا کے خون ناحق کا ایک ایک قطرہ ظلم وجور کے سانچے میں ڈھل کر اپنے مہاراجہ کے لیے ہیرے جواہرات پیدا کرنے لگا۔ تن آسان حاکم اس دولت پر سانپ کی طرح بیٹھ کر اسی مظلوم رعایا کو ڈسنے لگا جس نے نشاطِ زندگی فراہم کیا۔ پھر وہی کھیت جو کبھی سونا اگلتے تھے زاعی اور رعایا سے بغاوت کر کے موت کی آبیاری کرنے لگے۔ اس زہریلی خوراک کا اثر تھا کہ کشمیر کا حاکم بزدل اور مظلوم رعایا صدیوں غلامی پر قناعت کر بیٹھے۔ مجلس احرار کی تحریک ہر اعتبار سے پر امن تحریک تھی۔ البتہ احرار رضاکاروں کی سرخ وردیوں سے خائف ہو کر مہاراجہ کشمیر نے پہلے تو اپنی موٹر جس کا رنگ سرخ تھا تبدیل کیا۔ اس کے بعد اسکولوں میں ہدایت جاری کی کہ آئندہ سے بچوں کی وردی زرد رنگ کی ہوگی۔ جو پیشتر کیسری رنگ کی تھی۔ نیز یہ اعلان بھی کیا گیا کہ سرکاری تقریبات میں شمولیت کے لیے آئندہ سرکاری نشان پیلے رنگ کی پگڑی ہوگی۔ ورنہ سرکاری محفلوں میں حاضری کے لیے کیسری رنگ مخصوص تھا۔ ہندی میں کیسری شیر کو کہتے ہیں، مگر احرار کے سرخ نشان سے یہ شیر اس طرح

فرار ہوا کر گیدڑ بھی اس بھاگتے ہوئے شیر کا مذاق اڑانے لگے۔

کشمیر میں نیا آرڈیننس

عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک نے ریاستی حکام کو نئی الجھن میں ڈال دیا۔ ریاست کے گاؤں اور دیہاتوں میں یہ تحریک اس قدر عام ہوئی کہ ۲۷۔جنوری کو حکومت کشمیر نے ایک نیا آرڈیننس جاری کیا جس کی رو سے تقریر و تحریر کی پابندی عاید کر دی گئی۔نیز پنجاب کے اکثر مسلم اخبارات کا ریاست میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔

تمام سیاسی اور مذہبی اجتماعات کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ سیاسی کارکنوں کی گرفتاریاں عام ہو گئیں ۳۱۔جنوری ۱۹۳۲ء کو راجوڑی کے مسلمانوں کے ایک احتجاجی اجتماع پر گولی چلائی گئی۔ جس میں پینتیس مسلمان شہید ہوئے۔اسی روز شاہی عمارات اور حضوری باغ کو عوام نے آگ لگا دی۔

مجلس احرار کی تحریک میں اس وقت تک اٹھائیس ہزار سات سو گرفتاریاں ہو چکی تھیں اور شہیدوں کی تعداد چوبیس تھی۔

میر پور مالیہ تحریک میں تین سو آٹھ افراد گرفتار ہو چکے تھے۔اور شہداء کی تعداد دس تھی میر پور راجوڑی میں فوج کی گولیوں سے زخمی ہونے والوں کی تعداد پچاس سے زائد تھی۔

مجلس احرار کے دفتر میں چھاپہ

۲۱۔جنوری کو شام چار بجے پولیس کی بھاری تعداد نے دفتر مرکزیہ پر چھاپہ مارا۔گھنٹوں تلاشی کے بعد پولیس حسب ذیل عنوان کے پوسٹر اپنے ساتھ لے گئی۔

۱۔کہاں تک لو گے ہم سے امتحان فتح ایوبی ۔ دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

۲۔ شمع توحید کے پروانوں! کفن بردوش ہو جاؤ۔

۳۔ فرزندان توحید پر گورا فوج کے مظالم۔

۴۔ جمعۃ الوداع کی نماز آپ کہاں پڑھیں گے۔

متذکرہ بالا اشتہارات دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت ضبط کر لیے گئے۔

ماسٹر تاج الدین کا کشمیر سے اخراج

عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک نے کشمیر میں باردولی کا سا سماں پیدا کر دیا۔کانگریس کو علاقہ باردولی میں عدم ادائیگی مالیہ کی

تحریک پر بڑا ناز تھا۔ لیکن مجلس احرار اور جموں کے مسلمانوں نے اس تحریک میں وہ جان پیدا کی کہ حکومت کشمیر جو احرار کی پرامن تحریک سے ہی جاں بلب ہو چکی تھی۔ اس تحریک سے اس قدر عاجز آئی کہ اسے گلینسی کمیشن کی سفارشات بھی کوئی سہارا نہ دے سکی۔ باوجود کہ شیخ عبداللہ اور ان کی کشمیر کمیٹی حکومت کو تعاون کا یقین دلا چکے تھے۔ مگر صدیوں کی غلامی سے اکتایا ہوا کشمیری علم بغاوت کی اڑانوں کے سامنے میں اڑتا چلا جا رہا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اب میری تقدیر کا پانسہ پلٹ چکا ہے۔ میری زنجیریں ٹوٹنے والی ہیں۔ میرا خون کشمیر کی ہر کھیتی میں زعفران پیدا کرے گا جس کی سرخی میرے زرد چہرے کو سیب کی طرح کر دے گی۔ مگر آہ! بھولا کشمیری یہ نہیں جانتا تھا کہ جو ہاتھ میری غلامی کی گرہیں کھولنے کا تماشہ کر رہا ہے ہنوز وہی ہاتھ میرے گریبان کی دھجیاں نوچ کر اپنی تن پوشی کا انتظام بھی کر رہا ہے۔

عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک سے پریشان ریاستی حکام نے ایک طرف ریاست کے اندر تشدد کو ہوا دی تو دوسری طرف ۵۔ فروری کو احرار رہنما ماسٹر تاج الدین انصاری کو سرینگر سے گرفتار کر کے پنجاب میں لا کر چھوڑ دیا۔

عدم تشدد اور تشدد کی تحریکات

جب غلاموں کا ضمیر بیدار ہوتا ہے تو آقاؤں کی طنابیں آپ سے آپ ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔

مہاتما گاندھی کی دوسری گول میز کانفرنس سے ناکام واپسی کے بعد برطانوی سامراج کی پالیسی کے تیور بھی درست نہیں رہے تھے۔ خصوصاً شمالی صوبہ سرحد، بنگال اور صوبجات متحدہ کے عوام کانگریس اور حکومت ہند کے سیاسی معاہدوں سے مایوس ہو کر خلاف آئین لڑائی شروع کر چکے تھے۔ وائسرائے ہند نے ان صوبوں میں آرڈیننس جاری کر دیا تھا جس کے باعث اکثر افراد گرفتار ہو چکے تھے۔

کانگریس کے اندر ایک گروپ ایسا بھی تھا جو گاندھی جی کے لندن جانے پر راضی نہیں تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اس گروہ کے سرغنہ تھے۔ جبکہ دوسری طرف ڈاکٹر راجندر پرشاد، مس سوجنی نیڈو، گاندھی جی کے ہمنوا تھے۔ ۲۸۔ ستمبر کو ہندوستان پہنچتے ہی گاندھی جی نے اپنے کارکنوں سے باز پرس کرنے کی بجائے لارڈ ولنگڈن کو تشدد کا محرک قرار دے کر گاندھی ارون سمجھوتہ

کو ختم کر دیا۔ اور کانگریس کی طرف سے نئی تحریک شروع کر دی۔ اس سلسلے میں انہیں ۴۔ جنوری ۱۹۳۲ء کو گرفتار کر لیا۔ وائسرائے نے اب کے سول نافرمانی کے قیدیوں کی جائیداد ضبط کرنے کا بھی حکم دے رکھا تھا۔ جس سے کانگریس کی نئی تحریک کو کافی نقصان پہنچا۔

احرار کی تحریک جسے دو گونہ تشدد کا شکار ہونا پڑ رہا تھا۔ کانگرسی تحریک کے مقابل آگے بڑھ رہی تھی۔ باوجود دونوں کے مسلک میں نمایاں فرق تھا تاہم انگریز کی حکمت عملی نے دونوں تحریکوں کو ایک ہی جرم کے مجرم ٹھہرا کر جیل خانوں میں ایک سا سلوک کیا۔

کانگریس اور کشمیر تحریک نے برصغیر کے عوام کو غلامی سے نجات کے نئے نئے راستے سجھائے۔ چنانچہ عدم تشدد سے بغاوت کر کے ایک گروہ نے انگریزوں کے خلاف انقلابی تحریک بھی شروع کر رکھی تھی۔ یعنی تشدد کے ذریعے حصولِ آزادی کی جدوجہد۔ پنجاب میں اس تحریک کی باگ ڈور نوجوان بھارت سبھا کے ہاتھ میں تھی۔ جس کے لیڈر سردار بھگت سنگھ تھے اور بنگال کی ٹیررسٹ پارٹی (TERORARIST PARTY) جس کی رہنمائی متعدد بنگالی نوجوانوں کے سپرد تھی۔

آخر الذکر پارٹی کی ایک ۲۱ سالہ خاتون ورکر بینا داس نے ۶۔ فروری ۱۹۳۲ء کو گورنر بنگال سر اسٹینلی جیکسن چانسلر کلکتہ یونیورسٹی پر اپنے ریوالور سے دو فائر کیے۔ گورنر بنگال یونیورسٹی میں جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت کر رہے تھے۔

مس بینا داس نے ۱۹۳۱ء میں انگریزی زبان اور ادب کے امتحان میں امتیازی پوزیشن حاصل کی تھی۔ ۶۔ فروری کو بینا داس بی۔ اے آنرز کی ڈگری حاصل کرنے یونیورسٹی گئی تھی کہ اس نے گورنر پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ مگر وہ بچ گیا۔

ملزمہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے پندرہ فروری کو عدالت میں اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے کہا،

"میں اقرار کرتی ہوں کہ سینٹ ہاؤس میں میں نے کونشن کے آخری دن گورنر بنگال پر فائر کیے تھے۔ میں اس کے لیے اپنے کو قطعی ذمہ دار ٹھہراتی ہوں۔ آخر کو اگر مرنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ اس آمرانہ اور غیر ملکی نظام کے خلاف لڑتے ہوئے باعزت طریق پر شریفانہ موت مرا جائے۔

اس غیر ملکی نظام کے خلاف جس نے ہمارے ملک کو دائمی غلامی اور ذلت و رسوائی

کے جوتے تلے دبا رکھا ہے۔ میں نے اپنے وطن کی محبت میں سرشار ہو کر گورنر پر گولی چلائی تھی۔ میں نے اپنے ملک کے لیے جو قدم اٹھایا وہ ایک زبردست تشدد کا اقدام تھا۔ اور خود میری فطرت کے خلاف بھی۔ ساتھ ہی مجھے اس بات پر مسرت بھی ہے کہ قدرت نے سر اسٹینلی جیکسن کو بچالیا۔ اور اس طرح لیڈی جیکسن اور ان کے بچے ایک المناک حادثے سے بچ گئے۔

میرے لیے یہ بات باعث مسرت ہے کہ میں نے اپنا مقصد بغیر کسی انسانی جان کے اتلاف کے حاصل کر لیا۔ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ کنونشن ہال میں ڈینیش چندر سین زخمی ہو گئے۔ ان کو یا کسی اور کو ذرا بھر بھی نقصان پہنچانا میرا مقصد نہ تھا اور مجھے اس بات کا گمان تک نہ تھا کہ میرے اس اقدام سے انہیں یہ تکلیف پہنچے گی۔

میں نے اپنی دماغی کیفیت اور دل کی گہرائیوں میں اپنے ملک کی غلامی کی ذلت کو محسوس کیا ہے۔ میں یہ سوچتی رہی۔ کیا ایسا ہندوستان زندگی بسر کرنے کے قابل ہے۔ جو مظالم کی آماجگاہ ہو۔ اور مسلسل غیر ملکی حکومت کی زیادتیوں کے تحت بے چینی سے کراہ رہا ہو؟ اور کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ان سب چیزوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ایک شخص اپنی زندگی نچھاور کر دے۔ کیا ہندوستان کی ایک بیٹی اور انگلستان کے ایک فرزند کی قربانی ہندوستان کے عوام کو ان کی مسلسل غلامی کے خلاف بیدار کرنے کے لیے کافی نہ ہوگی اور انگلستان کو اس کی زیادتیوں پر تنبیہہ نہ کرے گی؟

یہ سوالات تھے جو میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح ضرب لگاتے رہے اور مجھے سکون حاصل نہ تھا۔

میری مذہبی اور اخلاقی حس سیاسی آزادی کے جذبے سے بے تعلق اور بے جوڑ نہیں ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جو شخص سیاسی طور پر غلام ہو وہ خدا کو نہیں پہچان سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا ہی آزادی کی روح ہے اور اس نے اپنے

انسانوں کو آزاد بنایا ہے۔ تاکہ وہ اس مسرت سے ہمکنار ہو سکیں جو اس میں ہے
اس لیے میں نے سیاسی آزادی کو مذہب اور اخلاق کا ایک جزو بنایا ہے اور
ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔ اس موقعہ پر بینا نے اپنے دل کی
گہرائیوں میں محسوس کیا کہ انسانیت کا بہترین اور فطری تقاضہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں
ہر جور و ظلم کے خلاف آواز اٹھائے اور بغاوت کرے۔

میں نے اپنے عملی اقدام کے لیے اپنی مقدس مادرِ تعلیم کا کنونشن ہال
منتخب کیا۔

بینا داس کے اس تحریری بیان کے بعد کلکتہ ہائی کورٹ نے ملزمہ کو ۹ سال قید سخت اور
بی کلاس میں رکھنے کا حکم دیا۔

روزنامہ "احرار" کا عید نمبر ضبط

۷۔ فروری کو مجلس احرار کے آرگن روزنامہ "احرار" کا عید نمبر ضبط کر لیا گیا۔ مگر تحقیق کے باوجود یہ معلوم نہ ہو سکا کہ حکومت کا یہ اقدام کس بنیاد پر ہے۔ پولیس کافی دیر دفتر احرار کی تلاشی لیتی رہی۔ اور اخبار احرار کی تمام کاپیاں اپنے ساتھ لے گئی۔

ہری کشن کول کی تبدیلی

کشمیر میں آئے دن کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیش نظر لندن کے اخبارات جن میں "سنڈے ٹائمز" "مارننگ پوسٹ" "ڈیلی ٹیلیگراف" قابلِ ذکر ہیں۔ حکومت برطانیہ اور مہاراجہ کو مشورہ دیا کہ کشمیر کے قضیے کو جلد سے جلد ختم کر دیں۔

۸۔ فروری کے "سنڈے ٹائمز" لندن نے اپنے افتتاحی کالم میں لکھا۔

" ریاست کشمیر کے نظم و نسق میں فوری کوئی شدید قسم کی تبدیلیاں آنی چاہئیں۔
جب تک ریاست میں موجودہ بدنظمی کا دور دورہ رہے گا، مسلمان جہاں کہیں بھی
رہتا ہے اس سے متاثر ہوگا۔ لہٰذا آئندہ ریاست کا وزیر اعظم انگریز ہونا چاہیے۔
نیز ریاست کے نظم و نسق میں مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنا ضروری اور اہم ہے۔
ساتھ ہی مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اعتدال کی راہ اختیار کریں اور
ریاست میں جتھے بھیجنے بند کر دیں۔"

دوسرے دن ۱۹۔فروری ۱۹۳۲ء کو جموں سے اطلاع ملی کہ وزیر اعظم کشمیر راجہ ہری کشن کول بیماری کی بنیاد پر کچھ دنوں کے لیے رخصت پر چلے گئے ہیں اور ان کی جگہ لفٹیننٹ کرنل مسٹر جے۔ ڈی۔ کالون کو جموں و کشمیر کا نیا وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا ہے۔

اس خبر کے ساتھ یہ نوٹ بھی تھا کہ مہاراجہ سر ہری سنگھ نے حکومت ہند سے مسٹر کالون کی خدمات عاریتہً لی ہے۔ دوسرے دن اخبارات میں علاقہ میرپور کے مسلمانوں کا یہ مطالبہ شائع ہوا کہ میرپور میں ڈوگرہ فوج کی جگہ گورا فوج علاقہ میں متعین کرنی چاہیے۔

تحریکِ احرار کا تیسرا رُخ

انگریز فطرتاً پولیٹیشن واقع ہوا ہے۔ امورِ سلطنت میں اس کی فکر برسوں پہلے اس کی رہنمائی کرتی ہے اور اپنے سفر کا راستہ متعین کرنے اور اس کے نقش و نگار سنوارنے میں وہ انسانی خون تک کو داؤ پر لگا دینے سے دریغ نہیں کرتا۔ میدان کارزار ہو یا میز پر گفتگو، اس کے دماغی کل پرزوں میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ قلم اور تلوار کی لڑائی میں یکساں وار کرتا ہے۔

مہاراجہ کشمیر سے پولیٹیکل انتقام لینے کے لیے انگریز کو کن دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنا پڑا، تاریخ کا یہ باب اس قدر گہرا نہیں کہ دیکھنے اور سمجھنے میں دشواری ہو۔ اس نقشے کی لکیریں آئینے کی طرح واضح ہیں کہ فرنگی انتقام نے اقوامِ کشمیر کے خون کو دریائے جہلم کی موجوں سے کیونکر ہم آہنگ کیا۔ اور یہی صدا گل پوش وادیوں سے نکل کر پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی جب انسانی دلوں تک پہنچی تو پھر انسانوں پر کیا گزری؟

کشمیر پر انگریز کا بطورِ وزیر اعظم مقرر ہونا ڈوگرہ شاہی کی شکست کا ابھرتا ہوا نشان تھا۔ کشمیر کے مطلق العنان حکمران نے اپنی سیاسی موت پر دستخط کرنے کے لیے جس بے ضمیر ٹولے کا خون اپنے قلم کی سیاہی میں استعمال کیا اس خون کے جراثیم بھی زندہ نہیں تھے۔

مجلس احرار کی لڑائی اب مہاراجہ سے نہیں بلکہ براہِ راست برطانیہ سے تھی۔ نئے محاذ پر دونوں نے اپنے پینترے بدلے۔ ۲۳۔فروری کو مہاراجہ کشمیر وائسرائے سے ملنے دہلی گئے۔ تاکہ نئی پالیسی وضع کی جا سکے۔ اس بیٹھک میں کیا طے پایا؟۔ اس سوال کا جواب آئندہ تاریخ دے گی۔

روزنامہ احرار کی ضمانت کی ضبطی

۲۴۔فروری ۱۹۳۲ء کو مجلس احرار کے روزنامہ "احرار" کی سابقہ ضمانت ضبط کر کے آئندہ پانچ ہزار کی ضمانت کا مطالبہ کیا گیا۔

۳۱۔جنوری۔یکم، تین اور چار فروری عید نمبر اور ۱۲۔فروری کے مضامین قابل جرم قرار دیے گئے۔

۲۶۔جنوری کو روزنامہ "انقلاب" لاہور اور مسلم پرنٹنگ پریس جس میں انقلاب چھپا تھا۔دونوں کی پانچ پانچ ہزار کی الگ الگ ضمانتیں طلب کر لی گئیں۔

روزنامہ انقلاب کی فرد جرم میں حسب ذیل مضامین قابل گرفت قرار دیے گئے۔

۱۔ڈوگرہ شاہی نے مسلمانوں پر قیامت برپا کر دی۔

۲۔میر پور میں قتل عام۔

۳۔قرآن کریم جلا دیے گئے۔

۴۔عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔

مجلس احرار کے دفتر میں چھاپہ

۲۸۔فروری کو مقامی پولیس نے رات دس بجے دفتر مرکزیہ میں چھاپہ مارا۔نیز مقامی دفتر کی دربندی کر دی گئی بیرون دہلی دروازہ احرار کیمپ پر چھاپہ مار کر احرار رضاکاروں کو گرفتار کر لیا گیا۔روزنامہ احرار کے دفتر کی تمام ڈاک پولیس نے اپنے قبضہ میں کر لی۔مقامی احرار کارکنوں کے گھروں کی تلاشیاں لی گئیں۔ان سب کے باوجود احرار نے یکم مارچ ۱۹۳۲ء کو اپنے نئے پروگرام کے تحت تحریک کو ریاست کی بجائے برطانیہ کے خلاف شروع کر دیا۔

میر پور میں عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک اپنی جگہ برابر چلتی رہی۔ان دنوں کانگریس کی تحریک سول نافرمانی بھی ہندوستان میں چل رہی تھی کہ مجلس احرار نے اپنی نئی تحریک کا رخ اس نہج پر شروع کرتے ہوئے اعلان کیا۔

"ہم کانگریس کے ساتھ نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارا اس تحریک سے کوئی تعلق ہے۔ ہماری نئی تحریک بھی تحریک کشمیر کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔چونکہ ریاست کا

وزیراعظم انگریز آگیا ہے لہٰذا ہماری یہ پرامن لڑائی ایک طرف اگر دربار کشمیر کے خلاف ہے تو دوسری طرف برطانوی سامراج کے خلاف بھی ہے۔ کیونکہ اس نے کشمیر میں براہ راست مداخلت کی ہے"۔

اس اعلان کے بعد مجلس احرار نے غیر ملکی کپڑے اور شراب کی دکانوں پر پکٹنگ کا پروگرام بنایا۔ ساتھ ہی بغیر ٹکٹ ریل گاڑی پر سفر کرنا بھی پروگرام میں شامل کر لیا۔

احرار اور کانگریس کے رضاکار شراب اور غیر ملکی کپڑے پر ایک ساتھ پکٹنگ کر کے گرفتار ہوتے رہے۔ یہ تحریک لاہور سے سارے پنجاب میں اور پھر دہلی اور آگرے تک چلی گئی صوبہ یوپی بھی اس تحریک میں برطانوی مصائب کا شکار رہا۔

ان دنوں مجلس احرار کے صدر مولانا معین الدین اجمیری تھے۔

خواتین احرار کا قیام تحریک جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی۔ عوام کے جذبات بھی پرورش پاتے گئے۔ ۱۹۲۰ء کے ستیہ گرہ کی طرح امسال بھی کانگریس تحریک میں ہندو خواتین بطور والنٹیر گرفتار ہو رہی تھیں۔ مجلس احرار نے بھی مسلمان عورتوں میں ان جذبات کو ابھارنا چاہا۔ اس کے لیے ۵ مارچ کو لاہور میں مولانا مظہر علی اظہر کے مکان ریلوے روڈ پر خواتین کا اجتماع ہوا۔ جس میں خواتین احرار قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور مندرجہ ذیل انتخاب عمل میں آیا۔

صدر:۔ بیگم چودھری عبدالستار میونسپل کمشنر فیروزپور۔ نائب صدر:۔ بیگم مولانا مظہر علی اظہر بیگم مولانا عبداللہ بی۔ اے احرار قصور اور بیگم شیخ عبدالحمید۔ ناظم اعلیٰ:۔ بیگم خواجہ غلام محمد لاہور۔

اس اجتماع میں حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی۔

۱۔ مسلم خواتین کا یہ جلسہ اپنی ہندوستانی مسلم بہنوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ریاست کشمیر میں مسلمانوں پر ڈوگرہ راج اور برطانیہ کے ظلم و تشدد کے خلاف منظم ہونے کے لیے اپنے اپنے علاقوں میں خواتین مجلس احرار کی شاخیں قائم کریں۔

۲۔ یہ جلسہ تمام بہنوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ مجلس احرار ہند کے حق میں پروپگنڈہ کریں۔ نیز اپنے شوہروں، بھائیوں اور دوسرے مردوں کو مجلس احرار میں کام کرنے کی تلقین کریں۔

۳۔ یہ جلسہ مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ اگر انہوں نے اس پر امن جنگ کو جس میں ہزاروں مسلم بھائی اس وقت تک جیلوں میں جا چکے ہیں جاری رکھنے کا فیصلہ نہ کیا تو پھر ہم خواتین کشمیری بھائیوں کی امداد کے لیے میدان میں آئیں گی۔"

روزنامہ زمیندار کی ضمانت

۷۔ مارچ کو روزنامہ زمیندار کی چھ ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی گئی۔ روزنامہ احرار اور روزنامہ انقلاب کے بعد زمیندار کو مجلس احرار کی اعانت میں یہ سزا دی گئی۔ اور یہ برطانوی پالیسی کا کرشمہ تھا کہ مسلم پریس کا گلا گھونٹ دیا اور ہندو پریس کو آنچ تک نہ آنے دی۔ یہ حکومت برطانیہ کی جانبداری کی کھلی مثال تھی۔

مقامی مجلس احرار نے اپنا نظام توڑ دیا

کشمیر میں انگریز وزیر اعظم کی آمد اور وائسرائے ہند سے والیٔ کشمیر کی ملاقات نے ریاست کے علاوہ برطانوی علاقے میں بھی اپنی داخلی پالیسی کو اس قدر تشدد آمیز کر دیا کہ مجلس احرار کا گھیراؤ ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ شراب، غیر ملکی کپڑے پر پکٹنگ اور بغیر ٹکٹ ریلوے کا سفر جاری تھا۔ تاہم حکومت ایک طرف کانگریس تحریک کو اور دوسری طرف مجلس احرار کی سول نافرمانی کا مقابلہ کر رہی تھی۔ ان حالات میں پنجاب کے جیل خانوں میں جو ہنوز تحریک کشمیر کے قیدیوں سے پر تھے مزید قیدیوں کے لیے گنجائش نہیں تھی۔ حکومت نے جیل خانوں میں بیرکوں اور تنہائی کوٹھڑیوں کے علاوہ احاطوں میں کیمپ اور چھولداریاں نصب کر دیں۔ لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی حکومت کیل کانٹوں سے لیس تھی۔ لیکن مجلس احرار بھی غافل نہیں تھی۔ چنانچہ مرکزی صدر مولانا معین الدین اجمیری نے ماتحت جماعتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنا مقامی جماعتی نظام ختم کر کے وار کونسلیں قائم کر لیں۔ اس حکم پر لاہور میں ۹۔ مارچ ۱۹۳۲ء کو شیخ محمد شریف پہلے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے۔ اسی طرح پنجاب، یو پی اور شمال مغربی سرحد میں بھی کیا گیا۔

ایسا کیوں؟

سیاسی جماعتوں اور حکومتوں کے مابین جب ٹکراؤ ہوتا ہے تو پھر فریقین بساط پر بیٹھے مہرے چلانے والوں کی طرح دماغی لڑائی لڑتے ہیں۔ ایسے وقت میں حکومت کی خواہش ہوتی ہے کہ تحریک کے رہنماؤں کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ تاکہ تحریک جلد سے جلد فیل ہو جائے۔ مگر سیاسی رہنما اپنی جگہ عقلی اور فکری سرمائے کو محفوظ کرنے کے لیے جماعتی

نظم ونسق ختم کر کے ڈکٹیٹر شپ قائم کر دیتے ہیں۔ اسے وار کونسل بھی کہتے ہیں۔ اس کا فائدہ تحریک کو پہنچتا ہے کہ اصل رہنما حکومت اور قانون کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی جگہ تحریک کی ذمہ داریاں رضا کاروں کو سونپ دی جاتی ہیں۔ اور لیڈر پس منظر میں رہ کر تحریک کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک رضا کار کے بعد دوسرا رضا کار گرفتار ہو جاتا ہے۔ سیاسی رہنماؤں کی اس حرکت سے حکومت مات کھا جاتی ہے۔

حکومتِ برطانیہ اور ریاستی حکام کو یہ علم تھا کہ احرار تحریک میں اب تک جو موڑ آئے ہیں چودھری افضل حق ان سب کے پس منظر میں کام کر رہے ہیں۔ بظاہر وہ بیمار تھے اور چارپائی سے ہل نہیں سکتے تھے۔ ڈاکٹر ہر اوقات ان کے سرہانے رہتا۔ روزانہ اخبارات میں ان کی بیماری کے متعلق ڈاکٹری رپورٹ شائع ہوتی۔ لیکن ۲۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء سے تحریک کشمیر ان کے ذہنی نقشے کے عین مطابق چل رہی تھی۔ ہر روز ان سے ہدایات حاصل کی جاتی تھیں۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود قانون انہیں گرفت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ تصویر فریم میں نہیں تھی۔

چودھری افضل حق حقیقتاً بیمار تھے۔ سارا دن لحاف اوڑھے دفتر کی بالائی منزل پر پڑے رہتے۔ انہیں دمے کا عارضہ تھا اور موسم سرما اس مرض کے عروج کا موسم ہوتا ہے تاہم چھ ماہ سے مسلسل تحریک کشمیر اُنہی کی رہنمائی میں چل رہی تھی۔ بظاہر دیکھنے کو جماعت کا نظام دوسرے کارکنوں کے کندھوں پر تھا۔

کشمیر گول میز کانفرنس

۹۔ مارچ ۱۹۳۲ء کو حکومت ہند کے اشارے پر حکومت کشمیر نے ایک نیا ڈرامہ کھیلنا چاہا۔ یعنی گول میز کانفرنس کا اعلان کیا گیا۔ جس میں حکومت نے اپنے خواجہ تاش قسم کے نمائندوں کو دعوت دے کر اس ڈرامے کا آخری سین بھی عوام کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کانفرنس میں حسب ذیل ریاستی نمائندے شامل ہوئے۔

ہندو:۔ ۱۔ رائے بہادر پنڈت اننت رام۔ سابق گورنر ریاست جموں۔ ۲۔ کرنل شنگھارا سنگھ جاگیردار دیہاتی نمائندہ (ریاست کشمیر) ۳۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز شہری نمائندہ (ریاست کشمیر) ۴۔ ٹھاکر داس۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی شہر جموں۔ ۵۔ چرن جیت لال۔ سابق سیکرٹری پرسنل گلینسی کمیشن۔ ۶۔ سردار لدھا سنگھ پلیڈر سکھ نمائندہ (کشمیر)

مسلمان:۔ ا۔ پروفیسر مولوی محمد ابراہیم۔ انسپکٹر آف سکولز۔ جموں۔ سرکاری ممبر۔ ۲۔ راجہ فیروز خاں جاگیردار۔ دیہاتی نمائندہ۔ ریاست کشمیر۔ ۳۔ غلام محمد عشائی۔ شہری نمائندہ سری نگر۔ ۴۔ چودھری غلام عباس۔ جموں۔ ۵۔ صفدر میر ذیلدار کشمیر۔ ۶۔ چودھری رمضان علی۔

حکومت کے اس فیصلے کے خلاف مسلمانانِ کشمیر نے ۱۴۔ مارچ (۱۹۳۲ء) کو اعلان کیا کہ جب تک یہ مطالبات منظور نہیں کیے جائیں گے وہ اس کانفرنس کو تسلیم نہیں کریں گے۔

۱۔ مسلمانوں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے نمائندگی دی جائے۔

۲۔ نامزدگی کا حق مسلمانوں کو ہو۔

۳۔ آبادی کا موجودہ سرکاری تناسب منسوخ کیا جائے۔

۴۔ تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے۔

۵۔ تمام مسلمان نمائندوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ جب تک مندرجہ بالا مطالبات منظور نہ کیے جائیں۔ وہ مجوزہ گول میز کانفرنس میں شامل نہ ہوں۔

اس اعلان کے بعد حکومت کشمیر نے گول میز کانفرنس کا اجلاس ملتوی کر دیا۔ کیونکہ سرکاری اور غیر سرکاری مسلم نمائندوں نے حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے سے انکار کر دیا تھا۔

حکومت ہند کا پل بنام دربارِ کشمیر

سلطنت بھی ایک کاروبار ہے۔ اس سوداگری کا معاہدہ کبھی میدانِ جنگ میں تلوار کی نوک سے لکھا جاتا ہے اور کبھی قلم سے تحریر ہوتا ہے۔ شخصی حکومتیں۔ ایسے معاہدے رعایا کے خون سے مرتب کرتی ہیں اور جمہور کی شاہی میں یہی معاہدہ حاکموں کے سروں پر کھڑے ہو کر ترتیب دیا جاتا ہے۔ بہرحال سودا ضرور ہوتا ہے اور سودا کیے بغیر جو نظام وجود میں آتا ہے۔ وہ سود و زیاں کے معاملے سے ناآشنا رہ کر اپنی موت پر آجلانہ دستخط کر دیتا ہے۔

۱۹۳۱ء سے پیشتر کے بین الاقوامی حالات نے فرنگی قمار بازوں کو مجبور کیا کہ وہ ریاست کشمیر کے گرد ایسا جال بنے کہ ریاست کا حکمران اپنی عظمت تک کو اس جوئے میں داؤ پر لگا دے۔ راج مالا کا ایک ایک موتی بکھر کر ان کے اپنے تاج کی زینت بن جائے اور آخر کو ایسا ہی ہوا۔

تحریک کشمیر جو مہاراجہ اور اس کی رعایا کے درمیان کشمکش کا نتیجہ تھی۔ اس ہنگامہ آرائی میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ فرنگی جو اپنے ۱۸۴۶ء کے معاہدہ کی دفعہ ۹ کے تحت ریاست کشمیر کی امداد کرے تو غیر ملکی سوداگروں نے اپنے معاہدہ سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں اور مہاراجہ ہری سنگھ کو تیس ہزار احرار قیدیوں کا بیس لاکھ روپے کا بل بھیج دیا۔ یہ اس خوراک کا بل تھا جو پنجاب کے جیل خانوں میں احرار قیدیوں کو دی گئی۔ اس خبر کو لاہور کے روزنامہ انقلاب نے اپنی ۵۔ اپریل کی اشاعت میں شائع کیا۔

شروع تحریک کے قریباً ڈیڑھ ماہ بعد حکومت ہند نے یہ تحریک اپنے ہاتھ میں لی۔ اس طرح جو قیدی ریاست کی جیلوں سے انگریزی جیلوں میں آئے ان کے پاس ریاستی کمبل تھے جو واقعی بڑے قیمتی تھے۔ ہر قیدی کے پاس تین کمبل تھے۔ جب کوئی قیدی اپنی سزا ختم کر کے رہا ہونے لگتا۔ وہ اپنے لحاف سے روئی نکال کر اس کی جگہ کمبل بھر لیتا۔ اس طرح سینکڑوں ریاستی کمبل جیلوں سے باہر چلے گئے۔ اور اس طرح لاکھوں کا نقصان ریاست کا الگ ہوا۔ اور برطانیہ نے جو بل مانگا یہ دوسری رقم ہے۔ خوراک کے علاوہ سرکاری لباس جو ضائع ہوا وہ شمار سے باہر ہے۔

احرار سے تعاون کی سزا

۸۔ اپریل ۱۹۳۲ء کو سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے چھ مسلمان ممبران آغا غلام حیدر۔ میر حسن محمد۔ فقیر میر دین۔ مستری محمد حسن۔ میاں فیروز دین میر علی حسن کو وزیر سلف گورنمنٹ گوکل چند نارنگ نے دفعہ ۱۶ کے تحت بلدیہ کی رکنیت سے خارج کر دیا۔ کہ انھوں نے کشمیر آرڈی ننس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے احرار تحریک سے تعاون کیا تھا۔ جس سے شہر کا امن خراب ہوا۔

ریاستی اصلاحات

سے کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا

مجلس احرار کی سات ماہ کی مسلسل جدوجہد اور قربانیوں کے بعد مہاراجہ نے ۱۰۔ اپریل ۱۹۳۲ء کو گلینسی کمیشن کی رپورٹ پر احکام جاری کیے۔

یہ کمیشن ۱۳۔ نومبر ۱۹۳۱ء کو قائم کیا گیا تھا۔ جس نے ۲۴۔ مارچ ۱۹۳۲ء کو اپنی تمام

سفارشات ریاستی حکمران کو پیش کیں۔ احرار رہنما ان دنوں جیل خانوں میں تھے جب گلینسی کمیشن کی جزوی سفارشات ان کے سامنے آئیں تو انہوں نے ان سفارشات کو مسلمانان کشمیر کے لیے ناکافی بلکہ ناکارہ سمجھ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

کمیشن کے ساتھ تین غیر سرکاری ممبر(پریم ناتھ بزاز، خواجہ غلام احمد عشائی اور چودھری غلام عباس) کے اختلافی نوٹ بھی تھے۔ اس وقت ریاست کی وزارت عظمٰی کا قلمدان مسٹر کالون کے پاس تھا۔

اصلاحات

مذہبی آزادی:۔ مذہبی مشکلات دور کرنے کے لیے جو احکام صادر کیے گئے ان میں اذان سے روکنے اور اس طرح مذہب تبدیل کرنے یا تبدیلیٔ مذہب کا ارادہ کرنے پر ریاستی عوام کو خوفزدہ کرنے کو جرم قرار دیا گیا تھا۔ اور ایسے مجرموں کے لیے سزا دینے کی ہدایت کی گئی تھی لیکن اب توہین مذہب کرنے والوں کے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ ہائی کورٹ اپنی ماتحت عدالتوں کو یہ ہدایت جاری کرے کہ ان تمام مقدمات میں جن میں توہین مذہب کے ارتکاب کا ثبوت مہیا ہو جائے۔ مجرمین کو ایسی سزائیں دی جائیں جن سے مجرمین کو یقین ہو جائے کہ انہوں نے کس قدر سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

مقدس مقامات:۔ مقدس مقامات کی واپسی کے متعلق کچھ احکامات پہلے مہاراجہ کی طرف سے جاری ہو چکے تھے کہ ان کی پوری پوری تعمیل کی جائے یہ بھی ہدایت کی گئی کہ جن جائیدادوں کو ضبط کیا جا چکا ہے وہ واپس کر دی جائیں۔

یہ بھی ہدایت کی گئی کہ مسجدیں اور گرجا وغیرہ بنانے کے لیے درخواست آئے تو اس پر بہت جلد ہمدردی سے غور کیا جائے۔

تعلیم کی ترقی:۔ ابتدائی تعلیم کی توسیع اور عربی معلموں کی تعداد بڑھانے اور صنعتی تعلیم کے اجراء کے متعلق احکام دیے گئے۔ مڈل اور ہائی سکولوں میں اضافہ کیا گیا۔ کالجوں میں سائنس کی جماعتوں میں داخلے کے وقت جانبداری سے کام نہ لیا جائے اور اس سلسلے میں اقوام کشمیر کے جائز تحفظ کا انتظام کیا جائے۔ مسلمان

اساتذہ اور انسپکٹر مقرر کیے جائیں۔ جو ان صوبائی انسپکٹروں سے علیحدہ ہوں۔

ملازمتیں:۔ معیار تعلیم کو کم کرنے اور ہر نئی آسامی کے خالی ہونے پر بذریعہ اعلان درخواستیں طلب کرکے اسے پر کرنے اور مختلف اقوام کی آبادی کے تناسب کو ملحوظ رکھا جائے۔ نیز ہر سال ایک نقشہ کے ذریعے مختلف ادارہ جات میں مختلف اقوام کی ملازمتوں کی تعداد ظاہر کی جائے۔

مالیہ اراضی:۔ مالیہ کی وصولی بند کردی جائے۔ نذرانہ کی رقم کے متعلق فوراً غور ہو کر اس میں تبدیلی کی کیا ضرورت ہے۔ جو زمینیں ریاست کی ملکیت میں ہیں۔ لیکن قبضے کے حقوق عوام کو حاصل نہیں۔ ان سب کے مالکانہ حقوق قابض لوگوں کو دے دیے جائیں گے۔ کاہچرائی کا ٹیکس چھ تحصیلوں یعنی جموں، اکھنور، کٹھوعہ، جسمرگڑھ، میرپور اور بھمبر میں منسوخ کردیا گیا۔ دھاروں کا ٹیکس بھی معاف کردیا گیا۔

قصاب جو جانور حدود میونسپل کمیٹی میں ذبیحہ کرنے کے لیے لاتے تھے۔ ان سے کاہچرائی کا محصول لیا جاتا تھا۔ اسے بند کردیا گیا۔ اخروٹ اور دوسرے درختوں کو کاٹنے کے متعلق جو پابندیاں تھیں ان کو دور کردیا گیا۔ کوآپریٹو قرضہ جات کے نظام کو وسعت اور ترقی دینے کے متعلق احکام جاری ہوئے۔ ریاستی پریس ایکٹ جو بہت سخت اور ناقابل برداشت تھا اسے برطانوی ہند کے قانون کے مطابق کردینے کا فیصلہ کیا گیا۔

ان کے علاوہ رشوت ستانی، کار سرکار، دبیگار، جنگلات، کسٹم۔ مذہبی فریضہ کی بجا آوری۔ جانوروں کے ذبح کرنے پر ٹیکس کی معافی وغیرہ کی بھی ہدایت کی گئی۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن اگر کچھ نہ ہوا تو مجلس احرار کا مطالبہ (آزاد اسمبلی) پورا نہ ہوا اور اس کے بغیر تمام اصلاحات اسی طرح تھیں جس طرح ایک درخت بغیر پھل کے ہو۔

میرپور سے مسلمانوں کی ہجرت

غریب کی جھونپڑی ہو کر امیر کا محل ان دیواروں سے باہر رہ کر انسان کوڑی کا نہیں رہتا۔ برا وقت کسی پر نہ آئے۔ لیکن جب آجاتا ہے تو پھر فقیر اور وزیر ترازو کے ایک ہی تول تلتے ہیں۔ وطن عزیز کی ہوائیں بھولے

پسینے بھی گھی کی طرح لگتی ہیں۔ لیکن غریب الدیار آدمی تنکے سے بھی ہلکا ہوتا ہے۔ تاہم حیات چند روزہ میں کچھ ایسے دن بھی آتے ہیں کہ انسان کشمکش حیات میں الجھ کر موت سے بھی ٹکرا جاتا ہے اور یہی دن قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں مرتب کرتے ہیں۔

حکومت کشمیر کے ہزار دلاسوں اور بہانوں کے باوجود کشمیریوں کی مشکلات کے دن بڑھتے ہی گئے۔ ہر صبح نئی مصیبت جنم لیتی۔ ہر شام غروب ہونے والا آفتاب اپنے پیچھے ان گنت مصائب چھوڑ جاتا۔ ڈوگرہ شاہی کی سنگینیں اور گورہ فوج کی گولیاں مظلوموں کی حیات مستعار سے موت کی جھولیاں بھر رہی تھیں۔ گاؤں ویران، گھر قبرستان بن چکے تھے۔ کھیتوں میں خاک اڑ رہی تھی۔ پانی میں انسان کا لہو ملوث ہو کر زہر بن گیا تھا۔ ان حالات سے تنگ آیا ہوا کشمیری اپنی رہی سہی پونجی چھوڑ کر جانِ ناتواں لے کر اپنے ملک سے ہجرت پر مجبور ہوا۔ تاکہ ظالم کے خوف سے زندگی بچا سکے۔ گھر سے بے گھر ہو کر یہ قافلہ پہلے تو جہلم اترا۔ شہر کے عوام نے بھائی چارے کی رسم نبھائی۔ اور خوب نبھائی۔ دریا کے کنارے جہلم کی آبادی کو ہر سال دریا کی طوفانی موجیں آپے سے باہر ہو کر مہاجر بنا دیتی تھیں لیکن کشمیر کے بے گھر مسلمان بھائیوں کی اعانت میں جہلم کے عوام نے اپنی بساط سے کہیں زیادہ امداد کی۔

مہاجروں کا دوسرا قافلہ جو کئی ہزار پر مشتمل تھا۔ سیالکوٹ پہنچا۔ سیالکوٹ دستی صنعتکاروں کا شہر ہے۔ تحریک کشمیر کے باعث تمام کارخانے مقفل تھے۔ شہر کے ہزاروں پیر و جوان اور بچے جیل خانوں میں تھے۔ تاہم سیالکوٹ نے اپنی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ گھروں سے رہا سہا اثاثہ بھی اپنے بے وطن بھائیوں کی نذر کر دیا۔

ہجرت کی اس تحریک نے حکومت ہند اور دربار کشمیر کو پریشان کر دیا۔ وہ رسوائی کے ڈر سے مہاجروں کو واپس وطن لے جانے کی کوشش کرنے لگیں اور انہوں نے ہجرت کی تمام ذمہ داری مجلس احرار پر ڈال دی۔ حالانکہ احرار کا منشا ہرگز نہیں تھا۔ کہ گھروں سے بے گھر ہو کر لوگ دوسروں کے دست نگر بنیں۔ لیکن ریاست کے جبر و تشدد سے مجبور ہو کر انہیں ایسا کرنا پڑا۔ مگر حکومتوں کے اشارے پر ہندو پریس اور انگریزی اخبارات نے اپنے جرم کا اقرار کرنے کی بجائے۔ یہ الزام بھی مجلس احرار کے سر تھوپ دیا۔ اس پر مجلس احرار کے ڈکٹیٹر مولانا معین الدین اجمیری نے

مجلس کی پوزیشن واضح کرنے کے لیے ۱۷ اپریل ۱۹۳۲ء کو حسب ذیل بیان پریس کو دیا۔

میرپور کے متعلق مجلس احرار کا اہم اعلان

مجلس احرار اعلان کرتی ہے کہ جو ہجرت ریاست کشمیر سے عمل میں آئی ہے وہ کسی بیرونی ایجنسی کی انگیخت پر عمل میں نہیں آئی بلکہ ریاست کے حکام نے جو ظلم اپنی مسلمان رعایا پر کیا یہ سب اس کا نتیجہ ہے۔ اس کی وجہ سے کسی شریف آدمی خصوصاً کسی عورت کا وہاں رہنا ناممکن ہو رہا ہے۔

ہندو اور انگریزی اخبارات مسلسل اس پروپیگنڈہ میں مصروف ہیں کہ ہجرت مجلس احرار کے اشارے پر شروع کی گئی ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جس وقت مہاجرین انگریزی علاقے میں آئے تو اس وقت ان کی خدمت مجلس احرار نے اپنی محبت کے مطابق ضرور کی۔ مہاجرین کی امداد ایک مقدس فرض ہے جس سے انکار یا پہلوتہی کر کے کوئی مسلمان اپنے کو سچا مسلمان نہیں کہلا سکتا

ہم اپنے تمام مخالفین پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے کسی کو ہجرت کے لیے آمادہ نہیں کیا۔ اگر کوئی مسلمان ہجرت کر کے آ جائے تو حکومت کے خوف یا ڈر کی وجہ سے اس کی خدمت سے دریغ نہیں کیا جائے گا

مجلس احرار کے علم میں وہ زہرہ گداز مظالم ہیں جن کی تفصیل کے لیے موجودہ حالات سازگار نہیں۔ آرڈی ننسوں کی موجودگی میں کوئی اخبار ان واقعات کو شائع نہیں کرے گا۔ تاہم حقیقت بے نقاب ہوگی۔ آج نہیں تو کل اور معلوم ہو جائے گا کہ کشمیر میں کتنا بے پناہ تشدد ہو رہا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ حالات قابو سے باہر ہو جائیں۔ اور پھر حکومت ہند، حکومت کشمیر اور احرار تینوں مل کر بھی اس کی اصلاح نہ کر سکیں

احرار کے اس ملک گیر پراپیگنڈے کے بعد دونوں حکومتوں نے مہاجرین کو ریاست میں کئی اصلاحات کا کھلونا دکھا کر بہلایا اور لاریوں کے ذریعے واپس بلا لیا۔

چودھری افضل حق کو نوٹس اور ان کی گرفتاری

۱۸۔اپریل ۱۹۳۲ء رات ساڑھے نو بجے لاہور شہر کا کوتوال کثیر پولیس کی معیت میں دفتر احرار میں آیا اور چودھری افضل حق سے مندرجہ ذیل نوٹس کی تعمیل کرائی۔

"گورنر با اجلاس کونسل کی یہ رائے ہے کہ چودھری افضل حق خلف الرشید چودھری امیر خاں مرحوم سکنہ گڑھ شنکر ضلع ہوشیار پور نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا یا کیا جارہا ہے اور آئندہ بھی کیے جانے کا ارادہ ہے۔ جو امن عامہ کے لیے نہایت مضر ہے۔ لہٰذا گورنر با اجلاس کونسل قانون اختیارات ہنگامی کی دفعہ ۳ کے تحت ضمنی دفعہ ۱ کے اختیارات کے تحت چودھری افضل حق مذکور کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس نوٹس سے چوبیس گھنٹے تک لاہور چھوڑ دے اور تحصیل گڑھ شنکر میں سکونت اختیار کرلے۔

یہ حکم نامہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک یہ آرڈی ننس جاری رہیگا"

نوٹس وصول کرتے ہوئے چودھری صاحب نے اعلان کیا کہ وہ اس نوٹس کی تعمیل کے متعلق اپنی آئندہ پالیسی کا فیصلہ کل کریں گے۔

چنانچہ ۱۹۔اپریل کو نوٹس وصول کیے چوبیس گھنٹے گذر چکے تھے۔ مگر ہنوز چودھری صاحب نے لاہور نہیں چھوڑا تھا۔ آخر میں بیس اپریل صبح پانچ بجے اس مرد بیمار کو نوٹس کی خلاف ورزی کے جرم میں لاہور دفتر احرار سے گرفتار کر لیا گیا۔

گرفتاری سے قبل کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے چودھری صاحب نے کہا،

"ہم نے حق و صداقت کی جو پرامن جنگ شروع کر رکھی ہے۔ الحمدللہ وہ بڑی حد تک کامیاب ہو چکی ہے۔

میں اپنے بعد اس تحریک کو سرسبز چھوڑ چلا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ مسلمان اس تحریک کو منزل مقصود تک پہنچائیں گے۔

خواتین احرار کی گرفتاریاں

چودھری افضل حق کی گرفتاری پر سارے ملک میں ہڑتال اور جلسے ہوئے۔ جلوس نکالے گئے۔ احتجاجی قرار دادیں منظور

کی گئیں۔ اور اس کے ساتھ ہی احرار خواتین نے اپنی گرفتاریاں پیش کرنے کے لیے سیالکوٹ کے راستے کشمیر میں جتھے بھیجنے شروع کر دیے۔ اس تحریک کا پہلا قافلہ چودھری عبدالستار میونسپل کمشنر فیروزپور کی بیوی کی زیر قیادت جو چھ عورتوں پر مشتمل تھا روانہ ہوا۔ قافلہ سالار کی گود میں ان دنوں چھ ماہ کا بچہ بھی تھا جو اپنی والدہ کے ساتھ محاذ پر روانہ ہوا۔

قافلہ سالار کے علاوہ دوسری خواتین میں ۱۔ بیگم مولانا عبیداللہ احرار۔ فیروزپور ۲۔ بیگم عظیم خاں ۳۔ بیگم مولوی علی محمد ہیڈ ماسٹر ۴۔ بیگم مولوی عبدالرحیم المعروف جماعت شاہ سکول ماسٹر ۵۔ ہمشیرہ مولانا عبیداللہ احرار فیروزپور۔

احرار خواتین کا یہ قافلہ جو سب کا سب خنجروں سے مسلح تھا۔ فیروزپور دیہات کا دورہ کرتا ہوا ۱۸۔ اپریل کو سیالکوٹ پہنچا اور یہاں اسے گرفتار کر کے چھ ماہ قید بامشقت دی گئی تھی۔

احرار خواتین کی یہ تحریک چودھری عبدالستار بی۔ اے۔ میونسپل کمشنر فیروزپور کی زیر قیادت جاری تھی۔

چودھری عبدالستار فیروزپور کے قریب بستی رحمان کے رہنے والے تھے۔ بلدیہ فیروزپور کے ممبر منتخب ہونے سے پیشتر فاضلکا میں سکول ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کے برادر اکبر چودھری عبدالحق بلدیہ فیروزپور کے چیئرمین تھے۔

خلافت اور کانگریس کی تحریکات میں چودھری عبدالستار نے کافی دلچسپی لی۔ فیروزپور میں اخوان المسلمین کے نام سے ایک انجمن کے بانی تھے۔ تحریک کشمیر میں احرار سے وابستہ ہوئے تو انجمن کو مجلس احرار میں مدغم کر دیا۔ تحریک احرار میں بھرپور حصہ لیا۔ چودھری افضل حق کی گرفتاری کے بعد آپ نے دفتر مرکزیہ لاہور کی ذمہ داری سنبھال لی مگر گرفتار نہیں ہوئے۔

تحریک کے دنوں فیروزپور جیل میں ایک احرار قیدی کا انتقال ہوا تو حکام جیل نے اس کی لاش دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر چودھری عبدالستار نے حکام جیل کو لکھا۔

> "اگر اس قیدی کی لاش حاصل کرنے کے لیے مجھے اپنا بچہ بھی گولی کے سامنے رکھنا پڑا تو میں دریغ نہیں کروں گا۔ مگر احرار قیدی کی لاش ضرور حاصل کروں گا۔ کیونکہ میں اس کا صحیح وارث ہوں۔"

اس پر حکام جیل نے لاش چودھری صاحب کے حوالے کر دی۔ جس کا شہر میں جلوس نکالا گیا اور تحریک میں نئی جان پیدا ہو گئی۔

چودھری عبدالستار کو اگر زندگی فرصت دیتی تو وہ سوچ اور فکر کے اعتبار سے چودھری افضل حق کے صحیح جانشین تھے۔ مگر ۱۹۳۲ء کے آخر میں موت نے انہیں آدبایا۔ وہ دمہ کے مریض تھے اور تحریک کے دنوں دوڑ بھاگ کے باعث بیماری نے انہیں مغلوب کر لیا۔

۱۰ مئی ۱۹۳۲ء کو عدالت نے نوٹس کی خلاف ورزی کے جرم میں چودھری افضل حق کو ایک سال قید سخت اور پانچ سو روپیہ جرمانہ کی سزا دے کر انہیں نیو سنٹرل جیل ملتان بھیج دیا۔

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا

جس طرح سمندر میں جوار بھاٹا اور صحراؤں میں باد سموم کے طوفان اٹھتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔ غلام ملکوں کی سیاسی تحریکات اسی طرح جنم لیتی ہیں اور اپنی موت مر جاتی ہیں۔ کبھی حکومتوں کے تشدد انہیں کھا جاتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ حالات راستے کی رکاوٹ بن گئے اور وہ آگ جس سے حکومتوں کا وقار جلنا چاہیے تھا۔ جماعتوں کو وقتی طور پر لے بیٹھتے ہیں۔

مہاراجہ کشمیر کا مذہبی تعصب، انگریزوں سے ان کا ذاتی انتقام، برطانوی حکومت کی بین الاقوامی سیاسی ضرورت، شیخ عبداللہ کا سیاسی فقدان، قادیانیوں کی عیاری اور پنجاب کے ٹوڈی رؤسا کے احرار کے مقابل احساس کمتری نے بتیس لاکھ کشمیریوں کی زنجیریں جو ۱۹۳۱ء کی عوامی تحریک کے نتیجے میں ٹوٹنے والی تھیں، نہ جانے کتنی مدت کے لیے مضبوط کر دیں۔

۲۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء سے ۹۔ جون ۱۹۳۲ء تک کشمیر کی آزادی کے لیے مجلس احرار نے جس قدر جدوجہد کی۔ اگر کشمیری رہنما ذاتی مصلحتوں سے ماورا رہ کر مجلس احرار کی عوامی تحریک سے عدم تعاون نہ کرتے تو کشمیر کے لہلہاتے کھیت۔ جہاں گلپوش وادیاں، برف سے لدے مسکراتے پہاڑ۔ دریائے جہلم کی ہنستی ہوئی موجیں جن کی روانی میں خصوصاً پنجاب کے مسلمان نے اپنا خون شامل کیا تھا۔ آج اس قدر اداس نہ ہوتیں مگر آہ!۔ ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

۹۔ جون ۱۹۳۲ء کو مجلس احرار کے ڈکٹیٹر مولانا معین الدین اجمیری نے کشمیر تحریک سے

ہاتھ روک کر ہندوستان کی دوسری سیاسی اور مذہبی ضروریات کے پیش نظر حسب ذیل بیان دیا۔

"مجلس احرار اسلام ہند نے کشمیر کے مظلوم بھائیوں کی ہمدردی کے لیے جو آواز اٹھائی اور اس سلسلے میں تمام مسلمانوں کو دعوت عمل دی۔ اس آواز پر مسلمانان ہند نے جس قربانی و ایثار کا مظاہرہ کیا وہ قومی بیداری کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ قریباً پینتیس ہزار فرزندان توحید نے جیلوں کی صعوبتوں کو لبیک کہا اور بائیس نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ وہ لوگ جو اس تحریک میں کسی طرح بھی کام آئے قابل ستائش ہیں تاریخ انہیں کبھی نظر انداز نہیں کرے گی۔ اگر کشمیر کے رہنما بھی تعصب سے بالاتر ہو کر احرار کی تحریک سے مخلصانہ تعاون کرتے تو کشمیر کی مظلوم رعایا کی مصیبت کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو جاتا۔

تاہم مجلس احرار تمام ایسے افراد کی شکر گزار ہے۔ جنہوں نے اپنے بھائیوں کی مصیبت میں کام آکر ان کی مصیبت کم کرنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالےٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔

آج ہندوستان برطانوی سامراج کے پیدا کئے ہوئے مصائب میں الجھا ہوا ہے۔ ایسے نازک اور مصیبت کے دور میں مجلس احرار ایسی فعال جماعت کا چپ ہو جانا اور موجودہ پرامن جنگ سے منہ موڑ کر گھر کی چار دیواری میں بیٹھ رہنا کسی طرح بھی قابل برداشت نہیں۔

موجودہ وقت ہر لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کا عام سیاسی حالات سے بے خبر رہنا اپنی تنظیم نہ کرنا اور آزادیٔ وطن کا تحفظ اور ناموس اسلام کے لیے جدوجہد نہ کرنا حقیقی طور پر سیاسی موت مرنے کے مترادف ہے۔ ہمارے دیہاتی بھائی اپنی فصل ربیع سے قریباً فراغت پا چکے ہیں اور یہ بہترین وقت ہے کہ ہم دیہات سے رضاکار بھرتی کریں اور از سر نو اپنی جماعتی تنظیم کریں۔ ہمیں تنظیم جدید کی شدید ضرورت ہے۔ کشمیر کے علاوہ اور بھی بہت سے امور غور طلب ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ باقاعدہ منظم ہو کر قومی اور ملی

اتحاد اپنے اندر پیدا کریں۔

اس وقت جو دستور کا مسئلہ در پیش ہے۔ اس میں مسلمانوں کو اپنے مطالبات تسلیم کرانے کے واسطے بڑی سے بڑی قربانی دینی ہوگی۔

ماتحت مجالس سے پر زور اپیل ہے کہ وہ ۱۲۔ جون ۳۲ ۱۹ء بروز اتوار سے ۱۹۔ جون تک اپنا دیہاتی ہفتہ منائیں۔ اور اس ہفتے کے تمام پروگرام کو ہر طرح کامیاب کریں لوگوں کو مجلس احرار کی جانی اور مالی امداد پر آمادہ کریں۔ رضا کار بھرتی کریں اور سیاسی جدوجہد سے اس وقت تک منہ نہ موڑیں جب تک حکومت ہند مسلمانوں کے مطالبات تسلیم نہ کر لے۔

پروگرام

۱۔ ۱۲۔ جون بروز اتوار شہر اور دیہات میں مجلس احرار کے پروپیگنڈہ کے لیے رضا کار اور ذمہ دار کارکن روانہ ہوں۔

۲۔ کشمیر کے مظلوم بھائیوں کی مظلومیت اور مجلس احرار کی قربانیوں کو عوام پر واضح کریں

۳۔ سرمایہ فراہم کیا جائے۔ رضا کار بھرتی کیے جائیں اور نئی مجالس کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۴۔ اپنے تمام دوروں کی کیفیت سے دفتر مرکزیہ کو آگاہ کیا جائے۔

نتائج تحریک آزادئ کشمیر

۲۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء تا ۹۔ جون ۳۲ ۱۹ء مجلس احرار کی تحریک میں احرار دفاتر کی رپورٹ کے مطابق چونتیس ہزار مسلمان قید ہوئے اور بائیس نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا۔

روزنامہ "سٹیسمین" شملہ کی رپورٹ کے مطابق جیسے اس نے اپنی ۴۔ مئی ۳۲ ۱۹ء کی اشاعت میں شائع کیا۔ احرار سول نافرمانی کرنے والوں کی تعداد پینتالیس ہزار پانچ سو چھیاسی ہے۔

قید و بند کے مصائب اور خون ریز قربانیوں کے سلسلے میں مسلمانان کشمیر کو مجلس احرار کی خواہش کے مطابق ڈوگرہ شاہی سے نجات کے لیے وہ کچھ تو نہ مل سکا تاہم باغبان نے بار ضا کے صیاد و گل و غنچہ کو چمن کی ہر شاخ پر چہکنے کی اجازت دے دی۔

۱۔ وہ کشمیری کاشتکار جس کے پاس زمین تھی لیکن وہ اس کا مالک نہیں تھا۔ (کیونکہ

ریاست کی تمام اراضی مہاراجہ کی ملکیت تھی) تحریک احرار کے بعد کسان اس کا مالک بن گیا۔ اور ریاست کے مالکانہ حقوق ختم ہو گئے۔ اب زمیندار صرف مالیہ ادا کرتا ہے۔

۲۔ پچاس فیصد لگان تحریک کے بعد صرف پانچ فیصد رہ گیا۔

۳۔ تقریر و تحریر اور جماعت بنانے کی اجازت مل گئی۔

۴۔ اخبار نکالنے اور آزادئ رائے پر کوئی پابندی نہیں رہی۔

۵۔ آزاد اسمبلی کا وجود تسلیم کر لیا گیا (مگر یہ اسمبلی برائے نام تھی)

ننانوے سال کے لیے برطانیہ اور مہاراجہ کشمیر کے مابین ایک معاہدہ طے پایا۔ جس کی رو سے انگریز کو بطور پولیٹیکل ایجنٹ کے عارضی طور پر کشمیر میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔

سیالکوٹ

تحریک احرار میں پنجاب کے علاوہ دہلی، آگرہ، علی گڑھ، مراد آباد، اجمیر، سہارنپور، کلکتہ، بمبئی اور پھر شمال مغربی صوبہ سرحد کے عوام نے اپنی بساط اور حالات کے تحت دل کھول کر کشمیری بھائیوں کے لیے جانی اور مالی قربانی کی۔ لیکن اس تحریک میں سیالکوٹ شہر اور ضلع نے جس فراخ حوصلگی اور دلجمعی کا مظاہرہ کیا۔ برصغیر کی کسی سیاسی یا غیر سیاسی تحریک میں کسی شہر کو یہ مرتبہ یا اعزاز حاصل نہیں۔

چونتیس ہزار قیدیوں کی تعداد میں قریباً پندرہ ہزار افراد سیالکوٹ نے دیئے اور شہدا کی تعداد بھی اسی کی زیادہ رہی۔ دستی صنعتکاروں کا یہ شہر تحریک کشمیر میں احرار کی چھاؤنی کہلاتا تھا۔ جوان بچے اور بوڑھوں کے علاوہ اس شہر کی مستورات نے اپنی گود سے معصوم بچوں تک کو نکال کر احرار کے سپرد کر دیا۔ ماں نے بیٹا۔ بہن نے بھائی اور بیوی نے اپنا شوہر آزادئ کشمیر کیلئے پروانہ وار نثار کرنے میں دریغ نہیں کیا۔

راجہ سالبان کی یہ بستی (سیالکوٹ کا تاریخی نام) پورن بھگت کی طرح اپنے حسن کردار میں روز اول کی طرح روشن ہے۔ شہر اقبال کا ایک ایک فرد اپنی تاریخ ماضی پر جس قدر فخر کرے اسے زیب دیتا ہے۔
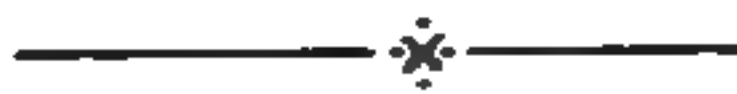
حرفِ آخر انقلابِ کشمیر کے مصنف سید غلام حسن کاظمی کی رائے اس باب کا بہترین اختتام ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"مجلس احرار اسلام نے عظیم الشان حقِ حرّیت ادا کیا اور کشمیری تحریک کو آزادی کے قریب پہنچا دیا۔ اور اس تحریک میں جان ڈال دی۔ تقریباً چونتیس ہزار احرار رضاکار جیل خانے آباد کر بیٹھے۔ ستائیس شہید ہوئے۔

شیخ عبداللہ نے باوجود احرار کی قربانیوں کے انہیں ٹکا سا جواب دیا۔ کہ ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کریں یعنی مطلب یہ تھا کہ قیادت ہمارے ہاتھ میں رہے۔ احرار مجبور تھے، اچپ سادھ کر رہ گئے۔

احرار ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کرتے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ اس پر آمادہ نہ تھے وہ اس سے کم پر رضامند تھے۔ یہ الگ بات ہے، احکومت کشمیر کے ہتھکنڈوں اور اس کی مسلسل کارستانیوں اور وعدہ خلافیوں سے واقف ہو کر انہوں نے ذمہ دار حکومت کا مطالبہ شروع کیا۔ لیکن کئی سال کے بعد۔ ؎

" ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا "

البتہ یہ بات صحیح ہے کہ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہ کہنا چاہیے۔ شیخ صاحب نے اس وقت احرار کی بیرونی مداخلت گوارا نہ کی لیکن بعد میں، انڈین نیشنل کانگریس کی مداخلت قبول کر لی۔ اور اس کے سائے میں ۱۹۳۹ء کو نیشنل کانفرنس قائم کر لی۔

اگر شیخ محمد عبداللہ مجلسِ احرار سے تعلق نہ توڑتا تو کسی حد تک ذمہ دار حکومت لے ہی لیتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت وہ گھبراہٹ میں تھا اور کشمیریت کا تعصب بھی کارفرما تھا" انقلاب کشمیر۔ ص ۱۰۶-۱۰۷

"قادیا[illegible]ں سے شیخ عبداللہ کا بڑا ربط و ضبط تھا اور لوگوں میں یہ افواہ گرم تھی کہ شیخ عبداللہ خود بھی قادیانی ہیں۔ مگر یہ افواہ غلط تھی۔ البتہ شیخ صاحب نے قادیانیوں سے روپے کی کافی امداد حاصل کی" • انقلاب کشمیر۔ ص ۱۱۱

احرار کے کشمیر میں مطالبۂ آزاد اسمبلی سے انحراف یا بغاوت کے بعد شیخ عبداللہ نے تا ملزیب کے اکسانے اور نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد وہی مطالبہ کیا جو مجلس احرار نے ۱۹۳۱ء میں کیا تھا چنانچہ ۱۹۳۸ء کے بعد شیخ عبداللہ کے دست راست مولانا سعید کا اس ضمن میں ایک بیان قابل غور ہے۔

"نیشنل کانفرنس مطالبہ کرتی ہے کہ اگر رائے عامہ کی اکثریت کا فیصلہ مہاراجہ ہری سنگھ تسلیم کریں تو مطلق العنان اختیارات سے دست بردار ہو کر صرف اختیارات کا استعمال کریں جو جمہوری نظام کی قومی اسمبلی آئینی حکمران کے لیے آئندہ آئین میں مقرر کرے۔ اگر رائے عامہ کی اکثریت کا فیصلہ ہو کہ آئندہ ریاست جموں وکشمیر کا سرے سے کوئی حکمران ہونا ہی نہیں چاہیے کہ وہ ہر بالغ کے آزادی ووٹ سے ایک آئین ساز جماعت بنا کر اپنی آئندہ قسمت ملک کے اندرونی نظام اور بیرونی تعلقات و تحفظ کا خود فیصلہ کرے اور کشمیر میں ایک آزاد جمہوری حکومت قائم کرے جو اس خطے کو ہندوستان کے دوش بدوش ترقی کے راستے پر ڈال دے۔"

انقلاب کشمیر صفحہ ۱۳۹-۱۴۰

قوت اور انصاف ہمیشہ متصادم رہے ہیں۔ ان کے مابین ٹکراؤ تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ جس کے صفحات انصاف کے خون سے رنگین ہیں۔ وقت نے قوت کا ساتھ دینے میں انصاف کی راہوں کو پامال کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ لیکن انصاف کا ہاتھ جب اپنے حقوق کے لیے قوت سے برسرِ پیکار ہوا تو وقت آپ سے آپ راستہ چھوڑتا چلا گیا۔

انصاف ایک ایسا چراغ ہے جس کی روشنی اندھیرے کے بادلوں کو چیر کر ابھرتی ہے۔ پھر وقت اور قوت دونوں مات کھا جاتے ہیں۔

احرار کی دربارِ کشمیر سے لڑائی انصاف کی لڑائی تھی۔ مگر قوت نے انصاف کو ناانصافی سے مسلح ہو کر دبانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس دھرتی کے سپوت بھی اپنے خلاف فیصلہ دینے میں قوت کے حامی رہے۔ لیکن زمانہ گواہ رہے کہ اس باغ و بہار بستی پر گرا ہوا شہیدوں کا خون ایک دن کیسر کے پھول بن کر ابھرے گا۔

یورپ کے مشہور ادیب روسو کی کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ لیکن یہی کتاب جب دوبارہ طبع ہوئی تو جن لوگوں نے کل مصنف کی ہنسی اڑائی تھی دوسرے ایڈیشن کی جلد باندھنے کے لیے انہی لوگوں کے جسم کا چمڑا استعمال کیا گیا۔ اسی طرح وقت آئے گا کہ مظلوم کشمیریوں کے لیے ۱۹۳۱ء میں بیرونِ کشمیر کے عوام کا خون اس وقت کے کشمیری رہنماؤں سے اپنا انصاف مانگے گا۔

ریاست اور

سال رواں انگریز حکمرانوں کے لیے سیاسی اعتبار سے بے اطمینانی کا سال تھا۔ تیسری گول میز کانفرنس کے اجلاس کی تجویز بھی پروان چڑھتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کانگریس اور مجلس احرار کی الگ الگ تحریکات کے باعث حکومت ہند آتش فشاں کے دھانے پر کھڑی تھی۔ ایسے میں ہندوستان کی ریاستیں ہی انگریزی سامراج

کا آخری سہارا تھیں۔ جن کے رئیس اپنی راج گدیاں قائم رکھنے کے لیے ایوانِ افرنگ کا ستون بنے ہوئے تھے۔ رعایا کا خون نواب اور مہاراجوں کے لیے جشنِ بہاراں فراہم کرتا تھا۔ ہندو ریاستوں میں مسلمان اور مسلم ریاستوں میں ہندو پرجا اپنے انسانی حقوق کی جدوجہد میں اندر ہی اندر آگ کی طرح سلگ رہی تھی۔ لیکن انگریز کے بعد ریاستی حکمران کی دوہری غلامی کے باعث ان کی آواز حلق میں اٹک کر رہ جاتی۔ یوں بھی ریاستوں کا وجود برصغیر کی آزادی کے لیے اسی قدر غیر مفید تھا جس قدر انگریز کا اپنا وجود۔ لیکن ریاستوں کے انتظام میں دخل کون دے؟ جب رعایا ہی ہیں راعی سے ٹکرانے کی ہمت نہ ہو تو بادِ بہاری چمن میں بادِ سموم سے کیوں دست و گریباں ہو؟ مگر سوال راعی اور رعایا کا نہیں انسانی حقوق کا تھا۔ جس کے زخمی ہونے سے انسانیت داغدار ہو رہی تھی۔ ریاستی پرجا کے لیے آزادی کا سانس اسی قدر اہم تھا جس قدر انگریزی عہدِ اقتدار سے باقی ہندوستان کو نجات کی خواہش۔ غلامی کی زنجیر دونوں کے لیے ایک سا وزن رکھتی ہے۔ لیکن ریاستی رعایا کے لیے یہ زنجیر اس قدر بوجھل ہو چکی تھی کہ ان کا ہر اٹھنے والا قدم اسی زنجیر سے ٹکرا کر رہ جاتا تھا۔ محلات کی چار دیواری میں نشاطِ زندگی سے آراستہ والیانِ ریاست کو ناتواں رعایا کا احساس تک نہیں تھا۔ وہ انہی کا کھاتے اور انہی کو گھورتے۔

ریاست الور کی مسلمان رعایا اپنے حکمران سے اپنے جائز حقوق سے محروم تھی۔ سیاسی اور مذہبی پابندیوں نے ریاست کے مسلمان کو ہراساں کیا ہوا تھا۔ ۳۰۔ جون ۱۹۳۲ء کو مہاراجہ نے اعلان کیا۔

۱۔ ریاست کے اندر جو مذہبی جماعتیں قائم ہیں وہ فوراً رجسٹر کرائی جائیں۔

۲۔ ہر جماعت اپنے ممبروں کی فہرست اور اپنے اجلاس و چندے کی فراہمی کے رجسٹر باقاعدہ رکھے۔ تاکہ ریاست کا متعلقہ آفیسر جب چاہے ان رجسٹروں کا معائنہ کر سکے۔

۳۔ ریاست کا کوئی باشندہ برطانوی ہند سے تنخواہ لینے کا مجاز نہ ہوگا۔ مثلاً اگر جمعیتہ مرکزیہ تبلیغ الاسلام (انبالہ) ریاست الور میں اپنا کوئی مبلغ مقرر کرے تو ریاست الور کا کوئی باشندہ اس آسامی کو قبول کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔

۴۔ حکومت الور کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ جس جماعت کے متعلق چاہے رجسٹریشن سے انکار کر دے۔ مثلاً اگر انجمن خادم الاسلام الور رجسٹریشن کے لیے درخواست دے تو مہاراجہ الور کی حکومت بیک قلم اس جماعت کو خلاف قانون قرار دے سکتی ہے۔

۵۔ اس قانون کی خلاف ورزی دست اندازیٔ پولیس ہوگی اور اس کی سزا پانچ سال تک قید بامشقت ہوگی اور مقدمہ بلا ضمانت ہوگا۔ یا دو ہزار روپیہ جرمانہ یا دونوں سزائیں ہو سکتی ہیں۔

ان سرکاری احکام کی زد براہِ راست مسلمانوں پر پڑی تو وہ چیخ اٹھے۔ صحرا بہ صحرا یہ صدا ڈاکٹر غلام بھیک نیرنگ صدر جمعیتہ مرکزیہ تبلیغ الاسلام (انبالہ) نے سنی اور انہوں نے اپنی انجمن کے ذریعے ریاستی مسلمانوں کی دادرسی کی کوشش میں شب و روز دوڑ دھوپ کی لیکن یہ آواز بصد بہ صحرا ثابت ہوئی۔ اسی دوران ۲۔ جولائی کو ریاست میں ایک ہندو کے قتل میں بہت سے مسلمانوں کو سزائے موت کا حکم ہوا تو حالات مزید بگڑ گئے۔ اس پر ۱۱۔ جولائی کو ڈاکٹر سر محمد اقبال نے وائسرائے ہند کو تار دیا۔

"شہر الور میں جگن ناتھ کے میلے پر فساد کا سخت خطرہ ہے اس طرف توجہ فرمائیں"۔

۲۲۔ جولائی ۱۹۳۲ء کو مجلس احرار ہند نے الور کے مسلمانوں کے بگڑتے ہوئے حالات پر اعلان کیا۔

"مسلمانان الور کی بڑھتی ہوئی پریشانی اور مشکلات کے پیش نظر تمام ہندوستان میں یوم الور منایا جائے۔ جلوس نکالے جائیں۔ جلسے کیے جائیں۔ ان جلسوں میں منظور کردہ قراردادوں کی نقلیں مہاراجہ الور۔ وائسرائے ہند اور دفتر مرکزیہ مجلس احرار کو بھیجی جائیں۔

ہندوستان بھر میں یوم الور بڑے جذبات کے ساتھ منایا گیا۔ اس کا یہ تاثر ہوا کہ ریاست الور میں مسلمانوں پر حکومت کا تشدد اور زور پکڑ گیا۔ پولیس کا لاٹھی چارج اور دوسرے جور و ستم کے نتیجے میں سینکڑوں مسلمان زخمی ہوئے اور اکثر کو گرفتار کر لیا

گیا۔ ایسے حالات سے تنگ آتے ہوئے ریاستی مسلمانوں نے ۲۱۔ جولائی کو لیین خاں ایم۔ ایل۔ اے کی سرکردگی میں، ریاست سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ ہزاروں کی تعداد میں الور سے نکل کر دہلی شاہجہان مسجد کے گرد خیمہ زن ہو گئے۔

ریاستی مہاجرین کے لیے مقامی مسلمانوں نے اپنی روائتی مہمان نوازی کا دل کھول کر مظاہرہ کیا اور مہاجرین کو جلاوطنی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔

الور کا مسلمان یا تو زراعت پیشہ تھا کہ سال بھر ہل جوت کر جو کچھ پیدا کرتا ریاست مختلف طریقوں سے لوٹ لیتی۔ ریاستی مسلمان سرکاری ملازمت سے محروم تھا۔ لیکن اگر کہیں داؤ چل جاتا تو نچلی سطح پر ملازمت کے سوا کوئی جگہ نہ ملتی۔ اس پر غیر مسلم مہاجنوں کا سود ان کی زندگی اجیرن کر دیتا۔ تعلیمی درسگاہ کے دروازے ان پر ہمیشہ بند رہے۔ اس پر ان کی غربت ان کے آڑے آتی۔ ریاست کا میواتی مسلمان، ریاست کے مسلمان امرا سے پریشان تھا۔ ان کا وجود ریاست کے غریب مسلمان کے لیے صفر کے برابر تھا۔ اپنوں اور پرایوں سے تنگ آیا ہوا مجبور مسلمان گھر کی آسائش چھوڑ کر ہجرت پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہونے والا راجہ پینسٹھ فیصد مسلمان رعایا کے دکھ درد سے ناآشنا رہ کر محفل ناؤ نوش میں ایسا کھویا کہ مسلمان کی بغاوت کا اسے احساس تک نہ ہوا۔

مہاراجہ الور بظاہر جواں سال، خوبصورت اور دل آویز تھا۔ لیکن مردانہ اوصاف سے محرومی کے باعث تسکین نفس کے لیے ہر رات ہفتہ میں ایک دن محفل نشاط جمتا۔ جس میں ریاستی اہلکار بمعہ اپنی بیویوں کے شریک ہوتے۔ کچھ دیر تو ساغر و مینا ٹکراتے، پھر یہی محفل غرق مے ناب ہو کر رہ جاتی۔ سرخ بتیاں گل کر دی جاتیں اور سبز بتیوں کی روشنی میں گناہوں کی ایسی فلم چلتی کہ رات کے ستارے حیا سے اپنا منہ چھپا لیتے۔ اس طرح راجہ اپنے ذوق مردانہ کو تسکین بخشتا۔

حسن کی بے چارگی ہوس کے ہاتھوں اپنی بے بسی کا اس طرح ماتم کرتی کہ راج محل کی اونچی دیواریں بھی سرنگوں ہو جاتیں۔ رات بھر راجہ، پرجا کی بہو بیٹیوں کا تماشہ دیکھ کر مسکراتا اور صبح سویرے نہائے ہوئے موسم کی طرح انصاف کے راج سنگھاسن پر براجمان ہو کر مسلمان

رعایا کے بے گناہ خون کی سرخی سے آئندہ محفل کا اہتمام کرتا۔

الور کے دکھی اور بے گھر مسلمان ڈاکٹر غلام بھیک نیرنگ کے حوصلے پر گھروں سے نکلے تھے۔ نیز انہیں جمعیتہ علمائے ہند پر بھی بھروسہ تھا کہ علماء کی یہ جماعت ان کی شریک غم ہوگی لیکن مہاجرین الور کا یہ گمان چند دنوں کے بعد ختم ہوگیا۔

جمعیتہ علمائے ہند کے نزدیک مہاراجہ الور نیشلسٹ ذہن رکھتا تھا اور انڈین نیشنل کانگریس سے اس کی خاصی بن آئی تھی۔

ان روشنیوں سے مایوسی کے سائے بڑھے۔ تو مہاجرین الور نے لاہور پہنچ کر مجلس احرار کے ڈکٹیٹر مولانا معین الدین اجمیری سے ملاقات کی۔ اپنی بے بسی کا رونا رویا۔ اپنے زخموں کیلئے مرہم اور درد کا مداوا چاہا۔

مجلس احرار کا وفد آخر ۲۹۔ جولائی ۱۹۳۲ء کو مولانا معین الدین اجمیری کے حکم پر مہاجرین الور کی امداد کے لیے مجلس احرار کا ایک وفد جس میں مولینا عبدالغفار غزنوی محمد اشرف عطا اور راقم (جانباز مرزا) شامل تھے، دہلی پہنچا۔ حالات کی جانچ پڑتال کے بعد وفد نے اپنا کام شروع کیا۔ جمعیتہ علمائے ہند کے رہنماؤں نے احرار وفد سے تعاون میں پہلوتہی کی تو احرار کا وفد دہلی میں غریب الدیار ہو کر رہ گیا۔

شاہجہان کی مسجد دونوں جماعتوں کا سیاسی اکھاڑہ بن گئی۔ آخر تھوڑی سی ردوکد کے بعد مسجد کے بڑے منبر پر مجلس احرار کا سرخ پرچم لہرانے لگا۔ سیاسی تاریخ کا یہی موڑ ہے جہاں پہنچ کر مجلس احرار اور جمعیتہ علمائے ہند کے درمیان سیاسی کشمکش نے جنم لیا۔ سیاسی عقیدوں میں ہم آہنگی کے باوجود دونوں جماعتیں ایک دوسرے کی حریف بن گئیں جمعیتہ علمائے ہند کے دو گروہ بن گئے۔ ایک طرف مولانا مفتی کفایت اللہ، شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا احمد سعید تھے جبکہ دوسری طرف مولانا محمد نعیم لدھیانوی، مولانا گل بادشاہ پشاوری، مولانا بشیر احمد بھٹہ شامل تھے۔ اول الذکر گروہ مجلس احرار کا ہمیشہ معاون رہا۔ ثانوی گروہ اصولی طور پر مجلس احرار کا مخالف نہیں تھا لیکن بعض جگہ یہ اختلاف خانگی نوعیت کا تھا۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا محمد نعیم کے حقیقی بھتیجے تھے۔ مولانا محمد نعیم کو یہ کد رہا کہ چچا کو نظر انداز کر کے

بھتیجے کو مجلس احرار کی صدارت کا اعزاز کیوں دیا گیا؟ اسی طرح شمال مغربی صوبہ سرحد میں علماء کی باہمی رقابت بھی مجلس احرار کی دشمنی کا سبب بنی۔ جیسے کہ مجلس احرار نے مولانا گل بادشاہ کی موجودگی اور شہرت کو نظر انداز کر کے مفتئ سرحد مولانا عبدالقیوم پوپلزئی کو احرار ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔ بھارت کے صوبہ یوپی میں مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری کی احرار میں شمولیت نے مولانا بشیر احمد بھٹہ کو احرار کا مخالف بنا دیا۔

آخر دہلی میں احرار کارکنوں نے مہاجرین الور کے لیے اس قدر محنت اور دھوڑ دھوپ کی کہ جمعیۃ علمائے ہند بھی احرار کی ہمنوا ہو کر ان کے اجتماعات میں شامل ہونے لگی۔ اس سے تحریک الور میں قدرے نئی روح پیدا ہو گئی۔

وزیر اعظم الور کے نام

احرار کے تحریک الور کو سنبھالا دینے کے بعد حالات نے نئی کروٹ لی دہلی سے نکل کر یہ تحریک ہندوستان گیر بننے لگی۔ کشمیر اور کپورتھلہ کے بعد ریاست الور کے مسلمانوں کی امداد کے لیے احرار کا فیصلہ مشکل ترین قدم تھا جبکہ ہندوستان کے افق پر سیاسی بادل بڑی تیزی سے گھیرا ڈکر رہے تھے۔ خصوصاً تیسری گول میز کانفرنس میں ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے مابین فرقہ وارانہ کشمکش بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ ایسے میں محض ریاستی معاملات پر ساری توجہ مرکوز کر دینا کوئی دانشمندی نہیں تھی۔ مگر ملت اسلامیہ کے غم میں شرکت سے اعتراض بھی کوئی کارِ خیر نہیں تھا۔ پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں اس تحریک میں احرار کے ہمنوا تھے۔ اس بنا پر اخبار زمیندار کی پالیسی نے نیا روپ دھار لیا۔

انہی دنوں مجلس احرار نے مہاراجہ الور کو برقی پیغام کے ذریعے ریاست کے حالات درست کرنے اور تحقیقات کے لیے ریاست میں احرار کا ایک وفد بھیجنے کی اجازت چاہی۔

یکم اگست ۱۹۳۲ء کو وزیر اعظم نے اس تار کے جواب میں کہا۔

"آپ نے سٹیٹ سیکرٹری کے نام جو تار ارسال کیا ہے اس کے حوالے سے آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ تحقیقات کے لیے احرار کے وفد کو ریاست الور میں آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ بیرون ریاست سے بعض خود غرضوں نے جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں۔ ان میں کوئی صداقت نہیں اور ان تمام غلط

اطلاعات کی تردید بھی ہو چکی ہے۔ یہاں حالات حسب معمول پر امن ہیں۔

مولانا شوکت علی کا خط

وزیر اعظم کے برقی پیغام نے مہاجرین الور کو یقین کی بجائے اور مشتعل کر دیا۔ حالات میں صلح ہونے کی بجائے تصادم کے امکان بڑھنے لگے۔ مجلس احرار نے غیر آئینی اقدام کرنے سے باہم گفتگو کو بہتر جانا کیونکہ عملی اقدام کیلئے جمعیۃ علمائے ہند تیار نہیں تھی۔ اور دونوں جماعتوں کے موقف میں بعد کے باعث اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا نظر نہیں آتا تھا۔ عین اسی موقع پر مولانا شوکت علی کا ایک خط جو انہوں نے مولانا غلام بھیک نیرنگ کے نام بھیجا۔ جسے ۱۲۔ اگست ۱۹۳۲ء کے روزنامہ انقلاب نے شائع کیا اس کی عبارت حسب ذیل ہے۔

برادرم مولانا غلام بھیک صاحب

"السلام علیکم۔ میری درخواست ہے کہ چونکہ مہاراجہ الور مولانا محمد علی جوہر کے ذاتی دوست تھے۔ اور وہ ان کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔ نیز میرے بھی ان سے مراسم ہیں۔ لہٰذا جہاں تک ہو سکے الور کے خلاف تحریک کو ختم کر دیا جائے"

آپ کا۔ شوکت علی۔

مسجد شاہجہان میں داخلے پر پابندی

مولانا شوکت علی کا یہ خط حالات کے بگاڑنے میں ایسا معاون ہوا کہ جمعیۃ علمائے ہند کے بڑھتے ہوئے قدم بھی ٹھٹھک کر رہ گئے اور ساتھ ہی مسجد شاہجہان کے امام نے حسب ذیل تحریری نوٹس مسجد کے ہر سہ دروازوں پر آویزاں کر دیا۔

"۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے اس مسجد پر قبضہ کیا تھا۔ اور ۱۸۶۲ء میں اسی معاہدے کے تحت یہ مسجد (شاہجہان) مسلمانوں کو واپس کی گئی تھی کہ اس میں حکومت برطانیہ کے خلاف کوئی بات نہ کہی جائے اور نہ ہی اس کے فوائد پر کسی قسم کی ضرب لگانے کی سازش یہاں بیٹھ کر کی جائے"

یہ سارے واقعات اس تیزی سے ظہور میں آئے کہ مہاجرین الور اور ان کی معاون جماعت احرار کے لیے سوائے لڑائی کے دوسرا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ یکایک

۱۸۔ اگست کو مہاراجہ الور نے اپنے جنم دن پر ایک سپاسنامے کے جواب میں کہا۔

"پٹواری اہلکاروں کے ذریعہ جو روپیہ بطور مالیہ حکومت کسانوں سے وصول کرتی ہے۔ وہ امسال معاف کر دیا گیا ہے اور آئندہ بھی وصول نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ ریاست میں مذہبی تعلیم کا انتظام چھ ماہ کے اندر اندر کر دیا جائے گا۔ اور اس کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں کے سپرد ہوگی۔

۳۔ وہ مسلمان جو تحریک کے دنوں ریاست سے ہجرت کر گئے تھے انہیں تمام معافی دی جاتی ہے۔ وہ بلا تکلف اپنے گھروں کو واپس آ سکتے ہیں۔

مہاراجہ الور کے اس اعلان کے باوجود الور کے مہاجرین نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔

مہاراجہ کو گدی سے اتار دیا گیا ہندوستان کے سیاسی حالات میں کسی وقت بھی تغیر پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا اس لیے انگریز ریاستی معاملات کو بہرحال سمیٹنا چاہتا تھا۔ چنانچہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ سے مراسلات کی باقاعدگی کے بعد ایک ایجنٹ مقرر کر دیا گیا۔ اور مہاراجہ یورپ چلا گیا۔ اور وہیں اس کی موت واقع ہوئی۔

کمیونل ایوارڈ متحدہ عرب جمہوریہ کے سابق صدر جمال عبد الناصر رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ۔

"اگر سمندر کی تہہ میں دو مچھلیاں لڑ رہی ہوں تو سمجھو کہ ان کے لڑانے میں بھی انگریز کا ہاتھ ہے۔"

اقتدار ایک ایسا سنہری جال ہے کہ انسانی ہوس اس میں الجھ جائے تو رہائی کو جی نہیں چاہتا۔ اس جال کی ایک ایک تار کو انسانی خون کا مانجھ دے کر زندگی کھینچنے کے لیے اقتدار عجیب وغریب حرکتیں کرتا ہے۔ کشمکش حیات کا بھی یہ ایک دلچسپ پہلو ہے کہ انسان جب اس پگڈنڈی سے گزرتا ہے تو نہ جانے کس قدر جانیں تلف ہو جاتی ہیں اور جب یہ سورج غروب ہوتا ہے تو شام کے اندھیروں میں ابھرنے والی شفق انسانی ظلم وجور کا سارا نقشہ لکیر دیتی ہیں۔ اور خونِ ناحق کے بکھرے ہوئے چھینٹے ستاروں میں جذب ہو کر اقتدار کے دامن پر ایسے داغ چھوڑ جاتے ہیں کہ تاریخ قیامت تک اس کے ماتم سے

فارغ نہیں ہوتی۔ اور اگر اقتدار غیر ملکی ہو تو غلامی کی کڑیاں ایسی مربوط ہو جاتی ہیں کہ رعایا کے جائز مطالبات بھی بغاوت کہلاتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی سیاستدانوں نے برصغیر کی دو اکثریتی قوموں کے مابین جنہوں نے برطانوی اقتدار کی ابتدائی بنیادوں کے خلاف اس جہاد میں حصہ لیا تھا، منافرت کی ایسی تخم ریزی کی کہ یہ پودا جوان ہو کر اپنے برگ و بار بکھیرنے لگا۔ ہمسایہ ہمسائے کے۔ بھائی بھائی کے آمنے سامنے آکھڑا ہوا۔ اور دوسری طرف ہندو اور مسلمانوں کے درمیان سے منتخب لوگوں نے یونین جیک کی اڑانوں کو دامنِ دل سے ہوائیں دینا شروع کیں۔ جس نے ہندوستان کی آزاد فضاؤں کو محیط کر لیا۔ فرنگی حکمرانوں کا یہ فتنہ برصغیر کی فضاؤں میں ایسا تحلیل ہوا کہ یہ زہر دلوں میں اتر کر دماغوں میں راسخ ہو گیا۔ اور پھر جب کبھی غلام اپنی آزادی کے لیے نکلے تو یہی طبقہ پہاڑ بن کر راستے کی روک بن گیا۔

دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد آل انڈیا نیشنل کانگریس کے نمائندے پنڈت مدن موہن مالوی نے برطانوی وزیر اعظم مسٹر رمزے میکڈانلڈ کو ایک خط کے ذریعے یہ پوزیشن دے دی کہ وہ ہندو مسلم فیصلے کا حل خود ہی کر دیں۔ اگرچہ اس خط پر گاندھی جی کو بھی دستخط کرنے کو کہا گیا لیکن انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔

یہ انہی برگ و بار کا اثر تھا کہ ایوان برطانیہ میں بیٹھے ہوئے ہندو مسلمان فرنگی اثرات سے ماوراء نہ ہو سکے۔ آخر وزیر اعظم برطانیہ کو کہنا پڑا۔

"اگر ہندوستان کی تمام پارٹیاں مل کر کوئی متفقہ لائحہ عمل پیش کر سکتیں تو حکومت برطانیہ ہندوستان کو مراعات دینے پر مجبور ہو جاتی۔ مگر اب وہ خود کوئی عارضی سکیم بنائے گی۔ لیکن ہندوستان کی ترقی کو پسپا نہیں ہونے دے گی۔ وہ لوگ جو آئے دن انگریزوں کو ہندوستان کی ترقی اور مفاہمت میں حارج سمجھتے رہے وہ خود اپنے اعمال و افعال کا صحیح اندازہ لگانے سے قاصر ہیں۔ یہاں مجھے مولانا محمد علی کا وہ فقرہ یاد آتا ہے کہ "ہندوستان میں ہم (ہندو مسلمان) تقسیم ہوتے ہیں اور آپ (انگریز) حکومت کرتے ہیں۔

حالانکہ حالات گواہ ہیں کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی ناکامی کی تمام تر ذمہ داری ہندوستان کے زعماء پر ہے۔

سمجھدار قومیں کس خوبصورتی سے پرائی آگ سے اپنا دامن سنبھالتی ہیں۔ حالانکہ یہ آگ خود ان کی لگائی ہوئی تھی۔ مگر واقعات کے ایسے سانچے ڈھالے کہ سانپ بھی مرگیا اور لاٹھی بھی بچ رہی۔

وزیر اعظم برطانیہ کا اعلان ۱۴۔ اگست ۱۹۳۲ء کو وزیر اعظم برطانیہ نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہوئے اعلان کیا۔

"حکومت کے فیصلے کا درست ادراک کرنے کیلئے اُن اصلی حالات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے جن میں یہ فیصلہ صادر کیا جا رہا ہے۔

گزشتہ بہت سالوں سے اقلیت کے فرقوں نے جداگانہ انتخاب کو اپنے حقوق و تحفظ کے لیے ضروری خیال کیا ہے اس لیے زمانہ حال کے آئینی استدراج کی ہر منزل میں جداگانہ انتخاب کو جگہ میسر آ رہی ہے۔ گو حکومت مخلوط انتخاب کے یکساں سلسلے کو کتنی ہی ترجیح کیوں نہ دیتی ہو۔ اس نے ان تحفظات کو منسوخ کرنا ناممکن پایا۔ جن کو اقلیتیں ابھی تک بہت اہم سمجھتی ہیں۔ ان وجوہات پر بحث کرنا عبث ہے۔ جن کی بدولت موجودہ حالات پیدا ہوئے۔ لیکن بڑی اور چھوٹی قوموں کو امن اور محبت سے تعاون کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تاکہ تحفظ کی خاص خاص صورتوں کی مزید ضرورت نہ رہے مگر اس اثناء میں حکومت کے لیے لازمی ہے کہ واقعات کو ان کے اصل رنگ میں دیکھے اور نمائندگی کے اس خاص طریقے کو جاری رکھے۔

چونکہ یہ فیصلہ جداگانہ طریق انتخاب کی بنیاد پر تھا۔ اس رو سے پنجاب میں مسلمانوں کو ایک سو پچھتر نشستوں میں سے چوراسی جداگانہ انتخاب سے دی گئیں۔ پانچ نشستیں بڑے زمینداروں کے لیے اور تین مزدوروں کے لیے مخلوط انتخاب سے پر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ زمینداروں کی پانچ نشستوں میں سے تین مسلمانوں کو ملنے کی امید تھی۔ اور اس طرح

مزدوروں کی تین نشستوں میں دو مسلمانوں کو ملتیں۔ یوں مسلمانوں کو کل اناوے نشستیں تو بہرحال حاصل ہو ہی جاتیں۔ ممکن ہے زور پڑتا تو ایک آدھ اور مل جاتی۔ اس نتیجے سے مسلمانوں کو پنجاب میں اکثریت کا وہ حق تو ملتا تھا۔ مگر عملاً اسمبلی کے ایوان میں صرف دو ووٹوں کی اکثریت ہوتی۔

بنگال بنگال میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب سے ایک سو انیس نشستیں ہاتھ آئیں۔ بڑے زمینداروں کے لیے پانچ اور مزدوروں کے لیے آٹھ نشستیں مخلوط انتخابات سے مقرر کی گئیں۔ جن میں کچھ نہ کچھ نشستیں مسلمانوں کو ملنے کی امید ہو سکتی تھی۔ خواہ وہ ان میں سے چھ یا سات نہ بھی حاصل کر سکیں۔ مگر حکومت نے ہندوؤں اور اچھوتوں کے لیے اسی نشستیں مخصوص کیں۔ ہندوستانی عیسائیوں کے لیے دو، اینگلو انڈین کے لیے چار اور یورپینوں کے لیے گیارہ۔ نیز ان کے علاوہ مخلوط انتخاب سے انیس نشستیں تاجروں کے لیے مخصوص کی گئیں۔ جن میں سے چودہ نشستیں یورپینوں کے قبضے میں آنے والی تھیں۔ اسی طرح یورپین پچیس نشستیں حاصل کرتے اور ان کے علاوہ چار اینگلو انڈین دو ہندوستانی بھی انہی کے ہمنوا ہوتے۔ ہندوستانی عیسائی اور اینگلو انڈین جو چاہیں کریں۔ مگر پچیس یورپین بذات خود وہ پاسنگ قائم کر سکتے تھے جو بنگال میں صوبجاتی وزارت کو برسر اقتدار رکھنے یا نہ رکھنے میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان قطعی فیصلہ کر سکیں۔ یعنی اگر یورپین ارکان مسلمانوں کے ساتھ ہوں تو مسلمان اپنی مرضی کے مطابق حکومت بنا سکیں اور وہ غیر مسلموں کا ساتھ دیں تو اپنی ترکیب سے صوبے کا نظام بنا سکیں۔

بہرحال جو صورت بھی ہو جب تک ہندو اور مسلمان باہم متفق و متحد نہ ہوں حکومت خود اختیاری کی باگ ڈور یورپینوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس طرح چاہیں اس کو پھرائیں۔

اپنا اپنا راگ اس برطانوی فیصلے کی آگ ہنوز روشن نہیں ہوئی تھی کہ اس کی چنگاریاں پیشتر ہی ہندوستان کے خرمن امن کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔

مسلم کانفرنس ۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس نے ایک قرارداد میں کہا کہ۔ " ہرگاہ مسلم قوم گزشتہ دو گول میز کانفرنسوں کی کارروائی سے خوش نہیں ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے وہ مطالبات جو یکم جنوری ۱۹۲۹ء اور ۵ جولائی ۱۹۳۱ء تک مختلف اجلاسات میں مرتب کیے گئے۔ منظور نہیں کیے گئے۔

ہر گاہ کہ اس کانفرنس میں رائے عامہ یہی ہے کہ چونکہ اس کی تعاونی حکمتِ عملی تاحال تسلی بخش نتائج پیدا نہیں کر سکی اس لیے یہ کانفرنس فیصلہ کرتی ہے کہ اب مسلمانوں کے لیے گول میز کانفرنس اور اس کی ماتحت کمیٹیوں سے تعاون کرنا خارج از امکان ہے۔ جو آئین حکومت مرتب کر رہی ہے اس سے تعاون اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ فیصلہ نہ کیا جائے کہ مسلمانوں کے مطالبات اس آئین میں شامل کیے جائیں گے۔

اس قرارداد کی تائید میں ۵۔ جون ۱۹۳۲ء کو سر آغا خان کی رہنمائی میں مسلمانوں نے اس دلیل کے ساتھ ایک اور بیان دیا۔

۱۔ ہندوستانی فوج میں مسلمان سپاہیوں کی تعداد مسلمان آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ جنگ عظیم میں مسلمانوں نے شہنشاہ معظم کی بھرتی کی دعوت کا شاندار جواب دیا اور مسلمان سپاہی بڑی مصیبتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جرمن دشمنوں کے علاوہ اپنے ہم مذہبوں سے بھی لڑتے رہے۔ جن کے ساتھ ان کو یگانگت تھی۔

انگریزوں نے اکثر دفعہ کہا ہے کہ جنگ عظیم میں پنجاب کا اتنا خون بہا کہ وہ سفید ہو گیا۔ اور پنجاب کی فوج میں غالب اکثریت مسلمان تھی۔ اسی طرح صوبہ سرحد اسرحدات ہند اور بلوچستان کی پولیس ملیشیا اور فرنٹیئر کانسٹیبلری کی نمایاں اکثریت مسلمان ہے۔ جسے ہمیشہ اپنے ہی عزیز و اقارب سے جنگ کرنا پڑی ہے۔

۲۔ مسلمانوں نے کانگریس کی ۱۹۳۰ء کی تحریک میں بہت کم حصہ لیا۔ سوائے صوبہ سرحد کے جہاں کہ سرخ پوشوں نے دھوکے میں آکر کانگریس کے جھنڈے کو قبول کیا اور وہ تحریک جاری کی جس کا کانگریس سے تعلق نہ تھا مگر جس میں اب انصاف کو کانگریس کی سازش پر فتح نصیب ہو چکی ہے۔ کانگریس کی موجودہ مہم میں مسلمان ایک سے زائد مواقع پر بغاوت پسندوں کے خلاف عداوت

کا اظہار کر چکے ہیں اور پہلے سے بہت کم مسلمان ظاہرا طور پر کانگریس کا ساتھ دے رہے ہیں۔

محض اس بنا پر حقوق طلب کرنا شاید نامناسب معلوم ہو لیکن ہم اپنی طرف سے واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمان کانگریس کی سیاست سے اس لیے علیحدہ نہیں رہا کہ اس سے ان کو فائدہ حاصل ہوگا۔ لیکن تلخ تجربہ ہمیں اس کے خلاف سبق دیتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر اس لیے کہ انہیں موجودہ نظام حکومت کی بجائے ہندو کانگریس کی مطلق العنانی قائم ہونے سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا اور انہیں یقین ہے کہ کانگریس کی سیاست ہندو اور مسلمانوں کے لیے یکساں اقتصادی کی تباہی کا باعث ہوگی۔

۴۔ گورنروں کے صوبوں میں گزشتہ دو سال میں یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ میں جو سیاسی قتل ہوئے ہیں۔ ان میں کوئی بھی کسی مسلمان نے نہیں کیا۔ لاہور میں مسٹر سانڈرس اور چنن سنگھ کے تینوں قاتل ہندو تھے۔ مسٹر لومین۔ کرنل سمپسن مسٹر گارگ۔ مسٹر سٹوونز۔ مسٹر پیڈی اور مسٹر ڈگلس کے قاتل بھی ہندو ہی تھے۔ اسی طرح پنجاب، بمبئی اور بنگال کے گورنروں پر مسٹر ویلٹرز۔ مسٹر کاسلز اور چارلس ڈگارٹ پر حملہ کرنے والے بھی ہندو ہی تھے۔ لارڈ ارون کی جان پر بھی حملہ کرنے کے سلسلے میں مسٹر پیڈی کے قتل اور بے شمار جرائم میں سب کے سب مشتبہ لوگ ہندو تھے۔ چاٹگام میں اسلحہ خانہ پر حملہ کرنے والے اور خان بہادر امان اللہ کے قاتل بھی ہندو تھے۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۷ء کی سیاسی تحریک اور جرائم کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی جبکہ مسلمانوں کے جذبات ایک سے زائد مرتبہ انگریزوں کے خلاف بھڑکائے گئے تھے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب ایک تیس کا تھا۔ ہمیں یہ بھی یاد نہیں پڑتا کہ مسلمان اخبار نے بھی گزشتہ دو برس میں کسی سیاسی قاتل کے ساتھ ہمدردی کا ایک لفظ بھی کہا ہو۔ حالانکہ ہندو

کانگریسی اخباروں نے کئی مہینوں تک ایسے سیاسی مجرموں کی قصیدہ خوانی کی۔

قوم پرور مسلمانوں کا اعلان | قوم پرور مسلمانوں نے جن کی رہنمائی شوکت اللہ انصاری کر رہے تھے مندرجہ بالا اعلانات کے جواب میں ایک اعلان شائع کیا۔ جس میں ان کے مقابل اپنا نقطہ نگاہ تفصیل سے پیش کیا۔ اس میں صوبہ سرحد اور دوسرے علاقے کے مسلمانوں کی تحریک آزادی میں قربانیوں کا ذکر کیا گیا اور انہیں خوب سراہا گیا۔ ہندوستان کے آئینی مسائل کا ذکر بھی کیا گیا

"باہمی گالی گلوچ کا ارزاں سبب یہ ہے۔ کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل نہیں ہوا۔ لیکن ہم ان لوگوں کو مطلع کرتے ہیں جنہیں اب تک علم نہیں کہ جمعیتہ علمائے ہند اور مسلم نیشلسٹوں نے اور کانگریس نے چند فارمولے تیار کیے تھے۔ جن کو اگر باہم ربط دیا جاتا تو مختلف فرقوں کے درمیان مفاہمت ہو جاتی لیکن اس سے پہلے یکایک گاندھی جی کو لندن جانا پڑا اور ان کے آنے کے فوراً بعد دوسرے آزاد خیال رہنماؤں کو جیل جانا پڑا۔

سکھوں کے مطالبات | مسلم رہنماؤں کے بعد خالصہ جی بھلا کیوں چپ رہتے چنانچہ ۲۵- مارچ ۱۹۳۲ء کو وہ بھی کہہ اٹھے۔

۱- پنجاب میں سکھ قوم اپنی تاریخی سیاسی اور اقتصادی اہمیت کے پیش نظر مطالبہ کرتی ہے کہ پنجاب کی مجلس قانون ساز اور ملازمتوں میں ان کو تیس فیصد نمائندگی دی جائے۔ جیسے کہ مسلمانوں کو دوسرے صوبوں میں دی جا رہی ہے۔

۲- سکھوں کو مرکز میں پانچ فیصد نمائندگی دی جائے۔

۳- پنجاب کی وزارت میں سکھوں کو ایک تہائی حصہ دیا جائے۔ اگر کوئی فرقہ وارانہ سمجھوتہ نہ ہو سکے تو پنجاب کی نئی ذمہ دار مرکزی حکومت اپنے دائرہ انتظام میں لے لے۔

پنجاب میں مختلف جگہوں پر خاص کر لاہور میں سکھ پولیٹیکل کانفرنس کے اجلاس کر

کے سکھوں کی مختلف پارٹیوں نے حلف لیے کہ سکھ پنجاب میں مسلم اکثریت دوسرے لفظوں میں مسلم راج کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔

ہندو

یکم اپریل ۱۹۳۲ء کو مسٹر کھابرڈے، مسٹر جگدیش چندر بینرجی، رائے بہادر رام سہائس اور اسی قسم کے دوسرے ہندو لیڈروں نے جو مرکزی اسمبلی اور کونسل کے رکن تھے۔ مسلم کانفرنس کے مطالبات کی مخالفت میں ایک اعلان جاری کیا جس میں مخلوط انتخاب پر زور دیا گیا کہ ہندو اور سکھ ہمیشہ مخلوط انتخاب کی تائید کرتے آئے ہیں اور مخلوط انتخاب کے بغیر جمہوریت قائم نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے ایک قرارداد کے ذریعے حکومت برطانیہ سے کہا۔

"اگر حکومت نے مسلمانوں کے مطالبات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہندوؤں کے حقوق سلب کر رہی ہے اور اس حالت میں تمام ہندو اور سکھ قوم سخت ترین مزاحمت کریں گے۔"

اسی طرح بنگال کی ہندو سبھا نے بنگال کے متعلق مسلم مطالبات کی تردید کی۔ انہوں نے اور باتوں کے علاوہ کہا۔

۱۔ بنگال کے مسلمانوں نے اور صوبوں کے مسلمانوں کی طرح کبھی فوج میں بھرتی نہیں دی۔

۲۔ ہندو قوم جو تعلیم کی فراوانی، سیاسی قابلیت، شہری اور سیاسی اداروں کی ترقی اور ہر شعبہ میں حکومت کی ہمیشہ خدمت کرتے چلے آئے ہیں۔ مسلمانوں سے فائق ہے۔ اور خوب کارہائے نمایاں دکھا چکی ہے۔

۳۔ ادب اسائنس اور فنونِ لطیفہ میں بنگالی ہندو سارے ہندوستان سے بڑھکر ہیں۔ اور بنگال کے مسلمان ہنوز ایک ایسا شخص بھی پیدا نہیں کر سکے جو سارے ہندوستان میں شہرت رکھتا ہو۔

۴۔ آبادی کے لحاظ سے ان کا زیادہ حصہ مانگنا بھی فضول ہے۔ کیونکہ اول تو بنگالی بولنے والے کئی ضلعے دوسرے صوبوں میں شامل ہیں۔ جن میں ہندو آبادی کی اکثریت ہے۔ دوسرے بنگال میں مسلم اکثریت بھی نام نہاد ہے۔ کیونکہ یہ اکثریت

نابالغ بچوں اور پردہ نشین عورتوں پر مشتمل ہے۔ جو پردہ میں رہنے کے باعث قومی زندگی میں کوئی حصہ نہیں لیتیں۔ جہاں تک بالغ آبادی کا تعلق ہے ہندو اکثریت میں ہے۔

۵۔ وہی تناسب جو لکھنو کے میثاق میں قائم کیا گیا تھا۔ اب بھی قائم رہنا چاہیے۔ یعنی مسلمانوں کو چالیس فیصد نشستیں ملنی چاہیں۔

آل انڈیا ہندو مہاسبھا

مئی ۱۹۳۲ء کے دوسرے ہفتے کے شروع میں ہندو نوجوانوں کی کراچی میں کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ اس کے صدر بھائی پرمانند نے مسلم کانفرنس کے مطالبات کے خلاف بہت کچھ کہا۔ اس کانفرنس میں زیادہ توجہ سندھ کی علیحدگی کے مسئلے پر دی گئی۔ چنانچہ ایک قرارداد میں اور باتوں کے علاوہ کہا گیا کہ

"حکومت نے یہ اعلان کرنے میں غلطی کی ہے کہ اگر سندھ کے صوبے کی مالیات کا بندوبست تسلی بخش ہو گیا تو صوبے کو علیحدہ حیثیت دے دی جائے گی اور حکومت کو یاد دلایا گیا کہ مندرجہ بالا اعلان اس قرارداد سے تجاوز کرتا ہے جو گول میز کانفرنس میں منظور کی گئی تھی۔ کیونکہ سندھ کمیٹی کے چیرمین نے تو کہا تھا کہ اگر سندھ اپنا خرچ خود برداشت نہ کر سکا تو علیحدگی نہ ہوگی۔"

سکھوں کی ہنگامہ آرائی

برطانوی وزیر اعظم کے اعلان سے پیشتر ہی پنجاب کے سکھوں نے ہندوؤں کے کہنے پر برطانوی فیصلے پر غصہ کھا کر مسلمانوں کو خون کی ندیاں بہانے کی دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ اور سارے پنجاب کا امن گدلا کر دیا۔ پنجاب کا ہندو پریس بھی سکھوں سے ہم آہنگ ہو کر سکھ رہنماؤں کے ساتھ حرکت کرنے لگا اور دونوں کے بازو ایک ساتھ فضا میں لہرانے لگے۔ حالانکہ یہ لڑائی انہیں برطانوی وزیر اعظم کے خلاف لڑنی چاہیے تھی لیکن گری گدھے سے اور غصہ کمہار پر۔

ناراضگی حکومت سے اور خون کی ندیاں بہانے کی دھمکیاں مسلمانوں کو۔ انہی مسلسل اشتعال انگیز دھمکیوں سے تنگ آ کر مجلس احرار نے ۲۸۔ جولائی ۱۹۳۲ء کو حسب ذیل بیان پریس کو دیا۔

"مجلس احرار اسلام ہند سکھوں کی موجودہ ایجی ٹیشن کو بغور دیکھ رہی ہے اور اس بے سمجھ اور بے فکر طبقے کے حالات کو بغور جانچ رہی ہے۔ ان کے دھمکی آمیز اعلان پڑھ کر ان کی سمجھ اور عقل کا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

سکھ اگر موجودہ حالات میں بھی جبکہ اصلاحات کا جدید دور شروع ہونے والا ہے۔ اغیار کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے رہے تو ہندوستان کے لیے اس سے بڑھ کر بدبختی کی اور کوئی ساعت نہیں ہوسکتی۔ ہمیں اس امر کا یقین ہے کہ سکھ اس وقت ایک خودغرض اور وطن دشمن عناصر کے ہاتھ کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ ہم سکھوں کو بروقت متنبّہ کرتے ہیں کہ وہ ایسے وطن دشمن عناصر کے ہاتھ نہ کھیلیں جو اپنا مطلب نکال کر سکھوں کو بے نیل و مرام چھوڑ دے گا جیسے کہ ان کی فطرت ہے۔ باقی رہا مسلمانوں کی اکثریت کا معاملہ تو اس کے لیے ہم ببانگ دہل اور بلاخوف و خطر اعلان کرتے ہیں کہ مسلمان اپنی اکثریت کو کسی تحریک سے متاثر ہو کر ہرگز چھوڑ نہیں سکتا۔ اور اکاون یا باون فی صدی پر وہ ہرگز ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتا اس لیے وہ نہ تو کسی کا حق چھیننا چاہتا ہے اور نہ اپنا حق غصب کرانے کے لیے تیار ہے۔

پنجاب اور بنگال میں اپنے جائز حق اکثریت سے دست بردار نہیں ہو سکتا خواہ اس کے لیے اسے کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

باقی رہا خون کی ندیاں بہانا اور اس قسم کی دوسری گیدڑ بھبکیوں کا سوال تو وہ ان سے بھی قطعاً خائف نہیں، کیونکہ وہ مرنا جانتا ہے۔ ہم اس امر کا اعلان واضح الفاظ میں کرتے ہیں کہ مسلمان باوجود اپنی اکثریت کے وطن دوستی اور رواداری کے اصول کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا۔ نیز حکومت کو بھی متنبہ کرتے ہیں کہ اگر اس نے ہماری اکثریت کو کسی قسم کا بھی نقصان پہنچایا تو اس امر کا اعلان کھلے الفاظ میں کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم آئندہ دستور اساسی کو ہرگز کامیاب نہ ہونے دیں گے۔ بلکہ اسے ہر لحاظ سے ناممکن العمل بنا دیں گے۔"

یوم پنجاب جیسے جیسے دن گزرتے گئے پنجاب میں سکھوں کی فرقہ وارانہ سرگرمیاں تیز ہوتی چلی گئیں یہاں تک کہ ۲۔اگست ۱۹۳۲ء کو امرتسر دربار صاحب کے اکال تخت میں جمع ہو کر ایک لاکھ سکھوں نے مسلمانوں کے خلاف مرنے مارنے کی قسمیں اٹھائیں۔ اس کے جواب میں ۵۔اگست ۱۹۳۲ء کو مجلس احرار نے "یوم پنجاب" منانے کا اعلان کرتے ہوئے کہا

"مسلمانوں کی امن پسندی اور صلح جویانہ زندگی کو ہمسایہ قوم نے بزدلی سے تعبیر کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ عرصہ سے سکھ پنجاب کے مسلمانوں کے پولیٹیکل اقتدار کو فنا کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ اور پنجاب کا ہندو پریس علانیہ ان کی پشت پناہی کر رہا ہے۔

پنجاب کے ہندوؤں کی دلی خواہش ہے کہ ہندوستان کے کسی حصے میں اور بالخصوص پنجاب میں مسلمانوں کو کسی قسم کا سیاسی اقتدار حاصل نہ ہو۔ اس غرض سے پنجاب کے ہندو نے سکھ کو مسلمان کے خلاف منظم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ جیسے کہ فری پریس نے ایک غیر مصدقہ اطلاع شائع کی ہے کہ پنجاب کے مسلمانوں کو آئندہ دستور میں اکاون فیصد نشستیں ملیں گی۔

اس خبر کی اشاعت کے ساتھ ہی سکھوں نے جن میں وزیر حکومت پنجاب سردار جوگندر سنگھ اور نیشنلزم کے علمبردار ماسٹر تارا سنگھ تک شامل ہیں اعلان کیا ہے کہ وہ اپنی قوت کے ساتھ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت کو کسی حال میں بھی قائم نہیں ہونے دیں گے۔

اور سکھوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ گوردوارہ صاحب کے سامنے ایک لاکھ سکھ یہ عہد کریں کہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت کو فنا کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دیں گے۔

اس قسم کے امن سوز اور فتنہ انگیز اعلانات کو پنجاب کا ہندو پریس نہ صرف بہت آب و تاب سے شائع کر رہا ہے بلکہ ان کی کھلی حمایت بھی کر رہا ہے اور پنجاب کا ہندو بھی مجرمانہ طور پر خاموش ہے۔ لیکن جب مسلمان حفاظت

خود اختیاری اور اپنے جائز حقوق کے تحفظ کے لیے میدان میں آئے گا۔ اس وقت ملک کے تمام ہندو، مسلمان کو مفسد اور فتنہ پرور کہنے کے لیے فوراً کھڑے ہو جائیں گے۔ اور گورنمنٹ بھی ان کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر مسلمانوں پر ہر قسم کا الزام درست سمجھے گی۔

اس وقت کہاں ہیں وہ لوگ جو مسلمانوں کو ہندوستان کا دشمن قرار دیا کرتے ہیں؟ کیا آج وہ ان سکھوں کی مفسدانہ حرکات کی مذمت کریں گے؟

مجلس احرار اسلام ہند مسلمانوں کو تنبیہہ کرتی ہے کہ وہ کسی فتنہ پرداز کی فتنہ پردازی سے متاثر نہ ہوں۔ بلکہ اپنے آپ کو بہادر ترین اور امن پسند ثابت کریں بزدل اور کمزور قوموں کو جینے کا حق نہیں ہے۔

جب تحریک حریت کشمیر میں مسلمان اپنا سب کچھ قربان کر رہے تھے تو کسی قوم کی جرأت نہیں تھی کہ وہ مسلمان کو اس قسم کی دھمکیاں دے۔ لیکن آج جب مجاہدین اسلام کمر کھول چکے ہیں تو تیس لاکھ سکھوں کو بھی جرأت ہو گئی کہ وہ پنجاب کے ڈیڑھ کروڑ مسلمان کی اکثریت کو فنا کرنے کی دھمکیاں دے۔

مجلس احرار اسلام عارضی جوش اور ہنگامہ آرائیوں کے ہمیشہ خلاف رہی ہے۔ اس لیے وہ اعلان کرتی ہے کہ مسلمان قلب صمیم کے ساتھ خدا کے حضور کھڑے ہو کر عہد کریں کہ ہندوستان میں بہادر سپاہیوں کی سی زندگی بسر کریں گے اور سیاسی معاملات میں غفلت اور تن آسانی کو راہ نہ دیں گے۔ پورے تحمل و استقلال کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف قدم بڑھاتے جائیں گے۔

جہاد حریت کشمیر میں آپ نے دیکھا کہ مسلمان ایثار و قربانی میں ہندوستان کی کسی قوم سے کمزور نہیں۔

دنیا کی جدوجہد میں وہی قوم کامیاب ہوا کرتی ہے جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے برسوں خون اور پسینہ ایک کر دیتی ہے۔

آخر میں ہم پنجاب کے ہندو پریس کو تنبیہہ کرتے ہیں کہ وہ سکھوں کی مفسدانہ

اور امن سوز طریق کار کی حمایت ترک کر دیں۔ کیونکہ اس طرز عمل سے مسلمانوں کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکے گا۔ البتہ ملک کی آزادی کی منزل اور دور ہو جائیگی۔

مجلس احرار اسلام ہند اعلان کرتی ہے کہ ہر خیال اور ہر رنگ کے مسلمان کو متحد و متفق ہو کر اپنے جائز سیاسی حقوق کو برقرار رکھنے کے لیے حسب ذیل پروگرام کو عملی جامہ پہنائیں۔

۱۔ ۵۔ اگست بروز جمعہ تمام ہندوستان میں یوم پنجاب منایا جائے۔ اس دن کم از کم دس لاکھ مسلمان مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے یہ حلف لیں کہ وہ ہندوستان میں اپنے جائز سیاسی حقوق کو حاصل کرنے میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ اور بالخصوص پنجاب میں اپنی اکثریت کو کسی حالت میں فنا نہیں ہونے دیں گے۔

۲۔ مجلس احرار کے کارکنوں کو شہروں سے نکل کر دیہات میں پھیل جانا چاہیے اور ہر گاؤں اور بستی میں رضا کاروں کی تنظیم قائم کریں۔ جو مرکز کے حکم پر ہر قسم کی قربانی کو تیار ہوں۔ کیونکہ دیہات کی بیداری کے بغیر کامیابی مشکل ہے۔

۳۔ ہر مسلمان کو اپنی آمدنی کا ایک حصہ سیاسی اغراض کی تکمیل کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ اور انہیں یہ یقین کرنا چاہیے کہ اس ایثار و قربانی کے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔

نوٹ:۔ ۵۔ اگست کو ہر مقام پر جلسے کیے جائیں۔ اور ان کی تمام کارروائی مرکز کو بھیجی جائے۔

(مولانا) معین الدین اجمیری۔

فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان ہندو، سکھ اور مسلمانوں کے آپس کے مندرجہ بالا دھمکی آمیز فیصلوں کے باوجود برطانوی وزیر اعظم نے حسب ذیل فیصلے کا اعلان کر دیا۔

۱۔ شمالی صوبہ سرحد کو جسے پیشتر سے کوئی آئینی حیثیت حاصل نہیں تھی مستقل الگ صوبہ قرار دیا گیا۔

۲۔ سندھ جو ہمیشہ بمبئی کا ایک حصہ تھا الگ صوبہ بنا دیا گیا۔
۳۔ تمام ہندوستان کے صوبوں کو گورنروں کے تحت خود مختار کر دیا گیا۔ (پیشتر ہر صوبہ سنٹرل گورنمنٹ کے تحت تھا۔
۴۔ ہندوستان کے اچھوتوں کو الگ فرقہ قرار دے کر انہیں جداگانہ انتخاب کا حق دے دیا گیا۔
۵۔ کانگریس اور دوسرے ہندو سکھ رہنماؤں کی خواہش کے باوجود کہ ہندوستان کا آئندہ آئین مخلوط انتخاب کی بنیاد پر ہونا چاہیے، جداگانہ انتخاب کے اصول پر رائج کیا گیا۔

اس پر کانگریس سمیت تمام غیر مسلم فرقے ایک طرف آپس میں گتھم گتھا ہوئے اور دوسری طرف برطانیہ سے بھی ان کی ناراضگی بڑھ گئی۔

۱۸۔ اگست ۱۹۳۲ء کو کانگریس رہنما مہاتما گاندھی نے برطانوی اعلان کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار یروودا جیل سے برطانوی وزیر اعظم کے نام اپنے ایک خط کے ذریعے کیا۔

"اگر آپ نے اپنے فیصلے میں ترمیم کر کے اچھوتوں کو اونچی ذات کے ہندوؤں کے برابر درجہ نہ دیا اور انہیں مخلوط انتخاب کی اجازت نہ دی تو میں ۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ء کو آپ کے اس فیصلے کے خلاف مرن برت اس وقت تک جاری رکھوں گا تا آنکہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر کے اس میں ترمیم نہ کر دیں۔ یا پھر موت آ کر مجھے اپنی آغوش میں لے لے۔"

گاندھی جی کے اس فیصلے نے حکومت سمیت سارے ہندوستان کو بلا امتیاز مذہب متاثر کیا۔

مجلسِ احرار کا احتجاج اقوام ہند کو برطانوی وزیر اعظم کا فیصلہ کسی طرح بھی مطمئن نہ کر سکا۔ ہندوؤں کو شکایت کہ جداگانہ طریق انتخاب سے مسلمان جہاں کہیں وہ انتہائی اقلیت میں ہیں۔ چند نشستیں اپنے حق سے زائد لے جائیں گے (حالانکہ اگر ایسا ہو جاتا تو ہندو اکثریت کا وہاں کوئی نقصان نہیں تھا) دوسرا گلہ اچھوتوں کو ہندوؤں سے

الگ کرنے کا بھی تھا جبکہ اس سے پیشتر رائج انتظام میں اچھوتوں کا ووٹ ہندوؤں کے ساتھ تھا اور وہ اپنی دولت کے زور سے غریب اچھوتوں کا ووٹ خرید لیتے تھے۔

سکھ پنجاب میں آٹے میں نمک کے برابر تھے لیکن انہیں پنجاب میں تعداد سے کہیں زیادہ نشستیں ملیں۔ مگر ہندوؤں کا آلۂ کار بن کر انگریزوں کی بجائے وہ بھی مسلمانوں سے ناراض ہو گئے۔

مسلمان کو بھی انگریز کی یہ حکمت عملی پسند نہ آئی کہ پنجاب اور بنگال ہی دو ایسے صوبے تھے جنہیں مسلم اکثریت والے صوبے کہا جا سکتا تھا۔ مگر انہیں غیر مسلموں کی دلجوئی کے لیے یا پھر اپنی عادت کے مطابق دونوں صوبوں میں ایسا تماشا کیا کہ باوجود اکثریت مسلمان کی تسلیم کی گئی مگر ایسی کتر بیونت کی کہ مسلمان بھی ناراض اور ہندو بھی ناخوش۔

برطانیہ کا یہ فیصلہ گو مجلس احرار کی جولائی ۱۹۲۱ء کی قرارداد کے مطابق تھا۔ مگر انداز ایسا اختیار کیا کہ باغبان بھی راضی نہ رہ سکا اور صیاد بھی ناراض ہو گیا۔

۲۷۔ اگست ۱۹۳۲ء کو مجلس احرار نے اپنے ایک خصوصی اجتماع میں جس کی صدارت شیخ صادق حسن ممبر سنٹرل اسمبلی نے کی۔ برطانوی وزیر اعظم کے فیصلے پر ہندو اور سکھوں کے طرز عمل پر غور کیا۔

"سب سے پہلے وزیر اعظم برطانیہ کا اعلان ہے جس پر ہمیں غور کرنا ہے۔ پنجاب اور بنگال صرف دو صوبے ہیں جہاں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے لیکن انہی دو صوبوں میں مسلمانوں کو اقلیت میں رکھا گیا ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ہندو امسلمانوں کو اس قدر ظالم کیوں سمجھ رہے ہیں حالانکہ مسلمانوں نے ایک ہزار سال ان پر نہایت انصاف اور ایمان پروری سے حکومت کی ہے۔

تمام صوبوں میں سے مسلمانوں کو دو صوبوں میں اکثریت حاصل ہے۔ اس پر بھی ہندو اور سکھ شور مچا رہے ہیں۔ لیکن وہ ان صوبوں کو بھی دیکھیں جہاں مسلمان نہایت قلیل تعداد میں ہیں۔ مگر وہاں وہ بالکل خوش ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہندو اور سکھوں کا صحیح نیشنلزم کیا ہے؟ ان کی رائے ہے کہ

تمام ہندوستان میں صرف ہندو راج ہونا چاہیے۔ تبھی نیشلزم ہو سکتا ہے۔
اور اگر کہیں مسلمانوں کو ذرا سی اکثریت حاصل ہو جائے تو پھر کوئی نیشلزم نہیں۔
ہندو نہیں چاہتا کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے اسے الگ صوبہ بنا دیا جائے
نہرو رپورٹ میں بھی سندھ کی علیحدگی کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

آج قربانی کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا مجلس احرار کی رائے ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ملک اور قوم کی بہتری کیلئے جدوجہد کا عہد کریں۔

آل انڈیا مسلم لیگ

۴۔ ستمبر ۱۹۳۲ء کو مسلم لیگ نے بھی فیصلہ دیا۔ مسلم لیگ کا یہ اجلاس شملہ میں سر ذوالفقار علی کی صدارت میں ہوا۔ جس میں وزیر اعظم برطانیہ کے فرقہ وارانہ فیصلے پر حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

"باوجود اس کے کہ ملک معظم کی حکومت کا فیصلہ آل انڈیا مسلم لیگ کی متعدد قراردادوں کے مطابق ہے تاہم حقیقی مطالبات سے بہت کم ہے۔ پھر بھی مسلم لیگ کونسل کی رائے ہے کہ اس اعلان کی رو سے ایک راستہ نکل آیا ہے جس سے آگے چل کر آئینی ترقی کے راستے کی تمام مشکلات محدود ہو گئی ہیں اور اہل ہند کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ آئینی مراحل کی بقیہ مشکلات کے حل پر متوجہ ہو سکیں۔

بہر حال کونسل اس امر کو واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس منزل پر کونسل قطعی یہ نہیں کہہ سکتی کہ آئینی خاکہ کے مکمل ہونے پر وہ مسلمانوں کے نزدیک قابل قبول ہو یا نہ ہو۔

اس اجلاس میں صدر کے علاوہ شاہنواز، بیگم شاہنواز۔ ڈاکٹر ضیاء الدین۔ کپتان شیر محمد خاں نواب اسمٰعیل خاں۔ سر راتب علی۔ خان بہادر حاجی رحیم بخش شامل تھے۔

آل انڈیا مجلس احرار کی تشکیل

۵۔ ستمبر ۱۹۳۲ء کو احرار ورکنگ کمیٹی کے ممبر شیخ حسام الدین حریت کشمیر کے جرم میں ایک سال کی سزا پوری ہونے پر ملتان سنٹرل جیل سے رہا کر دیئے گئے۔

ہندوستان کے سیاسی حالات برطانوی وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلے کی وجہ سے پریشان کن تھے۔ چھوٹی اور بڑی قومیں اپنے حقوق کی دوڑ میں مصروف تھیں۔ مسلم لیگ کا اعتدال پسند گروہ انگریز کی ناراضگی پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن ان کی غیر مسلموں سے لڑائی بھی زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں تھی۔ کانگریس کا طرز عمل مسلمانوں کے لیے غیر مفید تھا۔ لہٰذا مسلمانوں میں کوئی جماعت ایسی نہیں تھی جو آگے بڑھ کر حقوق کی اس دوڑ میں ہندو اور انگریز سے نبرد آزما ہو سکے سوائے مجلس احرار کے۔ لیکن اس کا دائرہ عمل ہنوز پنجاب تک محدود تھا۔

تحریک حریت کشمیر میں مجلس احرار کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ اس بنا پر شیخ حسام الدین نے رہائی کے ایک ہفتہ بعد ۹۔۱۰ ستمبر کو امرتسر میں ان سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کی ایک میٹنگ بلوائی جو جیلوں سے باہر تھے۔ تاکہ مجلس احرار کو آل انڈیا بنیادوں پر منظم کیا جا سکے۔ چنانچہ شمالی صوبہ سرحد اور پنجاب کے علاوہ جن دوسرے صوبوں کے رہنماؤں نے اس اجلاس میں شمولیت کی ان میں

مرکزی احرار کی طرف سے:۔ ۱۔ شیخ حسام الدین۔ ۲۔ خواجہ عبدالرحمٰن غازی۔ ۳۔ ڈاکٹر عبدالقوی۔ ۴۔ سید جماعت علی شاہ۔

لاہور:۔ ۱۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ۲۔ شمس الدین حسن۔ ۳۔ چودھری برکت علی۔ ۴۔ چودھری محمد امین۔ ۵۔ محمد اشرف عطا۔ ۶۔ ملک لال دین۔

امرتسر:۔ ۱۔ مولانا عبدالسلام ہمدانی۔ ۲۔ مولانا عبدالغفار غزنوی۔ ۳۔ ملک غلام حسن۔ ۴۔ میاں محمد شریف میونسپل کمشنر۔ ۵۔ میاں محمد عمر سوداگر چرم۔ ۶۔ صوفی نذیر حسین۔ ۷۔ حکیم مہر دین۔

لدھیانہ:۔ ماسٹر تاج الدین انصاری۔

بمبئی:۔ ۱۔ حافظ محمد ابراہیم۔

اجمیر:۔ ۱۔ حافظ محمد شریف۔ ۲۔ مولانا معین الدین۔

علی گڑھ:۔ ۱۔ ایم۔ ایم۔ بشیر۔

کلکتہ:۔ ۱۔ حکیم غلام حسین۔ ۲۔ تاج الدین جانڈ۔ ۳۔ ایم غلام حسن۔

کانپور: ۱۔ مولانا حسرت موہانی۔

سہارنپور: ۱۔ مولانا مشتاق احمد۔ ۲۔ سید محمد احمد کاظمی ایڈوکیٹ الہ آباد ہائی کورٹ۔

لائلپور: ۱۔ غلام محی الدین ٹھیکیدار۔ بابا اللہ دتہ۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ: ۔ مولانا محمد زمان۔ ۲۔ چودھری محمد سخی۔ ۳۔ مستری عبدالعزیز۔

وزیر آباد: قاضی محمد سعید (دبگھو والوی)

فیروز پور: ۔ چودھری عبدالستار بی۔ اے۔ ۲۔ چودھری عبدالعظیم۔

دسوہہ ضلع ہوشیار پور: ۱۔ مولانا عبدالمنان۔ ۲۔ چودھری عبدالحق۔ ۳۔ چودھری عبدالرحمٰن (دراہوں والے)

ملتان: ۔ شیخ عبدالرشید صدیقی۔

جہلم: ۔ ٹھیکیدار چودھری۔ مستری غلام نبی انصاری۔ ڈاکٹر نذر محمد۔

بٹالہ: ۱۔ ماسٹر محمد ابراہیم۔ ۲۔ حاجی عبدالغنی۔ ۳۔ شوق محمد۔ ۴۔ حاجی عبدالرحمٰن۔ ۵۔ مولوی رحمت اللہ

راولپنڈی: ۱۔ صوفی عنایت محمد پسروری۔ ۲۔ حکیم فضل احمد۔ ۳۔ مولانا محمد اسماعیل۔

سیالکوٹ: ۔ خواجہ احمد دین۔

ہشیار پور: ۱۔ مولانا الہ دین۔ ۲۔ شیخ سردار احمد۔

چک جھمرہ: ۱۔ سید کرم حسین شاہ۔ حکیم جمال الدین۔

پٹی ضلع لاہور: ۱۔ مولانا عبدالمجید قریشی ایڈیٹر ہفت روزہ "ایمان"۔

جالندھر: ۔ عزیز احمد خان۔

چک ہر موعہ ۱۲ ضلع لائلپور: ۔ کرم بخش۔ ۲۔ سید غلام علی۔

علاوالپور ضلع جالندھر: ۱۔ سید محمد سلیمان شاہ۔ ۲۔ خوشی محمد۔

شجاع آباد ضلع ملتان: ۔ قاضی احسان احمد۔

سمندری ضلع لائلپور: ۔ چودھری محمد جمیل۔

جھنگ مگھیانہ: ۔ شیخ خدا بخش۔

شمال مغربی صوبہ سرحد: ۔ عطا محمد۔ ۲۔ محمد رمضان۔ ۳۔ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی۔

جموں: ۱۔ سردار گوہر الرحمٰن خان ۲۔ شیخ اللہ رکھا ساغر

ڈیرہ غازیخاں: ۱۔ عبداللہ خاں۔

اس طرح ہندوستان کے منتخب نمائندوں کی تعداد پانچ سو سے زائد تھی۔ یہ اجتماع اسلامیہ ہائی سکول شریف پورہ کے وسیع ہال میں شیخ حسام الدین کی صدارت میں شروع ہوا۔ کانگریس اور مسلم لیگ پر اس وقت تک سروں۔ خان بہادروں اور ہندو سرمایہ داروں کا قبضہ تھا۔ ان کی ہر تجویز مخصوص مفاد کی نمائندگی کرتی تھی۔ غریب عوام غیر ملکی اقتدار کے کے ساتھ ساتھ دونوں جماعتوں سے بھی مایوس ہو چکے تھے۔ یہی حال سیاسی کارکنوں کا تھا ان کی دال بھی ان جماعتوں میں نہیں گلتی تھی۔

برطانوی اعلان نے حالات میں ایسا زہر گھول دیا کہ سیاسی ذہن رکھنے والے درکرز نئے ٹھکانوں کے آرزومند تھے۔ ایسے میں مجلس احرار کے اجتماع نے درمیانے طبقے کو نئی زندگی، نئے جذبات اور نئے عزم کی دعوت دی۔

اجتماع میں خاص قسم کا جوش اور ولولہ پایا جاتا تھا۔ مجلس احرار جو بیشتر ازیں ایک تحریک کے باعث ہنگامی دور سے گذر چکی تھی، تعمیری پروگرام سے مسلمان عوام کی رہنمائی کرنا چاہتی تھی۔ مسلمان اقتصادی اور معاشرتی بنیادوں پر بھی نئی قیادت کی تلاش میں تھا ایسے ماحول میں مجلس احرار کا یہ اجتماع تاریخ برصغیر میں ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔

دو روزہ اجلاس میں بیس گھنٹے کی مسلسل بحث کے بعد مجلس احرار کو آل انڈیا حیثیت دی گئی اور حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

قرارداد ۱: مسلک جمہوریت ہند اور حکومت خود اختیاری کا یہ تقاضا تھا۔ کہ فرقہ وارانہ امور کے متعلق فیصلہ ہندوستان کے مختلف فرقے باہمی رضامندی سے کرتے۔ ازبس کہ وزارت برطانیہ کا اعلان اس جمہوری اصول حزین کے منافی ہے۔ علاوہ ازیں خالص اسلامی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اس میں مسلمانانِ ہند کے واجبی مطالبات کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اور ان کی حیثیت کو مستقل خطرہ میں ڈالا گیا ہے۔

ا۔ پنجاب میں جہاں ان کی آبادی ستاون فیصد کے قریب ہے ان کی اکثریت کو انچاس فیصد جی کی آئینی اقلیت میں بدل دیا گیا ہے۔

ب۔ بنگال میں کہ وہاں بھی وہ آبادی کا جز غالب ہیں۔ ان کی اکثریت کو اڑتالیس فیصد کی دائمی اقلیت میں تبدیل کر دیا۔

ج:۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کا مسئلہ جو ملک کا متفق علیہ مسئلہ تھا۔ کوئی تصفیہ نہیں کیا۔ بلکہ اسے غیر معین مدت کے لیے کھٹالی میں ڈالدیا گیا ہے۔

د:۔ بلوچستان کو ایک مستقل جداگانہ آئینی صوبے کی حیثیت کے سوال پر بھی خاموشی اختیار کر لی گئی۔

س:۔ اس امر کا کہ صوبہ سرحد کی حیثیت باقی صوبہ جات ہند کے مساوی ہوگی کوئی ذکر نہیں۔ حالانکہ اس مسئلہ پر مختلف اسلامی انجمنیں اور کانگریس متحد ہیں۔

ش:۔ ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ ان کا تناسب نمائندگی موجودہ تناسب سے بھی گھٹا دیا گیا ہے۔

ص:۔ مرکز میں مسلمانوں کی نیابت کے سوال کو چھوا تک نہیں۔

لہٰذا مجلس احرار اسلام ہند کے اس اجلاس کی رائے میں یہ فیصلہ قطعاً ناقابل التفات ہے اور مجلس یہ اعلان کر دینا چاہتی ہے کہ اگر مسلمانوں کے واجبی مطالبات پورے نہ کیے گئے تو وہ مؤثر اقدام کرنے پر مجبور ہوگی۔

قرارداد ۲ مجلس احرار اسلام ہند اپنے بلند ترین نصب العین استخلاص وطن اور جمہور ہند کی بالعموم اور فاقہ کش مسلمانوں کی بالخصوص اقتصادی اور سیاسی آزادی کے لیے جس طرح سے علم بردوش ہے اس سے ہر کہ ومہ اچھی طرح واقف ہے لہٰذا اپنے مقاصد عالیہ کے حصول کے لیے حسب ذیل فوری پروگرام ملک کے سامنے پیش کرتی ہے اس پروگرام کے اکثر حصے ایسے ہیں جن کا اطلاق جمہور ہند پر ہوگا۔ اور اس کا مفاد بجز سرمایہ دارانہ ذہنیت کے افراد اور جماعتوں کیلئے مساوی ہوں گے۔ مجلس احرار صحیح معنوں میں ایک جماعت خلق ہے

اور اس کا مقصد وحید نادار جماعتوں کو موجودہ سیاسی اور اقتصادی نظام کی تباہ کاریوں سے نجات دلانا ہے۔

تعمیری پروگرام

۱۔ تمام ہندوستان میں ممبر بھرتی کیے جائیں۔ صوبجاتی اور ضلع وار جماعتیں آئین مجلس کے مطابق بنائی جائیں۔ دیہات میں نظام کو مکمل کیا جائے۔

۲۔ جیوشِ احرار کی تنظیم:۔ اس والنٹیر آرگنائزیشن کو ہر ضلع میں ایک مستعد جماعت کے طور پر منظم کیا جائے جو سوشل سروس اور فداکاری کیلئے تیار ہو

۳۔ سرمایہ کی فراہمی:۔ اس کے لیے ایک آنہ فنڈ کی رسیدیں جاری کی جائیں اس کے علاوہ ایک اپیل کی جائے، جو غیر ممالک میں بھیجی جائے۔ ساتھ ہی مجلس کے نصب العین کو بھی واضح کیا جائے۔

۴۔ غیر ممالک میں ایک وفد جو ایک یا دو ارکان پر مشتمل ہو بھیجا جائے جو ہندوستان سے محبت رکھنے والی جماعتوں سے تبادلہ خیالات کرے۔

۵۔ اسیرانِ احرار کی امداد کے لیے ایک مستقل ریلیف فنڈ قائم کیا جائے۔

۶۔ ایک مرکزی دارکرزہوم کی بنیاد رکھی جائے۔ جس میں مجلس کے نصب العین اور پروگرام کے مطابق مبلّغ تیار کیے جائیں۔

۷۔ اضلاع کے مشہور دیہاتی مراکز میں ڈسٹرکٹ کانفرنسوں کا انعقاد۔

۸۔ ایک مرکزی وفد تمام ہندوستان میں دورہ کرے۔ جو نئے پروگرام سے لوگوں کو روشناس کرائے۔

۹۔ مدارسِ شبینہ کا قیام۔

۱۰۔ رسومِ قبیحہ کا انسداد۔

۱۱۔ جماعت کے مقاصد کی اشاعت کے لیے ایک روزنامہ کا اجرار۔

۱۲۔ پست اقوام کے معیار معیشت بلند کرنے کے لیے کام کرنا۔

اقتصادی پروگرام

۱۔ صنعتی اور دوسرے مزدوروں کو اقتصادی اصول پر منظم کرنا۔
۲۔ بیکاروں کے لیے حکومت سے الاؤنس کا مطالبہ کرنا۔
۳۔ سود کی لعنت سے، جو سوسائٹی کو تباہ کر رہی ہے، ملک کو بچانا۔
۴۔ شہروں میں تخفیف کرایہ کی تحریک جاری کرنا۔ یعنی مکانوں، دکانوں کے کرایہ میں مؤثر تخفیف۔
۵۔ دیسی مصنوعات کی ترقی کے لیے خاص بازاروں کا افتتاح۔ ہر بازار، ہر شہر اور قصبہ میں ہفتہ میں ایک بار کھلا کریں گے۔
۶۔ مقدمات کے فیصلوں کے لیے پنچائتوں کا قیام۔
۷۔ اوقاف کی تحقیقات۔ اس پر قبضہ اور تحفظ۔

سیاسی پروگرام

۱۔ پریس ایکٹ اور آرڈیننسوں کے خلاف مظاہرے کرنا۔
۲۔ میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں پر قبضہ کرنا۔
۳۔ مالیانہ اراضی، انکم ٹیکس اصول کے مطابق لگائے جانے کی کوشش کرنا۔
۴۔ عام زمینداروں کے مالیہ کو پچاس فیصد کم کرانا۔
۵۔ ہندوستانی ریاستوں کے مظلوم باشندوں کی امداد کرنا۔

قرارداد نمبر ۳

مجلس احرار اسلام ہند کا یہ اجلاس، اسلامی پریس کی استواری جو موجودہ نازک مرحلہ میں مسلمانوں کی زندگی کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس مسئلے کی اہمیت کی طرف پورے طور سے متوجہ ہوں چونکہ اخبار "زمیندار" اس وقت مجبور کن مالی مشکلات میں مبتلا ہے۔ لہٰذا مجلس احرار تجویز کرتی ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں یوم "زمیندار" منایا جائے اور اس دن مجموعی حیثیت سے مسلمانوں کو اسلامی اخبارات کی سرپرستی اور ان کی موجودہ تکلیف کے ارتفاع کے لیے تلقین و تعلیم دی جائے۔ نیز "زمیندار" کو اپنے قدموں پر کھڑا کرنے کے لیے کارکنانِ احرار اور دوسری اسلامی انجمنیں اور جماعت المسلمین متحدہ کوشش کریں۔ ہر شہر

اور قصبہ سے لازمی طور پر کم از کم "زمیندار" کے لیے ایک خریدار پیدا کریں اور جہاں سہولیات ممکن ہوں "زمیندار" کو مالی امداد دیں۔

قرارداد ۴ مجلس احرار ہند کا یہ اجلاس سکھوں اور دیگر اہل ہند کے فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق امن سوز حرکات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ان کی توجہ اس طرف منعطف کراتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں حق بجانب نہیں ہیں۔

قرارداد ۵ مجلس احرار ہند کا یہ تاریخی اجلاس گورنمنٹ ہند سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ سرکاری کاغذات میں مسلمانوں کی پسماندہ اقوام کو کمین نہ لکھا جائے۔

قرارداد ۶ مجلس احرار اسلام ہند کا یہ اجتماع سردار گوہر الرحمٰن قائد جموں و کشمیر سے دل فگار بیان سن کر مظلومین کشمیر کے متعلق اپنی قدیم حکمت عملی کی تجدید کرتا ہے اور برادران کشمیر کو یقین دلاتا ہے کہ آج بھی مجلس ہذا ہر ممکن اعانت اور کمک کے لیے آمادہ و تیار ہے۔ جس کے ثبوت میں مجلس ہذا عنقریب اپنی استطاعت کے مطابق اعانت کشمیر کے متعلق ایک ٹھوس لائحہ عمل مرتب کر کے عمل پیرا ہوگی۔

قرارداد ۷ مجلس احرار اسلام ہند کا یہ اجلاس دربار الور کی اس جابرانہ روش پر نفرت و غصے کا اظہار کرتا ہے۔ جس کے باعث الور کی مظلوم مسلم رعایا کی ایک کثیر تعداد کو ریاست کی حدود سے نکلنا پڑا۔ مجلس احرار ان مظلوم مہاجرین الور اور ریاست کے مظلوم انسانوں کے ساتھ اپنی پوری ہمدردی کا اظہار کرتی ہے اور انہیں یقین دلاتی ہے کہ ان کی ہر مصیبت میں اپنے تمام ذرائع کے ساتھ امداد دینے کے لیے آمادہ ہے۔

اس اجتماع کے اختتام پر اپنے اپنے صوبوں کے درکرز اور رہنماؤں کے چہروں پر خاص قسم کی مسرت اور ارادوں میں نئی زندگی دکھائی دے رہی تھی۔

آل انڈیا مجلس احرار کی تشکیل سے اس کے بنیادی اصول وہی قرار پائے جو

جولائی ۱۹۳۱ء میں طے کیے گئے تھے۔ خصوصاً جداگانہ انتخاب کی قرارداد کا ازسرنو کانفرنس کی تقریروں میں بار بار اعادہ کیا گیا۔ البتہ ورکنگ کمیٹی میں خاصا ردّو بدل کرنا پڑا۔ اور اس طرح ہندوستان کے ہر صوبے کو اس میں نمائندگی دی گئی۔

ممبران کی اکثریت حریت کشمیر کے جرم میں ہنوز جیل خانوں میں تھی۔ لہٰذا مرکزی عہدیداران کا نیا انتخاب کرنے کی بجائے سابقہ انتخاب پر اکتفا کیا گیا۔ یعنی صدر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی۔ ناظم اعلیٰ مولانا محمد داؤد غزنوی۔ خزانچی ڈاکٹر عبدالقوی۔

گاندھی جی کا مرن برت

سیاسی جدوجہد میں مذہب ثانوی حیثیت قرار پاتا ہے۔ تو میں جب اس راہ سے گزرنے لگتی ہیں۔ تو قیود مذاہب کو اس بری طرح پامال کرتی ہیں کہ اس کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔ برہمن کے عہد اور مہاراجہ چندر گپت کے راج میں شودر کی زندگی کچھ اس طرح تھی۔

"انسان نے جب برہمن کا روپ دھارن کیا تو اپنے علاوہ عام انسانوں کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ کھشتری، ویش اور شودر۔ آخرالذکر کو اس قدر ذلیل سمجھا گیا کہ اونچی ذات کے کسی آدمی کو گالی دینے پر اس کی زبان کاٹ لی جاتی تھی۔ برابر بیٹھنے پر جسم میں گہرا گھاؤ کر دیا جاتا تھا۔ اگر مذہبی امور میں وہ کسی برہمن کو مشورہ دیتا تو اس کے منہ اور کان میں گرم تیل ڈال دیا جاتا۔ برہمن کی چوری کرنے پر شودر کو موت کی سزا دی جاتی۔ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ سلوک کا یہ عالم تھا کہ ذرا سی مذہبی غلطی پر آگ میں جلا دیا جاتا۔ محض چنگی کا محصول نہ دینے پر پھانسی دے دی جاتی۔

("بڑھتا ہے ذوق جرم" ص ۱۴-۱۵)

جس قوم میں اچھوت کی صدیوں تک مندرجہ بالا حیثیت رہی ہو۔ اور ان اصولوں کو ہندو مذہب کا درجہ حاصل رہا ہو۔ جب سیاسی ضرورت پڑی تو اس بھگوان کے دروازے بھی ان پر کھول دیے گئے، جس کے چرن چھونے تو کجا، اچھوت کو دور کھڑے ہو کر بھگوان

کے درشن کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔

انڈین نیشنل کانگریس کا لیڈر جو کبھی ہندو مسلم اتحاد کے لیے بھوک ہڑتال کرتا آیا تھا آج ہندو جاتی کے حقوق کی خاطر اچھوتوں کو ہندوؤں میں مساوی حقوق دلانے کیلئے مرن برت رکھنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ گاندھی جی کے اس فیصلے نے اقوام ہند کے مقتدر رہنماؤں کو خاصہ متاثر کیا۔ اوران کی خواہش رہی کہ وہ ۲۰۔ستمبر کا فیصلہ ملتوی کر دیں۔ یہاں تک کہ ۸۔ستمبر کو وزیر ہند نے بھی انہیں یہی مشورہ دیا۔ لیکن برطانوی دانشوروں سے ہندوستانی رہنماؤں تک ہر کوشش کو شکست ہوئی اور بالآخر اپنے ۱۸۔اگست کے فیصلے کے مطابق گاندھی جی نے ۲۰۔ستمبر ۱۹۳۲ء کو دن کے بارہ بجے برودھا جیل (پونا) میں اپنا مرن برت شروع کر دیا۔ اس روز ہندوستان کے اکثر ہندوؤں نے گاندھی جی کی ہمنوائی میں بھوک ہڑتال کی۔ کانگریسی رہنما سی راج گوپال اچاریہ۔ پنڈت مدن موہن مالوی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور اچھوت رہنما ڈاکٹر امبیت کر کی دوڑ دھوپ کے بعد ۲۶۔ستمبر ۱۹۳۲ء کو گاندھی جی کے اس مطالبے کو قبول کرتے ہوئے برطانوی کیبنٹ نے اپنے فیصلے میں ترمیم کر دی اور اچھوتوں کو ہندوؤں کے برابر ووٹ دینے کا حق تسلیم کر کے مخلوط انتخاب منظور کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں نے اچھوتوں پر مندروں کے دروازے کھول دیئے۔

گاندھی اور ہریجنوں کے اس سیاسی فیصلے نے آگے چل کر سناتن دھرم اور آریہ سماج کے درمیان مذہبی کشمکش کو عجیب شکل دے دی۔ اول الذکر گروہ کو سیاسی استحکام حاصل تھا اور دوسرا گروہ ہندو مہاسبھا کا معاون تھا۔ ایک فریق نے اگر اچھوتوں کو بھگوان کے درشن کی آگیا دے دی تو دوسرے نے اس کو مذہب میں مداخلت سمجھا۔ اس ہاتھا پائی کے نتیجے میں آریہ سماج نے اچھوتوں پر ہندو مذہب کی تبلیغ شروع کر دی۔

ہندو مذہب کے تشدد نے کمزور قوموں کو انسانیت سے بھی پرے پھینک دیا تھا۔ ایسے میں اگر اسلام کے ماننے والے اپنے کردار میں درست ہوتے تو بھنگی ایسی خدمت گزار قوم اسلام کے پاکیزہ اصولوں کو قبول کرنے میں کوتاہی نہ کرتی۔ مسلمانوں کے گھروں میں صفائی کرنے والا بھنگی اس کی نفرت کے باعث عیسائیت کی آغوش میں تو چلا گیا مگر مسلمان کی

گندگی کو سر پر اٹھانے والا مسلمان کے قدموں میں جگہ نہ پا سکا۔
آریہ سماج کے تبلیغی مشن کے پھیلاؤ نے مجلس احرار کو اکسایا کہ وہ اچھوتوں کو اسلام کی دعوت دے۔ چنانچہ لاہور میں اچھوت تبلیغ کانفرنس کر کے مجلس احرار نے اقوام ہند پر اپنا مؤقف واضح کیا اور پھر اچھوتوں میں اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ اس سلسلے میں پنجاب کے دوسرے اضلاع کے علاوہ جالندھر اور ریاست نابھہ میں اچھوتوں کی خاصی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ مجلس احرار کے اس اقدام سے ہندو قوم خاصی ناراض ہوئی اور مجلس احرار کی قوم پرستی ہندوؤں کے نزدیک مشکوک سمجھی جانے لگی۔ اس سے پیشتر ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں میں احرار رہنما جبکہ یہ خلافت سے وابستہ تھے ہندوؤں سے ٹکرا چکے تھے۔ اچھوتوں میں تبلیغ کی تحریک نے نفرت کی گرہ اور مضبوط کر دی۔

یادِ رفتہ مالی اپنے پودوں کی آبیاری کبھی آنسوؤں سے کرتا ہے اور کبھی خونِ جگر دے کر۔ جوان ہو کر جب پودے صحنِ چمن کو رونق بخشتے ہیں تو باغبان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ مگر جیسے ہی ابھرتے اور پھلتے ہوئے پودوں کو خزاں اپنی لپیٹ میں لینے لگتی ہے، مالی کا دل بیٹھ بیٹھ جاتا ہے اور تمام آرزوئیں خاک کا ڈھیر دکھائی دیتی ہیں۔
مجلس احرار نے غلام کشمیریوں کے لیے جو ایثار کیا۔ اگر کشمیری رہنما ڈوگرہ سامراج کے سنہری جال میں الجھ کر اپنے کشمیری بھائیوں کا خون دریائے جہلم کی موجوں کے ساتھ نہ بہا دیتے تو زعفران کے کھیتوں میں پھر بہار آجاتی۔ گلمرگ کے سبزہ زار لالہ زاروں کی بہاروں سے اس طرح دکھائی دیتے جیسے ساون بھادوں میں بیر بہوٹیاں پہاڑوں کی ترائی میں تیر رہی ہوتی ہیں۔ ششیش ناگ کے چشمے چاندی کی طرح پانی اگلتے۔ ان کی نگاہیں خون نہ برساتیں مگر آہ ؎

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

بیالیس سال کے بعد اپنے جرم کے اعتراف میں کشمیری رہنما شیخ عبداللہ "لندن ٹائمز" کے نمائندے کو ایک بیان دیتے ہوئے کہتے ہیں۔
"کشمیر میری غلطی کی وجہ سے بھارت کا حصہ بنا۔ اگر میں غلطیاں نہ کرتا

تو ریاست بھارت کا حصہ بنتی۔ (روزنامہ مشرق لاہور۔ ۱۱۔ مارچ ۱۹۷۲ء)

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو مولانا داؤد غزنوی اپنی میعادِ اسیری گذار کر ملتان جیل سے رہا ہوئے۔ تو انھوں نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو زعمائے کشمیر کے نام حسب ذیل خط لکھا۔

برادرِ محترم!

السلام علیکم! میں گیارہ اکتوبر کو نیو سنٹرل جیل ملتان سے رہا ہو کر آگیا ہوں مجھے اور میرے دوسرے رفقاء کو جیل میں اخبارات کے ذریعے معلوم ہوگیا تھا کہ آپ حضرات ایک کانفرنس منعقد کر رہے ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے اور اپنے دوستوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں چند معروضات پیش کروں۔

آپ حضرات نے جموں اور کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کے لیے جو تحریک شروع کی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہماری ہمدردیاں آپ کے ساتھ تھیں۔ اور اب بھی یقین دلاتا ہوں کہ میری جماعت کی تمام ہمدردیاں ہر اس جماعت کے ساتھ ہیں جو آپ کی ریاست میں ذمہ دار نمائندہ حکومت کا آئین حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرے گی۔ تا آنکہ آپ کو مقصدِ اعلیٰ میں کامیابی حاصل ہو۔

آپ حضرات کو معلوم ہے کہ اس سلسلے میں میری جماعت کے متعدد ارکان ابھی تک جیل خانوں میں سختیاں برداشت کر رہے ہیں۔ میں ان کی طرف سے آپ کو مزید یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے نیک عزم کے ساتھ میرے تمام رفیق پوری طرح شامل ہیں۔ ہم سب کی دلی تمنا ہے کہ آپ کی یہ کانفرنس کامیاب ہو اور کشمیری مسلمانوں کے لیے اس کا انعقاد ان کے تمام مصائب اور مظالم کا خاتمہ کر دینے والا ہو۔ تمام مسلمانوں کی آنکھیں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

آپ حضرات نے اور بالخصوص میر پور، راجوری وغیرہ کے مسلمانوں نے جو بے نظیر قربانیاں پیش کی ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے ہم سب کی رائے

ہے کہ کشمیر اور جموں کے مسلمان اپنے عزم و ارادے کے ساتھ اٹھے ہیں۔ اور کوئی طاقت انہیں پامال نہیں کر سکتی۔

گلینسی کمیشن کی رپورٹ کے نقائص

امید ہے کہ آپ کی کانفرنس میں گلینسی کمیشن کی سفارشات غور و فکر اور استصواب رائے کے لیے نمائندگان کے سامنے پیش ہوگی۔ مجھے اجازت دیجیے کہ اس کے متعلق چند ضروری گزارشات پیش کروں۔

جب مجلس احرار سے صلح کا سلسلہ شروع ہوا تو گلینسی کی تجویز ہمارے سامنے پیش کی گئی تھی۔ لیکن ہم نے ان تجاویز کو آپ کے سامنے رکھنا بھی باعث توہین سمجھا۔ اتنی بے نظیر قربانیوں کے بعد ایسی کمزور شرائط کے ساتھ صلح کرنا شہداء کے خون کی ارزاں فروشی سمجھ کر ہم صلح پر آمادہ نہ ہوئے۔

اب کانفرنس کے موقعہ پر ریاست کے تمام رہنما اور مقتدر نمائندے تشریف لائے ہوئے ہوں گے۔ اگر اس کانفرنس میں کوئی خوددارانہ قدم نہ اٹھایا گیا تو اس سے بڑھکر مسلمانان کشمیر کی اور کوئی بد قسمتی نہ ہوگی۔

گلینسی کمیشن کی سفارشات پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ

ا۔ مجوزہ اسمبلی کی ساٹھ نشستوں میں سے ستائیس ۲۷ نامزد ممبروں کے لیے اور تینتیس ۳۳ منتخب ممبروں کے لیے ہیں۔ ان میں صرف بیس نشستیں مسلمانوں کے لیے تجویز کی گئی ہیں۔ جس میں نصف کے قریب نامزد ممبروں کی بھرتی کر کے اسمبلی کو ایک کھلونا بنا دیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف انتخابی نشستوں میں مسلمانوں کی زیادتی کا تناسب قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ب:۔ اسمبلی کا صدر سرکاری عہدیدار تجویز کر کے اسمبلی کی آواز پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔

ج:۔ مجوزہ اسمبلی کی اکثریت کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ محکمہ جات کے بجٹ کو

منظور یا نامنظور کر سکے۔ بلکہ ممبروں کو صرف مشورہ دینے کی اجازت دی گئی ہے جس سے صریح طور پر اسمبلی کو پورا اقتدار حاصل نہیں ہوگا۔

د۔ محکمہ جات متعلقہ کے وزیر کو ذمہ داری دینے کے متعلق گلینسی رپورٹ بالکل خاموش ہے۔

ہ:۔ حق رائے دہی کے متعلق جو شرط تجویز کی گئی۔ مثلاً بیس روپے سالانہ مالیہ ادا کرنے والا۔ ایک ہزار قیمت کی غیر منقولہ جائیداد رکھنے والا دونوں موجودہ حالات کے لحاظ سے بہت بلند ہیں۔ اور ان شرائط کی موجودگی میں ملک کی آبادی کا وہ حصہ جو ہمیشہ قربانی کرتا ہے۔ ملک کی مجلس آئین ساز کے نمائندوں کے انتخاب میں اپنی کوئی آواز نہیں رکھ سکے گا۔

بیداری کی ضرورت

اس لیے جب تک ان نقائص کو دور نہیں کیا جاتا اس وقت تک مجوزہ اسمبلی کا وجود کشمیری مسلمانوں کے مصائب و تکلیف کے لیے کوئی پیغام بیداری اپنے اندر نہیں رکھتا۔ ان حالات میں ادب کے ساتھ لیکن پرزور الفاظ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ اپنی قوم کی ان بیش بہا قربانیوں کو ضائع نہ ہونے دیں اور پوری جرأت بہادری اور اولوالعزمی کے ساتھ مسلمانان ریاست کے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنی آواز بلند کریں۔ آپ اس وقت نہایت نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ اگر آپ نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس نہ کیا اور اضطراب و تذبذب میں رہ کر مسلمانان ریاست کے حقوق کی طرف سے کسی قسم کی لاپرواہی یا کمزوری برتی تو اس کے افسوسناک نتائج ایسے ہوں گے کہ نہ معلوم اس کی تلافی میں اور کتنے برس مسلمانان کشمیر کو مصائب و آلام میں مبتلا رہنا پڑے گا۔

یاد رکھیے! اس قسم کے اوقات قوموں کی زندگی میں بہت کم آیا کرتے ہیں۔ بہادر اور دلیر قائد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس قسم کے موقع سے فائدہ اٹھا کر قوم کو ترقی کی منزل کے قریب لے جائے۔

میں آخر میں پھر دعا کرتا ہوں کہ آپ کی یہ کانفرنس کامیاب ہو اور مسلمانان کشمیر کے مصائب اور تکالیف کا خاتمہ کرنے والی ہو۔ خدا تعالیٰ ہم سب کا محافظ ہو والسلام
آپ کا صادق۔ محمد داؤد غزنوی۔ سیکرٹری مجلس احرار اسلام مرکزیہ ہند۔
لاہور۔ ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء"

آل کشمیر مسلم کانفرنس

۲۵۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو مسلمانانِ کشمیر کی ایک نمائندہ کانفرنس شیخ عبداللہ کی صدارت میں شروع ہوئی۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر اقبال اور خواجہ حسن نظامی کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے مگر مولانا داؤد غزنوی کے خط کا حوالہ نہ دیا گیا اور نہ ہی مجلس احرار کی قربانیوں کا تذکرہ آیا۔ اس میں شیخ عبداللہ نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"گزشتہ تحریک فرقہ وارانہ اتحاد اور بلا امتیاز مذہب وملت اپنے ہم وطنوں کی ترقی کے لیے تھی۔ آپ نے مہاراجہ کی ذات اور تخت کے ساتھ اطاعت اور وفاشعاری کا اظہار کیا۔ نیز آپ نے گلینسی کمیشن کے مختلف مفید نکات کا ذکر بھی کیا۔ مہاراجہ بہادر کے ہمدردانہ رویے کا شکریہ ادا کیا۔

آخر میں آپ نے سٹر گلینسی کی تجویز کردہ اسمبلی پر نکتہ چینی کی اور اس میں ترمیم کا مشورہ دیا۔ لیکن ساتھ کشمیری عوام سے کہا کہ وہ گلینسی اصلاحات کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔

پونچھ کے حالات پر روشنی ڈالی۔ اور تجویز کی کہ وہاں کے لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جائے۔

برطانوی فیصلے کے خلاف متحدہ محاذ

مسلم لیگ کے سروں اور خان بہادروں کے سوا برطانوی فیصلے پر ہندوستان کی کسی قوم کو بھی اطمینان نہیں تھا۔ اس کے لیے مسلم کانفرنس کے رہنماؤں نے جن میں مولانا شوکت علی، چودھری خلیق الزمان شیخ عبدالمجید سندھی پیش پیش تھے۔ مختلف مکاتیب فکر کو (۸۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء) کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔ لیکن پنجاب سے ڈاکٹر سر محمد اقبال اور مولانا ظفر علی خاں نے اس کانفرنس

میں شمولیت سے انکار کیا۔ ساتھ ہی آل انڈیا مجلس احرار نے بھی معذرت کرتے ہوئے ارکانِ کانفرنس کو حسب ذیل تار دیا۔

"جب پنجاب کے نمائندے اس کانفرنس میں شامل نہیں ہو رہے تو مجلس احرار کو بھی اس میں شامل ہونے سے معذور سمجھا جائے۔" شیخ حسام الدین"

اس کے ساتھ ہی مولوی سر محمد یعقوب ایم۔ ایل۔ اے آنریری سیکرٹری مسلم لیگ نے مولانا شوکت علی کو تار دیا۔

"مسلم لیگ لکھنؤ کانفرنس میں شامل نہیں ہوگی۔"

مولانا آزاد کا تار شیخ حسام الدین کے نام

۱۱۔ اکتوبر۔ شیخ صاحب! آپ ۱۴۔ اکتوبر کو لکھنؤ پہنچ جاویں۔

جواب "اکثریت (ہندوؤں کی) کی طرف سے قطعی شرائط یا متبادل تجویز کے بغیر آل پارٹیز کی تحریک قبل از وقت اور غیر مناسب ہے۔ تاہم مرکزی مجلس احرار آپ سے اور دوسرے دوستوں سے گفتگو کے لیے تیار رہے بشرط کہ آپ لاہور تشریف لادیں نیز اپنی آمد کی اطلاع بذریعہ تار دیں۔"

۱۲۔ اکتوبر کو مولانا شوکت علی اور شیخ عبدالمجید سندھی کا ایک تار مولانا داؤد غزنوی کے نام آیا۔

"اسلامی اتحاد کے پیش نظر آپ کو لکھنؤ کانفرنس میں ضرور شریک ہونا چاہیے۔"

جواب "برقی پیغام کا شکریہ! احرار فرقہ وارانہ مفاہمت کی ہر تحریک کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن ہندوؤں کی طرف سے قطعی تجویز کا پیش ہونا ضروری ہے تاکہ مسلمان اس پر غور کر سکیں۔ لہٰذا برائے کرم مجوزہ کانفرنس ملتوی کر دی جائے۔"

دوسرے روز ایک اور تار مجلس احرار کی طرف سے لکھنؤ بھیجا گیا۔

"ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب نہایت ضروری ہے۔ ورنہ لکھنؤ کانفرنس ملتوی کر دی جائے۔"

ان تمام کوششوں کے باوجود ۱۵۔ اکتوبر کو لکھنؤ میں کانفرنس ہوئی لیکن ناکام رہی۔

اس پر بھی مولانا شوکت علی اور دوسرے حضرات نے اس اجتماع کو ۲۸ اکتوبر کیلئے ملتوی کر دیا۔

کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد

۱۵۔ اکتوبر کی مجوزہ کانفرنس کے بعد کشمیری مسلمانوں کے لیے مسلم کانفرنس کے نام سے ایک جماعت ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو قائم کی گئی۔ جس کے پہلے صدر شیخ محمد عبداللہ اور جنرل سیکرٹری چودھری غلام عباس منتخب ہوئے۔

شیخ محمد عبداللہ ۵۔ دسمبر ۱۹۰۵ء کو سری نگر کے قریب ایک گاؤں شورہ پور میں شیخ محمد ابراہیم کے گھر پیدا ہوئے۔ لیکن ان کی پیدائش سے قریباً پندرہ دن قبل ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ شیخ عبداللہ اپنے والد کی دوسری بیوی کے بطن سے تھے۔ اپنے چھ بھائیوں میں شیخ صاحب سب سے چھوٹے تھے۔ دو بہنیں تھیں۔ ابتدائی تعلیم گھر میں اور میٹرک تک سری نگر میں۔ پھر لاہور اسلامیہ کالج سے فارغ ہو کر علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ اور ۱۹۳۱ء میں تحریک آزادی کشمیر سے وابستہ ہو گئے۔

شیخ عبداللہ کی شادی ۱۹۳۲ء میں شیخ محمد حسین کی دختر سے ہوئی۔

شیخ محمد حسین اسلام قبول کرنے سے پیشتر عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا نام مسٹر نیڈو تھا۔ لاہور مال روڈ پر نیڈوز ہوٹل کے مالک تھے۔ آج کل یہ ہوٹل پاک لگژری کے نام سے مشہور ہے۔

سرینگر میں انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی پیر کرم شاہ نامی ایک شخص سے کی جو درحقیقت بدقماش تھا۔ لیکن بظاہر اس نے پیری کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ جب یہ راز فاش ہوا تو شیخ محمد حسین نے زبردستی اس سے اپنی لڑکی کی طلاق حاصل کر لی۔ اور یہی وہ نیک خاتون ہیں جو بعد میں شیخ عبداللہ کی رفیق حیات بنی۔

شیخ عبداللہ امرتسر میں

تحریک کشمیر میں شیخ عبداللہ نے جو کردار ادا کیا۔ مجلس احرار کو اس پر شبہ رہا۔ کہ موصوف کی پشت پناہی قادیانی کر رہے ہیں۔ وہ جیسے چاہتے ان سے کام لیتے ہیں۔

۱۷۔ نومبر ۱۹۳۲ء کو شیخ محمد عبداللہ امرتسر آئے تو ان کا قیام اسماعیل غزنوی کے مکان کوچہ غزنویہ کٹڑہ مہا سنگھ میں ہوا۔ حالانکہ امرتسر میں لاکھوں کشمیری گھرانے موجود

تھے۔ مگر اسماعیل غزنوی کے مکان پران کا قیام مجلس احرار کے شبے کو تقویت دے رہا تھا۔

اسماعیل غزنوی قادیانیوں کے خلیفہ اول حکیم نورالدین کے حقیقی نواسے تھے۔ اسماعیل غزنوی کی حقیقی خالہ بشیرالدین محمود کی بیوی تھی۔ اس رشتے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شیخ عبداللہ کا اسماعیل غزنوی کے ہاں ٹھہرنا خالی از علت نہیں تھا۔ ع

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

الہ آباد کانفرنس کی دعوت

۲۸۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو مولانا شوکت علی کا ایک تار شیخ حسام الدین کے نام جس میں درج تھا کہ

"مسلم کانفرنس کے اجلاس ۱۴۔ ۱۵ اکتوبر کو لکھنؤ میں ہوئے۔ ان کے نتیجے میں مختلف الخیال مسلمانوں کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی کہ وہ ۳۔ نومبر کو الہ آباد میں سکھوں اور ہندوؤں کے نمائندوں کے ساتھ گفتگو کرے۔ ان نمائندوں کو پنڈت مدن موہن مالوی نے الہ آباد میں جمع کیا ہے۔ اس گفتگو کی غرض و غایت یہ ہے کہ کوئی مفاہمت کی راہ نکالی جا سکے۔

اس مرحلے پر جناب کی موجودگی ضروری ہے۔ لہٰذا میری استدعا ہے کہ آپ ۲۔ نومبر کو الہ آباد پہنچ جائیں۔ بڑی نوازش ہوگی۔ آپ تشریف آوری سے قبل مسٹر ظہور احمد بیرسٹر الہ آباد کو یا میرے سیکرٹری کو مطلع کر دیں۔ میں ۲۷۔ ۲۸۔ اکتوبر کو بمبئی میں ہوں گا۔

آپ کا خادم "شوکت علی"

جواب

مولانا داؤد غزنوی اور شیخ حسام الدین نے مشترک خط میں مولانا آزاد کو جواب دیا۔

"جناب کی تشریف آوری کی توقع پہلے سے ہے۔ الہ آباد میں گفت و شنید کا فیصلہ کرنے سے پیشتر براہ کرم آپ لاہور تشریف لائیں۔ یہ بات چیت ضروری ہے۔ تشریف آوری سے مطلع فرمائیں۔

مجلس مرکزیہ کا اجلاس

مسلسل خط و کتابت کے بعد بالآخر مولانا داؤد غزنوی الہ آباد کانفرنس میں شامل ہوئے۔ اور کانفرنس کے فیصلوں پر جماعت کی منظوری کے لیے لاہور میں ۲۔ ۳۔ ۴۔ دسمبر کو مجلس شوریٰ کا ایک اہم اجلاس بلایا گیا۔

جس کے لیے ہندوستان کی مجالس احرار کو حسب ذیل خط لکھا گیا۔

"۲۰۔ نومبر، مولانا داؤد غزنوی جو الہ آباد کانفرنس میں باصرار شامل ہوئے تھے، انہوں نے مرکز کو اطلاع دی ہے کہ الہ آباد اتحاد کمیٹی نے جو قرارداد پاس کی ہے وہ ۵۔ دسمبر کو الہ آباد میں منظوری کے لیے پیش کر دی جائے گی۔ الہ آباد کانفرنس کا فیصلہ اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس فارمولا میں بنگال، پنجاب اور سندھ کا مسئلہ خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

مشترک انتخاب کے متعلق بھی بالکل نئی صورت پیش کی گئی ہے۔ یہ معمولی مسائل نہیں بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی مستقبل پر ان کا گہرا اثر پڑنے والا ہے۔ اس لیے ہندوستان کی تمام مجالس سے درخواست کروں گا کہ مجلس احرار کے اس اہم اور غیر معمولی اجلاس میں اپنے نمائندے بھیج کر قیمتی مشوروں سے مجلس مرکزیہ کو مستفید فرمائیں۔

یہ اجلاس ۲-۳-۴۔ دسمبر کو دفتر مرکزیہ لاہور میں منعقد ہوں گے۔

آپکا (شیخ) حسام الدین

مسلم لیگ کی تائید

۲۸۔ نومبر آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک اہم اجلاس زیر صدارت عبدالعزیز بیرسٹر (پشاور) منعقد ہوا جس میں مولوی سر محمد یعقوب نے حسب ذیل قرارداد پیش کی جو اتفاق رائے سے منظور ہو گئی۔

"الہ آباد کانفرنس کی تجاویز کے متعلق ۲۰۔ نومبر کو مسلم لیگ کی کونسل نے مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ اور جمعیتہ علمائے ہند نے متفقہ طور پر جو قرارداد منظور کی ہے اس کی تائید کرتی ہے۔

۴۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو مجلس مرکزیہ کا ایک اہم اجلاس الہ آباد کانفرنس کی قرارداد پر غور کرنے کے لیے شیخ حسام الدین کی صدارت میں لاہور برکت علی ہال میں دن کے چار بجے منعقد ہوا۔ صدر اجلاس نے الہ آباد کانفرنس کی قرارداد پر روشنی ڈالی۔ دو گھنٹے کی طویل اور مسلسل بحث کے بعد حسب ذیل افراد پر مشتمل ایک سب کمیٹی بنا دی گئی جو اتحاد کانفرنس

کی قرارداد پر اپنی سفارشات مرکز کو پیش کرے گی۔

سب کمیٹی کے ممبران شیخ حسام الدین۔ صدر۔ مولانا داؤد غزنوی جنرل سیکرٹری میاں احمد شاہ بیرسٹر (چارسدہ۔ ضلع پشاور) سید محمد احمد کاظمی ایڈوکیٹ سہارنپور۔ یوپی۔ چودھری عبدالستار بی۔ اے۔ میونسپل کمشنر (فیروزپور) مولانا عبدالرحمٰن (نکودر۔ ضلع جالندھر) چودھری عبدالعزیز (بیگھووال۔ ریاست کپورتھلہ)

دوسرا اجلاس رات آٹھ بجے سب کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی جو الہ آباد کمیٹی کے متعلق تھی۔ اس پر غور کرنے کے لیے دفتر مرکزیہ میں دوسرا اجلاس ہوا۔ تمام رات اس پر بحث رہی۔ آخر چار بجے صبح عارضی طور پر اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔

تیسرا اجلاس ۵۔ دسمبر کو صبح دس بجے مجلس مرکزیہ کا تیسرا اجلاس برکت علی ہال میں شروع ہوا۔ صدر۔ شیخ صاحب تھے۔ جس میں سب کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ جس پر مجلس احرار کے مرکزی ارکان نے تفصیلی بحث کی۔ یہ تمام بحث صیغہ راز میں رہی کیونکہ اس اجلاس میں پریس کے نمائندوں کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ تاہم اس قدر معلوم ہوا، کہ مجلس مرکزیہ نے الہ آباد کانفرنس کی تمام کارروائی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا ہے۔ جو مختلف اقوام ہند کے اختلاف کو مٹانے کے لیے منعقد کی گئی۔ اور ان تجاویز مصالحت میں بعض تعمیری نقطہ نظر سے ترمیمیں تجویز کی گئی ہیں۔ تاکہ مجلس احرار کے نمائندے ان ترامیم کو آل مسلم پارٹیز اور اتحاد کانفرنس الہ آباد میں پیش کر سکیں۔ نیز مجلس مرکزیہ نے حسب ذیل افراد کو کانفرنس کے لیے منتخب کیا۔

شیخ حسام الدین۔ غازی عبدالرحمٰن۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی۔ میاں احمد شاہ بیرسٹر پشاور۔ میاں غلام صابر وکیل فیروزپور۔ سید محمد احمد کاظمی ایڈوکیٹ مولانا وحیدالدین علیگڑھ اور چودھری عبدالعزیز بیگھووال۔

یہ اجلاس رات نو بجے ختم ہوا۔

اتحاد کانفرنس کی ناکامی

کیمونل ایوارڈ کا اعلان کرتے ہوئے برطانوی وزیراعظم نے یہ بات واضح کر دی تھی اگر اقوام ہند نے کوئی متفقہ فارمولا پیش کیا تو اس ایوارڈ میں ترمیم کر دی جائے گی۔

برطانوی اعلان سے سیاسی استفادہ کے لیے گاندھی جی نے بغیر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے مشورہ کے اچھوتوں کے مسئلہ پر مرن برت رکھنے کا اعلان کر دیا۔ مہاتما گاندھی کی سیاسی شخصیت نے اقوام ہند پر بلا امتیاز اثر کیا۔ اور آخر کو چھ دن کے بعد برطانوی پارلیمنٹ نے گاندھی جی کے مطالبے کو منظور کر لیا۔ اسی بنیاد پر ہندو مسلم رہنماؤں نے جن میں مولانا شوکت علی، چودھری خلیق الزمان۔ شیخ عبدالمجید سندھی اور پنڈت مدن موہن مالوی نمایاں تھے۔ پہلے لکھنؤ میں پھر الٰہ آباد میں ہندوستان کی دوسری سیاسی جماعتوں سے رابطہ قائم کر کے انہیں دعوت دی کہ وہ ہندو مسلم حقوق کے مسئلے پر باہم مل کر کسی نتیجے پر پہنچیں۔ تاکہ فرقہ وارانہ مسائل کا حل تلاش کیا جا سکے۔ لیکن نہرو رپورٹ کی طرح الٰہ آباد اتحاد کانفرنس بھی پنجاب کے مسئلہ پر ہندوؤں اور سکھوں کی ہٹ دھرمی کے باعث ناکامی کا باعث بنی۔

۷۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو آل انڈیا مسلم لیگ نے اس اجلاس میں جو الٰہ آباد کے بعد کلکتہ میں ہونے والا تھا، شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح مجلس احرار کے ناظم اعلیٰ مولانا سید محمد داؤد غزنوی جو الٰہ آباد کے فیصلوں پر جماعت کے مشورے کے لیے لاہور آئے تھے۔ ۲۲۔ دسمبر کو شیخ حسام الدین کو ایک خط کے ذریعے مطلع کر دیا کہ وہ اس معاہدے پر دستخط نہ کریں۔ اور اس خط کی نقل مولانا آزاد اور پنڈت مدن موہن مالوی کو بھیج دی

خط کا متن! <u>الٰہ آباد کے معاہدے پر دستخط نہ کیے جائیں</u>

مولانا داؤد غزنوی نے ۲۲۔ دسمبر کو پنڈت مالویہ کو جو اس وقت اتحاد کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے اس مضمون کا نوٹ لکھ کر دیا تھا کہ "میں پنجاب فارمولا کے نمبر۲ کو اپنی جماعت کے صریح فیصلوں کے خلاف پاتا ہوں۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ میں اس سے اتفاق کروں لہٰذا پنجاب کے مسئلے کو فی الحال ملتوی کر دیا جائے اور سب کمیٹی

کا اجلاس جو کلکتہ میں ہونے والا ہے اس میں پیش کیا جائے۔ تاکہ اس دوران میں اپنی جماعت سے مشورہ کرکے آخری فیصلہ کمیٹی کے سامنے پیش کرسکوں۔ اس نوٹ کی نقل مولانا آزاد کو بھیج دی گئی ہے۔

۲۳۔ دسمبر کو مولانا غزنوی الہ آباد سے روانہ ہو کر مجلس احرار سے مشورہ کرنے کیلئے لاہور آگئے۔ انہوں نے پنجاب میں جماعت کے مشورے کے بعد پنڈت مالوی اور مولانا آزاد کو مندرجہ ذیل خط لکھا

"پارٹی سے طویل بحث کے بعد اس حقیقت سے آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ احرار پنجاب کے فقرہ ۳ سے متفقہ طور پر شدید مخالف ہیں۔ اور اس کو جمہوری طرز کے خلاف اور پنجاب کے دستوری نشوو ارتقاء کے راستے میں رکاوٹ اور فرقہ وارانہ بداعتمادی کو ترقی دینے والا اور قوم پرستانہ جذبہ کے خلاف سمجھتے ہیں۔ نیز مسئلہ پنجاب کے متعلق مولانا محمد علی والا فارمولا ترمیم شدہ شکل میں نامنظور کرتے ہیں۔ لہٰذا مجلس احرار کی طرف سے اس پر دستخط نہ کریں"

کلکتہ ۲۴۔ دسمبر جمعیۃ علمائے ہند نے بھی الہ آباد فارمولا کو اپنے اجلاس میں مسترد کر دیا۔ اس طرح ہندو مسلم اتحاد کی یہ کوشش بھی پیشتر کی ناکام کوششوں میں جمع کر دی گئی۔

ایکٹ ۱۹۳۵

ان حالات میں تیسری گول میز کانفرنس کے آخری اجلاس ۲۴۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو وزیر ہند نے اعلان کیا کہ

"سندھ کو بمبئی سے الگ کرکے مستقل صوبہ بنا دیا۔ اس طرح اڑلیسہ کو بھی ایک الگ صوبہ کی حیثیت دے دی۔ اور مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کے ساتھ سواتینتیس فیصد نشستیں دے کر مطمئن کر دیا"

اس پر بھی پنجاب اور بنگال کے مسلمان مطمئن نہیں تھے۔ کیونکہ پنجاب کی چھپن فیصد مسلمان آبادی کو معمولی اکثریت حاصل رہی۔ اور یہی حال بنگال میں ہوا۔

———*———

سنہ ۱۹۳۳ء

تاریخ جب قوموں کی داستانوں کو اپنے دامن میں گرہ دیتی ہے تو اسے واقعات کی چھان بین میں کبھی سمندروں اور کبھی ستاروں سے ہمکلام ہونا پڑتا ہے۔ زمین کے ذرات اور پہاڑوں کی برف پوش وادیاں بھی شہادت کے کٹہرے میں مؤرخ کے سامنے صف آرا دکھائی دیتی ہیں۔ موسموں کے جوار بھاٹا بھی واقعات کو اپنے ساتھ سمو لیتے ہیں کہ مستقبل کی تاریخ میں خلا محسوس نہ ہو۔

خود مؤرخ کا قلم تاریخ کی شہادت کا اہم جزو ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندہ قومیں مؤرخ کے قلم کو مستقبل کے چوکھٹے میں محفوظ کر لیتی ہیں۔ ورنہ افسانوی طرزِ تحریر کے گل بوٹوں سے بزم آرائی کوئی مشکل نہیں۔ اور ایسے قلم جنسِ ارزاں کی طرح جس بھاؤ فروخت ہوتے ہیں۔ قلمکار کا ضمیر بھی اسی ترازو میں تل جاتا ہے۔

۱۹۳۲ء کا آفتاب متحدہ ہندوستان کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا آخر شفق کی گہرائیوں میں کھو گیا۔ اور ۱۹۳۳ کی سنہری کرنوں نے نئے سال کا خیر مقدم کیا۔ ڈوبتے ستاروں نے سالِ نو کو خوش آمدید کہا۔ بہاروں نے دُھلے ہوئے پھولوں کے گجرے پہنائے۔ لیکن غلام ہندوستان کا چہرہ بدستور بے رونق رہا۔ غیر ملکی حکومت کے سائے پھیل رہے تھے۔ حالات کی کجروی بساطِ سیاست پر بکھرے ہوئے مہروں کو اس طور سے حرکت دے رہی تھی کہ ہر بازی مات کھائے جا رہی تھی۔

تیسری گول میز کانفرنس کے گرد بیٹھے ہندوستانی سیاستدانوں کی اکثریت نے فرنگی دانشوروں کی زبان میں گفتگو کر کے اپنے دیش کی غلامی کی زنجیروں کو مزید پختگی بخشی۔ جس پر برطانوی وزیر اعظم نے بڑے حوصلے سے غلام ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا۔ یہی وہ غلط فیصلہ تھا جس نے سال ۱۹۳۳ء کو آزادی کی طرف قدم بڑھانے

کا نیا حوصلہ دیا۔

ریاست کپور تھلہ میں بے چینی

گذشتہ سال ۲۴۔ دسمبر کو برطانوی وزیر اعظم نے ہندوستان کو نئی اصلاحات دیتے وقت جس خبثِ باطن کا اظہار کیا تھا۔ غلام ہندوستان کے سیاستدانوں نے ہر امکانی طریق اور باہم مشوروں سے اسے ٹالنے اور رد کرنے کی کوشش کی۔ آخر انہیں شکست ہوئی اور ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے ہندوستان کو نئی اصلاحات کا کھلونا دے کر بہلا دیا گیا۔

گو کانگریس ان دنوں بھی انگریز سے برسرِ پیکار تھی اور مہاتما گاندھی سمیت اس کے اکثر رہنما جیل خانوں میں تھے۔ تحریک آزادیٔ کشمیر کے جرم میں مجلس احرار کے اکثر ذمہ دار رہنما میعادِ اسیری گزار رہے تھے۔ اس طرح میدان خالی پاکر رجعت پسند عناصر آئندہ انتخابات کی تیاریوں میں اپنی کامیابیوں کے نقشے لکیرنے لگا۔

ان دنوں ہندوستان میں چار گروہ باہم متصادم تھے۔ حکومت، کانگریس، فرقہ پرست جماعتیں اور رجعت پسند (سرکار پرست) گروہ۔ مجلس احرار متحدہ ہندوستان کی پانچویں سیاسی طاقت ہونے کے باوجود متذکرہ قوتوں سے الگ اپنی راہیں متعین کر رہی تھی۔ چونکہ احرار ورکنگ کمیٹی کے اکثر ارکان جیلوں میں تھے۔ لہٰذا احرار تصادم کے اکھاڑے میں نہیں تھے۔

کشمیر میں مجلس احرار کی انقلابی تحریک کے بعد دیگر ہندوستانی ریاستوں کی دوہری غلامی میں الجھی ہوئی مظلوم رعایا نے نواب اور راجاؤں سے گلو خلاصی کے لیے کروٹ لی۔ پانچ سو سے زائد ہندوستانی ریاستیں انگریزی سامراج کا ہندوستان میں مضبوط ترین حصار تھیں اس قلعہ میں کسی قسم کی دراڑ غیر ملکی سامراج کو پسند نہیں تھی۔ چنانچہ کشمیر اور پھر الور میں راعی اور رعایا میں تصادم حکومت برطانیہ کو پسند نہیں تھا۔ اور یہی آگ اب بڑھتے بڑھتے کپور تھلہ تک آن پہنچی۔

ریاست کپور تھلہ پنجاب میں دریائے بیاس کے مغرب میں واقع تھی۔ والیٔ ریاست ہز ہائی نس مہاراجہ جگجیت سنگھ اکثر ریاست سے باہر رہ کر یورپ میں اپنا وقت گزارتے۔ ریاست

کا نظم ونسق وزیر اعظم میاں سر عبدالحمید کے سپرد رہتا۔ برطانوی خطاب یافتہ ہونے کی حیثیت سے ان کا ہر فعل فرنگی منشا کے مطابق تھا۔

باوجود کہ ریاست میں ساٹھ فیصد مسلم آبادی تھی۔ لیکن ہندو ساہوکار نے زمیندار طبقہ کو جس میں سکھ بھی شامل تھے۔ اپنی مخصوص ذہنیت سے پریشان کر رکھا تھا۔ اس پر ریاست میں مسلمان اور سکھ زمینداروں نے مشترک طور پر زمیندار لیگ قائم کی۔ جس کے صدر بگھیوال (ریاست کپور تھلہ) کے رئیس چودھری عبدالعزیز منتخب ہوئے۔ اس کے ذریعہ سے ریاستی حکام سے مطالبہ کیا گیا کہ۔

"ریاست میں انتقال اراضی اور ساہوکارہ قانون کا طریق رائج کیا جائے جو پنجاب میں گزشتہ بتیس سال سے لاگو چلا آرہا ہے"

اس کے جواب میں ۵۔ جنوری ۱۹۳۳ء کو ریاست کپور تھلہ کی تحصیل پھگواڑہ کے ہندو ساہوکاروں نے وزیر اعظم ریاست سے درخواست کی کہ۔

"ریاست کپور تھلہ میں قانون برائے انتقال اراضی اور ساہوکارہ قانون کا نفاذ نہ کیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ریاست بحران کا شکار ہو جائے گی"

یہ حقیقت ہے کہ ریاست میں ساٹھ فیصد مسلم آبادی تھی لیکن ایسا کوئی قانون جس کے نفاذ پر ہندو ساہوکار ناراض تھا۔ اگر نافذ ہو جاتا تو صرف مسلم اکثریت کو ہی نہیں سکھ زمیندار بھی اس سے مستفید ہوتا۔ لیکن ساہوکارانہ ذہنیت نے اپنے مخصوص تحفظ کیلئے یہ گوارہ نہ کیا۔

جیسے ہی مندرجہ بالا درخواست کا متن اخبارات میں شائع ہوا "زمیندارہ لیگ" کے صدر نے ریاست کے ہندو ساہوکار کی اور زمیندار طبقہ کی پوزیشن واضح کرنے کیلئے حسب ذیل بیان پریس کو دیا۔

"اس حقیقت کے اعتراف سے کسی صحیح الدماغ کو آج تک کوئی انکار نہیں ہوا کہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے۔ اور اس کی ترقی کا تمام تر انحصار زراعت پر ہے۔ جہاں زراعت کی ترقی ملک کی بہبود کے لیے ضروری ہے

وہاں یہ بھی لازم آیا ہے کہ زراعت پیشہ جماعتوں کے تحفظات کو نظر انداز کرنا ترقی کی راستے میں سدِ سکندری قائم کرنے کے مترادف ہے۔ تیز حکمرانوں نے بھی اسے اہمیت دینے میں کبھی تساہل نہیں کیا۔ جس کی زندہ مثال حکومت انگریزی کے قیام سے قبل انتقال اراضی پر قیود کا عاید کیا جانا بعض ہندوستانی ریاستوں میں پایا جاتا ہے۔ حکومت انگریزی کو بھی آج سے ساٹھ سال قبل اس امر کا احساس ہوا کہ زراعت پیشہ قوم کو ساہوکاروں کے پنجے سے محفوظ رکھنے کے لیے عملی قدم اٹھایا جائے۔ مگر اسی صوبہ کا ایک چھوٹا سا حصہ یعنی ریاست کپورتھلہ کا زراعت پیشہ طبقہ اس سے محروم رہا۔

اس ریاست کے زمینداروں نے اس محرومی کو مدت سے محسوس کرتے ہوئے بارہا اپنے لائق حکمرانوں اور ان کی حکومت کو ہر مناسب موقعہ پر توجہ دلانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ مگر مسلسل بیس سال سے ان کی صدائیں صدا بصحرا ثابت ہوتی رہیں۔ مہاراجہ صاحب اور ان کی حکومت نے اس بارے میں زمیندار رعایا کی پیہم درخواستوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ ہمارے نزدیک اس کا باعث ساہوکاروں کا زبردست پروپیگنڈہ ہے۔

عین مایوسی کے عالم میں ریاست کے زمینداروں نے اپنے اس آئینی حقوق کے حصول کے لیے اب کی دفعہ عزم راسخ کے ساتھ جدوجہد کا آغاز کیا ہے اور مہاراجہ صاحب کو توجہ دلانے میں یہاں تک کامیابی حاصل کی ہے کہ ایک کمیٹی کا تقرر ظہور میں آیا۔ کمیٹی کے وجود میں آتے ہی ریاست کے ساہوکاروں اور ہندو پریس نے اس کے خلاف پراپیگنڈہ کا طوفان بدتمیزی برپا کر دیا ہے۔

مہاراجہ بہادر اور ان کے کارپردازانِ حکومت کو مرعوب کرنے کا کوئی حیلہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ مختلف عنوانوں اور زہر آلود تقریروں سے فضا کو مکدر کرنے کے لیے ریاست کے ساہوکار انتہائی کوشش سے کام لے رہے ہیں

پریس کی یہ بیہودگیاں، پراپیگنڈے کے جو ذرائع اور جو مہارت انہیں حاصل ہے وہاں اپنی بے چارگی ایسی بے بسی نیز کپور تھلہ کی بساطِ سیاست پر زمینداروں کا فقدان ہمارے لیے باعثِ مایوسی ہے۔ ہمارے پہلو میں بھی دل ہے اور اس میں عزم ہے، اپنی اس عزیمت پر ہمیں پورا بھروسہ ہے۔ اس لیے بلا کسی خوف اس امر کا ایک بار نہیں ہزار بار اعلان کرنے میں پس و پیش سے کام نہیں لیتے کہ ہمارا یہ حق ہے اور ہم اسے حاصل کر کے دم لیں گے۔

پراپیگنڈہ اور تمام حیلہ سازیاں جو آج بروئے کار ہیں۔ ہم ان سے بے نیاز ہیں اور اب وہ دن گئے جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے:

اخبارات میں جس قدر چاہیں ساہوکار حضرات شور مچائیں۔ ہمارے سادہ لوح بھائیوں کو للکاریں۔ اور خاص خاص شخصیتیں بلا وجہ اس تحریک کے روحِ رواں پر اتہام لگائیں۔ لیکن آنے والا وقت خود فیصلہ کرے گا کہ قانونِ انتقالِ اراضی کے حصول کی جو آواز اس وقت ریاست میں بلند ہے وہ کن کی آواز ہے۔

ہم نے آج تک اس معاملے میں کامل حزم و احتیاط سے کام لیا ہے کہ اس ریاست میں کون کون سی طاقتیں اپنے منصبی فرائض کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ ہمیں اب بھی اپنی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس راز کو طشت از بام کرنے میں تامل ہے۔ اس مقام پر کمیٹی مذکور کی ساخت میں زمیندار عنصر کی اقلیت کو ہم نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس کمی کو پورا کرنے اور شہزادگان ریاست میں سے کسی ایک اور صاحب کو اس میں شمولیت کی تکلیف دینے کے متعلق سنٹرل زمیندارہ لیگ مہاراجہ صاحب بہادر دوران کی حکومت کو توجہ دلا چکی ہے۔ ہم اب بھی اس کی اہمیت کے اظہار پر مجبور ہیں کہ بجز اس کے کہ کمیٹی ہمارا کامل اعتماد حاصل نہیں کر سکی۔ مہاراجہ اور کمار صاحبان میں سے کسی ایک کو شامل کر لیا جانا ہمارے نزدیک

اس لیے از بس ضروری ہے کہ غیر جانبدار صرف انہی کی ذات ہو سکتی ہے۔"

(روزنامہ "انقلاب"۔ لاہور۔ ۱۴۔ جنوری ۱۹۳۳ء)

الور کی صدائے بازگشت

گذشتہ سال ریاست الور کے مہاراج دیوداس کی مسلم رعایا اور اندرون ریاست کی سیاسی اور مذہبی بے چینی کے باعث جس تحریک نے جنم لیا تھا وہ تصفیہ مجلس احرار کی مداخلت سے طے ہو چکا تھا۔ تاہم اس تالاب میں تلاطم کی لہریں بدستور کناروں سے ٹکراتی رہیں۔ یہاں تک کہ یہ معاملہ پھر مجلس احرار کے پاس آیا۔ چنانچہ صدر مجلس احرار شیخ حسام الدین نے ۱۳۔ جنوری ۱۹۳۳ء کو ریاست مذکور اور مجلس احرار کی پالیسی پر ایک بھرپور بیان دیا۔

"الور کے رنجیدہ حالات جن کا سلسلہ ایک عرصے سے شروع ہے اور جنکی انتہا وہ خونی منظر ہے جو اڑھائی سو بیگناہ داد طلب کرنے والے انسانوں کی تڑپتی ہوئی لاشوں نے ایک ستم گر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور اس سے بھی بہت بڑی تعداد میں زخمیوں کی آہوں نے ہندوستان کی فضا کو متاثر کیا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوا ہے کہ شروع سے لے کر اس وقت تک اس تمام معاملے میں اصل وجوہ اور صحیح واقعات کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اور اخبارات میں شروع سے اسے مذہبی رنگ دے کر کاشتکاروں کی جائز اور مبنی بر صداقت تحریک کو بغاوت اور مذہبی تعصب کے نام سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ مجلس احرار ہند سیاسی معاملات میں ملکی جمہوریت پر کاربند ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ برطانوی ہند یا ریاستوں میں کوئی امتیاز نہیں کرتی۔ اس کی نظر میں برطانوی ہند کی غیر ذمہ دارانہ دفتری حکومت اور ریاست کا نظام ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں جسے شکست دینے کے لیے احرار وجود میں آئی ہے۔

مجلس احرار بار بار اعلان کر چکی ہے کہ وہ مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر مظلوم انسانوں اور جماعتوں کی امداد کے لیے آمادہ ہے اور جبکہ

الور کے مظلوم انسانوں کی آہیں بلند ہو رہی ہیں۔ مجلس احرار مجبور ہے کہ ان کی جائز اور مؤثر امداد کر کے اپنے انسانی فرض سے عہدہ برآ ہو۔

مجلس احرار تمام شاخوں کو ہدایت دیتے ہوئے اعلان کرتی ہے کہ وہ الور کے معاملے کے اصل پہلوؤں کو عوام کے سامنے رکھیں۔ الور کے واقعات کو غیر مذہبی رنگ دے کر عوام کو اصل حالات سے آگاہ کریں۔ نیز اس سلسلے میں پبلک جلسے کریں اور جلوس نکالیں۔"

اس بیان کے ایک ہفتہ بعد الور کے پرائم منسٹر نے انگریز انسپکٹر پولیس اور ریونیو کمشنر انگریز مقرر کر کے ریاست میں سیاسی اور مذہبی اصلاحات کا نفاذ کیا جس سے ریاست کے حالات میں بہت حد تک سکون آ گیا۔

امیر شریعت کی رہائی

۱۷۔ جنوری ۱۹۳۳ء کو مولانا سید عطا اللہ شاہ بخاری حریت کشمیر کے جرم میں اپنی میعادِ اسیری گزار کر نیو سنٹرل جیل ملتان سے رہا کر دیئے گئے۔

کپورتھلہ تحریک کا سیاسی پس منظر

جب قومیں آپس میں نفاق کا شکار ہو جائیں تو حکمران ٹولہ اس چنگاری کو ایسی ہوا دیتا ہے کہ یہ آگ محبت کی دیوار پھاند کر گھر کا گھر پھونک دیتی ہے۔ جھونپڑیوں سے نکل کر یہ الاؤ جب امرا کے محل تک پہنچتا ہے تو احساس ملوکیت بیدار ہو کر اپنا محاسبہ کرنے لگتا ہے۔ لیکن بے وقت کی راگنی کی طرح یہ آواز کسی کان کو بھلی نہیں لگتی۔

تحریک کشمیر شہری آبادی سے نکل کر جب دیہاتی زندگی میں تحلیل ہوئی تو اس کی صدائے بازگشت ریاست کپورتھلہ میں سنائی دی۔ کشمیری مسلمانوں پر ڈوگرہ شاہی کے تشدد نے ملت اسلامیہ کے ہر فرد کو ماہئ بے آب کی طرح تڑپا دیا۔ مسلمان کا خون اپنی قیمت وصول کیے بغیر ارزاں ہونے لگا تو جسم کے ساتھ روح میں بھی ارتعاش پیدا ہوا۔ چنانچہ دیگر اضلاع کی طرح کپورتھلہ کے مسلمانوں نے مسلمانان کشمیر کی ہمدردی میں آواز بلند کی۔ ریاست کے ہندو ساہو کار نے اس آواز کو اپنے لیے بھیانک اور

مخدوش سمجھ کر اس کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ جس نے آئندہ چل کر ایک تحریک کی سورت اختیار کر لی۔

ہندو ساہوکار کے مقابل مجلس احرار کے رضا کاروں نے موضع بگھو وال اور تحصیل بھولتھ (ریاست کپورتھلہ میں راجپوتوں کے گاؤں) میں نماز کمیٹیاں قائم کیں اور ہر صبح مسلمانوں کو نماز کے لیے کہنا اور انہیں خلاف شرعی رسموں سے روکنا ان کا موقف تھا۔ مسلمان عورتوں کو ان کے گھروں میں جا کر انہیں بازار سے سودا سلف خریدنے سے روکا گیا۔ ہندو، ریاست کا ہو یا برطانوی ہند کا اس کی بنیا ذہنیت کے ساتھ سیاسی رگ ہمیشہ بیدار رہتی ہے۔

ریاست کے ہندو ساہوکار نے مسلمانوں کی متذکرہ تحریک کے جواب میں فیصلہ کیا کہ آئندہ مسلمان کاشتکار کو کسی قسم کا قرضہ نہ دیا جائے۔ نیز گزشتہ قرضوں کی فوری وصولی کا مطالبہ کیا جائے۔ ہندو ساہوکار کے فیصلے کی زد سکھ اور ہندو کاشتکار پر بھی پڑی چنانچہ انہوں نے ساہوکاروں کے اس اقدام کے جواب میں فیصلہ کیا کہ پہلے کی طرح آئندہ بلا رسید طلب کیے ساہوکار سے کوئی لین دین نہ کیا جائے۔ ریاست کا وزیر اعظم اکثریت کی بجائے اقلیت کے حقوق کا پاسبان بن گیا۔ انہی حالات و واقعات نے ریاست کے نظم و نسق میں زہر گھول دیا کہ ریاست کپورتھلہ کا سکون برسوں تک تاخت و تاراج رہا۔

ہٹلر کا اقتدار

اقتدار کی جنگ میز پر ہو یا میدان میں ہو جب آخری مراحل میں ہو تو فاتح کبھی اپنے مستقبل پر مطمئن نہیں ہوتا۔ جرمن کا مفتوح ہوتے ہوئے مایوس ہونا لازمی تھا۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے فاتح تسخیر یورپ کے باوجود باہم غیر مطمئن تھے۔ فرانس، برطانیہ اور امریکہ سے اپنے تحفظ کی ضمانت مانگ رہا تھا۔ فرانسیسیوں کا موقف تھا کہ ایک ہزار سال سے دریائے ڈھاسن کے اس پار جرمنوں سے ہمارا لین دین چلا آ رہا ہے۔ ہم ان کے اقتصادی جذبات سے آگاہ ہیں۔ آج نہیں تو کل وہ ہم پر ضرور حملہ کریں گے۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ فرانس کو یہ ضمانت دینے کو تیار نہیں تھے۔

جرمن میدانِ جنگ میں ہار کر ان شرائط کے تحت!

۱۔ جرمن کے بہت سے علاقے چھین کر اتحادیوں کو دے دیئے گئے مثلاً السیس اور لورین کے صوبے فرانس کو دے دیئے گئے۔ سار کا علاقہ ایک بین الاقوامی کمیشن کے تحت کر دیا گیا۔ اور اس میں جو کوئلے کی کانیں تھیں وہ فرانس کے سپرد کر دی گئیں۔ ڈینزک کے علاقے کو خود مختار بنا دیا گیا۔ جرمن کی تمام نوآبادیات اتحادی حکومتوں نے اپنی عملداری میں لے لیں۔ مثلاً کیمرون کی آبادی فرانس اور انگلستان نے آپس میں بانٹ لی۔ جنوب مغربی جرمن افریقہ کو ایک یونین کے تحت کر دیا گیا۔ مشرقی جرمن افریقہ پر بلجیم اور انگلستان قابض ہو گئے۔ اور بحر الکاہل کی نوآبادیوں میں سے جزائر مارشل جاپان کو، سمو نیوزی لینڈ کو، نیوگنی آسٹریلیا کو، اور جزیرہ نورو انگلستان کو ملا۔

اسی عہد نامے کی رو سے جرمن کی بحری، بری اور فضائی طاقت کو بھی سلب کر دیا گیا۔ اسلحہ کا تعین کیا گیا۔ کئی قلعے مسمار کر دیئے گئے۔ نیز جرمن کو حکم دیا گیا کہ وہ خاص علاقوں میں اپنی فوج نہیں رکھ سکتا۔ ان حد بندیوں کے علاوہ جرمنی پر چھ سو ساٹھ کروڑ پونڈ تاوان عاید کیا گیا۔ بعد ازاں ینگ کمیشن کے فیصلے کے تحت انسٹھ کروڑ پونڈ کر دیا گیا۔

۲۲۔ جون ۱۹۱۸ء کو متذکرہ عہد نامے پر دستخط کر کے جرمن اپنی شکست کی منظوری دے چکا تھا۔

باعزت قومیں ہار کر بھی میدانِ جنگ میں فتحیاب ہونے کی قسم اٹھاتی ہیں اور ان کا یہی یقین انہیں زندگی کی جدوجہد میں آگے بڑھاتا ہے۔

معاہدہ وارسائی (۱۹۱۸) کی ذلت کے بعد جرمن قوم نے ۱۹۳۳ء میں ایک نئی کروٹ لی۔ اور نئے ارادوں سے تسخیر عالم کی قسم اٹھائی۔

۳۔ فروری ۱۹۳۲ء کو ہٹلر نے انتخاب جیت کر اہل جرمن کو پیغام دیا۔

" معاہدہ وارسائی کی تلوار سے مجروح ہونے والے جرمنو! میری طرف آؤ! میں تمہیں اس بلندی پر لے جاؤں گا جہاں تم ۱۹۱۴ء میں تسخیر عالم کے خواب دیکھ

رہے تھے۔

ہٹلر ۲۰ اپریل ۱۸۸۹ء کو جرمن اور آسٹریلیا کی سرحد پر صوبہ بویریا کے ایک شہر میں ٹوپیاں بنانے والے کے ہاں پیدا ہوا۔ یہ شخص ہٹلر کی پیدائش سے پیشتر اپنے گاؤں میں جوتے مرمت کیا کرتا تھا۔ اور بعد میں آسٹریلیا ہنگری میں چنگی پر ملازم ہوا۔ اور آخر کو چھیاسٹھ سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ ہٹلر کی والدہ بھی چند دنوں کے بعد انتقال کر گئی۔ یہ عورت ایک غریب کسان خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

والدہ کی خواہش پر ہٹلر نے تصویر کشی اور مصوری کا شوق پورا کیا۔ گو باپ کی آرزو تھی کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر سرکاری ملازم بنے۔ اس کشمکش میں ہٹلر پچیس برس تک آوارہ لڑکوں میں شمار ہوتا رہا۔ والدین کی موت کے بعد اس نے یتیموں کی سی زندگی بسر کی بچپن انقلابی ذہن لے کر پیدا ہوا تھا۔ لہٰذا تنہائی کے اکثر لمحات میں یہ کسی عظیم انقلاب کے خواب دیکھتا رہا۔ اس دوران اخبارات کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ یہی شوق جب پروان چڑھا تو سیاسی ذوق نے جنم لیا۔ سیاسی مذاکرات کی محفلوں میں شب و روز شرکت ہونے لگی اور اپنے مؤقف کو ہر محفل میں جرأت اور دلیری سے پیش کرنے لگا۔ اس طرح ایک دن آیا کہ ہٹلر اپنی زندگی کا مختصر اثاثہ چند کپڑے لے کر قسمت آزمائی کے لیے آسٹریلیا کے دارالخلافہ وی آنا چلا آیا۔

امراء کے اونچے محل اور غریبوں کی جھونپڑیاں دیکھ کر ہٹلر کے ارادوں میں مزید توانائی آئی۔ یہودی وی آنا شہر کے کاروبار پر غالب تھے۔ صنعت کے ساتھ یہاں کی صحافت بھی انہیں کے اقتدار میں تھی۔ ہٹلر اس شہر میں تصویر کشی اور نقشہ نویسی سے اپنی روزی کمانے لگا۔ مزدوری سے ربط بڑھا تو خیالات کو نئی جلا ملی۔ تاہم تسکین قلبی کے لیے یہ ذخیرہ کم نکلا۔ لیکن وی آنا میں یہودیوں کی غریب عوام پر چیرہ دستیاں ہٹلر کو ان کا ہمیشہ کے لیے دشمن بنا گئیں۔

مارچ ۱۹۱۳ء میں ہٹلر وی آنا کو چھوڑ کر جرمن کے مرکزی مقام میونخ چلا آیا۔ اور ۴ اگست ۱۹۱۴ء کو جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو یہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ ۱۹۱۶ء کو

میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر برلن کے ہسپتال میں آن پڑا۔ زخم اچھے ہوئے تو سپاہی سے ترقی کر کے لانس نائیک بنا دیا گیا۔

جنگ کے حالات جرمن قوم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اندرونِ ملک قیصر ولیم کے خلاف بغاوت ہو گئی اور عوام نے آگے بڑھ کر اس سے تخت چھین لیا۔ وہ جرمن سے بھاگ گیا۔ دوسری طرف یہودیوں کا کردار بھی جنگ کے دوران جرمن قوم کے لیے غیر تسلی بخش تھا۔ مزدور اپنی جگہ پریشان تھے۔ قوم پرست طبقہ آپس کے خلفشار کا شکار تھا۔ یہ حالات تھے کہ جب جرمن کو شکست ہوئی۔

ہٹلر ان تمام واقعات کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ جرمن قوم میں اس وقت اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔ ملک کی مقتدر سیاسی جماعتیں اس اہم ضرورت کو پورا کرنے میں ناکام ہیں۔ لہٰذا اس نے نیشنل سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی اور یہی جماعت آگے چل کر نازی پارٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔

جرمن کے تمام مزدور آہستہ آہستہ ہٹلر کے مشن سے متفق ہوتے چلے گئے۔ آخر ۲۴ فروری ۱۹۲۰ء کو ہٹلر نے پہلی مرتبہ جرمن عوام اور پارٹی ممبران کے سامنے اپنے مؤقف کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا۔ اس تقریر کا عوام اور خواص پر خاصہ اثر ہوا اور ۲۵ فروری ۱۹۲۰ء کو پارٹی کا ایک انقلابی پروگرام مرتب کیا گیا۔ جس کی بنیاد ہٹلر کے وضع کردہ حسب ذیل اصولوں پر تھی۔

۱۔ جرمنی کے تمام علاقوں کو اس اصول پر متحد کر دیا جائے کہ ہر قوم اپنی قسمت کا فیصلہ خود کر سکتی ہے۔ نیز عہد نامہ وارسائی کو مسترد کر دیا جائے۔

۲۔ لین دین کے معاملہ میں جرمنی کو دوسری اقوام کے مقابلہ میں حقیر نہ سمجھا جائے۔

۳۔ جرمنی کی نو آبادیات واپس کی جائیں۔

۴۔ صرف جرمنوں کو شہری قرار دیا جائے۔ اس لحاظ سے یہودی شہری حقوق حاصل نہیں کر سکتے۔

۵۔ جس شخص کے پاس شہری حقوق نہ ہوں وہ صرف غیر ملکی مہمان کے طور پر جرمنی میں قیام کر سکتا ہے۔

۶۔ حق رائے دہی اور عہدے صرف شہریوں کے لیے وقف ہوں۔

۷۔ تجارت کو فروغ دینے اور شہریوں کے روزگار کا بندوبست کرنے کیلئے حکومت تمام ایسے لوگوں کو رائخ (جرمن پارلیمنٹ) سے علیحدہ کر دے جن کے پاس شہری حقوق نہیں ہیں۔

۸۔ صرف جرمن (آریہ) ہی جرمن میں آباد ہوں۔

۹۔ تمام شہریوں کو حکومت میں مساوی حقوق دیے جائیں۔

۱۰۔ تمام شہریوں کو اپنے ذاتی مفاد قوم کے مفاد پر قربان کر دینے چاہئیں۔

۱۱۔ بغیر کام کے کسی شہری کو آمدنی حاصل نہ کرنے دی جائے۔

۱۲۔ جن لوگوں نے جنگ (پہلی جنگ عظیم) سے فائدہ اٹھا کر نفع کمایا ہے۔ ان کی دولت چھین لی جائے۔

۱۳۔ ٹرسٹوں (متمول کاروباری کمپنیوں) کی آمدنی کو اجتماعی قرار دیا جائے۔

۱۴۔ تھوک فروش کے منافع کو قوم میں تقسیم کر دیا جائے۔

۱۵۔ بوڑھوں کی مالی امداد زیادہ کی جائے۔

۱۶۔ چھوٹے اداروں کو خاص مراعات دی جائیں۔

۱۷۔ قومی مفاد کے لیے ذاتی زمینیں ضبط کر لی جائیں۔ اور اراضی کی ضمانت پر قرضہ نہ دیا جائے۔

۱۸۔ جو لوگ ناجائز سود کھاتے ہیں یا جن کی حرکات مفاد عامہ کے خلاف ہیں ان پر مقدمہ چلا کر انہیں سزا دی جائے۔

۱۹۔ جرمنی میں روس لا، کی بجائے جرمن قانون نافذ کیا جائے۔

۲۰۔ نوجوانوں کے لیے ورزش لازمی قرار دی جائے۔ اور بچوں سے مزدوری بند کرا دی جائے۔

۲۱۔ قومی فوج کو تنخواہ دینے کا رواج اڑا دیا جائے۔

۲۲۔ اخبارات کے لیے خاص سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور صرف جرمنوں کو اخبار چلانے کی اجازت دی جائے۔

۲۳۔ لوگوں کو مذہبی آزادی صرف اس شرط پر دی جائے کہ وہ جرمن قوم کے اخلاقی تصور کے خلاف نہ ہو۔

۲۴۔ مرکز میں ایک مضبوط حکومت قائم کی جائے۔

۲۵۔ پارٹی کے لیڈر مندرجہ بالا مقاصد کے لیے اپنی جانیں لڑا دیں "

تقریباً تین سال کی مسلسل محنت کے بعد ہٹلر اور اس کی پارٹی کو عوام میں عروج حاصل ہوگیا۔ ہٹلر کی طوفانی فوج کی مکہ بازی اور مڈبھیڑ نے عوام کے دلوں پر ایک قسم کی دہشت طاری کردی۔ یہاں تک کہ حکومت بھی خوف کھانے لگی۔ نازی پارٹی نے اپنا اخبار بھی جاری کرلیا۔ اور پارٹی کا سرمایہ دو لاکھ (جرمنی سکہ) کے قریب جمع ہوگیا۔

حکومت پر ان دنوں فوج کے علاوہ پولیس بھی قابض تھی۔ ہٹلر اپنے طوفانی دستوں کو تشدد کی ترغیب دے کر حکومت کے اکثر محکموں پر قبضہ کرکے انہیں اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر تنگ آکر حکومت نے ہٹلر کو گرفتار کرکے آٹھ ماہ قید کی سزا دے دی۔ ۲۴۔ نومبر ۱۹۲۴ء کو رہا ہو کر ہٹلر باہر آیا تو اس کی جماعت پہلے سے زیادہ طاقتور سمجھی جانے لگی تھی۔

اس طرح تیرہ سال کی جدوجہد کے بعد ہٹلر نے مسندِ اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

شکست کے بعد جرمن میں اشتراکی عناصر نے سر اٹھایا اور اپنے مقاصد کی ترغیب میں جرمن کو ہراساں کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ لیکن ہٹلر نے برسرِ اقتدار آتے ہی اشتراکیت کی تمام سرگرمیاں خلاف قانون قرار دے دیں۔

تحریک کپورتھلہ ریاست کے ہندو مہاجن اور ساہوکاروں نے قانون انتقال اراضی کی مخالفت کسی اصول پر نہیں کی بلکہ اپنے سرمائے کے حصار کو ٹوٹتے دیکھ کر ریاستی حکام کو تاثر دیا کہ اگر یہ قانون ریاست پر لاگو ہوگیا تو ہمارا سات کروڑ روپیہ جو ہم نے ریاست کے مسلمان اور سکھ کاشتکاروں کو بطور قرض دے رکھا ہے ضائع

ہو جائے گا۔ انہی دنوں ۱۶۔ فروری ۳۳ء کو خوشی رام نامی ساہوکار ایک غریب مسلمان کے ہاتھوں لین دین کے جھگڑے میں قتل ہو گیا۔ ہندو مہاجن ساہوکاروں نے اس ذاتی قضیئے کو فرقہ وارانہ رنگت دے کر ریاست کے امن کو ایسی آگ دی کہ سارے گل بوٹے راکھ کا ڈھیر بن گئے۔

۱۴۔ فروری کو ریاست میں بڑھتی ہوئی بے چینی کے تدارک کے لیے مہاراجہ مع اپنے وزیر اعظم وائسرائے ہند سے ملنے دہلی گیا۔ کپورتھلہ کا وزیر اعظم میاں سر عبدالحمید ریاست میں انگریزی اقتدار کا نمائندہ تھا۔ اس اعتبار سے ریاستی جھگڑا اس کے منشا پر طے ہونا چاہیے تھا۔ مہاراجہ کی دہلی سے واپسی پر ۲۷۔ فروری کو ریاست کے پچاس ہزار کے قریب عوام نے جس کی قیادت چودھری عبدالعزیز (بگھووال) نے کی، مہاراجہ سے مطالبہ کیا کہ ایکٹ انتقال اراضی مروجہ پنجاب کا جلد سے جلد ریاست میں نفاذ کیا جائے۔ اس کے بغیر زمینداروں کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔

مہاراجہ نے اس وفد کو یقین دلایا کہ وہ ان کے مطالبات پر غور کریں گے لیکن ۲۸ فروری کو اس وعدہ کے باوجود مہاراجہ سیر و تفریح کے لیے یورپ چلے گئے۔ انہی دنوں ۲۲۔ فروری کو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تحریک کشمیر کے سلسلے میں اپنی میعاد اسیری گذار کر نیو سنٹرل جیل ملتان سے رہا ہو کر لاہور پہنچ گئے۔

آل انڈیا مجلس احرار کا اجلاس

تحریک کشمیر کا کیا انجام ہوا؟ اس کا جواب مستقبل کی تاریخ دے گی۔ یہ فیصلہ مؤرخ کرے گا کہ کشمیری مسلمانوں کے خون ناحق کا سودا کس نے کیا۔ لیکن جہاں تک بحیثیت انسان اور مسلمان احرار کے فرائض میں تھا۔ انہوں نے قربانی و ایثار سے اپنی اور کشمیر کی تاریخ کو ہم آہنگ کر لیا۔ کشمیر کی تاریخ احرار کا ذکر کیے بغیر ادھوری رہے گی۔ وہ مؤرخ بخیل اور بددیانت ہوگا جو شہدائے کشمیر کی لاشوں کا شمار کرتے وقت احرار رضاکاروں کی لاشوں کا شمار نہیں کرے گا۔

۱۵۔ اور ۲۱۔ مارچ (۱۹۳۳ء) کو چودھری افضل حق اور مولانا مظہر علی اظہر بھی ملتان نیو سنٹرل جیل سے رہا کر دیے گئے۔ یہ آخری قیدی تھے جو تحریک حریت کشمیر کے جرم میں سزا کے مستحق قرار دیے گئے تھے۔

ان رہنماؤں کی آمد پر ۳۰۔ مارچ کو آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کا اجلاس جماعت کی تنظیم جدید کے لیے طلب کر لیا گیا۔ اس سے پیشتر مرکزی احرار اسلام ہند کے دفتر کے لیے فون نمبر ۳۱۴۰ منظور ہو چکا تھا اور دوسرے انتظامی امور بھی طے ہو چکے تھے۔

۱۔ تحریک کپور تھلہ۔

۲۔ اچھوت اور گاندھی جی کی تحریک۔

۳۔ حکومت برطانیہ کا اعلان۔

یہ اہم مسئلے تھے جن پر احرار رہنماؤں کو غور کرنا تھا۔ ۲۵۔ مارچ کو برلن میں ایک قانون کے ذریعے ہٹلر کو مکمل اختیار دے کر اسے ڈکٹیٹر بنا دیا گیا۔ جس نے سابقہ اتحادی طاقتوں کو ذہنی طور پر پریشان کر دیا۔ اور دوسری جنگ عظیم کے بادل صاف دکھائی دینے لگے۔ اس کے ساتھ ہی یورپ ایشیا پر اپنے اقتدار کی طنابیں کمزور ہوتی دیکھنے لگا۔ اس کا اثر ہندوستان کی فرقہ وارانہ کشمکش نے بھی قبول کیا۔ انہی دنوں ہندوستان بھر میں انقلاب پسندوں کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ چنانچہ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق ۱۵۔ مارچ کو پنجاب سے دو سکھ نوجوان اسی شبہ میں گرفتار کر لیے گئے۔ کلکتہ میں سرکاری عمارت کے ساتھ یورپینوں کے مکانات بھی ڈائنا میٹ سے اڑا دیے گئے۔ ۲۱۔ مارچ کو کلکتہ ریلوے اسٹیشن پر ڈاکہ ڈالا گیا۔ کلکتہ پولیس اسٹیشنوں سے اسلحہ چھین کر انہیں آگ لگا دی گئی۔ ۲۵۔ مارچ کو پنجاب (ضلع لائلپور) کے ایک گاؤں سے چند سو مہاجنوں کو لوٹ لیا گیا۔ پٹنہ ضلع بہار سے پنجاب کا ایک انقلاب پسند تخریبی کارروائیاں کرتا ہوا گرفتار کر لیا گیا۔

ہندوستان کے یہ حالات برطانیہ اور خود ہندوستانیوں کے لیے پریشان کن تھے۔ انہی دنوں ۱۴۔ مارچ ۱۹۳۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر میاں عبدالعزیز نے مسٹر محمد علی جناح سے بحری تار کے ذریعے درخواست کی کہ وہ ہندوستان پہنچ کر مسلمانان ہند کی رہنمائی کریں۔ جس کا جواب مسٹر جناح نے ۳۰۔ مارچ کو دیا کہ وہ وسط دسمبر ۱۹۳۳ء تک ہندوستان آئیں گے۔

یہ تمام واقعات مجلس احرار کے سوچنے اور سمجھنے کے تھے۔ گو احرار رہنما گذشتہ اڑھائی سال سے جیل خانوں میں تھے۔ تاہم ان کے دل و دماغ وطن عزیز سے لاتعلق نہیں تھے۔

۳۰ مارچ ۱۹۳۳ء کو لاہور میں احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ جس میں دو دن کی بحث کے بعد حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

"وائٹ پیپر کی تجاویز اس تاریک ترین تصور کو پیش کرتی ہیں۔ جو وائٹ ہال نے ہندوستان کے لیے تیار کیا ہے۔ یہ تجاویز کیا ہیں؟

ایگزیکٹو کو غیر معمولی اختیار دے کر ہندوستان کو زنجیروں میں جکڑے رکھنے کا ایک طریقہ ہے۔

ہم نے اختیارات کے انتقال (سیلف گورنمنٹ یا درجہ نوآبادیات) کو دیکھنے کے لیئے شروع سے لے کر آخر تک ان تجاویز کا مطالعہ کیا ہے لیکن باوجود گورنمنٹ کے مقتدر ممبر کے وعدوں کے جن میں مسٹر رمزلے میکڈانلڈ بھی شامل ہیں۔ ہم برطانیہ کی دھندلی فضاؤں میں سوائے صوبجاتی خودمختاری کے کچھ دیکھ نہیں سکے۔

کنٹرول برطانوی ایگزیکٹو آفیسروں کے ہاتھ میں رکھا گیا ہے۔ تحفظات نے اصلاحات کے مطلب کو فوت کر دیا ہے۔

اور ایسی کوئی دفعہ نہیں رکھی گئی۔ جس سے یہ معلوم ہو کہ تحفظات عارضی ہیں۔

ہندوستان لیجسلیٹروں کے ساتھ مخالفانہ اور فریب آمیز طاقتوں کا سا سلوک کیا گیا ہے۔ اور ایسے ذرائع تجویز کیے گئے ہیں جن سے انہیں قابو میں رکھا جا سکے۔

اس غیر اعتمادی سے لازمی طور پر نفرت پیدا ہو جائے گی۔ جس سے ہماری سیاست میں زہر پھیل جائے گا۔ فیڈریشن کو رد کر دیا گیا ہے کہ اس کی تکمیل قیامت سے پہلے ممکن نہیں۔

شرائط یہ ہیں۔

۱۔ آدھے والیانِ ریاست کا فیڈریشن میں شامل ہونا۔

۲۔ پارلیمنٹ کے دونوں ایوان درخواست کریں۔

۳۔ گورنر جنرل اور صوبائی گورنر مطلق العنان حاکم ہوں گے۔

لیجسلیٹروں کو سکول کے طلبا کی مباحثہ کرنے والی سوسائٹیوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اور انہیں اپنی بحث کو عملی جامہ پہنانے کا کوئی اختیار نہیں۔

پرونشل گورنمنٹوں میں مطلق العنانی کی جگہ دو عملی دے دی گئی ہے۔

گورنروں کو اس قدر وسیع اختیارات دے دیئے گئے ہیں کہ اصلاحات ایک مذاق بن کر رہ گئی ہیں۔

ملازمتوں کے ساتھ ذمہ دار وزرا کا تعلق مضحکہ خیز ہے۔ وزرا سرکش گھوڑے پر سوار ہوں گے جس کی لگام لندن پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس قسم کی سواری کی بے بسی کا اندازہ اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان پر پارلیمنٹ میں جو بحث حال ہی میں ہوئی ہے۔ اسے پڑھ کر ان لوگوں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی جنہیں یہ خیال تھا کہ جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی میں وائٹ پیپر کے نقائص کو رد کیا جائے گا۔

برطانوی کیبنٹ ٹوڑیوں کے ہاتھ میں کھیل رہی ہے اور اس نے ہندوستان کے پروٹسٹ کی طرف سے کان بند کیے ہیں۔ ہمارے ساتھ یہ توہین آمیز سلوک اس لیے روا رکھا گیا ہے کہ ہم متحد نہیں ہیں۔ اب ہمارے سامنے اہم سوال یہ ہے کہ کیا ترقی یافتہ ہندوستانی رائے کے نمائندے آئندہ لیجسلیٹروں میں جا کر نقائص دور کرنے کی کوشش کریں گے؟

۱۴ اور ۱۵۔ اپریل کے آل انڈیا احرار کے اجلاس میں اس پر دوبارہ غور کیا جائے گا۔ اس میں احرار رہنماؤں نے ریاست کپورتھلہ میں رونما ہونے والے واقعات پر بھی غور کیا۔

مرزائی ذرائع سے ایک خبر

۷- اپریل ۱۹۳۳ء کو عیدالاضحیٰ کے موقع پر مسجد احمدیہ لندن میں ایک تقریب منعقد ہوئی - جس میں دو سو کے قریب مشہور شخصیتیں تھیں - اس موقع پر مسٹر محمد علی جناح نے ہندوستان کے مستقبل پر سر سٹیوارٹ سنڈیمین ایم اے کی صدارت میں تقریر کی جس میں بتایا - کہ

"ہندوستان اب بہت جلد ترقی کرے گا - نیز قرطاس ابیض کی تجاویز ہندوستان کو مطمئن نہیں کر سکتی اسے کامل خود مختاری ملنی چاہیے"

صدر جلسہ نے مسٹر جناح کے خیالات سے اختلاف کیا - مگر درد صاحب (عبدالرحیم درد مرزائی) نے ہر دو احباب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا -

"ہم نے دونوں قسم کے خیالات سن لیے ہیں - اب ہمیں غور کر کے صحیح نتیجہ اخذ کرنا چاہیے"

مسٹر محمد علی جناح کی یہ تقریر ہندوستان پریس کی خاص توجہ کا موجب بنی - اس خبر کے ساتھ چہ میگوئیاں بھی ہونے لگیں - ایک مذہبی جماعت کے مرکز میں یہ سیاسی لیکچر کی کیا وجہ ہے ؛ بات دراصل یہ تھی کہ قائداعظم پہلی گول میز کانفرنس کے بعد اصلاح احوال کے لیے سخت مایوسی کا شکار ہو کر مستقل فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ اب ہندوستان واپس نہ جائیں گے - بلکہ حیات مستعار کے بقیہ دن انگلستان میں بسر کریں گے - چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں -

"مجھے اب ایسا محسوس ہونے لگا ہے - نہ ہندو ذہنیت میں کوئی خوشگوار تبدیلی کر سکتا ہوں - نہ مسلمانوں کی آنکھیں کھول سکتا ہوں - آخر میں نے لندن میں بود و باش کا فیصلہ کر لیا"

اس ناموافق صورت حال کے باوجود حضرت خلیفۃ المسیح ثانی کی خواہش تھی، کہ ان کو پھر سیاست ہند میں حصہ لینے پر آمادہ کیا جائے - اس کام کے لیے حضرت امیرالمومنین (بشیرالدین محمود) نے مولوی عبدالرحیم درد کو منتخب فرمایا - چنانچہ آپ مارچ ۱۹۳۳ء میں انگلستان پہنچ کر حضور کی ہدایت و منشا کے مطابق قائداعظم سے رابطہ قائم کر لیا - چنانچہ قائداعظم کا (عید کا دن) احمدیہ مسجد میں آ کر لیکچر دینا اس سلسلے کی ایک کڑی تھی - (تاریخ احمدیہ جلد ۷ صفحہ ۱۰۰)

فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ

برطانوی سیاستدان ایک بساط پر کئی رخ سے مہرے چلاتے رہے۔ ایشیا اور مڈل ایسٹ میں انہوں نے اپنی حکمت عملی سے تمام اقوام کو ایسے سانچے میں ڈھال لیا تھا کہ وہ اپنی غلامی کا تانا بانا خود بننے لگیں تھیں اور بالآخر برائی کے ہر فعل کا خود انہیں ہی ذمہ دار قرار دیا گیا۔ پہلی بڑی لڑائی کے بعد عرب ریاستوں کا جس بری طرح تیا پانچہ کیا گیا۔ اور اس کے نتیجے میں حجاز کے ٹکڑے کیے گئے۔ اور پھر ان عرب ریاستوں میں باہم نفاق کا ایسا بیج بویا کہ ہر مسلمان حکمران ایک دوسرے کا دشمن بن گیا۔ فلسطین کی باقی عرب سے علیحدگی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جس پر ہم آئندہ چل کر مفصل بحث کریں گے۔

ہٹلر ایسا جذباتی اور فوجی قسم کا ڈکٹیٹر یہودیوں کے چلن سے اس قدر متنفر ہوا کہ اس نے اقتدار سنبھالتے ہی یہودیوں کو جرمن سے نکالنے کی تجویز پر غور شروع کر دیا۔ یہ خبر برطانوی سیاستدانوں کے لیے بڑی مسرت کا باعث بنی۔ کیونکہ عربوں کے مابین تفریق کی جو تخم ریزی وہ کر چکے تھے اس کی آبیاری کے لیے عرب ریاستوں کے عین وسط میں یہودی ریاست کا قیام نہایت ضروری تھا۔ چنانچہ برائی کا یہی وہ بیج تھا جس نے تناور ہو کر وسط ایشیا کے سارے امن کو تہس نہس کر دیا۔

۴۔ اپریل ۱۹۳۳ء کو برطانیہ پارلیمنٹ میں وزیر نوآبادیات سے دریافت کیا گیا کہ

"کیا جرمن میں یہودیوں کی مصیبت کا خیال کرتے ہوئے فلسطین میں پناہ گزینوں کی آمد کے متعلق پابندیاں ہٹالی جائیں گی؟

جواب۔ "اگرچہ یہ معاملہ محکمہ آبادکاری کے متعلق ہے۔ تاہم اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ فلسطین کی اقتصادی حالت کیا ہے اور وہاں کس قدر لوگ آباد کیے جا سکتے ہیں۔

۱۳۔ اپریل کو برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر سر جان سائمن ؟ پارلیمنٹ میں کافی بحث کے بعد یہودیوں کو بطور مزدور ایک ہزار کی تعداد میں فلسطین میں رہنے کی اجازت دے دی۔

مہاراجہ کپورتھلہ کا اعلان

۲۷-اپریل مہاراجہ کپورتھلہ جو ان دنوں لندن میں قیام پذیر تھے۔ اپنے وزیر اعظم میاں سر عبدالحمید کو اطلاع دی کہ چونکہ ریاست میں ہماری ہندو رعایا بے چین ہے۔ لہٰذا ریاست میں قانون انتقالِ اراضی نافذ نہ کیا جائے۔

(روزنامہ انقلاب لاہور۔ ۳۰-اپریل ۱۹۳۳ء)

مرکزی مجلس احرار کا اجلاس

۲۹-۳۰-اپریل (۱۹۳۳ء) کو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی صدارت میں لاہور مرکزی دفتر میں مجلس احرار کا اجلاس ہوا۔ جس میں پچاس سے زائد ذمہ دار رہنماؤں نے شرکت کی۔ چوبیس گھنٹے کی شب و روز بحث کے نتیجے میں برطانوی اعلان، تحریک کپورتھلہ اور جماعت کی تنظیم جدید پر خصوصاً غور کیا گیا۔ مجلس احرار کا سالانہ انتخاب بھی عمل میں آیا۔ جس کی رو سے مولانا حبیب الرحمٰن کو از سرِ نو جماعت کا صدر منتخب کیا گیا۔ نائب صدر چودھری افضل حق۔ اور چودھری عبدالستار فیروز پوری منتخب ہوئے۔ جنرل سیکرٹری مولانا مظہر علی اظہر نائب سیکرٹری مولانا محمد داؤد غزنوی چنے گئے۔ خازن ڈاکٹر محمد نعمان قوی اور سالار کے لیے شیخ حسام الدین کا انتخاب ہوا۔

ارکانِ ورکنگ کمیٹی

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، حکیم نور الدین دلائیپور، سید محمد احمد کاظمی ایڈووکیٹ الٰہ آباد (یوپی) خان محمود علی خاں رئیس فلاش پور ضلع سہارنپور، میاں محمد عمر سوداگران چرم۔ امرتسر۔ چودھری عبدالعزیز بیگووال (ریاست کپورتھلہ) سردار محمد شفیع۔ ضلع لاہور، مولانا محمد شفیع سیالکوٹ۔

اس اجلاس میں ایک قرار داد بھی منظور کی گئی۔

"مجلس احرار کا یہ اجلاس اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتا ہے کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کے سیاسی اختلاف کو ختم کر کے مفاہمت کی راہ تلاش کی جائے۔ مجلس احرار اس کا صدق دل سے خیر مقدم کرے گی۔ اور اسے کامیاب بنانے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دے گی جس میں مسلمانوں کے ملی مفاد کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

نیز یہ اجلاس اس امر کا بھی اعلان کر دینا ضروری سمجھتا ہے کہ اگر مسلمانان

ہند کی سیاسی جماعتوں سے استفسار کیے بغیر مسلمانوں کے مفاد کو نظرانداز کرتے ہوئے کوئی معاہدہ کسی سرکاری یا نیم سرکاری افراد سے مل کر کیا گیا تو وہ معاہدہ مسلم قوم کی طرف سے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اور ایسے معاہدے کو ناکام بنانا مجلس احرار اور دوسری جماعتوں کا فرض ہوگا۔

اجلاس اس کارروائی کے بعد غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

گاندھی جی رہا کر دیے گئے گاندھی جی کے مرن برت اور برطانوی اعلان کے باوجود سناتنی ہندوؤں نے اچھوتوں پر مندروں کے دروازے نہ کھولے۔ اس پر گاندھی جی نے پونا جیل میں ۸۔ مئی کو ۲۱ روزہ مرن برت رکھنے کا پھر سے اعلان کر دیا۔ لیکن ۹۔ مئی کو وائسرائے ہند نے انہیں رہا کر دیا۔ اس پر ان مسلمانوں کو جن میں چودھری خلیق الزمان اور مولانا شوکت علی شامل تھے بڑی خوشی ہوئی۔ ان کی خواہش تھی کہ برطانوی وزیراعظم کے اعلان کے مطابق گاندھی سے مل کر اگر کوئی فرقہ وارانہ معاملہ طے ہو جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ ۱۶۔ مئی کو چودھری خلیق الزمان نے ڈاکٹر انصاری سے ایک خط کے ذریعے اپنے ان جذبات کا اظہار کیا۔

چودھری خلیق الزمان، مولانا شوکت علی اور پنڈت مدن موہن مالوی کی انہی خواہشات کو دیکھتے ہوئے مجلس احرار نے ۹۔ مئی ۱۹۳۳ء کو امرتسر میں چودھری افضل حق کے مکان پر احرار ورکنگ کمیٹی کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ اس میں پنجاب فارمولا کی از سر نو وضاحت کی گئی۔

پنجاب فارمولا ۱۔ ہندو، سکھوں اور مسلمانوں کی آبادیوں کا تناسب ان کے ووٹروں کی فہرستوں میں منسلک ہو جائے گا۔

۲۔ انتخاب مخلوط ہوگا۔

۳۔ عیسائی۔ اینگلو انڈین اور یورپینوں کو چار نشستیں، خاص مفاد کی دس مخلوط نشستیں اور ہندو، مسلمان اور سکھ خواتین کی چار نشستیں علیحدہ کر دینے کے بعد سارا صوبہ ستاون حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر قوم کو وہ حلقے مخصوص کرا لینے کا حق بھی دیا

جائے گا، جن میں اس قوم کے ووٹروں کی تعداد زیادہ ہو۔

فرقہ وارانہ سمجھوتے کا یہ فارمولا مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ یہ فارمولا ان کے مطالبات پر ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ اور یہ ان تمام قوتوں کو تباہ کرتا ہے جو اس کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔ اگرچہ مخلوط انتخاب کے نام سے فائدہ اٹھایا گیا ہے تاہم اس کا اصل فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس فارمولا سے مسلمانوں کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک مغربی اور دوسرا مشرقی۔

اس طرح تمام طاقت مغربی پنجاب کے قدامت پسند لوگوں کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ وسطی اور مشرقی پنجاب کے ترقی یافتہ مسلمانوں کو بے بسی کی حالت میں رکھا گیا ہے۔ نیز وسطی اور مغربی اضلاع کے ترقی یافتہ ہندوؤں کو تباہ کر کے ان کی تمام تر طاقت مشرقی اضلاع کے ہندوؤں کو دے دی گئی۔ سکھوں کی کیفیت بھی اتنی ہی بری ہے اس طرح پنجاب کی بڑی زمیندار جماعتوں کا فائدہ مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے طبقہ کے عوام کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ مجلس احرار کا یہ اجلاس حکومت اور اس فارمولا کو پسند کرنے والے عناصر سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس فارمولا کو اپنی صوابدید پر منظور کرے۔

اس سے پیشتر پنجاب مسلم نیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ بھی اس فارمولا کو نامنظور کر چکی تھیں۔

پنجاب میں تلوار کی اجازت

سکھ قوم کے سوا پنجاب میں کسی دوسری قوم کو ہتھیار رکھنے یا سر عام ساتھ لے کر چلنے کی اجازت نہیں تھی۔ سکھوں کی یہ پانچ چیزیں مذہبی نشان کے طور پر نمایاں تھیں۔ کچھا (انڈرویئر)، کیس (سر کے بال) کنگا (شانہ) لوہے کا کڑا ہاتھ میں ڈالنے کے لیے۔ ایک انچ کی کرپان۔ عموماً سر کے بالوں میں رکھی رہتی تھی۔ لیکن یہی کرپان بڑھتے بڑھتے ایک انچ سے اڑھائی فٹ کی تلوار تک پہنچ گئی۔ اس پر جب قانون نے گرفت کی تو پنجاب گوردوارہ پربندھک کمیٹی (سکھوں کی مذہبی اور سیاسی جماعت)، نے کرپان کو اپنا مذہبی شعار ظاہر کر کے اس پر خاصی جدوجہد کی۔ آخر حکومت نے ان کا یہ مطالبہ مان لیا۔ اب ہر سکھ کے گلے میں ڈیڑھ فٹ کی کرپان یا ہاتھ

میں دو فٹ کی تلوار دکھائی دینے لگی۔ یہ واقعہ ۱۹۲۳ء کا ہے۔

اس سال جب مجلس احرار کی عمر ہنوز تین برس تھی اور متحدہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ ہوائیں اپنا رخ تبدیل کر رہی تھیں۔ ۲۹۔ مئی ۱۹۲۳ء کو ملتان میں پرونشل مجلس احرار کے سالانہ اجلاس میں، جس کی صدارت شیخ حسام الدین کر رہے تھے، حکومت سے مطالبہ کیا۔

"اگر سکھوں کو امرتسر، لاہور اور پنجاب کے دیگر اضلاع میں تلوار رکھنے اور ہمہ اوقات ساتھ لے کر چلنے کی عام اجازت ہے تو مسلمانوں کو بھی پنجاب میں کھلے بندوں تلوار رکھنے کی اجازت دی جائے اور اس کے استعمال کے طریقے سکھائے جائیں۔"

مجلس احرار کے اس مطالبے پر پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں کے علاوہ دوسری غیر مسلم قومیں بھی برہم ہوئیں۔ ہندو اخبارات نے اس پر کافی برہمی کا اظہار کیا۔

مولانا سید محمد انور کشمیری کا انتقال

۲۹۔ مئی متاع دین و دانش رکھنے والے مسلمانوں کے لیے منحوس تاریخ تھی۔ جب آفتاب عالم سرزمین دیوبند میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ سید انور شاہ صاحب کشمیری کا انتقال ایک شخصیت کا انتقال نہیں تھا بلکہ ان کی موت سے علم و عرفان کی بارش ختم ہو گئی جو گذشتہ ربع صدی تک اسلام کے گل بوٹوں کی کشت ویران کو سیراب کرتی رہی۔

علامہ انور شاہ کشمیری اپنے سینے میں علم کی ہزاروں کتابیں نہیں الماریاں پوشیدہ رکھتے تھے۔ بظاہر وہ برصغیر میں مذہبی یونیورسٹی (مدرسہ دیوبند) کے پرنسپل تھے۔ لیکن ان کی نگاہیں آسمان کے ستاروں تک پہنچتی تھیں۔ جبھی تو فرمایا تھا کہ،

"زہرہ اور مریخ میں اگر کوئی انسانی آبادی ہے تو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بھی آخری پیغمبر ہیں۔"

ختم نبوت پر ان کے عقیدے کا یہ عالم تھا کہ بہاولپور کے مشہور مقدمہ میں جب اپنی شہادت ختم کر چکے تو فرمایا۔

"اگر میں زندہ رہا تو خود ورنہ فیصلہ ہونے تک اگر میری موت واقع ہو جائے تو یہ فیصلہ میری قبر پر آکر سنا دینا۔ میں سن لوں گا"

شاعر مشرق علامہ سر محمد اقبال کو حضرت انور شاہ صاحب سے والہانہ عقیدت تھی وہ ایک شاگرد کی طرح ان کے پاس بیٹھے اور کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ حدیث رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نقاط سمجھتے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۱ء میں جب مرزائیوں نے کشمیری مسلمانوں کو فریب دینے کے لیے کشمیر کمیٹی کا صدر ڈاکٹر اقبال کو منتخب کیا گیا۔ اور اس واقعہ کی اطلاع حضرت انور شاہ کو ہوئی تو وہ لاہور پہنچے۔ ڈاکٹر اقبال کو حضرت کی تشریف آوری کی اطلاع ملی تو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ لیکن حضرت نے یہ کہہ کر دعوت رد کر دی کہ

"آپ نے مرزائیوں کی خود ساختہ کمیٹی کی صدارت قبول کر کے اپنا اسلامی عقیدہ مشکوک کر لیا ہے۔ لہٰذا آپ جب تک اسے درست نہیں کرتے ہیں آپ کے ہاں کھانا نہیں کھاؤں گا"

اس پر ڈاکٹر اقبال دیگر وجوہات کے ساتھ کشمیر کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہو گئے اس استعفے کا تفصیلی ذکر ڈاکٹر اقبال نے ۲۔جون ۱۹۳۳ء کو اپنے پریس بیان میں کرتے ہوئے کہا

"بدقسمتی سے کشمیر کمیٹی میں بعض ایسے ممبر ہیں جو اپنے مذہبی پیشوا (بشیر الدین محمود) کے علاوہ اور کسی کی اطاعت تسلیم نہیں کرتے۔ اور یہ امر اس بیان سے ظاہر ہے جو کام میرپور کے مقدمات میں ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس پر انہوں (مرزائیوں) نے کہا ہے کہ ہم نے جو کچھ کیا وہ صرف اپنے مذہبی پیشوا (بشیر الدین محمود) کے حکم کی تعمیل میں کیا تھا"

اس اخباری اعلان کو احمدیوں نے نشر کیا تھا۔ میرے دل میں کشمیر کمیٹی کے متعلق اسی وقت خطرات پیدا ہو گئے تھے۔ لہٰذا کشمیر کمیٹی جو ایک مخصوص مذہبی فرقہ کی جماعت ہے۔ اس جماعت سے میرا واسطہ درست نہیں ہے۔

(روزنامہ انقلاب ۲۲۔جون ۱۹۳۳ء)

ڈاکٹر اقبال کے استعفٰی کے بعد مجلس احرار نے ۱۵۔جون کو اپنے مرکزی اجلاس میں ڈاکٹر اقبال کے استعفٰی پر انہیں مبارک باد دی۔ نیز کشمیر کمیٹی کے موجودہ حالات پر از سر نو غور کیا۔ جو اقبال کے مستعفی ہونے پر پیدا ہو گئے تھے۔

اس اجلاس میں چودھری عبدالستار فیروز پوری ممبر آل انڈیا احرار ورکنگ کمیٹی جن کا ۱۳۔جون ۱۹۳۳ء کو انتقال ہوا تھا، کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

جرمن قوم میں بیداری

برطانوی قرطاس ابیض کے باوجود اقوام ہند کسی طرح بھی مطمئن نہ ہو سکیں۔ بلکہ یہ خلفشار مزید بڑھتا گیا۔ دوسری طرف تشدد پسندوں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ برطانیہ ہندوستان کے ان غیر تسلی بخش حالات سے پریشان تھا کہ ۱۶۔جون کو جرمن قوم نے جو ہٹلر کے برسر اقتدار آنے کے بعد اپنے اندر توانائی محسوس کرنے لگی تھی۔ ایک بھرپور انگڑائی لی۔ اور پہلی جنگ کے اختتام پر اتحادیوں نے جرمن قوم سے جس معاہدہ وارسائی پر دستخط کرائے تھے۔ اس کے خلاف دن منایا اور اس معاہدہ کی نقلیں تمام جرمن میں نذر آتش کی گئیں۔

حکومت پنجاب کے خدشات

۲۴۔جون کو بغیر کسی سیاسی تحریک کے حکومت پنجاب نے صدر مجلس احرار ہند مولانا حبیب الرحمٰن کو دفعہ ۳ قانون ترمیم ضابطہ فوجداری پنجاب کے تحت لاہور ریلوے اسٹیشن پر ایک نوٹس کے ذریعے تا حکم ثانی لاہور میونسپل کمیٹی کی حدود میں نظر بند کر دیا۔ اسی روز دیگر احرار رہنماؤں کو جن میں مولانا احمد علی، مولانا داؤد غزنوی قابل ذکر ہیں، لاہور میں پابند کر دیا۔ اس حکم کی رو سے نہ تو وہ کوئی پریس بیان دے سکتے تھے اور نہ ہی کسی پبلک اجتماع میں شریک ہو سکتے تھے۔ اسی طرح شیخ حسام الدین اور راقم (جانباز مرزا) کو بھی امرتسر کی حدود میں نظر بند کر دیا۔ لیکن ۳۰۔جون ۱۹۳۳ء کو یکایک تمام احرار نظر بندوں کو رہا کر دیا گیا اور اس سلسلے میں حکومت پنجاب نے مندرجہ ذیل اعلان جاری کیا۔

> "حکومت کو اطلاع ملی تھی کہ احرار ۲۴۔جون کو کشمیر کے متعلق کسی تحریک کا آغاز کرنے والے ہیں۔ لیکن تحقیق پر حکومت کی یہ اطلاع غلط ثابت

ہوئی۔ لہٰذا تمام احرار رہنماؤں پر ان کی موجودہ پابندیوں کے احکام واپس لے لیے گئے ہیں۔"

احرار کانفرنس روک دی گئی

کانگریس کے ساتھ ساتھ برطانوی حکومت احرار سے بھی خفا ہوتی جا رہی تھی۔ انگریزی سامراج نے کانگریس کو فقط ہندوؤں کی جماعت ظاہر کر کے مسلمانوں کو تحریک آزادئ وطن سے ہر ممکن طریق سے الگ تھلگ رکھا۔ اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہی۔ لیکن جیسے ہی مجلس احرار نے سیاسیات ہند پر اپنی برتری کا مظاہرہ کیا۔ مسلمان کا سیاسی شعور بیدار ہونے لگا اور برطانوی حکمتِ عملی کو اپنی شکست دکھائی دینے لگی۔ اس بنا پر احرار کی ذرا سی حرکت بھی فرنگی سامراج کو پہاڑ نظر آتی تھی۔

۹ جولائی ۱۹۴۳ء کو راولپنڈی میں پنجاب پراونشل احرار کانفرنس کا سالانہ اجلاس شروع ہونے والا تھا کہ عین وقت پر مقامی ڈپٹی کمشنر نے دفعہ ۱۴۴ کے تحت یہ کانفرنس روک دی۔ اس کے ساتھ ہی کانفرنس کے صدر استقبالیہ خطیبِ شہر مولانا خدا بخش کے ساتھ مندرجہ ذیل حضرات کو بھی دفعہ ۱۴۴ کے تحت نوٹس دے دیے گئے۔

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، شیخ حسام الدین، علامہ حسین میر کاشمیری، خواجہ عبد الرحیم عاجز، مولانا داؤد غزنوی، مولانا خدا بخش اظہر امرتسری، اور راقم (جانباز مرزا)

یہ تمام کارروائی حکومت نے ایسے وقت میں کی جب کانفرنس کا پہلا اجلاس شروع ہو چکا تھا۔ اور دوران اجلاس تمام رہنماؤں سے نوٹسوں کی تعمیل کرائی گئی۔ لیکن احرار رہنما بھی بڑے کائیاں تھے۔ انہوں نے نوٹس تو وصول کر لیے اور اجلاس دس منٹ کے لیے ملتوی کر دیا۔ بالآخر باہم مشورہ سے اعلان کیا۔

"چونکہ دفعہ ۱۴۴ کے تحت احرار کانفرنس خلاف قانون قرار دی جا چکی ہے لہٰذا احرار کانفرنس ختم کر دی جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ اب موجودہ اجلاس مقامی جماعت خدام اسلام کے تحت ہوگا حضرات! اطمینان سے بیٹھیں۔"

احرار رہنماؤں کے تدبر سے عوام بڑے خوش ہوئے کہ سانپ بھی مرگیا اور لاٹھی بھی محفوظ رہی۔ لیکن دوسری طرف مقامی حکام کو اپنی شکست پر نادم ہونا پڑا۔ کیونکہ حکومت کا منشا تھا کہ احرار کسی طرح اپنی بات نہ کہہ سکیں۔

چودھری عبدالعزیز کی گرفتاری

ہندو ساہوکارانہ ذہنیت نے دسمبر ۱۹۳۲ء میں جس آگ کو ہوا دی تھی ۱۹۳۳ء کے وسط تک یہ آگ تمام کپورتھلہ کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ احرار اس وقت تک عملی طور پر اس تحریک سے لاتعلق رہے۔ چودھری عبدالعزیز چونکہ احرار ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ اس بنیاد پر وہ ریاستی عوام کے مقاصد سے غافل نہیں تھے۔ لیکن ۶۔ جولائی ۱۹۳۳ء کو پنجاب کے مسلم اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ

"کپورتھلہ میں زمیندارہ تحریک کے رہنما چودھری عبدالعزیز کو تحفظ امن عامہ کے تحت گرفتار کر لیا گیا ہے اور عدالت کی مختصر کارروائی کے بعد چودھری صاحب کو پانچ سال قید بامشقت کی سزا دے دی گئی۔

اس واقعہ سے احرار پر ریاست کپورتھلہ سے متعلق ایک نئی ذمہ داری آن پڑی۔ ریاستی حکام اور احرار کے ابین الجھاؤ سے پہلوتہی کے باوجود اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھ سکا۔ بالآخر فریقین آمنے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

مجلس احرار نے اس تحریک کی باگ ڈور ماسٹر تاج الدین انصاری کے سپرد کر دی اور اس تحریک کا مرکز جالندھر ٹھہرایا گیا۔

جالندھر کپورتھلہ سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ریل گاڑی اور پختہ سڑک کے باعث تانگوں کی آمد ورفت بھی تھی۔

ماسٹر تاج الدین نے جالندھر میں جماعت کے حکم کے تحت تحریک کیلئے ابتدائی کام کا جائزہ لیا۔ رضاکار بھرتی کیے اور دو صفحے کا ایک روزنامہ "المجاہد" بھی جالندھر سے شائع کرنا شروع کیا۔ یہ روزنامہ شام چار بجے شائع ہوتا تھا اس کی قیمت دو پیسے تھی۔ کپورتھلہ کے حالات روز بروز بگڑ رہے تھے۔ لہٰذا یہ مختصر روزنامہ مقامی عوام کیلئے

خاصی دلچسپی کا باعث بن گیا۔ ریاست کی خبریں بیرون ریاست کے اخبارات میں شائع نہیں ہوتی تھیں۔ جالندھر سے نکل کر یہ تحریک ریاست کے اندر تک پہنچ گئی۔ ہر روز دوپہر کے بعد احرار رضاکاروں کا جلوس کپورتھلہ شہر اور جالندھر کے بازاروں میں گشت کرتا۔ لیکن نہ تو ریاستی حکام کو جرأت ہوتی کہ انہیں گرفتار کرلے اور نہ برطانوی سرکار نے اس میں الجھنا مناسب سمجھا۔ تاہم دونوں کے مابین مشورے شروع ہوگئے۔ جس کے نتیجے میں چودھری عبدالعزیز جنہیں حال ہی میں پانچ سال قید سخت کی سزا ہوئی تھی۔ ایک ماہ بعد ہی رہا کر دیے گئے۔ چودھری صاحب کی رہائی کے بعد ریاست کے خلاف تحریک کو پھر زمیندارہ لیگ کے سپرد کر دیا گیا۔ لیکن احرار رہنما اپنے مشوروں سے زمیندارہ لیگ کی رہنمائی کرتے رہے۔

ایک نیا محاذ انگریزی اقتدار نے ایشیائی تمدن پر مختلف محاذوں سے جدا جدا حملے کیے یہاں تک کہ کھیل تماشوں کے کردار بھی تہذیب یورپ کا محرک اشتہار تھے پھر ایک دن ایسا سورج طلوع ہوا کہ حکمران کی ساحری نے اچھے بھلے انسانوں کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ لباس کی کتر بیونت، طرز تکلم میں ایشیا کا ہر باشندہ یورپین معلوم ہونے لگا۔ لیکن مجلس احرار نے انگریز کو اس محاذ پر بھی شکست دی۔

۳۰۔ جولائی ۱۹۳۳ء کو امرتسر کے ایک سینما میں ہندوستانی فلم "حورِ حرم" دکھائی جانے والی تھی۔ جس میں مسلمان بادشاہ کے دربار میں ایک برہنہ لڑکی کو محوِ رقص دکھایا گیا۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل حصے بھی قابلِ اعتراض تھے۔

۱۔ مسلمان بادشاہ کا اپنی فوج کو حکم دینا کہ مالیہ ادا نہ کرنے والوں کی جائیداد اور مکانوں کو آگ لگا دی جائے۔

۲۔ فوج کا زبردستی مالیہ وصول کرنا اور ان کے مکان جلانا۔

۳۔ اس کارنامے کی خوشی میں بادشاہ کا دولت کی تھیلیاں تقسیم کرنا اور رعایا کے مکانات جلنے کی خبر سن کر نعرے لگانا۔

۴۔ مسلمان فوج کا بادشاہ کو اس امر کی اطلاع دینا کہ جن لوگوں کو برباد کیا گیا ہے۔ ان میں ایک خوبصورت لڑکی بھی ہے۔

۵. بادشاہ کا یہ سن کر خوش ہونا اور لڑکی کو اپنے حرم میں داخل کرنے کا حکم دینا۔
۶. مسلمان وزیر کا لڑکی کے حصول میں قزاقوں کے ایک گروہ کو متعین کرنا اور ان کا لڑکی کو اٹھا کر لونڈی بنانا اور بازار میں نیلام کرنا۔
۷. نیلام میں لوگوں کا لڑکی کی قیمت ڈالنا اور بادشاہ کے ملازمین کا سب سے بڑی بولی دے کر لڑکی کو حاصل کرنا اور شاہی حرم میں ڈالنا۔

اس فلم کی اطلاع جب مقامی مجلس احرار کے رہنماؤں کو ملی تو انہوں نے سینما کے مالکان سے مطالبہ کیا کہ یہ فلم مسلمان بادشاہ اور اسلامی اصولوں کے خلاف ہے لہٰذا فلم مذکور کو ریلیز نہ کیا جائے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر اس کے قابل اعتراض حصے حذف کر دیے جائیں۔ لیکن مالکان سینما نے مجلس احرار کے مطالبات پر توجہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس پر یکم اگست کو مقامی مجلس احرار کا آئینی نظام توڑ کر اس کی جگہ وار کونسل قائم کر دی گئی اور پہلے ڈکٹیٹر مولانا عبدالقادر غزنوی مقرر ہوئے اور سینما پر احرار رضاکاروں نے پکٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ پہلے روز ہجوم اور رضاکاروں پر پولیس نے اس قدر لاٹھی چارج کیا کہ اس کے نتیجے میں عبدالکریم نامی ایک نوجوان زخمی ہو کر شہید ہو گیا۔ اسی روز مولانا عبدالغفار غزنوی کو گرفتار کر لیا گیا اور چھ ماہ کی سزا دی گئی۔

اس تحریک کے دوران امرتسر کا شہری کاروبار متاثر ہوا۔ اور ساتھ ہی سیاسی فضا میں مجلس احرار کو ایک نیا مقام ملا۔ یہ تحریک چار دن تک رہی۔ اس دوران چار سو سے زائد احرار رضاکار گرفتار ہوئے۔ آخر ۴۔ اگست شام سے پہلے شیخ حسام الدین اور مالکان سینما کے مابین سمجھوتہ ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں فلم "نورِ حرم" کے قابل اعتراض حصے کاٹ لیے گئے۔ گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا۔

مقامی مجلس احرار کی تحریک کا یہ اثر ہوا کہ فلم مذکور سارے ہندوستان کے لیے خلاف قانون قرار دے دی گئی۔

اتاترک کے خلاف مذہبی بغاوت اور اس کا پس منظر

مذہب اور سیاست جس مقام پر بھی ہم آہنگ ہوئے۔ حالات نے درمیان میں آکر وہاں کا رخ اس طرح متعین کیا کہ دونوں میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔

مذہب کے اصولوں میں تغیر نام کو نہیں۔ جب کہ سیاست کو اپنا رخ تبدیل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ جن سیاستدانوں نے مذہب کی اوٹ سے اقتدار تک پہنچنے کی سعی کی ان کی عمر سالوں تک نہیں پہنچی۔

۱۲۔ جولائی ۱۹۳۳ء کے روزناموں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ

• ٹرکی میں انقلابی جماعت کے ایک کارکن نے غازی کمال اتاترک کی ٹرین پر دستی بم پھینکا۔ کمال اتاترک محفوظ رہے۔ لیکن ٹرین کی کھڑکیاں اور شیشے ٹوٹ گئے۔

کمال اتاترک نے تمام ٹرکی میں حکم نافذ کیا کہ قرآن کریم عربی کی بجائے ٹرکی زبان میں پڑھا جائے۔

اس حکم کے خلاف سارے ٹرکی میں ہنگامہ آرائی شروع ہو چکی ہے:

حالانکہ اتاترک قرآن حکیم کے خلاف نہیں تھے۔ لیکن ان کے اس حکم کے پس منظر میں محض عربی زبان کی مخالفت کارفرما تھی۔ لیکن ٹرکی کا مسلمان عربی زبان کے تقدس کو بہر طور قائم رکھنا چاہتا تھا۔

خلافت عثمانیہ نے پانچ سو سال تک عرب تمدن پر براہ راست دخیل رہ کر حکمرانی کی۔ اور سرور کائنات کے روضہ اطہر کو اپنی ڈاڑھیوں سے صاف کیا۔ بیت اللہ میں جھاڑو کشی کو عافیت کا سرمایہ سمجھا۔ اس پر بھی مذہب کو اپنی سیاسی ضرورت کے لیے کھلونا سمجھنے والوں نے واقعات کی عارضی اور مصنوعی روشنی میں ایسی بری طرح ٹھوکر کھائی کہ اپنی نسلوں کے لیے ندامت کا سنگ میل بن کر رہ گئے۔

پہلی جنگ عظیم میں ٹرکی جرمن کا اتحادی تھا جس کے باعث عرب کی سیاست

فرنگی سامراج کے راستے کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کے لیے کرنل لارنس برطانوی لبساط پر ایک ایسا مہرہ ثابت ہوا کہ ترکوں کے ساتھ عرب سیاست بھی مات کھا گئی۔

مکہ کے شریف حسین کو سارے حجاز کی حکمرانی کا خوبصورت جھانسہ دے کر برطانوی سیاستدانوں نے ترکوں کے خلاف عربوں کو ابھارا۔ اور یہ کھیل اس طرح کھیلا گیا، کہ شریف حسین کے بیٹوں (عبداللہ علی، فیصل اور زید) کے ذہنوں میں ترکوں کے خلاف یہ زہر بھر گیا کہ

"تم رسول اللہ کی اولاد ہو اور خالص عربی النسل۔ ترکوں کی ماتحتی تمہاری اہانت ہے۔ اس داغ کو تمہیں ترکوں کے خون سے دھونا چاہیے!"

ترکوں کے خلاف عرب عصبیت کو ہوا دینے کے لیے کرنل لارنس نے لباس اور زبان کو اس انداز سے اپنایا کہ اس پر خالص عرب ہونے کا یقین ہو گیا۔ خصوصاً بدوؤں نے فرنگی جاسوس کے مندرجہ بالا استدلال کو فوراً قبول کر لیا۔ وہ پہاڑوں سے اتر کر ریت کے میدانوں میں ترکوں کو تلاش کرنے لگے۔ ان کا غصہ ان کے سیاہ چہروں کی طرح دن کی روشنی میں واضح دکھائی دینے لگا۔ لارنس کی ریشہ دوانیوں نے حکومت عثمانیہ کے خلاف عربوں کی بغاوت کو حقیقت بنا کر پیش کیا اور ۱۰۔ جون ۱۹۱۶ء کو شریف حسین نے اپنے محل کی کھڑکی سے ترکوں کے خلاف پہلی گولی چلا کر عرب ترک دشمنی کے اس خونی باب پر دستخط کر دیے۔

پھر کیا ہوا؟

مڈل ایسٹ کی تاریخ کا ایک ایک ورق ہنوز خون آلود ہے۔ مکہ اور مدینہ کی گلیاں بیگناہ ترکوں کے خون سے اب بھی کبھی کبھار شفق سے باتیں کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ترک بچوں کی لاشیں اور معصوم عصمتیں عرب نیزوں کی انّی پر اپنی بے گناہی کا جواز پیش کر رہی ہیں۔ آخر ترکوں نے خدا کے گھر سے منہ موڑ لیا اور وہ روضۂ رسول سے روٹھ کر چلے گئے۔

"جو معاہدے تلوار کی نوک سے تحریر نہ کیے جائیں، مسٹر شریف! ان کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ جاؤ!"

برطانوی پرائم منسٹر مسٹر لارڈ جارج کا یہ جواب سن کر شریف مکہ پر کیا گزری؟ اور اس کا انجام کیا ہوا۔ تاریخ نے اس کو ایسی گرہ دی کہ ترکوں کے دل بھینچ کر رہ گئے۔

اتاترک کی دم واپسی تک ترک عربوں کے خلاف دلوں کی میل صاف نہ کر سکا۔
مجلس احرار کے صدر مولانا حبیب الرحمٰن نے اس واقعہ کو اپنے پریس بیان میں کہا۔

"دہلی ۱۴۔جولائی۔ٹرکی کے عظیم رہنما غازی مصطفیٰ کمال کو بم کے حادثے سے محفوظ رہنے پر ہندوستان کے مسلمان خصوصاً مجلس احرار انہیں مبارک باد دیتی ہے۔ لیکن ان کے اس فیصلے کو ہندوستان کے مسلمانوں نے کرب و اضطراب سے سنا جو انہوں نے عربی زبان کے خلاف محاذ بناتے ہوئے قرآن کریم، نماز اور اذان کو ترکی زبان میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔

گو عربوں نے برطانوی سازش کے تحت ترکوں سے ناروا سلوک کیا لیکن اس کی سزا ایسی نہیں ہونی چاہیے جس سے اسلام کے وقار کو صدمہ پہنچے"۔

(روزنامہ "تیج" دہلی۔ ۱۵۔جولائی۔)

اس سال کا یہ مہینہ اقوام یورپ اور ایشیا میں ہندوستان کے لیے سیاسی اعتبار سے عجیب قسم کی پریشانیوں کا مہینہ تھا۔ ان دنوں ہٹلر کی کتاب (MY STRUGGAL) شائع ہو کر یورپ کی مارکیٹ میں آچکی تھی۔ جس میں اس نے لکھا تھا۔

"۱۹۱۴ء کے حدود کی واپسی کا مطالبہ کرنا ہر لحاظ سے ایک سیاسی حماقت ہے۔ بلکہ میں کہوں گا، جرم ہے۔ ۱۹۱۴ء کی مقرر کی گئی سرحدات نہ صرف اس لیے غلط تھیں کہ ان میں تمام جرمن کے باشندے شامل نہ تھے بلکہ فوجی نقطہ نگاہ سے بھی ان میں کوئی معقولیت نہ تھی۔ ۱۹۱۴ء کی سرحدیں کسی باقاعدہ سیاسی غور و فکر کا نتیجہ نہ تھیں بلکہ محض ایک ایسے سیاسی جھگڑے کا عارضی نتیجہ تھیں جس کا ابھی کوئی تصفیہ نہ ہوا تھا۔

جرمن قوم کے لیے صرف ۱۹۱۴ء کی سرحدات واپس لینا بالکل بے معنی ہے ان کے اندر نہ تو جرمن اپنی متحدہ قومیت برقرار رکھ سکتے ہیں اور نہ فوجی لحاظ سے وہ ہمارے لیے کافی ہوں گی۔ دوسرے الفاظ میں اگر ہم نے ۱۹۱۴ء کی حدود

واپس لینے کی کوشش کی تو گویا ہم وہیں کھڑے رہیں گے جہاں اس وقت ہیں۔"

ہٹلر کے ان عزائم سے یورپ کے افق پر دوسری جنگ کے دھندلکے پھیلتے جا رہے تھے۔ دوسری طرف ہندوستان میں کانگریس انفرادی ستیہ گرہ کی تیاری میں معروف تھی۔ چنانچہ انہی خطرات کو سامنے رکھتے ہوئے یکم اگست (۱۹۴۲ء) میں مہاتما گاندھی کو ان کے رفقا سمیت رات ایک بجکر دس منٹ پر بمبئی گورنمنٹ نے گرفتار کر لیا۔ اس کے جواز میں حکومت نے حسب ذیل بیان جاری کیا۔

"مسٹر گاندھی حال ہی میں انفرادی طور پر لوگوں کو اشتعال دلا کر سول نافرمانی کو تقویت دے رہے تھے۔ اور عملی طور پر لوگوں کو جوش دلانے میں معروف تھے۔ نیز اپنے فیصلے کی اطلاع انہوں نے برقی پیغام کے ذریعے کر دی تھی کہ وہ اپنا آشرم خالی کرنے کے بعد اپنے رفقا سمیت موضع راسگراں کی طرف کوچ کریں گے۔ جہاں پہنچ کر وہ افراد کو کانگریس کی قرارداد سول نافرمانی کی دعوت دیں گے۔ بناء بریں حکومت بمبئی نے سپیشل ایمرجنسی پاور ایکٹ ۱۹۴۲ء کی دفعہ ۲ کے تحت مسٹر گاندھی کو گرفتار کر لیا ہے۔

اس سے پیشتر گاندھی جی نے حکومت کو حسب ذیل برقیہ روانہ کیا تھا۔

"امید ہے میں سہ شنبہ کی صبح کو آشرم خالی کر دوں گا۔ اگر آزاد رہا تو رفقا سمیت بآسانی منزل طے کرتا ہوا۔ پہلا قیام راس میں کروں گا۔ اس سفر کا مقصد ان دیہاتیوں کے ساتھ ہمدردی کرنا ہے جو سب سے زیادہ بدحال ہیں لیکن دیہاتیوں کو اجتماعی سول نافرمانی کی دعوت دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ مگر افراد کو کہوں گا کہ کانگریس کی قرارداد کے مطابق سول نافرمانی کریں میں دیہاتیوں کے ساتھ منشیات کی بابت گفتگو کروں گا۔ اور ان سے کہوں گا کہ وہ شراب فروشی اور شراب نوشی بند کر دیں۔ غیر ملکی کپڑے کے تاجروں سے کہوں گا کہ وہ صرف کھدر فروخت کریں۔ نیز تمام دوسرے طریقوں سے کانگریس کے تعمیری پروگرام پر عمل کریں۔

ہندوؤں سے کہوں گا کہ اچھوت چھات بند کر دیں میں خود اور میرے رفقاء ایک پیسہ رکھے بغیر سفر کریں گے۔ اور اسی خوراک پر انحصار کریں گے، جو راستے میں دیہاتی انہیں دیں گے۔ اگر میری گرفتاری عمل میں آ گئی تو میرے رفقاء جن کی تعداد بتیس ہے، جن میں چودہ عورتیں بھی ہیں۔ اپنا سفر جاری رکھیں گے۔"

راعی اور رعایا کے مابین حالات کے بگاڑ نے آگے بڑھ کر رکاوٹ بننے کی کوشش کی مگر اس کی عمر بڑی مختصر نکلی۔ یعنی یکم اگست کو گاندھی کو گرفتار کیا اور ۴ اگست کو انہیں پونا جیل سے رہا کر دیا۔ رہائی کے ساتھ ہی ایک نوٹس کی تعمیل کرائی۔

"آپ (مسٹر گاندھی) اور آپ کے رفیق پونا شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔"

اس نوٹس کے جواب میں گاندھی جی نے پونا جانے پر اصرار کیا اس پر انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا اور مختصر عدالتی کارروائی کے بعد دفعہ ۱۴۴ کے تحت گاندھی اور اس کے تمام رفقاء کو ایک ایک سال قید بامشقت کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی سارے ملک میں کانگریسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔

روزنامہ آزاد کی ضمانت

مجلس احرار گو انفرادی ستیہ گرہ میں کانگریس کی ہمنوا نہیں تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کانگریس کی موجودہ تحریک میں وہ جاذبیت پیدا نہ ہو سکی، جو ۱۹۳۰ء کی تحریک میں تھی۔ یہ اثر تھا مسلمانوں کا اس تحریک سے علیحدہ رہنے کا۔ تاہم احرار اس تحریک کے مخالف بھی نہیں تھے۔ فقط اسی جرم میں مجلس احرار کے آرگن روزنامہ آزاد کی پانچ سو روپے کی ضمانت مانگ لی گئی۔ حکومت کے اس حکم کی بناء پر اخبار آزاد عارضی طور پر بند کر دیا گیا۔ لیکن ۷ ستمبر ۱۹۳۳ء کو زر ضمانت داخل کر کے دوبارہ اس کا اجراء کیا گیا۔

چودھری افضل حق کی کامیابی

مجلس احرار میں چودھری افضل حق کو وہی حیثیت حاصل تھی جو کانگریس میں مہاتما گاندھی کی رہی۔ البتہ اتنا امتیاز ضرور تھا کہ گاندھی کانگریس کے ابتدائی ممبر نہ ہونے کے باوجود کانگریس کی رہنمائی کرتے تھے اور چودھری افضل حق مجلس احرار کے دوامی سالانہ کے ابتدائی ممبر تھے۔

سوچ انکر اور جماعتی لائحہ عمل کے ذمہ دار چودھری افضل حق تھے۔ جماعت کو ملکی یا مذہبی تحریک کے لیے آمادہ کرنا، تحریک کے ساتھ کارکنوں کی سیاسی تربیت کرنا، جماعت کے دیگر رہنماؤں کی گفتگو خواہ وہ عوام میں ہو یا نجی مجالس میں۔ ان پر کڑی نگاہ رکھنا بھی چودھری افضل حق کے فرائض میں تھا۔

حکومت کی طرف سے اگر کبھی جماعت کو ملاقات کی دعوت آئی تو اس کے لیے مجلس مشاورت میں چودھری افضل حق اپنی رائے کو ہمیشہ محفوظ رکھتے۔ تاوقتیکہ ساتھی اپنا نظریہ بیان نہ کرلیں۔ آخری فیصلہ پارٹی لیڈر (چودھری افضل حق) کی رائے پر ہوتا۔

اگست ۱۹۳۳ء کے شروع میں ضلع ہوشیارپور اور لدھیانہ کے مسلم دیہاتی حلقہ کے لیے پنجاب اسمبلی کا ایک ضمنی انتخاب ہوا۔ اس کے لیے چودھری افضل حق کو مجلس احرار نے اپنا ٹکٹ دیا۔ سرکاری اور سرمایہ دار طبقہ ایک دھڑے میں اور دوسرے دھڑے میں غریب دیہاتی عوام تھے۔ اس الیکشن کے نتیجہ میں چودھری افضل حق نے اپنے حریف کو اٹھارہ سو چوالیس ووٹوں سے شکست دی۔ یہ ۱۲۔ اگست ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے۔

بظاہر یہ انتخاب دو ضلعوں کی مسلم دیہاتی سیٹ کے لیے تھا۔ لیکن مجلس احرار کے مستقبل میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ اس ضمنی الیکشن نے پنجاب کے رجعت پسند اور ٹوڈی قسم کے مسلمان رؤسا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ کیونکہ انہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ مجلس احرار نے اس طرح پارلیمانی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پنجاب برطانوی سامراج کا پنجۂ شمشیر زن سمجھا جاتا تھا۔ خصوصاً میانوالی، سرگودھا اور گجرات کے اکثر خاندان برطانیہ کے پائے اقتدار کے محافظ کہلاتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں انہی اضلاع نے انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر بلادِ اسلامیہ کو جو نقصان پہنچایا تھا۔ انگریز اس کے لیے ان کا ممنون تھا اور آئندہ بھی یہ علاقے فوجی کیمپ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایسے میں پانچ دریاؤں کی سرزمین پر فرنگی کسی ایسے پودے کی تخم ریزی پسند نہیں کرتا تھا، جس کے نوکیلے خار اس کے دامن کو تار تار کر دیں۔

ان دنوں شمال مغربی صوبہ سرحد کے قبائل بھی انگریز کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے

تھے۔ ان حالات میں مجلس احرار کی یہ ملکی سی کامیابی اچھا خاصہ اثر رکھتی تھی۔

مولانا ظفر علی خاں کے یہ دو اشعار انہی دنوں کی یادگار ہیں۔

ڈٹ کے کونسل میں کھڑا جس وقت افضل حق ہوا۔ حق کی ہیبت چھائی ایسی۔ رنگ باطل فق ہوا۔
جا فرے دی مونٹ آرلسی کی سٹی گم ہوئی۔ ان کے ہر پٹھو کی منطق کا کلیجہ شق ہوا۔

آزاد قبائل پر بمباری

انگریز صحیح معنوں میں پالیٹیشن قوم ہے۔ وہ اپنے حریف کو صدیوں نہ تو معاف کرتا ہے اور نہ ہی اسے نظر انداز کرنا مناسب سمجھتا ہے۔ کسی حد تک یہ بات ہے بھی درست۔ دوستی اور دشمنی ارائے کے اختلاف سے ہوتی ہے اگر اس میں تساہل ہو تو کسی وقت باہم تصادم کا احتمال ہو سکتا ہے۔

بساط کا ہر کھلاڑی اگر مہرہ اپنی مرضی سے نہیں چلائے گا تو مات کھا جائے گا کیونکہ حریف کبھی دوست بن کر ایسا مشورہ دے جاتا ہے کہ کھلاڑی منہ کی کھاتا ہے۔ اس کلیہ کی بنا پر اقتدار کے حصول یا اسے سنبھال رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میدان کے ہر کونے پر نگاہ رکھی جائے۔

اسلام کی آخری پونجی محفوظ رکھنے کے لیے شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی (رحمتہ اللہ علیہ) نے جو آگ ۱۸۱۳ء میں سکھا شاہی کے خلاف بھڑکائی تھی اس نے فرنگی آشیانے کو بھی بالآخر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گو فرنگی اقتدار کی طنابیں مضبوط ہو چکی تھیں لیکن شمال مغربی صوبہ سرحد کے خشک پہاڑوں نے غیر ملکی اقتدار کی ڈھال بننے سے انکار کر دیا۔ یہ وہی الاؤ ہے جسے شاہ اسماعیل نے بالاکوٹ کی شہادت سے پیشتر روشن کیا تھا۔

پتھروں کی اس سرزمین نے برطانوی قدموں کے نشان تک نہ جمنے دیے۔ پہاڑوں کی بلندیوں نے یونین جیک کے پرخچے اڑا دیے۔ فرنگی اپنے کسی قانون کو ان قبائل پر لاگو نہ کر سکا جو ہنوز مجاہدین کے کیمپ کی آخری متاع تھے۔ آخر برطانوی ہوائی جہازوں نے ان پر آگ برسانے کا فیصلہ کر لیا۔ مقابل میں پتھروں نے بھی آگ اگلی لیکن زمین

لے۔ گورنر پنجاب۔

آخر زمین تھی۔ آسمان کے سامنے ہار مان گئی۔ لیکن یہ ہار انسان کی ہار تھی، ایمان کی نہیں۔
رودکوہیاں اور پہاڑوں کی پگڈنڈیاں بغاوت کے علم لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جن
راہوں سے افواج فرنگی کا گذر ہوتا، دروں سے گولیاں برستیں اور پتھر پڑتے۔
یہ حالات تھے کہ برطانوی سامراج ان قبائل پر اپنی غلامی کا جال نہ پھینک سکا۔
ان آزاد قبائل میں باجوڑی قبیلہ سب سے پیش پیش تھا۔ اور حاجی ترنگزئی ان سب
کے رہنما تھے۔ یہ لوگ کبھی پہاڑوں سے اتر کر اور کبھی اپنی پناہ گاہوں میں چھپ کر سرکاری
فوج پر حملہ آور ہو کر اسے سخت نقصان پہنچاتے۔ کہیں اگر موقع ملتا تو کسی بڑے انگریز
آفیسر کو اغوا کر لیتے۔ اور پھر اس کی بازیابی کے عوض ہزاروں روپے حکومت سے وصول
کرتے۔ ان پہاڑوں کی اوٹ سے ایک طرف والئی افغانستان غازی امان اللہ خاں کی
شمشیر بے نیام فرنگی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی تو برابر میں روس اپنے موقع کی تاک میں تھا۔
ان واقعات کی موجودگی میں آزاد قبائل کی اپنے تحفظ کے لیے انگریز کے خلاف بغاوت
بڑی اہمیت کی حامل تھی۔

آزاد قبائل پر شب و روز کی اندھا دھند بمباری سے ہندوستان کے علاوہ لندن
کے اخبارات نے بھی احتجاجی نوٹ لکھے مجلس احرار نے جو ان دنوں مسلمانان ہند کی واحد
سیاسی جماعت سمجھی جاتی تھی، ۲۴۔ اگست ۱۹۳۳ء لاہور میں جلسہ عام کر کے جو مولانا
حبیب الرحمٰن لدھیانوی صدر مجلس احرار کی صدارت میں ہوا، حسب ذیل قرارداد منظور کی۔

"مسلمانان لاہور کا یہ عظیم اجتماع آزاد قبائل سرحد پر طیاروں کے ذریعے
فضائی بمباری کرنے کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہے۔ اور حکومت کے
اس فعل کو بین الاقوامی اخلاق اور انسانیت کے اصولوں کے خلاف قرار
دیتا ہے۔ جیسے کہ انگلستان کے ممتاز اخبارات اور اہل الرائے حضرات نے
بھی اس انسانیت سوز فعل کو ناپسند قرار دیا ہے۔
حکومت نے اپنے اس انسانیت سوز فعل کے جواز میں جو بیان دیا ہے
وہ قطعاً غیر تسلی بخش ہے۔ تین غیر ذمہ دار اور مشتبہ اشخاص کی عدم حوالگی کی

بنا پر باجوڑ قبائل پر بم برسانا، حکومت کے لیے کسی صورت بھی جائز نہیں۔
موجودہ اقدامات کی تفصیل اور شملہ کی اطلاعات سے صاف ظاہر ہوتا
ہے کہ حکومت بین الاقوامی ذمہ داریوں کی آڑ لے کر آزاد علاقے پر اپنا تصرف
جمانا چاہتی ہے۔
ان حالات کی موجودگی میں یہ جلسہ حکومت برطانیہ سے مطالبہ کرتا ہے
کہ وہ اپنی انسانیت سوز سرگرمیوں کو فوراً بند کر دے ورنہ اس کے افسوسناک
نتائج کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر ہو گی۔
اس قرارداد کے ساتھ ہی سارے ہندوستان میں سرحد پر انگریز کی بمباری
کے خلاف مذمت کی گئی۔ انہی دنوں ریاست کپورتھلہ کی انجمن رضاکاران اسلام کے
ایک جلوس پر ریاستی پولیس اور ہندو بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔ جس میں سینتالیس مسلمان
زخمی ہوئے جن میں دو ہسپتال جا کر شہید ہو گئے۔

مرکزی مجلس احرار کے اہم اجلاس

زندگی ایک سفر ہے اور اس سفر میں انسان
ان دیکھے راستوں سے گذر کر منزل کی جانب
رواں دواں رہتا ہے۔ لیکن اس انفرادی زندگی کو اگر کبھی اجتماعی زندگی سے گذرنا پڑے
تو راستے، پہاڑ اور سمندر بن کر ان راہوں کو انسان کے لیے مصائب کی گذرگاہ بنا دیتے
ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کے دامن ان پگڈنڈیوں پر بھی نہیں الجھتے۔ ان
کے تیور اور پیشانی کی لکیریں شفاف چاندنی کی طرح اپنے مؤقف پر مسکراتی نظر آتی ہیں۔
اگست کے آخر تک اسیران احرار قفس کی تیلیوں سے نکہت چمن تک آن پہنچے
تھے۔ یہ خوش آہنگ لوگ مسلمانان کشمیر کے لیے جیل خانوں میں گئے تھے۔ تین برس
تک کا عرصہ گذار کر جب رہا ہوئے تو ہنوز ان کے عزائم جوان تھے۔ ارادوں میں پختگی
اور ہمتوں میں وہی رنگ چمک رہا تھا۔ جس سے ان کے مؤقف کو جلا ملتی تھی۔ ایک
شاہراہ اور ایک منزل کے مسافر زندگی کے پُر مصائب لمحات گذار کر جب ایک دوسرے
سے ملے تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے بہاریں لوٹ آئی ہیں۔ بادِ بہاری نے خزاں کے

راستے روک لیے ہیں اور باد سموم کانٹے سمیٹ کر چمن سے رخصت ہو چکی ہے۔

۲۴ سے ۲۸۔ اگست (۱۹۳۳ء) تک احرار رہنما لاہور میں ملکی معاملات پر دلجمعی سے غور کرتے رہے۔ اس سوچ کے نتیجے میں حسب ذیل قرارداد مرتب ہوئی۔

۱۔ مجلس احرار ہند کا یہ اجلاس باجوڑ اور اس کے قرب و جوار کے سرحدی قبائل پر برطانوی طیاروں کے ذریعے بمباری پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

۲۔ مجلس احرار کی عاملہ کا یہ اجلاس کشمیر کمیٹی کو مستحق مبارکباد سمجھتا ہے کہ اس نے مسلمانان ہند کی خواہش پر مرزائی عنصر کو کشمیر کمیٹی سے نکال کر اس کو خالصتاً اسلامی جماعت بنا دیا ہے۔ نیز مجلس عاملہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی موجودہ ہیئت ترکیبی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امر کا اعلان کر دینا ضروری سمجھتی ہے کہ مجلس احرار اسلام ہند کو کشمیر کمیٹی کے ساتھ مذہبی نقطہ نگاہ سے جو بنیادی امور میں اصولی اختلاف تھا اب وہ اس تطہیر کے بعد ختم ہو چکا ہے۔

۳۔ مجلس احرار ہند کا یہ اجلاس مسلمانان ہشیار پور اور لدھیانہ کا شکریہ ادا کرتا ہے، جو انہوں نے چودھری افضل حق کو پنجاب اسمبلی کے ضمنی انتخاب میں منتخب کرنے کی محنت کی ہے۔

۴۔ مجلس عاملہ کا یہ اجلاس حکومت کشمیر کے اس فعل کی پرزور مذمت کرتا ہے جو اس نے مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ پنجاب ہائیکورٹ کو میرپور کے مقدمات میں مسلمان ملزموں کو اپنی طرف سے پیروی کرنے کی اجازت نہیں دی اور اس طرح میرپور کے مصیبت زدہ مسلمانوں کو اپنی مرضی کے مطابق اپنا وکیل منتخب کرنے اور انصاف حاصل کرنے میں رکاوٹ قائم کی۔

چیف جسٹس کشمیر ہائیکورٹ کا قادیانی اور غیر قادیانی وکلاء کو مقدمات کی پیروی کے لیے اجازت دینا اور جماعت احرار کے وکلاء کو مقدمات کی اجازت نہ دینا ایک ایسا غیر منصفانہ فعل ہے، جو انصاف کی روایات کے خلاف ہے۔

۵۔ مجلس احرار ہند کا یہ اجلاس اس مسودہ قانون پر غور کرنے کے بعد جو معلّمین حجاج کو لائسنس دینے اور ان پر پابندیاں عاید کرنے کے لیے حکومت ہند نے شائع کیا ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔

(ا) اس مسودہ قانون کے ذریعے سے مسلمانوں کے بہت بڑے اسلامی فریضہ کی ادائیگی میں غیر مسلم حکومت کی مداخلت لازم آتی ہے۔ اور فرائض اسلامی کی آزادی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

(ب) اس مسودہ قانون کے ذریعے حکومت برطانیہ چاہتی ہے کہ ہندوستان کی اسمبلی کی مدد سے حجاز مقدس کیلئے ایسا راستہ اختیار کرے جس سے باشندگان حجاز کے ہر طبقہ کو انگریزی حکومت کا محتاج بن کر اس کی ستمرانہ پالیسی کو مضبوط کیا جائے۔

(ج) اس مسودہ قانون کے ذریعے گورنر جنرل باجلاس کونسل اور صوبہ کی حکومتوں کو لائسنس دینے والے آفیسروں کو معلّمین حجاز پر اس ستم کی مبتلائے اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔ جن سے خطرہ ہے کہ زائرین بیت الحرام کی تعداد میں کمی ہو اور باشندگان حجاز مقدس کسی اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہوں۔

(د) اس مسودہ قانون کے پاس ہو جانے سے معلّمین محسوس کریں گے کہ ہماری روزی کا تمام تر دارومدار اس حکومت کی خوشنودگی پر ہے جس نے ہمیں لائسنس دیا ہے لہٰذا وہ اپنی اپنی ضروریات اور آسائش کی خاطر انگریزی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اور اس طرح تمام معلّمین حجاز انگریزی حکومت کے بالواسطہ ایجنٹ اور کارندوں کی حیثیت میں کام کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

۶۔ لہٰذا مجلس احرار کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور احساسات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، نیز ارضِ حرم کا تقدس اور اس کی آزادی کے پیش نظر معلّمین حجاز مقدس پر اپنے

ایجنٹوں کا جال نہ پھیلائے اور اس مسودہ قانون کو فی الفور واپس لے لے۔
اگر حکومت اس مسودہ قانون کو واپس نہ لے تو پھر مسلمان ممبران اسمبلی کا اسلامی فرض ہے کہ وہ اس کی شدید ترین مخالفت کریں اور اس مسودہ قانون کو مسترد کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کریں۔
مجلس احرار کے اس اجلاس میں سید شاہ بیرسٹر ایٹ لا پشاور کو مجلس احرار کی عاملہ کا رکن نامزد کیا گیا۔
اس اجلاس میں مولانا حبیب الرحمٰن، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مظہر علی اظہر، چودھری افضل حق، شیخ حسام الدین، خواجہ عبدالرحمٰن غازی، ڈاکٹر عبدالقوی، چودھری عبدالعزیز (بیگووال)، میاں محمد عمر اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی شامل ہوئے۔

ریاستوں کا تحفظ

ہندوستان کی سیاست میں یہ دن بڑی کشمکش کے دن تھے۔ برطانوی حکومت یورپ میں ہٹلر کے ارادوں سے آئندہ کے حالات کا جائزہ لے رہی تھی۔ گو آل انڈیا کانگریس کی موجودہ ستیہ گرہ تحریک ناکام ہو چکی تھی۔ تاہم مرے ہوئے سانپ کی طرح اس کی دہشت فرنگی حکمرانوں کیلئے سوہان روح تھی۔ مہاتما گاندھی کو ان کی بیماری کی وجہ سے ۲۳۔ اگست کو پونا جیل سے رہا کر دیا گیا تھا۔ لیکن مجلس احرار کی مندرجہ بالا قرارداد نے حکومت کے لیے الجھن کی نئی شاہراہیں کھول دیں۔ ایسے میں لے دے کر ہندوستان کی ریاستیں غیر ملکی حکومت کی آخری پناہ گاہ تھیں۔ مگر راج گدیوں کے مالک نواب اور راجے نشاط انگریز زندگی کے باعث اپنی رعایا سے غیر مطمئن تھے۔ راجی اور رعایا کے مابین بغاوت کی آگ نے راج محل کو جہنم کدہ بنا رکھا تھا۔ غیر ممالک میں بیٹھ کر داد عیش دینے والے ریاستوں کے رئیس غریب رعایا کی ضروریات زندگی سے ناآشنا تھے۔ ان کے حقوق سے انحراف ان کا پیشہ تھا۔ اس آگ کی تپش جب غیر ریاستی عوام تک پہنچی اور دہری غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ریاستی عوام نے اپنے آمروں کے خلاف بغاوت کی قسمیں کھائیں تو ہندوستان کے غلام ریاستی غلاموں کے دکھ درد میں شرکت کرنے لگے۔ اس چیخ و پکار کے مداوے میں سب سے

پہلا قدم مجلس احرار نے اٹھایا اور وہ گل پوش وادیوں کے اس پار جا پہنچے جہاں انسان جانوروں کی طرح ذبح ہو رہے تھے۔ اس کے بعد ریاست الور، کپور تھلہ اور پھر آگ ریاست بہاولپور میں سلگ رہی تھی۔

مجلس احرار کے بعد آل انڈیا کانگریس نے اپنی غلامی کے ساتھ ریاستی عوام کی غلامی کا بھی احساس کیا۔ گزرے ہوئے کل جو کانگریس مجلس احرار کو تیس لاکھ کشمیریوں کی امداد کے الزام میں فرقہ پرست قرار دے چکی تھی۔ خود ریاست راجکوٹ پر پڑھ دوڑی اس ریاست کا راجہ بھی اپنی رعایا کے حقوق سے غافل تھا۔

برطانوی ہند کے بعد دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کے خلاف تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ ان کی صدائے بازگشت جب برطانوی ایوان تک پہنچی تو آئین افرنگ نئے سانچوں میں ڈھلنے لگے۔ چنانچہ ۳۱ اگست ۱۹۲۲ء کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی۔

"والیان ریاست کی حفاظت کا قانون"

"حکومت برطانیہ اس فکر میں ہے کہ آئندہ سنٹرل اسمبلی (دہلی) میں ایک مسودہ قانون پیش کیا جائے کہ ہندوستانی ریاستوں کو اور ان کے اندرونی نظم ونسق کو برطانوی ہند کے عوام کی نقطہ چینی سے محفوظ کر دیا جائے"

سر محمد یامین خاں اپنی کتاب (نامۂ اعمال) میں لکھتے ہیں۔

۷۔ فروری ۱۹۲۴ء کو پرنس پروٹیکشن بل یعنی ہندوستانی ریاستوں کے تحفظ کا بل بحث کے لیے سیلیکٹ کمیٹی کی وساطت سے درست کرنے کو بھیجا جائے

(اس بل کے آخری الفاظ ہیں)

"اگر کسی والئی ریاست کا چلن خراب بھی ہے تو بھی اس کو معتوب کرنے کا حق کسی اخبار کو نہیں پہنچتا"

اس بل کے پیرا ۲ کے آخر میں سر محمد یامین ریاستوں کے اندرونی حالات پر بحث کے دوران کہتے ہیں۔

"والیان ریاست کی امداد کا مداوا اب برٹش گورنمنٹ پر ہے۔ جس کی فوج

ان کی محافظ اور مددگار ہے۔ اس لیے اب یہ اپنی رعایا کے زیر نہیں بلکہ وہ ان کے فریق مخالف بن گئے ہیں۔ اور ریاست میں کسی کی مجال نہیں کہ ان کے ظلم کے خلاف لب کشائی کر سکے۔ اگر کوئی شخص ذرہ برابر لب کشائی کرے تو اس کو عمر بھر کی قید اور اس کے خاندان والوں کی کل جائیداد ضبط کر لی جاتی ہے"۔

آخر یہ مسودہ قانون منتخب کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کے حق میں ۶۸ اور مخالفت میں ۳۰ ووٹ ہوئے۔

سنٹرل اسمبلی (دہلی) میں ہنوز یہ بحث جاری تھی کہ آل انڈیا مجلس احرار کے صدر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے لدھیانہ سے ایک بیان جاری کیا۔

برطانوی حکومت کو ریاست کے حکمرانوں کا تحفظ اس لیے اہم اور ضروری ہے کہ وہ برطانوی راج کے گماشتے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انگریزی حکومت کو ریاستوں کی مظلوم رعایا کا بھی پاس رکھنا چاہیے جو صدیوں سے شخصی راج کی چکی میں پستی چلی آ رہی ہے۔

اگر برطانوی ہند میں صرف ریاستی حکمرانوں کو ہی تحفظ دیا گیا تو اس سے غلط فہمی ہو جائے گی کہ انگریز حکمران ریاستی عوام کے حقوق کو پامال کرنے میں نواب اور راجوں کے ہمنوا ہیں۔

صدر مجلس احرار کے اس پریس بیان کے بعد جو ۲۔ ستمبر کے ملکی اخبارات میں شائع ہوا۔ ۶۔ ستمبر کو ہوم ممبر گورنمنٹ ہند نے سنٹرل اسمبلی میں اعلان کیا

"حکومت قانونِ تحفظ ریاست ہائے ہند کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کرتی ہے"۔

انہی دنوں ہندوستان کی دوسری مسلم سیاسی جماعتوں نے مجلس احرار کی ۲۴ سے ۲۸۔ اگست تک کی قراردادوں کی تائید میں اپنے اپنے اجلاس منعقد کیے۔

۱۔ جمعیۃ علمائے ہند نے ۴۔ ستمبر ۱۹۳۳ء کو اپنے اجلاس منعقدہ مسلم ہوٹل شملہ میں ایک قرارداد منظور کی،

"یہ اجلاس سرحد میں آزاد قبائل پر برطانوی حکومت کی بمباری اور حجاز

کے متعلق مسودہ قانون کی مخالفت کرتا ہے"۔

۲۔اس طرح آل انڈیا مسلم لیگ نے ۲۵، ۲۶۔ نومبر ۱۹۳۳ء کو اپنے دہلی کے اجلاس میں یہ قرارداد منظور کی۔

"مسلم لیگ گورنمنٹ کی اس کارروائی پر پرزور احتجاج کرتی ہے جو اس نے سرحد پار پٹھانوں پر ہوائی جہازوں کے ذریعے بمباری کی جس سے آزاد علاقے پر تشدد کیا گیا ہے"۔

۳۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس نے ۶۔ ستمبر کو شملہ میں اعلان کیا۔

"ہم سرحد میں آزاد قبائل پر حکومت برطانیہ کے تشدد کی پرزور مذمت کرتے ہیں"۔

شیخ عبداللہ اور مرزائیت

قوموں کے عروج و زوال کی داستان میں شخصی کردار ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ اگر اس کے دامن پر خلوص کا پیوند فرضی یا مصنوعی ثابت ہو جائے تو ساری داستان حقیقت سے ماورا ہو کر رہ جاتی ہے۔

سورج چاہے مقررہ وقت کے بعد طلوع ہو مگر اس کی روشنی پر شبہ کرنا اپنی آنکھوں پر شبہ کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اسی طرح حالات کا واضح ہو کر سامنے آجانا چاہے تاخیر سے ہو حقیقت کو جھٹلانے کی جرأت نہیں رکھتا۔

ریاست کشمیر کی تاریخ حریت میں شیخ عبداللہ کا مذہبی اور سیاسی کردار ۱۹۳۱ء سے جن راستوں سے گزرا وہ راستے آپ سے آپ شہادت دیں گے کہ ان کے ہر نقش پا میں تلون رہا۔ ان کی رائے وقت کے مصنوعی اور ناپائیدار سانچوں میں ڈھلتی رہی۔ ان کے فکر کے امتزاج میں ہمیشہ اجنبیت غالب رہی۔ یہ بگولے کی طرح اٹھے اور آندھی کی طرح بیٹھ گئے۔ سادہ لوح، سادہ مزاج اور صاف دل کشمیری قوم کا یہ لیڈر اپنی شخصیت کے علاوہ کشمیریوں کے لیے بھی غیر مفید رہا۔

آزادی کشمیر کی تاریخ مرتب کرنے والا مؤرخ اگر بددیانت نہ ہوا تو ڈوگرہ شاہی کے مظالم اور شیخ عبداللہ کے متذبذب فیصلے ہم وزن قرار دینے میں اسے کوئی دشواری نہیں

ہوگی۔

۱۹۳۱ء کی تحریک کشمیر میں (جس کی داعی مجلس احرار تھی) اگر شیخ عبداللہ کی دیانت کو ذرہ برابر دخل ہوتا تو آج کی تاریخ ماضی کی تاریخ کشمیر سے مختلف ہوتی۔ اس کے رنگ و روغن میں کشمیری مسلمانوں کا خون اس قدر ضائع نہ ہوتا جتنا ضائع ہو چکا ہے مگر کشمیر کے مرزائیوں نے کشمیری لیڈر کی رائے کو اپنے فاسد عقیدوں کے لیے ایسا استعمال کیا کہ اسے ویران کر کے رکھ دیا۔ آج دریائے جہلم کی لہریں کشمیر کی بہاروں کو ترس گئی ہیں چنار کے درخت خزاں کی زد میں ہیں۔ باد سموم نے باد صبحگاہی کو زہر گھولنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس کی تمام تر ذمہ داری شیخ عبداللہ پر ہے۔ اگر یہ کشمیر کے لیے مرزائیوں کی سیاست میں معاون نہ ہوتے تو شاید کشمیر کے مقدر کا فیصلہ اور انداز سے لکھا جاتا۔

بظاہر شیخ عبداللہ نے مرزائیت کی معاونت سے ہمیشہ اجتناب کیا جیسا کہ ان کے مندرجہ ذیل بیان سے ظاہر ہے۔

> "جب تک میں اس جماعت (جموں کشمیر مسلم کانفرنس) کا صدر ہوں کسی فرقے کو اجازت نہیں کہ وہ اس سیاسی جماعت کو اپنے مذہبی پروپیگنڈے کے لیے استعمال کرے۔ (اسی بیان کے آخر میں وہ کہتے ہیں) میں نہ تو احمدی ہوں اور نہ ہی مجھے قادیانیوں کی فرقہ وارانہ تبلیغ سے کوئی ہمدردی ہے۔ اس کے باوجود وہ (مرزائی) اس سیاسی جماعت کے ہمدرد ہو سکتے ہیں۔ میں یہ حق نہیں رکھتا کہ انہیں روک دوں یا ان کے مذہبی عقاید کے باعث انہیں جماعت سے خارج کر دوں۔ کیونکہ یہ احمدیت کا دور ہے۔"
>
> (روزنامہ انقلاب۔ ۷۔ اکتوبر ۳۲ ۱۹ء)

[نوٹ۔ جموں کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو رکھی گئی۔ اس کے پہلے صدر شیخ عبداللہ اور جنرل سیکرٹری چودھری غلام عباس مقرر ہوئے۔]

لیکن مندرجہ بالا بیان کے باوجود شیخ عبداللہ کا تعلق قادیانیوں سے تھا۔ جیسا کہ ان کے حسب ذیل خط سے ظاہر ہوتا ہے۔

خط

آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس۔ سری نگر کشمیر صدر کے دفتر بجواڑہ سے۔

نمبر اے۔ او۔ ایس۔ مورخہ ۳۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء

میں بصد شکریہ آپ کے خط نمبر ۳۱۔ پی۔ سی۔ ڈی مورخہ ۲۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء بحوالہ (دارالامان) نمبر ۲۲۵ اور ۳/۸ محررہ ۱۹۔ جون ۱۹۲۳ء کی وصولیابی کی اطلاع دیتا ہوں۔ میں نے آپ کے خط کے تیسرے جملے کو بڑی مسرت اور دلچسپی کے ساتھ نوٹ کیا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ آپ نے جو انتظامات کیے ہیں ان کے ذریعے ہم بڑی مفید امداد حاصل کر سکتے ہیں۔ میں ایسے موقعہ کا ایک عرصہ سے منتظر تھا۔ میری کوششیں بھی ہمیشہ یہی رہی ہیں۔ میں بھی اکثر اوقات اپنے معاملات پوری طرح بی (برٹش) گورنمنٹ کے ساتھ طے کر لیا کرتا تھا۔ جموں اور کشمیر کے علاقہ سے رہائی کے بعد مسٹر   سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے جو الفاظ کہے تھے وہ ابھی تک یاد ہیں۔ میں نے انہیں اس وقت پر بات بتا دی تھی اور انہوں نے اچھا مشورہ اور مفید جواب دیا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ حضرت خلیفہ صاحب کی ہدایات کے مطابق وہ ایس ۳ کے بارے میں دہلی میں پی (پولیٹیکل سیکورٹی) سے مزید معلومات حاصل کر کے مکمل اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کے آخری فیصلہ اور مزید احکام وصول ہونے تک عملی طور پر کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ فی الحال میں نے طے کیا ہے کہ مسلم کانفرنس کا آئندہ اجلاس اپنی زیر صدارت میرپور میں منعقد کروں۔ اس کے دو تین اسباب ہیں۔ یہ امر یقینی ہے کہ ہمارے خیالات پر مبنی کسی بھی تصور یا سکیم کی مخالفت کی جائے گی۔ آپ جن لوگوں کو بھیجیں گے انہیں پوری طرح سمجھا دیا جائے گا کہ ہر قسم کی مخالفت سے گریز کریں۔ جہاں تک دوسری پارٹی سے متعلق سوال کا تعلق ہے معاملہ بنا کا ویسا ہی ہے۔ ابھی تک اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ

(آزاد کانفرنس) بھی جلد ہی اپنی کانفرنس منعقد کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ دو وزیروں کی ہدایات پر ہو رہا ہے جنہیں کہ آپ جانتے ہیں۔ آخری ہتھیار جسے آپ پہلے ہی جانتے ہیں میدان میں چھوڑ دیا گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ان کی صفوں میں انتشار پھیلانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور یہ تمام مسلمانوں کو ایک رستے میں باڑھ کر صرف آپ کے پرچم (قادیانی جھنڈے) کے نیچے لا کھڑا کرے گا۔
آپ یہ جان کر خوش ہوں گے کہ ہر چیز طریقے سے انجام پذیر ہو رہی ہے لیکن دوسری طرف میری منزل کی راہ میں، جس کا ذکر دوسرے امور کے بارے میں بالاکوٹ میں آیا ہے، اگر کوئی رکاوٹ پیش آ رہی ہے تو وہ انہی دو وزیروں کی ہے جو دوسری پارٹی کو ہدایت / مشورہ اور شہ دیتے ہیں اور ہمارے موقف کو کمزور کر کے آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ اس مدد سے دوسری پارٹی کافی مضبوط ہو گئی ہے ورنہ وہ زمین پر پاؤں بھی نہیں رکھ سکتی۔ براہ کرم نوٹ فرمائیں کہ یہ دونوں وزیر خود میرے متعلقین میں بھی تفرقہ پیدا کرنے سے باز نہیں رہتے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں مسلسل یہ کہہ رہا ہوں کہ اس سے پہلوتہی کیلئے کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیا جائے لیکن افسوس کہ اب تک کچھ نہیں کیا گیا۔ مجھے جو تازہ مراسلہ وصول ہوا ہے اس میں مجھے کافی اطمینان دلایا گیا ہے کہ میری راہ کے یہ روڑے جلد ہی دور کر دیے جائیں گے (اس وقت افواہ تھی کہ ٹھاکر کرتار سنگھ اور مسٹر ہتہ تبدیل کر دیے جائیں گے)، جہاں تک پیر حسام الدین، سعد الدین شال، مسٹر حشائی اور پیر مقبول شاہ وغیرہم کے رویے کا تعلق ہے تو اس بارے میں عرض ہے کہ موجودہ حالات میں ان معاملات پر میری رائے زنی بالآخر خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ بے شک وہ مشہور لیڈر رہیں لیکن جہاں تک اصل کام کام کا تعلق ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ریاستی حکام مثلاً۔۔۔۔۔۔ میرے لیے ان لیڈروں کے آنے سے زیادہ مفید ثابت ہوئے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر دارالامان دوبارہ غلام محمد جوہری کے ذریعے آر ایس (رابطہ)

قائم رکھے تو میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ زیادہ اچھا ہوگا۔ مسٹر غلام نبی (گلکار) صدر انجمن احمدیہ قادیانی پارٹی سرینگر سے کہا گیا ہے کہ وہ فی الحال اپنا کام (تبلیغ) بند کر دیں۔ اس سلسلہ میں مسٹر بیہقی ان سے بات چیت کر رہے ہیں۔ آپ بھی نوٹ کر لیں۔ بعض سیاسی وجوہ کے پیش نظر مرزا محمد یوسف شاہ سے کہا گیا ہے کہ وہ مزید کچھ عرصہ کیلئے اپنی روانگی ملتوی کر دیں۔ اور دفتر کو اس کی اطلاع بھیج دی گئی ہے۔ میں صاحب بہادر سے کئی بار ملا ہوں اور میں نے ہر عمل ہدایات کے مطابق کیا ہے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ آپ کو مطلع کر دیا جائے کہ اس ضمن میں ضروری اطلاع پی (پولیٹیکل سیکرٹری) کو دے دی گئی ہے۔ فوری طور پر اس سے رابطہ قائم کر کے اپنی بات منوائی جائے۔ ازراہ نوازش نوٹ کر لیجیے۔ مجھے مطلع کیا گیا ہے کہ میرپور کے اجلاس کی تاریخ مقرر کرنے سے پہلے مزید ہدایات حاصل کرنے کے لیے خلیفہ صاحب سے ملاقات کا وقت طے کر لیا جائے۔ یہ ملاقات ایس/۲ کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے تب خلیفہ صاحب اس مسئلہ کے ہر پہلو پر غور و فکر کے بعد پی (پولیٹیکل سیکرٹری) کی خواہش کے مطابق ایک نہایت آسان منصوبہ پر بات کریں گے۔ ان کے جواب میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ اس ملاقات کے لیے سیالکوٹ یا وزیر آباد بہتر رہیں گے۔ (یہ خبر اخباروں میں شائع ہو گئی تھی کہ مرزا محمود وزیر آباد آئیں گے۔ ایم مولوی عبداللہ صاحب (وکیل مرزائی) اور صوفی صاحب (صوفی عبدالاحد قادیانی مبلغ) اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ جہاں تک مسٹر رحیم (عبدالرحیم ولد مولوی محمد عبداللہ) کا تعلق ہے وہ ضرورت کے وقت ہم سے آن ملے گا۔ آپ جو لوگ بھیجیں وہ بڑے منظم ہونے چاہئیں۔ واقف آدمی زیادہ بہتر رہیں گے۔ لاہور میں نمایاں کامیابی کے لیے ہدیہ تبریک قبول فرمائیں۔ (شاید ان دنوں کشمیر کمیٹی کا با قادیانیوں کا جلسہ ہوا تھا جس میں انہیں

کامیابی ہو گئی تھی۔ مؤدبانہ نیاز۔ آپ کا اپنا

(دستخط) ایس۔ایم۔عبداللہ ایم۔ایس سی

صدر آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس سری نگر۔

اس مراسلہ کی اصل نقل سید زین العابدین شاہ کو اطلاع اور ضروری کارروائی کے لیے ارسال کر دی گئی ہے۔ (دستخط) ایس۔ایم۔عبداللہ۔صدر

نوٹ۔ مذکورہ خط انگریزی تحریر کردہ ہے۔ یہ خط ربوہ کے دفتر امور عامہ سے ملا ہے۔ خط کے سرنامہ سے ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کا مخاطب کون ہے۔ تاہم خط کی عبارت سے ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا خط قادیان میں دفتر امور عامہ کی وساطت سے خلیفہ قادیان بشیر الدین محمود کو لکھا گیا تھا۔

زیر نظر کتاب کے گذشتہ اوراق میں لکھا جا چکا ہے کہ شیخ عبداللہ سرینگر سے جب کبھی امرتسر آتے تو اسماعیل غزنوی کے ہاں قیام کرتے۔ اسماعیل غزنوی قادیان کے خلیفہ اول حکیم نور الدین کا حقیقی نواسہ تھا۔ اس قیاس اور قرائن سے یہ حقیقت افسانہ نہیں رہی کہ کشمیر کی سیاسی بساط پر مرزائیوں نے جو مہرے بکھیرے تھے شیخ عبداللہ کو ان میں امتیازی حیثیت حاصل تھی اور یہ سلسلہ ۱۹۳۸ء تک قائم رہا۔ آخر مولانا ابوالکلام آزاد (رحمۃ اللہ علیہ) کے سمجھانے پر شیخ عبداللہ نے مسلم کانفرنس سے علیحدہ ہو کر نیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے جبکہ جموں کے ورکر بھی چودھری غلام عباس سمیت نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے تھے۔ مگر ۱۹۴۱ء میں چودھری غلام عباس نے پھر مسلم کانفرنس میں شمولیت اختیار کر لی۔

جس دور میں حکومتوں کے مسائل باہم رضامندی سے طے ہو رہے ہوں اس دور میں ایک ریاست کا قضیہ طے کرنا کوئی اہم بات نہیں تھی لیکن کشمیر کے قضیے میں ایک طرف بین الاقوامی طاقتیں کارفرما تھیں تو دوسری طرف اندرون ریاست کے مجرم ضمیر سیاستدان بھی اس جھگڑے کو طے کرنے میں مخلص نہیں تھے۔

شیخ عبداللہ علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم تھے کہ کالج کے اندر یوپی اور پنجابی طلبار میں باہم تنازعہ ہو گیا۔ اس ہنگامے میں شیخ عبداللہ پنجابی طلبار کی حمایت پر تھے اس طرح

اس تمام جھگڑے کی ذمہ داری ان پر آن پڑی۔ قریب تھا کہ اس جرم کی پاداش میں کالج سے نکال دیے جاتے کہ کشمیر کے انسپکٹر آف تعلیم خواجہ کمال الدین (لاہوری مرزائی) کی سفارش پر ان کا یہ گناہ معاف کر دیا گیا۔ اسی احسان کے بدلے میں شیخ عبداللہ مرزائیوں کے ہتھے چڑھے۔ اور پھر ۱۹۳۸ء تک کشمیر میں مرزائیوں نے ان سے جو کام لیا۔ وہ تاریخ کشمیر میں آئینے کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔

اقوام یورپ کی پریشانی | قومیں جب انتقام پر اتر آئیں تو اپنے عزم کے سانچے کو لوہے اور پتھروں کی آب سے نہیں بلکہ اپنے خون سے جلا دیتی ہیں۔ جس کی خوبصورتی ان کے ارادے کو پختہ کرتی ہے۔

جرمن قوم نے پلٹ کر جب اپنی شکست کے نقوش دیکھے تو ان کے چہرے اپنے گرے ہوئے خون کی رنگت سے زرد پڑ گئے۔ مستقبل کے آئینے پر اس قدر داغ پڑ چکے تھے کہ ان کا ہر نقش ہیولہ معلوم ہوتا، جس پر وارسائی کے معاہدے کی سیاہی ملی ہوئی تھی۔ ہٹلر اسی شکست خوردہ قوم کا ایک فرد تھا۔ وہ احساس کمتری سے نکل کر توانائی اور حوصلے کی دنیا میں آیا۔ تو فاتح، مفتوح معلوم ہونے لگا۔ یورپ کی سرزمین نئے عزم کی چاپ راست سے گھبرا اٹھی۔ انہی دنوں ہٹلر نے جرمن قوم کو حکم دیا۔ "روٹی سے بندوق زیادہ ضروری ہے"!

اس ایک فقرے نے پہلی جنگ عظیم کے اتحادیوں کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ امن کے نام پر ہٹلر سے چھٹکارا پانے کے بہانے تلاش کرنے لگے۔ چنانچہ تخفیف اسلحہ کانفرنس کی تجویز اقوام متحدہ کے سامنے لائی گئی۔ یہ تجویز ہنوز صفحہ قرطاس پر تھی کہ ہٹلر نے ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو برلن سے اعلان کیا۔

> "یورپ کی دوسری قوموں نے تخفیف اسلحہ کے ضمن میں غیر جانبداری کا ثبوت نہیں دیا۔ لہٰذا ہمارے لیے اقوام متحدہ چھوڑے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اگر امن کے لیے ذمہ داری سے کوشش کی جاتی تو جرمن حکومت آخری مشین گن اور اپنا آخری فوجی تک ختم کر دیتی۔"

اس بنا پر جرمن قوم نے اقوام متحدہ اور تخفیف اسلحہ کانفرنس سے اپنے

تعلقات منقطع کر لیے ہیں۔"

ہٹلر کے اس اعلان سے یورپ کے جنگجو سیاستدان مزید ہراساں ہوئے، جس کا اثر ہندوستان کی سیاست پر بھی پڑا۔ گو کانگریس نے ۳۔ اگست ۱۹۳۳ء سے ۲۔ اگست ۱۹۳۴ء تک کے لیے سول نافرمانی کی تحریک ملتوی کر دی تھی، تاہم گاندھی کی تحریک اچھوت ادھار نے حکومت ہند کو نئی الجھنوں میں ڈال دیا۔ آخر اس موڑ پر ہندو ساہوکار نے فرنگی کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا۔ یعنی ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء کے گجراتی زبان کے اخبار "سماچار" میں یہ خبر شائع ہوئی۔

"مدراس کے ضلع کریالہ میں چند ہندوؤں نے ہریجنوں کے کھیت کو آگ لگا دی۔"

اس خبر کو حکومت کے وسائل نے اس قدر ہوا دی کہ اس آگ کی لپیٹ میں ہندوستان بھر کے ہریجن آگئے۔ مندروں کے دروازے جو بادلِ نخواستہ کل اچھوتوں پر کھول دیئے گئے تھے۔ آج بند کر دیئے گئے۔ نفرت کی اس دیوار کو مہاتما گاندھی کے مرن برت بھی نہ گرا سکے اس ہنگامہ آرائی میں سینکڑوں ہریجنوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ ان گنت کھیت جلائے گئے۔ ان کی اپنی زمینوں پر پانی کے کنوئیں بند کر دیئے گئے۔ انسان تو کجا بھگوان کے چرن چھونا ان کے لیے پاپ قرار دے دیا گیا۔

انگریز اس سارے تماشے کو دور خاموشی سے دیکھتا رہا۔

مجلس احرار ان دنوں مولانا مظہر علی اظہر کے انتخاب کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ یہ انتخاب اسمبلی کی نشست گوجرانوالہ کے شیخ دین محمد ایڈووکیٹ ایم۔ ایل۔ اے کے استعفیٰ کے بعد خالی ہوئی تھی۔ ان کی جگہ اس ضمنی الیکشن میں مجلس احرار نے مولانا مظہر علی اظہر کو نامزد کیا تھا۔ جبکہ مقابل میں سابق ممبر کے بھائی شیخ عطا محمد نے اپنے کاغذات داخل کیے۔ یہ ۳۰۔ ستمبر ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے۔

قادیان کا جائزہ

ریاست کشمیر الور اور کپور تھلہ کی شخصی حکومتوں کے خلاف وہاں کے عوام کی خواہش پر مجلس احرار نے جن اصولوں پر اقدام کیا۔ واقعات شاہد ہیں کہ ریاست کے نظامِ حکومت میں نہ صرف تبدیلیاں آئیں۔ بلکہ مستقبل کے

انقلاب کی راہیں کشادہ ہوگئیں۔اسی بنار پر قادیان (ضلع گورداسپور) کے عوام نے مجلسِ احرار سے درخواست کی کہ،

"رہنمایانِ احرار! السلام علیکم!

قادیان کے عوام بھی آپ کی امداد کے منتظر ہیں۔گو قادیان عام اصطلاح میں ریاست نہیں لیکن یہاں کی غالب آبادی اپنے مخصوص مذہبی عقاید کی بنار پر قادیان کی دوسری اقلیت آبادی کو پریشان کیے ہوئے ہے۔

خلیفہ قادیان کے آمرانہ ظلم و جور کی کہانی دوسری ریاستوں سے مختلف نہیں جنہیں آپ اپنی مسلسل قربانیوں اور جدوجہد سے درست کرتے چلے آ رہے ہیں۔قادیان کے عوام بھی آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ انہیں نام نہاد مذہبی آمر سے نجات دلائی جائے۔ فقط قادیان کا ایک مظلوم"

اس درخواست کے نیچے نہ تو کسی کا نام درج تھا اور نہ ہی تاریخ اور مقام تحقیق پر پتہ چلا کہ درخواست دہندہ عبدالکریم نامی کوئی شخص ہے۔(یہ وہی عبدالکریم ہے جو آگے چل کر مولانا عبدالکریم مباہلہ کے نام سے معروف ہوئے۔) موصوف کا تمام خاندان پشتینی مرزائی تھا۔رشتے ناطے، برادری کے رسم و رواج اور کاروباری لین دین بھی مرزائیوں سے وابستہ تھا۔لباس کی کتر بیونت، چہرے کے خدوخال، سر کی پگڑی کا وہی قادیانی انداز، ڈاڑھی وہی فرنچ کٹ، جو عام طور پر مرزائیوں کے چہرے پر دیکھنے میں آئی تھی۔اور رہائش بھی قادیان میں تھی۔

یہ بات رازہائے درون پردہ ہے کہ اس قدر قرابت کے باوجود مولانا عبدالکریم کے خاندان نے مرزائیت سے بغاوت کیوں کی؟ تاہم یہ بات اسی دن سامنے آئی جب قادیان میں مولانا عبدالکریم کے مکان کو نصف رات گئے آگ لگا دی گئی۔یہ لوگ بڑی مشکل سے جان بچا کر بٹالہ اور پھر امرتسر پہنچے۔

ایسے حالات میں مولانا عبدالکریم مباہلہ کی درخواست احرار رہنماؤں کے لیے کئی دنوں تک معمہ بنی رہی۔کیونکہ احرار کے نزدیک پیشتر ازیں قادیان کوئی قابلِ توجہ گردہ نہیں تھا۔

جبکہ اس وقت کے علمار نے قادیانیوں کو اپنی کسی تحریر سے کافر یا اسلام کی حدیں توڑنے کا مجرم قرار نہیں دیا تھا۔ حالانکہ مرزا غلام احمد ۱۹۰۱ء میں اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کر چکا تھا۔ اس پر صرف لدھیانہ کے علمار نے اس کے کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ اس پر بھی ہندوستان اور خصوصاً پنجاب کے دیگر علمار نے کوئی توجہ نہ دی۔ تاہم قادیان کے واقعات سن کر احرار انسانی نقطہ نظر سے مجبور ہوئے کہ قادیان کے حالات معلوم کیے جائیں۔ چنانچہ ۶۔ اکتوبر (۱۹۳۳ء) کو حبیب الرحمٰن اور غریب شاہ دو گمنام کارکن قادیان بھیجے۔ جن کے ذمہ تھا کہ وہ چپکے سے وہاں کے حالات اور قصبے کی اقتصادی اور معاشرتی زندگی کا مطالعہ کریں۔ ان اجنبیوں کو قادیان میں گھومتے پھرتے دیکھ کر مرزائیوں کو شبہ گزرا جس پر ان کارکنوں کو بے دریغ مارا گیا۔ خاص کر غریب شاہ کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ وہ اسی حالت میں لاہور پہنچے۔ کچھ دن علاج معالجے کے بعد ہوش آنے پر انہوں نے آنکھوں دیکھا حال اور قادیان میں غیر مرزائیوں کی زندگی نیز وہاں کے کاروباری حالات کی رپورٹ مرتب کی۔ یہ رپورٹ کئی مہینے احرار رہنماؤں کے زیر مطالعہ رہی۔ کہ آخر قادیان کے اس گروہ کی مذہبی اور سیاسی حیثیت کیا ہے۔؟

مرزائیت کیا ہے؟

۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر میں جن واقعات نے سیاسی یا مذہبی اعتبار سے جنم لیا، اُن پر غور کرنے سے پیشتر مغل فرمانرواؤں کے نو سو سالہ دورِ حکومت میں ہندوستان کی مختلف اقوام کے رہن سہن اور طرزِ تمدن پر غور کرنا اہم اور ضروری ہے۔ کیونکہ یہی محرکات تھے جنہوں نے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں جہادِ حریت کی ابتداء کی۔

۱۸۰۰ء سے پیشتر کی ہندوستانی آبادی مذہبی عقاید کو انسانی برادری پر ترجیح دیتی تھی۔ دل اگر مذہب کا پیرو تھا تو نگاہیں انسانیت کا احترام کرتی تھیں۔ اخلاق اور اخوت کا یہ جذبہ گھروں کی چار دیواری کے اندر تک کارفرما تھا۔ مسلمان اور غیر مسلم کی بیٹی میں صرف جسموں کا امتیاز حائل تھا۔ مگر اس رشتے کی پاکیزگی اطراف میں ہم وزن تھی۔ محلوں میں مختلف مذاہب کی آبادی انسانی رشتہ حیات میں ایک دوسرے کی خوشی اور غمی میں برابر کی شریک تھیں۔ برادری اور بھائی چارہ مذہب کے اصولوں میں دخیل

نہیں تھے ۔ اور نہ ہی کوئی مذہب اس بنیاد پر باہم ٹکراؤ کی اجازت دیتا ہے ۔

مغل راج کی تاریخ شاہد ہے کہ اس دوران راج گدی کے حصول پر عسکری ٹکراؤ تو ہوئے لیکن اس دور کی تاریخ ان واقعات سے تہی ہے کہ کبھی رعایا محض مذہبی اصولوں کے اختلاف پر دست و گریبان ہوئی ہو۔ یہاں تک کہ اڑوس پڑوس میں کوئی ایسی دراڑ نہیں آئی جس سے باہم نفرت کی بو پھیلنے کا احتمال ہوا ہو۔ خود وا ثان سلطنت رعایا کو مذہب کے اصولوں پر نہیں بلکہ آدمیت کے اصولوں پر پیار کرتے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو اور مسلمان ان اختلاف کے باوجود باہم رشتہ ناطہ کرنے سے گریزاں نہیں تھے ۔ چنانچہ شہنشاہ اکبر اور راجہ اور کی بیٹی جودھا بائی کے ازدواجی تعلقات اس بات کی دلیل ہیں

یونین جیک کی اڑانیں جب متحدہ ہندوستان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو اپنی لپیٹ میں لے چکیں ۔ تو فرنگی راج کے سائے دریائے جمنا کو عبور کر کے گنگا کی طرف بڑھنے لگا ۔ راستے کی دیواریں ریت کے گھروندے کی طرح گرتی چلی گئیں ۔ غیر ملکی اقتدار آتشیں اسلحہ کے دامن میں ہندوستان کے لیے غلامی کی زنجیریں لے کر آگے بڑھ رہا تھا مسلمان بادشاہوں کی صدیوں پرانی قدریں ہندوستان کے مقدر سے معدوم ہو رہی تھیں ۔ تہذیب مشرق پر یورپ کا سورج اپنی کرنیں بکھار رہا تھا ۔ یہ پر آشوب دن تھے ہندوستان کے لیے ، جب مغلیہ سلطنت کے آثار مٹتے چلے جا رہے تھے ۔ آخر ہندوستانی بلا امتیاز مذہب وملت فرنگی طوفان کے آگے آہنی دیوار بنے ، آگ کے شعلوں سے لپٹے ، پھانسی کے تختوں پر چڑھے ، توپوں کے دہانوں سے باندھ کر ان کا گوشت اڑا دیا گیا ۔

دہلی کے لال قلعہ کی دیواریں اور جامع مسجد کے مینار یہ سارا تماشہ دیکھتے رہے ۔ جمنا کا پانی لال قلعہ کی دیواروں سے سر پٹکتا رہا ۔ لیکن ہندوستان کے مقدر پر غلامی کی جو سیاہ لکیر پھر چلی تھی اسے ہندو مسلمان کا خون بھی نہ مٹا سکا ۔ آخر ہندوستان کی ایکتا نے غیر ملکی حکمرانوں سے وقتی ہار مان لی ۔

اس شکست کو غیر ملکی فاتحین نے شدت سے محسوس کیا ، نیز ان عوارض پر غور کیا ۔

ا ۔ سلطنت مسلمانوں سے چھینی تھی ۔ لیکن اس کے دوبارہ حصول میں ہندوؤں

نے مسلمان کا ساتھ کیوں دیا۔؟

۲۔ ہندو مذہب میں جہاد کا وجود نہیں جبکہ اسلام کا یہ ایک اہم جزو ہے۔ پھر جہاد کے عنوان سے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ہندو کیوں شریک ہوا۔؟

۳۔ ہندو اور مسلمانوں کی تہذیب میں بھی اختلاف ہے پھر یہ اتحاد کیسا۔؟

۴۔ اگر اس کے محرکات محض انگریز دشمنی پر مبنی ہیں تو پھر انگریز قوم کو بھی سوچنا پڑے گا۔ ورنہ ہندوستان میں اس کا مستقبل روشن نہیں۔

فرنگی دانشوروں کی یہ سوچ برطانوی سیاستدانوں کی میز سے ایوان حکومت تک پہنچی اور اس بنیاد پر ۱۸۶۹ء کو انگریزوں نے ایک کمیشن ہندوستان بھیجا کہ وہ انگریزوں کے خلاف خاص کر مسلمانوں کا مزاج معلوم کرے۔ نیز آئندہ کیلئے ہندوستانی مسلمانوں کو رام کرنے کی تجاویز مرتب کرے۔

اس کمیشن نے ایک سال ہندوستان رہ کر مسلمانوں کے حالات معلوم کیے اور واپسی پر ۱۸۷۰ء کو لنڈن وائٹ ہاؤس میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں کمیشن مذکور کے نمائندوں کے علاوہ ہندوستان میں متعین عیسائی مشنری کے پادری بھی خاص دعوت پر شریک ہوئے۔ کمیشن کے نمائندوں اور پادریوں نے اپنی اپنی رپورٹ پیش کی، کمیشن کے سربراہ سرولیم ہنٹر کی رپورٹ،

"مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ وہ کسی غیر ملکی حکومت کے زیر سایہ نہیں رہ سکتے اور ان کے لیے غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے۔ اس تصور سے مسلمانوں میں ایک جوش اور ولولہ ہے۔ وہ جہاد کے لیے ہر لمحہ تیار رہتے ہیں۔ ان کی کیفیت کسی وقت بھی انہیں غیر ملکی حکومت کے خلاف ابھار سکتی ہے۔"

رپورٹ پادری صاحبان۔

"یہاں کے باشندوں کی ایک بہت بڑی اکثریت پیری مریدی کے رجحانات کی حامل ہے۔ اگر اس وقت ہم کسی ایسے غدار کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں جو ظلی نبوت کا دعوئی کرنے کو تیار ہو جائے تو اس کے حلقہ نبوت میں ہزاروں لوگ جوق در جوق شامل ہو جائیں گے۔ لیکن مسلمانوں میں سے اس قسم کے دعویٰ کے لیے کسی کو تیار کرنا بنیادی کام ہے۔ یہ مشکل اگر حل ہو جائے تو اس شخص کی نبوت

کو حکومت کے زیر سایہ پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔

ہم اس سے پہلے برصغیر کی تمام حکومتوں کو غدار تلاش کرنے کی حکمت عملی سے شکست دے چکے ہیں۔ لیکن وہ مرحلہ وار تھا۔ کیونکہ اس وقت فوجی نقطہ نظر سے غداروں کی تلاش کی گئی تھی۔ مگر اب جبکہ ہم برصغیر کے چپہ چپہ پر حکمران ہو چکے ہیں اور ہر طرف امن و امان بھی بحال ہو گیا ہے تو ان حالات میں ہمیں کسی ایسے منصوبہ پر عمل کرنا چاہیے جو یہاں کے باشندوں کے داخلی انتشار کا باعث ہو۔"

اقتباس مطبوعہ رپورٹ کانفرنس وائٹ ہاؤس منعقدہ ۱۸۷۰ء

(دی ارائیول آف برٹش ایمپائر آف انڈیا)

انہی دنوں برطانوی پارلیمنٹ میں وزیر اعظم انگلستان مسٹر گلیڈسٹون نے تقریر کے دوران قرآن کریم ہاتھ میں لے کر کہا کہ "جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود ہے ہم اطمینان سے حکومت نہیں کر سکتے"۔ یہ فقرہ کہتے ہوئے وزیر اعظم برطانیہ نے کلام الٰہی کو زمین پر دے مارا۔ اسی اجلاس میں لارڈ میکالے وزیر ہند نے کہا کہ اس ہاؤس میں میری تجویز ہے۔

"ہندوستان میں ایسی تعلیم رائج کی جائے، جس کے ذریعے ہر ہندوستانی لباس بول چال، رہن سہن اور طرز تمدن میں انگریز معلوم ہونے لگے۔ چاہے وہ عیسائی نہ بھی ہو، مگر زندگی کے ہر شعبے میں انگریز دکھائی دے"۔

ہندوستان کی سلطنت مسلمانوں سے چھینی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ بھی مسلمان علماء نے دیا تھا۔ نیز مسلمانوں نے بہادر شاہ ظفر کو دہلی کے تخت پر دوبارہ بٹھانے کے لیے ہندوؤں کو ساتھ ملا کر انہیں مسلح بغاوت پر آمادہ کیا۔ بدیں حالات انگریزوں کے نزدیک اصل مجرم مسلمان تھا اور آئندہ بھی برطانوی راج کو ہندوستان میں اگر کوئی خدشہ ہو سکتا تھا تو وہ بھی مسلمان سے۔ ان حالات میں وہائٹ ہاؤس لندن کے مجوزہ فیصلے وزیر اعظم برطانیہ کی رائے اور لارڈ میکالے کی تجاویز کا زیادہ وزن ہندی مسلمانوں پر ڈالا گیا۔

سر سید اور مرزا غلام احمد

لارڈ میکالے اور ہندوستانی پادریوں کی تجویز کے تحت ہندوستان سے ایسے آدمیوں کی تلاش ہونے لگی جن کے ذریعے ہندوستان

کے مسلمانوں کے دلوں سے ۱۸۵۷ء کے جذبات کا خاتمہ ہو سکے، اور جذبہ جہاد کو ختم کیا جا سکے۔ اس اہم کام کی ذمہ داری صرف ایسے افراد کے سپرد کی جاسکتی تھی جو آزمائش پر پورے اتریں اور حکومت کے اعتماد کو بحال رکھیں۔ یہ اشخاص صرف اسی ہجوم سے حاصل ہو سکتے تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں غیر ملکی حملہ آوروں کے کسی نہ کسی طرح معاون رہے ہوں اور اس پر شرط یہ کہ ہوں بھی مسلمان۔ چنانچہ لارڈ مقالے کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری سر سید احمد پر ڈالی گئی ——— کیوں؟ اس سوال کا جواب سر سید خود دیتے ہیں۔

"میں نہایت متامل ہوتا ہوں اس اگلی بات کے بیان کرنے سے کہ میں اپنی نسبت آپ لکھتا ہوں۔ اور پھر مجھ کو اس کے لکھنے پر اس لیے دلیری ہوتی ہے کہ در حقیقت میں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا ہوں۔ پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے۔ کہ اگر میرے آقا (انگریز) نے میری نسبت کہی ہو۔ میں کیوں نہ اس کو کہوں اور کس لیے نہ لکھوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اس کو بیان کر کے فخر کرنا نوکر کا کام ہے۔ یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر دام اقبالہٗ صاحب جج اور سپیشل کمشنر میری عزت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی گئی کہ تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا اور باوجود کہ بجنور کے ضلع کے ہندو اور مسلمانوں میں کمال عداوت تھی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کو مقابلہ کر کے اٹھایا تھا۔ اور جب ہم نے تم کو اور محمد رحمت خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور نہایت طرفداری سرکار (برطانیہ) کے سبب ہندوؤں نے جو بڑے رئیس اور ضلع میں نامی چودھری تھے۔ سب نے کمال خوشی اور نہایت آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے پر حاکم بننا قبول کیا بلکہ درخواست کی کہ تم ہی سب ہندوؤں پر ضلع کے حاکم بنائے جاؤ۔ اور سرکار نے بھی ایسے نازک وقت میں تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال

نوکر جان کر کمال اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح وفادار اور نمک حلال نوکر سرکار رہے۔ اس کے صلے میں تمہاری اگر ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کو رکھی جائے تو بھی کم ہے۔

میں اپنے آقا کا کمال شکر ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھ پر ایسی مہربانی کی اور میری قدردانی کی، خدا ان کو سلامت رکھے۔ (آمین)

(مقالات سرسید۔ حصہ ششم ص ۳۵۲)

جب جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا آغاز ہوا تو سرسید بجنور میں صدر امین کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ نے انقلابیوں کی شدید مخالفت کی اور انگریزوں کو بچانے کی پوری کوشش کی۔ جنرل محمود خاں بجنور کی انقلابی تحریک کے سربراہ تھے۔ سرسید نے انگریزوں کو انقلابیوں کے ہاتھ سے بچانے کے لیے محمود خاں کے ساتھ مصالحت کر لی۔ اور اعلیٰ انگریز افسروں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ نظم و نسق محمود خاں کو سونپ دیا جائے۔ اس طرح سے یورپین آبادی امن و امان سے بجنور سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ جنرل محمود خاں نے جب سرسید کو ساتھ ملانا چاہا تو آپ نے صاف انکار کر دیا اور میرٹھ چلے گئے لیکن سرسید اور ان کے ساتھیوں کا جواب یہ تھا کہ ہم حاضر ہیں لیکن انگریز حکام سے تحریری اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔

"تاریخ پاکستان" مطبوعہ سٹینڈرڈ بک ہاؤس ص ۱۹۱۔ اردو بازار لاہور

سرسید وفاداری اور مسلمانوں کی فلاح کا تقاضا اس میں سمجھتے تھے کہ انگریزی حکومت کی مخالفت نہ کی جائے۔ چنانچہ جنگِ آزادی کے خاتمے کے بعد سرسید کی ان خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور جنگ کے خاتمے پر ۱۸۵۸ء میں گورنمنٹ برطانیہ نے سرسید کو خلعت کے علاوہ دو سو روپیہ ماہوار کی پنشن دو پشت تک کر دی۔

"تاریخ پاکستان" مطبوعہ سٹینڈرڈ بک ہاؤس اردو بازار لاہور ص ۲۹۲

۱۸۵۷ء میں سرسید بجنور میں صدر امین تھے۔ آپ نے بڑی مشکل سے انگریزوں کی جانیں بچائیں۔ اور خود بھی وہاں سے میرٹھ چلے گئے۔ اس جنگ میں سرسید کی خدمات

کی وجہ سے انہیں ترقی دے کر صدر الصدور بنا دیا گیا۔

"تاریخ پاکستان" ص۱۸۰

سرسید نے مراد آباد میں اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ جب تک انگریزی لٹریچر کا ترجمہ اردو زبان میں نہیں کیا جاتا۔ جدید یورپین علوم کی روشنی کا برصغیر میں پھیلنا ناممکن ہے۔ اس احساس کے تحت انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ سرسید کے ساتھ یہ سوسائٹی بھی غازی پور اور پھر علیگڑھ منتقل ہو گئی۔ "تاریخ پاکستان" ص۱۸۵

سرسید ۱۸۷۰ء میں انگلستان سے واپس لوٹے، یاد رہے یہی وہ سال ہے۔ جب، وائٹ ہاؤس لندن میں وہ کانفرنس ہو رہی تھی جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے تو انہوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تگ و دو شروع کر دی تھی۔ کمیٹی "خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" کا قیام اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ اس کی تجاویز کے مطابق محمڈن کالج فنڈ کمیٹی کی تشکیل کی جو مجوزہ کالج کے لیے چندہ کی فراہمی کی ذمہ دار ٹھہرائی گئی تھی۔

حکومت ہند نے، جسے اس فیصلے کی اطلاع دی گئی تھی۔ اس تجویز کو بہت پسند کیا اور لکھا کہ شمال مغربی اضلاع کے مسلمانوں کی یہ تجویز اس بات کی مستحق ہے۔ کہ جہاں تک ممکن ہو حکومت اس میں مدد دے۔ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے ہند نے اپنی جیب سے دس ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۷۳ء میں مدرسہ کی سکیم مکمل کر لی گئی مولوی سمیع اللہ خاں کے زیر انتظام اس مدرسہ کا افتتاح ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو سر ولیم مور کے ہاتھوں ہوا۔ محمڈن کالج فنڈ کے سیکرٹری کو چندہ جمع کرنے میں کافی کامیابی ہوئی۔ نظام حیدر آباد نے نوے ہزار روپے دیئے اور چھ ہزار روپیہ سالانہ دینے کا وعدہ کیا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے اٹھاون ہزار روپیہ دیا اگر یہ تعلیمی سکیم صرف مسلمانوں کی ترقی کے لیے تھی تو مہاراجہ پٹیالہ نے اٹھاون ہزار روپیہ کیوں دیا؟ اسی سے شبہ ہوتا ہے کہ تعلیم ترقی کی سکیم میں انگریز کی نیت نیک نہیں تھی نواب رام پور نے بھی بہت مدد کی۔ حکومت نے بیالیس سو روپیہ سالانہ گرانٹ منظور کی بعد میں اضافہ کر دیا گیا اور گرانٹ بارہ ہزار روپیہ سالانہ مقرر کی گئی۔ الغرض اتنا چندہ جمع ہو گیا تھا کہ کالج کا آغاز کیا جا سکے۔ چنانچہ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو ایم اے او۔ کالج علی گڑھ کا افتتاح لارڈ لٹن

کے ہاتھوں ہوا۔ "تاریخ پاکستان" صفحہ ۱۸۸۔

سر سید احمد خاں علی گڑھ کالج کی مجلس منتظمہ کے سیکرٹری تھے۔ انہوں نے کالج میں بیشتر سٹاف یورپین رکھا تھا۔ کالج کا پرنسپل بھی انگریز ہی ہوا کرتا تھا۔ یہ بات بعض مخلص مسلمان سربراہوں کی نظر میں قابلِ اعتراض تھی۔ وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یورپین عیسائی مسلمانوں کی صحیح تربیت کیسے کر سکیں گے؛ بالخصوص پرنسپل بیک (Beck) کی سرگرمیاں سر سید کے رفقاء کار کو قطعی ناپسند تھیں۔ چنانچہ جب ایک انگریز پروفیسر کو ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا گیا تو اس کے خلاف شدید احتجاج ہوا۔

سر سید انگریزوں کی علمیت سے متاثر تھے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ یورپین سٹاف علیگڑھ اور حکومت کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے وہ ہر قیمت پر یورپین سٹاف کو راضی رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔ "تاریخ پاکستان" صفحہ ۱۸۹

قانون کی نظر میں مساوات کے مطالبے کے علاوہ معاشرتی انصاف پر بھی سر سید نے زور دیا۔ اور اس کے لیے اپنی قوم (مسلمان) کو انگریزوں کے سے طور طریقے اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ تاریخ پاکستان صفحہ ۱۹۰

برصغیر کا یہ ہونہار سپوت (سر سید احمد) ۱۷۔ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوا۔ یہ حسینی سید تھے۔ جوانی کے ابتدائی ایام تھے اور ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ گھر کی تمام ذمہ داری ان پر آن پڑی۔ یہ چاہتے تو مغل دربار میں اچھی ملازمت مل سکتی تھی لیکن ان کی رائے میں ملک کی مضبوط ترین حکومت انگریز کمپنی کی ہے۔ اور یہی آخر کار قائم رہنے والی ہے۔ لہٰذا انہوں نے کمپنی کی ملازمت کو ترجیح دی۔

۱۸۳۹ء میں سر سید کو کمپنی کی ملازمت میں سررشتے دار کی معمولی آسامی ملی ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کر لیا اور ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۵ء تک دہلی میں منصف کے عہدے پر نامزد رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ حریت میں انگریزوں کی جانیں بچانے کے سلسلے میں آپ کو ۱۸۶۲ء میں صدر الصدور بنا دیا گیا۔ ۱۸۶۹ء کو سر سید کے لڑکے سید محمود کو انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفہ ملا، تو آپ ان کے ساتھ انگلستان چلے گئے (انگلستان میں

قیام کے دوران سرسید احمد کو دو سو پچپن پونڈ سالانہ وظیفہ ملتا رہا۔

"مذہب اسلام" مصنفہ محمد نجم الغنی رامپوری ص ۶۲۳

۱۸۷۷ء میں دو سال کے لیے سرسید کو امپریل کونسل کا رکن نامزد کیا گیا۔ ۱۸۸۸ء میں سرسید کو حکومت برطانیہ کی طرف سے سر کا خطاب ملا۔

اس طرح زندگی کے خوبصورت دن گذار کر سرسید احمد ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اقتباس "تاریخ پاکستان" مطبوعہ سٹینڈرڈ بک ہاؤس اردو بازار

سرسید کے مذہبی عقاید | سرسید احمد کے سیاسی افکار جاننے کے بعد ان کے مذہبی عقاید کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ قارئین کو سرسید کی دونوں حیثیتیں جان کر ان کے متعلق فیصلہ دینے میں آسانی ہو۔

نبوت:۔ یہ ایک ملکہ (تجربہ) ہے جو انسان کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے طب اشاعری وغیرہ۔ اور جبریل علیہ السلام کا کوئی خارجی وجود نہیں۔ بلکہ وہ اسی کیفیت اور ملکہ کا نام ہے۔

(تفسیر القرآن جلد اول ص ۲۶ تا ۳۱ مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ)

۲۔ جنت اور دوزخ کے خارجی وجود سے انکار۔

تفسیر القرآن جلد اول ص ۲۵

۳۔ فرشتوں اور جنوں کے وجود کا انکار۔ " " ص ۴۲

۴۔ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا انکار " " ص ۱۰۱ تا 115

۵۔ ابراہیم علیہ السلام نے بھی بت پرستوں کی طرح عبادت کے لیے پتھروں کا ایک گھر کھڑا کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز کا حکم نہیں دیا۔

تفسیر القرآن جلد اول ص ۱۷۶ تا ۱۸۲۔

۶۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بن باپ پیدا ہونے، ماں کی گود میں کلام کرنے اور زندہ آسمان پر اٹھائے جانے سے انکار۔

تفسیر القرآن جلد دوم ص ۲۱ تا ۴۲ مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ۔

۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج جسمانی کا انکار۔

تفسیر القرآن جلد ششم ص۵۵ مطبوعہ اسٹیورٹ پریس علیگڑھ۔

نوٹ:۔ مندرجہ بالا حوالہ جات سرسید احمد کی کتاب تفسیر القرآن سے موخذ ہیں۔

۸۔ جوتا پہنے نماز پڑھنا:۔ جوتا پہن کر نماز پڑھنی سنت ہے۔ اس پر نجس ہونے کا گمان کرنا وسوسہ میں داخل ہے۔ صرف اتنا دیکھنا چاہیے کہ نجاست ظاہری اس میں نہ لگی ہو۔ اگر ہو تو اس کو سخت چیز یا زمین سے رگڑ ڈالو اور اسے پہن کر نماز پڑھ لو

انگریزی جوتا بہ نسبت ہندوستانی جوتے کے یا عرب کی نعلین کے بہت زیادہ صاف رہتا ہے۔ اس لیے کہ ان جوتوں کا تمام تلا زمین پر لگتا ہے اور انگریزی بوٹ کی ایڑی بہت اونچی ہوتی ہے۔ اس سبب سے وہ بہت کم زمین پر لگتا ہے۔

تہذیب الاخلاق۔ جلد دوئم ص۲۱۴۔ مصنف سرسید احمد۔

مشہور مورخ اسلام مولانا نجم الحسن رامپوری اپنی کتاب "مذاہب اسلام" کے ص۶۴۳ پر سرسید کے متعلق لکھتے ہیں۔

"راجہ رام موہن رائے ایک بنگالی ہندو نے اسلام اور پادریوں کی کتب سے واقف ہو کر ایک نئے مذہب برہمو سماج کی بنیاد رکھی۔ سرسید نے کلکتہ میں جب ان سے ملاقات کی اور برہمو سماج مذہب کو ہونہار دیکھا اور اس کے اصولوں کو یورپ کے فلاسفروں اور ایشیا کے معلموں کے مطابق خیال پا کر اس کو ازحد پسند کیا اور دل میں جو مراد تھی، اس کو بلا محنت و مشقت پایا۔ لیکن وہ کھلم کھلا اسلام کو ترک کر کے ایک بنگالی بابو کے مرید اور امتی کہلاتے رہتے۔

پس دل میں یہ سوچ کر کہ برائے نام تو اسلام ہو مگر اس کو برہمو سماج مذہب کے مطابق کیجیے۔ لفظ نبی، ملائکہ، جبرئیل، جنت اور دوزخ، وحی والہام شیطان بلکہ آسمان و جن کو تو بحال رہنے دیجیے۔ اور ہر مسلمان سے کہیے کہ میں ان چیزوں پر ایمان رکھتا ہوں۔ تاکہ مسلمانوں کو مجال تکفیر نہ ہو۔ اور ان الفاظ

کے معنی بالکل پلیٹ دیجیئے۔

سرسید کہتے ہیں کہ نبوت ایک فطری ملکہ (تہذیب الاخلاق مصنفہ سرسید احمد خاں) کا ہوتا ہے۔ اور جس شخص میں جس فن کا ملکہ بدرجہ کمال ہوتا ہے وہ اسی فن کا امام یا پیغمبر ہے۔ لوہار بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے۔ شاعر بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے۔

ایک طبیب بھی فن طب کا امام یا پیغمبر ہو سکتا ہے۔ مگر جو شخص روحانی امراض کا طبیب ہوتا ہے۔ اور جس میں اخلاق انسانی کی تعلیم و تربیت کا ملکہ ہو، مطابق اس کی فطرت کے، خدا سے عنایت ہوتا ہے۔ وہ پیغمبر کہلاتا ہے۔ خدا اور پیغمبر میں بجز اس ملکہ نبوت کے جس کو ناموس اکبر کہتے ہیں اور زبان شرع میں جبرئیل کہتے ہیں اور کوئی جسم ایلچی یا پیغام پہنچانے والا نہیں ہوتا۔ خود اس کے دل سے فوارے کی مانند وحی اٹھتی ہے اور خود اس پر نازل ہوتی ہے۔ وہ اپنا کلام نفس ان ظاہری کانوں سے اس طرح پر سنتا ہے۔ جیسے کوئی دوسرا شخص اس سے کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ظاہری آنکھوں سے اس طرح پر دیکھتا ہے جیسے دوسرا شخص اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔

"مذاہب اسلام" ص ۶۴۴ مصنفہ مولانا نجم الحسن رامپوری۔

سرسید اپنی کتاب "تبیین الکلام" کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

"میں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کو باہم ملانا اور ایک بنانا چاہا۔ مگر اس میں میں ناکام رہا۔

مرزا غلام احمد قادیانی سرسید کے سیاسی اور مذہبی نظریات کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کے افکار و نظریات پر بھی ایک نظر ڈالیں، کہ ان دونوں کے ڈانڈے کہاں ملتے ہیں۔

"اے بابرکت قیصرہ ہند (ملکہ وکٹوریہ) تجھے یہ تیری عظمت اور نیک نامی مبارک ہو۔ خدا کی نگاہیں اس ملک پر ہیں۔ خدا کی رحمت کا ہاتھ اس رعایا

پر ہے۔ جس پر تیرا ہاتھ ہے۔ تیری ہی پاک نیتوں کی تحریک سے خدا نے مجھے بھیجا ہے۔ تاکہ میں پرہیزگاری، پاک اخلاق اور صلح کاری کی راہیں دوبارہ دنیا میں قائم کروں۔"

کتاب مصنفہ مرزا غلام احمد۔

"ستارہ قیصرہ ہند" ص ۱۵۔

"یہ التماس ہے کہ سرکار دولت مدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس سال کے متواتر تجربہ سے ایک وفادار اور جانثار خاندان ثابت کر چکی ہے جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ (برطانیہ) کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کے خیر خواہ اور خدمت گذار رہے۔

اس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم و احتیاط سے اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایات اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔

"تبلیغ رسالت" مصنفہ مرزا غلام احمد جلد ۷ ص ۱۹

میں بیس برس تک یہی تعلیم اطاعت گورنمنٹ انگریزی کی دیتا رہا اور اپنے مریدوں میں بھی یہ ہدایتیں جاری کرتا رہا۔

"تریاق القلوب" مصنفہ مرزا غلام احمد ص ۲۶

دوسرا امر قابل گذارش یہ ہے کہ میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں۔ اپنی زبان اور قلم سے اہم کام میں مشغول ہوں تاکہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت و خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال "جہاد" وغیرہ کے دور کروں جو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں۔

"تبلیغ رسالت" مصنفہ مرزا غلام احمد جلد ۷ ص ۱۰۔

میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت (برطانیہ) کے سچے خیر خواہ ہو جائیں۔ اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روائتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں۔ ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔ "تریاق القلوب" مصنفہ مرزا غلام احمد ص۲۵

میں نے مخالفتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اسقدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ "تریاق القلوب"۔ ص۲۵

مجھ سے سرکار انگریزی کے حق میں جو خدمت ہوئی وہ یہ تھی کہ میں نے پچاس ہزار کے قریب کتابیں، رسائل اور اشتہارات چھپوا کر اس ملک اور دوسرے بلادِ اسلام میں اس مضمون کے شائع کیے کہ گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی محسن ہے۔ لہٰذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اس گورنمنٹ کی سچی اطاعت کرے۔ اور دل سے اس دولت کا شکر گزار اور دعا گو رہے۔ اور یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں یعنی اردو، فارسی، عربی میں تالیف کر کے اسلام کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں۔ اور یہاں تک کہ اسلام کے دو مقدس شہروں مکہ اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کر دیں اور روم کے پایہ تخت قسطنطنیہ و بلادِ شام مصر، کابل اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا، اشاعت کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلیظ خیالات چھوڑ دیئے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمت مجھ سے ظہور میں آئی ہے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہیں سکا۔ (ستارہ قیصر ہند ص۳)

میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید و حمایت میں گذرا ہے۔
"تریاق القلوب" ص۲۵

آج کی تاریخ تک تیس ہزار کے قریب یا کچھ زیادہ میرے ساتھ جماعت ہے

جو برٹش انڈیا کے متفرق مقامات میں آباد ہے۔ اور ہر شخص جو میری بیعت کرتا ہے اور مجھ کو مسیح موعود مانتا ہے۔ تو اسی روز سے اس کو یہ عقیدہ رکھنا پڑتا ہے کہ اس زمانے میں جہاد قطعاً حرام ہے۔ کیونکہ مسیح آ چکا۔ خاص کر میری تعلیم کے لحاظ سے اس گورنمنٹ انگریزی کا سچا خیر خواہ اس کو بننا پڑتا ہے۔

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد ص۷)

میں سچ کہتا ہوں کہ محسن (گورنمنٹ برطانیہ) کی بدخواہی کرنا ایک حرامی اور بدکار آدمی کا کام ہے۔ (شہادت القرآن ص۸۴)

"ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ اسلام کی دوبارہ زندگی انگریزی سلطنت کے امن بخش سائے سے پیدا ہوئی ہے۔ تم چاہو دل میں مجھے کچھ کہو۔ گالیاں نکالو۔ یا پہلے کی طرح کفر کا فتویٰ لکھو۔ مگر میرا اصول یہی ہے کہ ایسی سلطنت سے دل میں بغاوت کے خیالات رکھنا یا ایسے خیال جن سے بغاوت کا احتمال ہو سکے سخت بدذاتی اور خدا تعالیٰ کا گناہ ہے۔" (تریاق القلوب ص۲۶)

"اے ملکہ معظم قیصرۂ ہند! خدا تجھے اقبال اور خوشی کے ساتھ عمر میں برکت دے۔ تیرا عہدِ حکومت کیا ہی مبارک ہے کہ آسمان سے خدا کا ہاتھ تیرے مقاصد کی تائید کر رہا ہے۔ تیری ہمدردیٔ رعایا نیک نیتی کی راہوں کو فرشتے صاف کر رہے ہیں۔" (ستارہ قیصرۂ ہند ص۱۵)

"خدا تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے میری اور میری جماعت کی پناہ اس سلطنت (برطانیہ) کو بنا دیا ہے۔ یہ امن جو اس سلطنت کے زیر سایہ ہمیں حاصل ہے۔ نہ یہ امن مکہ معظمہ میں مل سکتا ہے اور نہ مدینہ میں۔ اور نہ سلطان روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ میں۔" (تریاق القلوب ص۲۶)

"ہم پر اور ہماری ذریت پر یہ فرض ہو گیا کہ اس مبارک گورنمنٹ برطانیہ کے ہمیشہ شکر گزار رہیں۔" (ازالہ اوہام ص۵۹ مصنفہ مرزا غلام احمد)

"میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے

مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے۔ کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا
ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے"۔ تبلیغ رسالت جلد ۷ ص ۱۷

پیش گوئی سرسید اور مرزا غلام احمد کے سیاسی اور مذہبی خیالات سمجھنے کے بعد جب شاہ نعمت اللہ ولی کی حسب ذیل پیش گوئی نظر سے گزری تو مزید تائید حاصل ہوئی۔ ؎ "دو کس بنام احمد گمراہ کنند بے حد
سازند از دل خود تفسیر فی القرآن"
(الکاویہ علی الغادیہ جلد اوّل ص ۱۷۶)

۱۸۵۷ء کے بعد متذکرہ بالا حضرات کے سیاسی اور مذہبی نظریات نے نووارد غیر ملکی حکومت کے استحکام کو کافی سے زیادہ معاونت بخشی۔ اگر سرسید اور غلام احمد قادیانی فرنگی حکمرانوں سے اسی طرح اعتراض کرتے جیسے ان دنوں سارے ہندوستان نے کیا تھا تو انگریزوں کے اکھڑے ہوئے قدم ہندوستانیوں کی غلامی کو اتنی طویل عمر کبھی نہ دیتے۔

سرسید احمد کی علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو تعلیم کے عنوان سے انگریزوں کا ذہنی غلام بنا دیا اور مرزا غلام احمد نے جہاد کے خلاف فتویٰ دے کر مسلمانانِ عالم کو انگریزوں کے خلاف مفلوج کرنے کی کوشش کی۔ ان تحریکات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۱ء تک غیر ملکی حکومت کے وقار نے خصوصاً مسلمانانِ ہند کے دلوں پر خوف و ہراس کی ایسی گہری چادر ڈال دی کہ جنگ طرابلس اور (۱۹۱۱ء) میں جنگ بلقان کے موقعہ پر ہندوستانی مسلمانوں کو انگریز کے خلاف بیدار کرنے کے لیے اس وقت کے رہنماؤں کو کافی دشواریاں پیش آئیں۔

تحریک کپورتھلہ کی صدائے بازگشت سرسید کے بعد مرزا غلام احمد کی تحریک سے متاثر ہو کر احرار رہنما ہنوز قادیان میں مداخلت کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ چودھری عبدالعزیز کا کپورتھلہ سے متعلق ایک بیان پریس میں آیا۔

۱۔ دیکم نومبر ۱۹۳۳ء زمینداروں کی اراضیات کے تحفظ کے لیے ایکٹ انتقال اراضی بمطابق صوبہ پنجاب نافذ کیا جائے۔

۲۔ لین دین خوش معاملگی قائم رکھنے کے لیے درست حسابات کا قانون تجویز کیا جائے۔
۳۔ ریاست میں ایسی اصلاحات نافذ کی جائیں جن سے اسٹیٹ اسمبلی کو وہی اختیارات حاصل ہوں جو ہندوستان میں جدید اصلاحات کی بنا پر صوبجاتی کونسلوں کو دیے گئے ہیں۔
۴۔ شرح مالیہ میں حسب حالات نظر ثانی کر کے مستقل تخفیف کی جائے اور اقوام کے ابواب میں تحقیق کر کے ملحقہ اصلاح کی شرح رائج کی جائے۔

میں حکومت اور ہندو ساہوکاروں پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جب تک ریاست کپورتھلہ اپنے حقوق حاصل نہ کر لیں گے اور سیاسیات ریاست میں ایسی پوزیشن حاصل نہ ہو جائے گی۔ جس کے وہ مستحق ہیں، ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔ ہم حصولِ مقاصد کے لیے تمام نازک مراحل و مشکلات سے گذرنے کے لیے ہمہ تن تیار ہیں۔

اس دوران کپورتھلہ شہر میں جمعہ کے روز احرار رضاکاروں کا ایک قافلہ نماز سے فارغ ہو کر جلوس کی صورت میں شہر میں گشت کرتا۔ ریاستی حکام تحفظ قانون کے تحت اسے گرفتار کر لیتے۔ گرفتاریوں کا یہ سلسلہ گذشتہ دو ماہ سے جاری تھا۔ کہ ۱۷۔ نومبر (۱۹۳۳ء) کو جمعیتہ علمائے ہند، مجلس خلافت، مسلم نیشلسٹ پارٹی کے باہم اشتراک سے ہندوستان بھر میں یوم فلسطین منایا گیا۔ اس سے پیشتر ۸۔ نومبر کو والئ افغانستان نادر خاں کو ایک طالبعلم نے سرِ عام گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ جبکہ وہ ایک تقریب میں طلبا کو انعام تقسیم کر رہے تھے۔

گو ہندوستان کے مسلمان نادر خاں پر خوش نہیں تھے۔ کیونکہ انہوں نے امان اللہ کی حمایت میں بچہ سقہ سے جنگ لڑی اور کامیابی کے بعد اس نے خود افغانستان کے تخت پر قبضہ جما لیا۔

امان اللہ خاں کو انگریزوں کی ایک سازش کے تحت ملک چھوڑنا پڑا تھا۔ ان دنوں نادر خاں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے۔ چنانچہ اس موقعہ کو غنیمت جان کر جنرل نادر خاں نے امان اللہ کی حمایت کا بہانہ کر کے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اس موقعہ پر مسلمانانِ ہند کی دعائیں جنرل نادر خاں کے ساتھ تھیں۔ لیکن جب فتح ہوئی تو امان اللہ کو پوچھا تک نہیں۔ نادر خاں کی اس حرکت پر مسلمان اس سے ناخوش تھے۔ جب ان کے قتل کی خبر آئی اور ایک ہفتہ بعد

یومِ فلسطین منایا گیا تو مسلمانانِ ہند کو بہر طور رنج پہنچا۔ چنانچہ ۴۔ ۵۔ دسمبر ۱۹۳۳ء کو ڈسٹرکٹ احرار کانفرنس بٹالہ ضلع گورداسپور کے کھلے اجلاس میں جس کی صدارت شیخ حسام الدین کر رہے تھے ایک تعزیتی قرارداد منظور کی جس میں حضرت مولانا سید انور شاہ کاشمیری۔ چودھری عبدالستار فیروزپوری اور والیٔ افغانستان جنرل نادر خاں کی موت پر اظہارِ افسوس کیا گیا۔

دوسری قرارداد۔ یہ اجلاس حکومت برطانیہ کی اس یہود نواز پالیسی اور مسلم آزار حکمت عملی کی پرزور مذمت کرتا ہے کہ مسلمانوں کے سروں پر فلسطین میں یہودیوں کو مسلط کرنے کا انجام اس کیلئے مفید نہیں ہوگا۔

تیسری قرارداد:۔ یہ کانفرنس اپنے آزادیٔ وطن کے مطالبے کا اعادہ کرتی ہے۔ جس کے بغیر ہندوستان کے کروڑوں باشندگان اور خاص کر مسلمانوں کی حالت میں جو اس وقت انتہائی تنگدستی میں بسر اوقات کر رہے ہیں۔ کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔

چوتھی قرارداد:۔ یہ کانفرنس مسلمانوں کو تلقین کرتی ہے کہ وہ کسی حال میں بھی آزادیٔ وطن کی منزل سے بے خبر نہ ہوں۔

وائٹ پیپر اور مجلسِ احرار

ہندوستان کی دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح مجلس احرار بھی برطانیہ کے اس اعلان پر خوش نہیں تھی۔ تاہم غیر مسلم پریس نے احرار رہنما چودھری افضل حق سے اکثر دفعہ اپنے اخباری کالموں میں یہ سوال دہرایا کہ وائٹ پیپر پر احرار اپنی پالیسی کا اظہار کرے۔ اس پر ۳۔ دسمبر کو پارٹی لیڈر چودھری افضل حق نے پریس کانفرنس میں کہا۔

> اکثر دوستوں نے مجھ سے مجلس احرار کی وائٹ پیپر کے متعلق پالیسی اور آئندہ پروگرام کے متعلق سوالات کیے ہیں۔ لہٰذا میں اس مجلس میں اپنی جماعت کی پالیسی واضح کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ مجلس احرار آزادی وطن کے نصب العین کے لیے کسی جماعت سے ایک قدم پیچھے نہیں۔ ہمارا گناہ صرف یہ ہے کہ ہم نے جداگانہ انتخاب کے حق میں رائے دی ہے۔ لیکن جب خود گاندھی اور

کانگریس نے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کر دیا تھا تو مجلس احرار آپ سے آپ سابقہ پوزیشن پر چلی گئی۔

جب جداگانہ انتخاب کا فیصلہ میری جماعت نے کیا اس وقت ہم نے یہ کہا تھا کہ اگر کوئی مفاہمت کی صورت ہو تو مجلس احرار اسے بنظر استحسان دیکھے گی لہٰذا جب تک متبادل سکیم سامنے نہ آئے وائٹ پیپر کے خلاف اعتراضات بے معنی رہیں۔

نمائندہ اسمبلی کا اعلان

جدوجہد! زندگی کا دوسرا نام ہے۔ کارگاہِ عالم میں یہ زندگی انسانی تاریخ میں جلی عنوان سے محفوظ رہتی ہے۔ اس سفر میں اگر کبھی کبھار راعی اور رعایا کے درمیان ٹکراؤ کا سماں آجائے تو یہ راہیں اہل عزم کی معاون ہوتی ہیں۔

ریاست کپورتھلہ کے عوام نے جب اپنے ارادے کی گرہ پختہ کی تو شاہی ایوان کی اینٹیں بھی ان کی مخبری کرنے لگیں۔ ریاستی قانون آتشیں اسلحہ سے لیس اپنے دفاع کی حفاظت کرنے لگا۔ لیکن جب قومیں حقوق کی دوڑ میں شامل ہوتی ہیں تو راستے کی کوئی رکاوٹ ان کا رستہ نہیں روک سکتیں۔

جنوری ۱۹۲۲ء کو ریاستی عوام نے زمیندارہ لیگ کے تحت چودھری عبدالعزیز کی قیادت میں جو لڑائی ریاستی حکام سے شروع کی تھی وہ وقت اور حالات کے مختلف موڑوں سے گزرتی ہوئی بالآخر اس موڑ پر آن پہنچی کہ ۲۰۔ دسمبر ۱۹۲۳ء کو مہاراجہ کپورتھلہ نے ریاست میں ذمہ دار اسمبلی کے قیام کا اعلان کر دیا۔

"اس اسمبلی میں دو تہائی ارکان انتخاب کے ذریعے اور ایک تہائی نامزدگی سے مقرر کیے جائیں گے۔ نیز اس مجلس کو دیوانی اور فوجداری قسم کے قوانین وضع کرنے کا اختیار ہوگا۔

مہاراجہ کی ذاتی جائیداد اور فوج کے تمام شعبوں کو چھوڑ کر باقی تمام میزانیہ پر بحث کی اجازت ہوگی۔ نیز اپنے ارکان میں سے دو وزیر بھی منتخب

کر سکے گی۔ یہ اسمبلی بالغ حق رائے دہی کی بنا پر مخلوط انتخاب کی بنیاد پر منتخب ہو گی۔

چودھری عبدالعزیز ڈکٹیٹر زمیندارہ لیگ ریاست کپورتھلہ نے مہاراجہ کے اس بیان پر ۳۰۔دسمبر (۱۹۳۴ء) کے اخبارات میں حسب ذیل بیان دیا۔

"۱۹۔ دسمبر کو میں نے ہز ہائی نس مہاراجہ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا تھا۔ جس میں زمینداروں کے کچھ مطالبات اور ان کی مشکلات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک مطالبہ ریاست میں نمائندہ اسمبلی کے قیام کا تھا۔ جیسا کہ ہز ہائی نس کی حکومت نے اعلان کیا ہے اگرچہ اس اعلان پر عوام کو شبہ ہے کہ آیا یہ اسمبلی قائم ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ اگر ہو گی تو کب؟ ابھی تک اس اعلان کی تفصیل میرے سامنے نہیں آئی۔ تاہم میں ہز ہائی نس کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ باقی مطالبات کی طرف بھی فوراً توجہ دی جائے گی۔

۱۹۳۳ء کا سال انہی واقعات اور حالات سے گذرتا ہوا آخری سانس لے رہا تھا کہ برطانوی دانشوروں کو جرمن سے مزید اطلاع ملی کہ ہٹلر کی نازی پارٹی کو ملک کے عام انتخابات میں نوے فیصد ووٹ ملے ہیں۔ انہی دنوں ہٹلر نے فرانس کی دعوت پر تخفیف اسلحہ کانفرنس میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ جرمن کے نزدیک یہ کانفرنس صرف نازی پارٹی کے بڑھتے ہوئے فوجی اقدام کے استحکام کو روکنے کا بہانہ تھا جبکہ یورپ کی بڑی طاقتیں خود اس پر عمل پیرا نہیں تھیں۔ اگر وہ دیانت داری سے اسلحہ میں تخفیف چاہتی ہیں تو پہلے اپنے اسلحہ میں کمی کریں۔ جرمن کی اس تجویز کی تائید میں اطالیہ بھی شامل ہو گیا۔

واقعات اس موڑ پر تھے کہ سالِ رواں کا سورج مشرق کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ آسمان پر ہلکی سی شفق نے شاہ خاور کو آخری سلام کیا۔

سنہ ۱۹۳۴ء

بیتے سال کی داستان تاریخ کے حوالے ہو چکی تو مؤرخ نے نئے انداز سے قلم سنبھالا۔ ماضی قریب کے واقعات صف بہ صف مورخ کے روبرو آن بیٹھے۔ زمانہ ورق الٹتا رہا اور حقیقت رقم ہوتی چلی گئی۔

سال گذشتہ جن راستوں سے گذرا تھا۔ تاریخ نے وقت کو گواہ ٹھہرا کران راہوں کے نقش پا مستقبل کے لیے محفوظ کر لیے، تاکہ آوارہ داستان موسم کی بے اعتنائی کی نظر نہ ہو جائے۔ اس سال کی لڑائی نئے آئین کے لیے تھی۔ آل انڈیا کانگریس، مسلم لیگ، مسلم کانفرنس، نیشلسٹ مسلمان، ہندو اور سکھ کمیونل ایوارڈ کے حصول میں جسے انگریز ہندوستان کو آزادی کی جدید قسط قرار دے رہا تھا۔ اپنے اپنے فکر کی جولانگاہ تک جدوجہد میں مصروف تھے۔ فرنگی حکمران اپنی جگہ مطمئن تھا اور اسی اطمینان کی اوٹ سے کھڑا دیکھتا رہا۔ مجلس احرار ۱۳۔ دسمبر ۱۹۳۳ء تک کمیونل ایوارڈ پر اپنا فیصلہ دے چکی تھی۔ لہٰذا وہ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے اس اکھاڑے سے الگ رہ کر اپنی متعینہ راہوں پر گامزن تھی۔

وزیر اعظم کپورتھلہ کا بیان

۲۔ جنوری ۱۹۳۴ء کو کپورتھلہ کے وزیر اعظم خان بہادر میاں سر عبدالحمید نے ہندوؤں کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا،

"اصلاحات پر نکتہ چینی کرنے والے احباب کو ذرا صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے جو سکیم شائع ہوئی ہے اس کی تفصیل ہنوز نہیں آئی۔ جب یہ تمام سکیم سامنے آئے گی تو ہندو سکھ مطمئن ہو جائیں گے۔"

اس بیان سے پیشتر ۲۹۔ دسمبر ۱۹۳۳ء کو کپورتھلہ سناتن دھرم سبھا کا پبلک جلسہ ہوا۔ جس میں حسب ذیل قرارداد منظور ہو چکی تھی۔

"عرصہ دراز سے باشندگانِ ریاست کپورتھلہ شخصی حکومت کے تحت چلے آ رہے ہیں۔ اور وہ بوجہ تعلیمی کمی کے عوام ایسی سکیم یا اصلاحات جن کا اعلان فرمایا گیا ہے۔ جو ہندوستان بھر میں کہیں رائج نہیں سمجھنے کے قطعی نااہل ہیں۔ لہٰذا ہندوؤں کے لیے اعلان کے کئی پہلو سخت باعث تشویش رہے ہیں۔ بادی النظر میں یہ اصلاحات ریاست میں اسلامی سلطنت قائم کر دینے کے مترادف ہے۔ اس لیے ہندو باشندگان کا یہ بھاری اجتماع حضور مہاراجہ والئی ریاست کپورتھلہ کی توجہ اس طرف مبذول کراتا ہے کہ ریاست میں اہم تبدیلیوں سے پیشتر اس کے تمام پہلوؤں پر غور فرما لیا جائے۔"

گذشتہ اوراق میں یہ بات آ چکی ہے کہ ۲۰۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو کپورتھلہ زمیندارہ لیگ کے صدر چودھری عبدالعزیز نے وزیر اعظم کپورتھلہ کی وساطت سے مہاراجہ کو الٹی میٹم دیا تھا۔ اس کے جواب میں ۲۔ جنوری ۱۹۳۴ء کو بغیر کسی وجہ کے چوہدری صاحب کو حکومت کپورتھلہ نے پھر سے گرفتار کر لیا۔ اس کے خلاف تمام ریاست میں ہڑتال ہو گئی۔ ہندو سکھ اس احتجاجی ہڑتال میں مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ ساتھ ہی زمیندارہ لیگ کے دیگر کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ زمیندارہ لیگ نے ریاستی عدالتوں پر پکٹنگ کا آغاز کر کے اپنی تحریک کو آگے بڑھایا۔ اس پر ریاستی حکام نے اپنی امداد کے لیے انگریزی فوج بلوانے کی وائسرائے ہند سے درخواست کر دی۔

صدر مجلس احرار کا بیان

احرار فطرتی طور پر انگریز کے خلاف تھے۔ انہیں جیسے ہی انگریز کے ریاست میں پہنچنے کا علم ہوا۔ فوراً بول اٹھے۔

"میں مدت سے ریاست کپورتھلہ کی تحریک کا بنظر غائر مطالعہ کر رہا ہوں۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے۔ ریاست میں شہر اور دیہات میں دو قسم کی تحریکیں ہیں۔ شہری تحریک صرف ہندو سبھا کی فرقہ وارانہ سرگرمیوں اور تعصبات کا مظاہرہ ہے۔ تو دوسری طرف مسلمانوں میں اس کا ردِ عمل ہے۔ لیکن دیہاتی تحریک عالمگیر اقتصادی بدحالی، دائمی تباہی، ٹیکسوں کی گرانی، خوفناک قرضوں

کے بوجھ تلے دبی ہوئی انسانی آبادی کا ایک دردناک مظاہرہ ہے۔

اس ریاست میں بہت سے خوشحال اور فارغ البال زمیندار بھاری ٹیکسوں اور ساہوکاروں کے گرانبار سود کے درمیان اس طرح پس گئے ہیں۔ جس طرح چکی کے دو پاٹ میں دانہ۔ یہ دیہاتی تحریک تمام وطن پرست جماعتوں کی توجہ کی مستحق ہے۔

ریاست کپورتھلہ کی حکومت، جیسے کہ آغاز سے معلوم ہو رہا ہے، پوری کوشش کرے گی کہ اس تحریک کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر ہندو اور سکھوں کو اس سے الگ کر دے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا ہے کہ رضاکاران اسلام کپورتھلا اور چودھری عبدالعزیز ڈکٹیٹر سنٹرل زمیندارہ لیگ کو بیک وقت گرفتار کر لیا ہے۔ تاکہ ساری تحریک فرقہ ورانہ رنگ میں دکھائی جائے۔ تمام اربابِ فکر و نظر کو اصل صورتِ حال پیشِ نظر رکھنی چاہیے صرف اس لیے کہ اس کا اصل ڈکٹیٹر ایک مسلمان ہے اس کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر حکومت کپورتھلہ کی مجرمانہ چالوں میں نہیں آنا چاہیے۔ بلکہ مسلم اور غیر مسلموں کی اس متحدہ کوشش کو بنظرِ پسند دیکھنا چاہیے۔

مجھے اپنی جماعت مجلسِ احرار کے متعلق تحریک کشمیر کے سلسلے میں جو تلخ تجربہ ہے اس کی بناء پر مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جب یہ جماعت مظلوم اور تباہ حال زمیندار ریاست کپورتھلہ کی حمایت میں پورے شد و مد سے مصروف ہے، تو ہندو اخبارات اور غیر مسلم جماعتیں نتائج سے بے پروا ہو کر اس کو اسلامی تحریک قرار دے کر اس کی مخالفت شروع کر دیں گے۔ اس لئے میں تمام مجالس احرار اسلام سے توقع رکھتا ہوں کہ اصل مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے زمینداروں کی اس تحریک میں ان سے ہمدردی کا اظہار کریں گے۔ نیز چودھری عبدالعزیز اور ان کے بعد آنے والے ڈکٹیٹروں جو کسی بھی مذہب یا جماعت سے تعلق رکھتے ہوں مستحق مبارکباد قرار دیں۔ جو فلاکت زدہ اور تباہ حال

زمینداروں کو حکومت اور ساہوکار کے مظالم سے بچانے کے لیے ایثار اور قربانی کا پورا پورا ثبوت دیں۔ کوئی ماتحت جماعت اس سلسلے میں ایسا کوئی اقدام نہ کرے جو سول نافرمانی کی حد تک پہنچتا ہو۔

میں حالات کا لغور مطالعہ کر رہا ہوں۔ جس وقت مجھے ضرورت محسوس ہوئی۔ میں مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کروں گا۔ ریاستی حکام نے انگریزی فوج کو طلب کر کے اپنے اور اپنی رعایا کے لیے کوئی بہتر فیصلہ نہیں کیا۔ میرے سامنے یہ صورت حال بھی ہے۔

آخر میں ملک کے تمام جرائد کے مدیروں، اشتراکیت پسند نوجوانوں اور نیشنلسٹ لیڈروں سے اپیل کرتا ہوں کہ ریاست کپور تھلہ کے مظلوم اور تباہ حال زمینداروں کی اس خالص اقتصادی تحریک کی حمائت کریں۔ اور کوئی اقدام نہ کریں جس سے کپور تھلہ کے سرمایہ داروں کی امداد کا پہلو نکلتا ہو۔ ورنہ یہ تحریک جو خالص زمیندارہ تحریک ہے، فنا ہو کر رہ جائے گی۔ میں پنڈت جواہر لال نہرو سے خاص طور پر اپیل کرتا ہوں کہ کپور تھلہ تشریف لائیں اور زمینداروں کے افلاس زدہ چہروں کا مشاہدہ کریں۔ اور ہو سکے تو کانگریس کے نظام کو ان کی امداد میں استعمال کریں۔

۹۔ جنوری کو مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ نے لاہور سے وزیر اعظم کپور تھلہ کو تار کے ذریعے اطلاع دی۔

"مجھے چودھری عبدالعزیز رئیس بگھیوال اور ان کے رضاکاروں کے خلاف مقدمات کی پیروی کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ مہربانی فرما کر تاریخِ مقدمہ اور مقدمات کی پیروی کی اجازت سے جلد سے جلد مطلع فرمائیں۔"

ممکن ہے اس نہج پر ریاست اور انگریز سے براہ راست لڑائی کی نوبت آجائے۔ اس لیے ۱۲ جنوری ۱۹۴۸ء کو مجلس احرار کے نام صدر مرکزیہ نے حسب ذیل ہدایات جاری کیں۔

"سال نو شروع ہو چکا ہے۔ مجلس احرار کو نئے عزم اور نئے ارادوں کے ساتھ

ملک اور قوم کے ضروری کاموں کے لیے متحد ہو جانا چاہیے۔ میں نے تحریک کشمیر کے دنوں کہا تھا کہ مجلس احرار کو بڑے بڑے عافیت کوش امرا کی ضرورت نہیں بلکہ ان آتش بجاں مجاہدوں کی ضرورت ہے جو اپنے خلوص سے تمام ملک کو غیر ملکی اقتدار سے آزاد کرا سکیں۔

نئے سال کے آغاز میں میں امید کرتا ہوں کہ بڑے بڑے ناموں کے آدمیوں سے بے پرواہ ہو کر مجلس احرار کے عہدے کام کے آدمیوں کے سپرد ہونے چاہییں۔ دنیا کے حالات کا آنکھیں کھول کر مطالعہ کریں کہ زمانہ کس سرعت سے بدل رہا ہے۔ اور گرد و پیش کے حالات کس قدر مخدوش صورت اختیار کر رہے ہیں۔ یہی غریب لوگ مجلس احرار کی اصل قوت اور طاقت ہیں۔ انہی کی بہتری کے لیے ہماری زندگیاں وقف ہیں۔ جماعت کے کارکنوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اپنے علاقے کی آبادی پر نظر رکھیں اور ان کی بہتری کے لیے کوشش کریں۔

میری خواہش ہے کہ نئے سال میں ہم مفلوک الحال غریب مخلوق کی امداد کے لیے کمربند ہو جائیں۔ تمام ماتحت مجالس اپنے دفتروں کی صحیح کیفیت لکھ کر مرکز کو روانہ کریں۔ رمضان مبارک کے فوراً بعد میں مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کرنے والا ہوں۔ تاکہ حالات و واقعات سے باخبر ہو کر آئندہ کا لائحہ عمل تیار کریں۔

مخلوط انتخاب کا اعلان مولانا حبیب الرحمٰن صدر مجلس احرار کے ۷۔ جنوری کے بیان کے دوسرے روز مہاراجہ کپورتھلہ نے ریاست میں مخلوط انتخاب کا اعلان کر دیا۔ اس سے مشتعل ہو کر ہندو سبھا نے مہاراجہ کو احتجاجی تار دیا۔

" اگر ایسا کیا گیا تو ریاست میں اسلامی راج نافذ ہو جائے گا کیونکہ یہاں ہندو آبادی کم ہے اور مسلمان ریاست میں زیادہ آباد ہیں۔"

۱۳۔ جنوری کو مہاراجہ کے اعلان کے ساتھ ہی چودھری عبدالعزیز کو رہا کر کے بڑی خاموشی کے ساتھ انہیں ان کے گاؤں بگھووال پہنچا دیا گیا۔ ان کے ساتھ ہی باقی سیاسی قیدی بھی رہا کر دیے گئے۔ اس روز مہاراجہ نے اپنے ۱۱۔ جنوری والے اعلان کی تشریح کر دی۔

"میں اپنی رعایا سے وعدہ کرتا ہوں کہ ریاست میں وسیع پیمانے پر آئینی اصلاحات رائج کی جائیں گی۔ آئندہ اصلاحات برطانوی وائٹ پیپر سے بھی زیادہ بہتر ہوں گی۔ کیونکہ ان میں بالغوں کے لیے حق رائے دہی کی اجازت دی گئی ہے۔ اور انتخاب مخلوط ہوں گے۔"

لیکن مجوزہ اصلاحات کا ریاست میں کوئی گرمجوشی سے خیر مقدم نہ کیا گیا۔ بلکہ ریاست کی ہندو مہا سبھا نے مہاراجہ کو برقی پیغام اور میمورنڈم بھیجا کہ مجوزہ سکیم کے تحت ہندوؤں کے مفادات محفوظ نہیں رہیں گے۔ اور تمام اختیارات مسلمانوں کے ہاتھ چلے جائیں گے جن کی ریاست میں چھتیس فیصد کی اکثریت ہے۔

اس طرح کپور تھلہ کی زمیندارہ لیگ نے اعلانِ اصلاحات پر نکتہ چینی کی کہ اس میں باہم ضروری بات پورا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا ہے اس سے زیادہ ضروری امر فراموش کر دیا گیا ہے۔ یعنی چودھری عبدالعزیز نے اخبارات کے ذریعے مطالبہ کیا تھا کہ ریاست میں قانون انتقالِ اراضی نافذ کیا جائے اور مالیہ اراضی اور شرح آبیانہ میں کمی کی جائے۔ نیز زمینداروں کے قرضہ کے بوجھ کم کرنے میں امداد دی جائے۔ لیکن مجوزہ اصلاحات میں ان کا کوئی ذکر تک نہیں اس طرح کپور تھلہ زمیندارہ لیگ کے تین مطالبات منظور کر لیے گئے ہیں۔ نیز زمینداروں کی خواہش پر زراعت پیشہ لوگوں کی اراضی کا انتقال بعینہٖ اس طریق پر عمل میں لانے کا فیصلہ کیا جس طرح پنجاب کے قانونِ انتقال میں رائج ہے۔ تاہم اعلان اصلاحات نامکمل ہے۔

برطانوی اعلان اور ہندوستان

تحریک کپور تھلہ اس موڑ پر تھی کہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں میں برطانوی اعلان پر بحث کا آغاز ہوا۔ ان دنوں سنٹرل اسمبلی (دہلی) کی گذشتہ میعاد ختم ہو رہی تھی اور ملک میں نئے انتخاب کی تیاریوں پر جماعتوں کے درمیان اتحادِ باہمی، جوڑ توڑ اور دوڑ بھاگ شروع تھی مسٹر محمد علی جناح (قائداعظم) بھی انہی دنوں لندن سے عارضی طور پر ہندوستان پہنچے۔ وہ ۲۲ دسمبر ۱۹۳۳ء کو لندن سے روانہ ہوئے تھے۔

مسٹر جناح نے پہلی گول میز کانفرنس کے بعد سر آغا خاں اور سر فضل حسین کے رویے سے

مایوس ہو کر لندن میں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن برطانوی اعلان نے جن حالات کو جنم دیا ان کے پیش نظر ان کا ہندوستان پہنچنا اہم سمجھا گیا۔ چنانچہ بمبئی پہنچ کر سب سے پہلے مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں میں اتحاد کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ وقتی طور پر کامیاب رہے۔

برطانوی وزیر اعظم نے اپنے اعلان میں ترمیم کرنے کی شرائط میں اس نقطے کو اوّلیت دی تھی کہ اگر ہندوستان متحد ہو کر کوئی ترمیم لائے تو میں اسے منظور کر لوں گا۔ یہ بات کہتے وقت اس کے ذہن میں اپنی حکمت عملی اور سیاسی شرارتیں کارفرما تھیں۔ اس نے جس انداز سے یہ دانہ پھینکا ناممکن تھا کہ اقوام ہند اسے کسی طرح بھی قبول کریں۔ کانگریس ہندو نظریہ سمیت اس کی حامی نہیں تھی۔ گو مسلمان بھی اس تجویز کے حق میں نہیں تھا تاہم متبادل تجویز کے آنے تک وہ اس کو من حیث القوم منظور کر چکا تھا۔ اس پر بھی بات آگے نہ بڑھ سکی۔ آخر مارچ ۱۹۳۲ء میں چند مسلمان رہنماؤں نے اسوائے مجلس احرار، نیشنلسٹ مسلمان، جمعیۃ علمائے ہند اور رجعت پسند حضرات شامل تھے۔ راجہ سلیم پور کے مکان پر انہی کی صدارت میں مسلم یونٹی بورڈ قائم کیا گیا۔ اس کارروائی کے داعی چودھری خلیق الزمان، مولانا شوکت علی، مولانا کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، حضرت مولانا حسین احمد مدنی تھے۔ اس اجلاس میں چودھری خلیق الزمان نے جداگانہ انتخاب کو مسلمانوں کے لیے قبول کرنے کی حمایت کی۔ اسی یونٹی بورڈ کی ایگزیکٹو باڈی نے ۱۲۔ جنوری ۱۹۳۴ء کو آل پارٹیز کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کے لیے حسب ذیل دعوت نامے جاری کیے۔

"ہندوستان میں ہر خیال اور ہر طبقہ کے لوگوں کا وائٹ پیپر میں اصولی نقائص کے متعلق اتفاق ہے۔ اس نازک موقعہ پر محسوس کیا گیا ہے کہ یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ ملک اس وقت تک وائٹ پیپر کی تجویز سے مطمئن نہیں ہوگا جب تک ان میں ملک کی ترقی پسند رائے عامہ کے مطابق ضروری تبدیلیاں عمل میں نہیں لائی جائیں گی۔

اس مقصد کے پیش نظر تجویز کیا گیا ہے کہ ہندوستان بھر کی تمام جماعتوں کے

نمائندوں کی ایک کانفرنس فروری ۱۹۴۲ء میں منعقد کی جائے۔ اس بات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کانفرنس میں فرقہ وارانہ مسئلہ اور اس کے متعلق منافی بحث نہیں کی جائے گی۔ نیز اس امر پر بھی اس کانفرنس میں غور نہیں کیا جائے گا کہ اگر کم از کم سیاسی مطالبات جن پر کامل اتفاق ہوگا قبول نہ کیے گئے تو کیا کارروائی کی جائے گی۔؟

ایگزیکٹو کمیٹی نے غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ ان مسائل کو ایجنڈے سے خارج کر دیا جائے۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس پر زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے حاصل ہوگی بلکہ اس لیے بھی کہ اس طرح مختلف انجمنوں کے نمائندے وائٹ پیپر میں تبدیلیوں کے متعلق تجویز پیش کرنے کے متعلق آزاد ہوں گے۔ کیونکہ یہ امر تو ظاہر ہے کہ ملک منظم طور پر وائٹ پیپر کی تجویز کو موجودہ شکل میں منظور نہیں کرتا۔"

۱۱۔ جنوری کو پنڈت جواہر لال نہرو نے الٰہ آباد سے مجوزہ آل پارٹیز کے متعلق اپنے ایک بیان میں کہا۔

"آل پارٹیز کانفرنس کی اس طرح معاہدوں کی گفتگو کوئی عملی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ جہاں تک کانگرس کا تعلق ہے اس کی پوزیشن واضح ہے صاف ظاہر ہے کہ وائٹ پیپر پر غور اور اس میں ترمیم کی کوشش غیر مناسب ہے۔ اگر وہ کانگریس یا دیگر اشخاص جو ہندوستان میں بنیادی تبدیلیوں کے لیے لڑ رہے ہیں۔ وائٹ پیپر کو بہتر بنانے کی کوشش میں شامل ہو جائیں تو وہ ان اصولوں کے ساتھ غداری کریں گے۔ جن کے لیے وہ لڑ رہے ہیں۔ ان حالات میں جو لوگ آل پارٹیز کانفرنس کے انعقاد کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے خیالات ملک کے لیے نقصان دہ ہیں۔"

۱۶۔ جنوری کو جمعیتہ علمائے ہند نے برطانوی اعلان اور پنڈت جواہر لال کے متذکرہ بیان پر اپنی رائے کا اظہار صاف اور واضح طور پر کر دیا۔

"اگر ہندوؤں میں اپنے وطن سے محبت کا جذبہ موجود ہے۔ اگر وہ کمیونل ایوارڈ کو

بدلوانا چاہتے ہیں۔ اور ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے برطانیہ کو مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وائٹ پیپر کی سکیم کو واپس لے کر ذمہ دارانہ حکومت کا خاکہ پیش کرے تو انہیں بھی اس تحریک اتحاد کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اور اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر آل پارٹیز مسلم کانفرنس سے اتحاد باہمی کے لیے گفت و شنید کرنی چاہیے ورنہ یاد رکھنا چاہیے کہ کمیونل ایوارڈ محض دل خوش تمناؤں سے ہرگز نہیں بدل سکتا۔

ملک کی جو جماعت اتحاد باہمی سے گریز کرے گی اور کمیونل ایوارڈ کے خلاف پروپیگنڈہ جاری رکھے گی۔ اس کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ وہ کمیونل ایوارڈ کو بدلوانا نہیں چاہتی۔ اور ہندو مسلم فساد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔"

اسی دوران ۱۳۔ جنوری ۱۹۳۴ء کو لندن سے مسٹر جناح کے نام برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر ایچ۔ کے ہیلز نے ایک خط لکھا۔ جو ملک کے عام اخبارات میں شائع ہوا۔ روزنامہ انقلاب سے ہم اس خط کو نقل کر رہے ہیں۔

"مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ بمبئی میں منعقد ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس میں نمایاں حصہ لیں گے۔

میں اس تجویز کو پسند نہیں کرتا کہ کمیونل ایوارڈ پر کسی قسم کی بحث نہ کی جائے۔ کیونکہ مجوزہ آئین کے کسی حصے پر اگر نہایت تلخ نکتہ چینی کی گئی ہے تو وہ کمیونل ایوارڈ ہی ہے۔ اگر اس کانفرنس میں بھی اس پر بحث نہ کی گئی تو کانفرنس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

مسٹر محمد علی جناح کی پالیسی

برطانوی اعلان نے اقوام ہند کو عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ ہندو اپنی اکثریت کے باوجود مسلمان سے مطمئن نہیں تھا۔ مسلمان غیر مسلموں سے بہر طور رواداری کا متمنی رہا۔ خود مسٹر جناح جیسا اعتدال پسند رہنما بھی دماغی طور پر الجھاؤ میں تھا۔ جس کا اظہار ان کی اس تقریر سے ہوتا ہے، جو انہوں نے ۲۰۔ جنوری ۱۹۳۴ء کو بمبئی میں مسلم طلبہ کے ایک اجتماع میں کی۔

"ملک کی مختلف جماعتوں اور طبقوں کے درمیان موجودہ اختلاف ایک قومی

المناک حادثہ ہے۔اس وقت ہندوستان میں کوئی ایسا راہنما نہیں جس کو ملک بھر کی رائے عامہ کا اعتماد حاصل ہو۔ہندوستان میں بے چینی کی موجودہ فضا اس بات کا ثبوت ہے۔اس کے باوجود ملک میں ایسی جماعت بھی موجود ہے جو ہندوستان کی آزادی کی فوراً خواہش مند ہے۔چنانچہ اس کے اہتمام کے لیے ضروری ہے کہ ہم مقصد کے حصول کے لیے واضح حکمتِ عملی کا پروگرام مرتب کریں۔

اس سے پیشتر مسٹر جناح نے لندن سے واپسی پر مسلم لیگ کے باہم اتحاد پر گفتگو کے دوران ایک اجلاس میں کہا۔

"میرے لیے اس سے بڑی کوئی خوشی نہیں ہو سکتی کہ ہندو اور مسلمانوں میں سچی دوستی ہو۔اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ دل سے تعاون کریں"۔

(سوانح حیات) محمد علی جناح۔مصنف بولائتھو۔ص ۱۶۳

کپورتھلہ میں قانون انتقالِ اراضی

اقوام متحدہ اسی الجھاؤ میں تھی کہ ۲۳۔جنوری ۱۹۳۴ء کو راج محل کپورتھلہ سے حسب ذیل اعلان برائے اشاعت اخبارات کو وصول ہوا۔

حسب ہدایت دربار۔فروخت اور رہن اراضیات اقوام زراعت پیشہ ریاست کپورتھلہ با ترمیم مجریہ ۲۸۔ہاڑ ۱۹۹۰ (بکرمی) ہے اور حسب ہدایت دربار فروخت رہن اراضیات اقوام زراعت پیشہ مقررہ ۲۸۔ہاڑ ۱۹۹۰ سے جاری ہوئی ہے۔زمینداران کے نمائندگان اس ہدایت پر چند ایک ترمیمات کی بابت متواتر درخواست کرتے رہے ہیں۔چنانچہ اس خیال سے کہ زراعت پیشہ جماعت کے حقوق اراضیات کی حفاظت میں کوئی امر نظر انداز نہ ہو اور ان کی خوشحالی میں سرکار کی جانب سے کسی قسم کی رکاوٹ نہ رہے۔شری حضور صاحب بہادر مہاراجہ حسب ذیل ترمیمات فرماتے ہیں۔

(۱) دفعہ اول ہدایت محولہ بالا زراعت پیشہ اقوام جن کی تفصیل احکام محکمہ ہذا مروثہ ۱۷۔پھاگن ۱۹۸۹ب و بیساکھ ۱۹۹۰ب میں درج ہے۔

آپس میں خرید و فروخت اراضیات با اصولِ اجازت حکام مال آزادی سے کر سکیں۔

(ب) دفعہ بنیم ہدایت محولا بالا۔ اجرا۔ ڈگری میں خواہ عدالت دیوانی ہو یا عدالت مال کی کسی زراعت پیشہ قوم کی اراضی کا انتقال نہیں ہوگا۔

(ج) ڈگری دار خواہ کوئی شخص ہو یا بینک زراعتی ہو۔ زراعت پیشہ قوم کے ہریان کی اراضی ۲۵ سال تک رہن ہو سکے گی۔ بعد میعاد مذکورہ بالا اراضیات مرہونہ تصور نہ ہوگی۔

(نوٹ) اجراڈگری میں زراعت پیشہ اقوام ہریان کی اراضی رہن کرنے کے وقت اجراء ہدائت مجریہ سرچارلس ریواز صاحب سابق سپرنٹنڈنٹ ریاست مورخہ ۸۔ اگست ۱۹۳۳ء کی پوری پابندی کرے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ احکام جاریہ ہوں۔ تحریرہ ۲۵۔ پوہ ۱۹۹۰ب دستخط جگجیت سنگھ مہاراجہ کپورتھلہ۔

دستخط عبدالحمید نائٹ سی۔ آئی۔ ای۔ او۔ بی۔ ای۔ خان بہادر۔ وزیر اعظم سرکار کپورتھلہ۔

قربانی چاہے مختصر ہو۔ قوموں کے مقدر بدل دیتی ہے۔ جس قوم نے قربانی کے بغیر عروج حاصل کیا وہ تاریخ کے صفحات سے اس طرح مٹا دی جاتی ہے کہ اس کا نشان تک نہیں رہتا۔

ریاست کپورتھلہ کے غریب عوام نے ایک سال کی جدوجہد سے صدیوں کا چھنا ہوا مقام حاصل کر لیا۔ ریاست کا ساہوکار اور حکام ہر موڑ پر اپنی پوری طاقت سے ان کے آڑے آئے۔ لیکن عوامی تحریک کے سامنے ان کا ٹھہرنا ناممکن ہو گیا۔ نتیجہ سامنے ہے۔

اس موقعہ پر مرکزی مجلس احرار کے اجلاس میں جو ۱۹۔ جنوری کو لاہور میں ہوا مولانا حبیب الرحمٰن کو سنگھووال بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تاکہ تحریک کے نتائج پر چودھری عبدالعزیز اور سنٹرل زمیندار لیگ کے رہنماؤں سے مشورہ کیا جائے۔ ۲۰۔ جنوری کو صدر مجلس احرار سنگھووال پہنچے۔ یہاں کے عوام نے صدر احرار کا شاندار استقبال کیا۔ رات ان کے اعزاز میں چوہدری عبدالعزیز نے استقبالیہ دعوت دی۔ جس میں تقریر کرتے ہوئے صدر مرکزیہ نے کہا۔

"غلطی سے ریاستوں کے والی یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ مجلس احرار ریاستوں کو تباہ کرنا

چاہتی ہے۔ حالانکہ میری جماعت کی زبردست خواہش ہے کہ والیان ریاست ایسا انصاف کریں اپنی رعایا سے جس کی وجہ سے ہم ہندوستان کے دشمنوں کو بتا سکیں کہ ہندوستانی اپنے اندر بہترین قابلیت حکومت کرنے کی رکھتے ہیں۔

مہاراجہ کپور تھلہ نے ہر مرد بالغ کو رائے دہی کا حق دے کر بہترین تدبر کا مظاہرہ کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مہاراجہ اس طرح اسمبلی کے باقی اجزا کو بھی ایسا ہی بنا دیں گے، جو ہندوستان کی عالی دماغی کی بہترین مثال ہوگی۔ میں آخر میں مہاراجہ کے اس اقدام پر انہیں مبارک باد دیتا ہوں۔ جو انہوں نے ایکٹ انتقال اراضی کے اعلان کے ذریعے کیا ہے۔"

آخر میں اس اجتماع میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔

" زمیندارہ لیگ کا یہ اجتماع جدید اصلاحات میں ہر بالغ کو رائے دینے پر مسرت کا اظہار کرتا ہے کیونکہ اس سے باشندگان ریاست کو ان کے جائز حقوق حاصل ہوئے ہیں۔"

آخر میں چودھری عبدالعزیز کی خدمات کو سراہا گیا۔

۳۰۔ جنوری ۱۹۴۳ء کو چودھری عبدالعزیز نے مہاراجہ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک اہم بیان دیا۔

" وفا شعار اور ناچیز فرد ملت کی حیثیت سے میں مندرجہ ذیل سطور حضور کی خدمت میں عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

بالغوں کے حق رائے کے ساتھ مخلوط انتخاب کی بنا پر ریاست میں اسمبلی کے قیام کے اعلان پر ہندوستان بھر میں انتہائی مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ فی الحقیقت اس اعلان کے ذریعے حضور والا نے فرقہ داری کے بھوت کا سر کچلنے کے لیے حکومت ہند اور دیسی ریاستوں کے سامنے نہایت شاندار اور قابل قدر مثال پیش کی ہے۔ ان حالات میں سب کی نگاہیں کپور تھلہ پر لگی ہوئی ہیں کہ حضور والا جو تجربہ شروع کرنے والے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

ہر دشمن تسلیم کرتا ہے کہ ہماری معاشرتی، اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی مشکلات کا مؤثر علاج بالغوں کے حق رائے دہی اور مخلوط انتخاب میں مضمر ہے۔ یہی سمت ہے جو مختلف جماعتوں، متحارب طبقوں اور تمام فرقوں کو ملا کر ایک قوم بن سکتی ہے۔ ہندوستان کی تمام ترقی خواہ جماعتیں اسی کے لیے مساعی میں ہیں۔ نہرو رپورٹ جو ہندوستان کے فرقہ وارانہ اور قابل ترین سیاستدانوں کے تجربات کا مرقع تھی اسی پر مبنی تھی۔

حضور والا کی روشن خیالی اور ترقی خواہی نے ہر وقت اس کی اہمیت کا احساس فرمایا اور فرقہ واری کو کچلنے کے لیے مخلوط انتخاب اور بالغوں کے حق رائے دہی کو رائج کیا۔

حضور والا پر روشن ہو گا کہ فرقہ پرستی کے کارندے اس فکر میں ہیں کہ حضور والا کی تجویز کو درہم برہم کر دیں۔ وہ پاسنگ اور مراعات کے لیے شور مچا رہے ہیں تا آنکہ بالغوں کے حق رائے کے ساتھ مخلوط انتخاب کی سکیم میں پاسنگ کا مطالبہ جمہوریت کے منافی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ایک قوم کے نقصان پر دوسری قوم کی حمایت کی جائے۔ اور کمزور سے چھین کر بڑوں کی شکم پروری کی جائے۔ علاوہ بریں اقلیت پاسنگ کے باوجود ہر حال میں اقلیت رہے گی۔ بتیرہ کے کے مقابل بیس ممبر ویسے ہی بے دست و پا ہوں گے۔ جیسے اس کے مقابلے میں بیس ممبر اس کے مقابلے میں رعایت یافتہ طبقے کے متعلق تعصب پیدا ہو جائے گا۔ انہی وجوہ کی بنا پر ہندو مہاسبھا برطانوی ہند میں مسلم اقلیت کو پاسنگ دینے کی مخالفت کر رہی ہے۔

حضور والا! آپ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہندو مہاسبھا جداگانہ انتخاب اور مسلم اقلیتوں والے صوبوں میں مسلمانوں کو پاسنگ دیے جانے کی بناء پر وزیر اعظم برطانیہ کے فرقہ وارانہ فیصلے پر ان کی مذمت کر چکی ہے۔ مذکورہ فیصلے کے متعلق سکھ لیگ کی روش بھی یہی ہے۔ سکھ پنجاب میں کسی قوم کو پاسنگ

دیے جانے کے سخت مخالف ہے۔ ہندو مہاسبھا جمعیتہ اقوام کے پاس اپیل کر چکی ہے کہ جمعیتہ کا اقلیت والا معاہدہ نافذ کر دیا جائے جس میں اقلیتوں کی حفاظت مختلف طریق پر کی گئی ہے۔ پاسنگ وار خاص مراعات کے متعلق ہندو مہاسبھا اور سکھ لیگ ان حالات کی موجودگی میں سکھ اور ہندو ریاست کپورتھلہ میں کس مقصد سے پاسنگ کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

حضور والا! پاسنگ کے نفاذ سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ ریاست کی مختلف قومیں الگ الگ مطالبے پیش کر دیں گی۔ سکھ کہیں گے کہ کپورتھلہ سکھ ریاست ہے۔ لہٰذا انہیں خاص مراعات دی جائیں۔ ہندو کہیں گے کہ اس میں ہماری قوم سب سے چھوٹی ہے لہٰذا ہمیں زیادہ نشستیں دی جائیں۔ مسلمان کہیں گے کہ ہم اکثریت میں ہیں اور ہماری اکثریت کو بہرحال باقی رکھا جائے۔ اس طرح یہ مطالبات کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ اگر ایک قوم کو زائد حق دیا گیا تو دوسری قوم طبعاً اس پر عدم اعتماد کا اظہار کرے گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ فرقہ وارانہ کشمکش پیدا ہو جائے گی۔

زمینداروں کا نقطہ نگاہ

میں آخر میں حضور والا کی توجہ گرامی زمیندارہ لیگ کے اجلاس بگھوال کی طرف مبذول کرانے کی جرات کرتا ہوں۔ زمیندار حضور والا کے ممنون ہیں کہ حضور نے بالغوں کے حق رائے دہی کے ساتھ مخلوط انتخاب رائج کر دیا۔ اور کسی قوم کو پاسنگ نہ دیا۔ اس سکیم میں اگر کوئی ترمیم ہوئی یعنی پاسنگ وغیرہ دیا گیا تو ریاست میں بے چینی اور فرقہ وار کشمکش کا بیج بو دیا جائے گا۔ جو موجودہ ہندوستان کیلئے موجب لعنت بنا ہوا ہے۔ مجھے امید ہے کہ حضور والا جداگانہ انتخاب یا پاسنگ یا نشستوں کی تخصیص وغیرہ کے مطالبات پر توجہ نہیں دیں گے۔ یہ تمام چیزیں افتراق کے آلات اور ان کے تحت قومیں حصوں میں بٹ جائیں گی۔

نازی پارٹی کی پہلی سالگرہ

ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں کے اندرونی سیاسی جھگڑوں کے باعث برطانوی سیاستدان دوہرے الجھاؤ میں تھے۔ ہر جگہ رعایا حکمرانوں سے ناراض اور غیر مطمئن تھی۔ لندن کی حکمران پارٹی ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھ کر اپنے جال سے رہا کرنا کسی صورت بھی پسند نہیں کرتی تھی لیکن اس کے خلاف بغاوت کی آگ اس قدر پھیل چکی تھی کہ اس آگ میں اس کا دامن محفوظ نظر نہیں آتا تھا۔ آج نہیں تو کل یہ آلاؤ اس کے ایوانوں تک پہنچنے والا تھا۔ کہ انہی دنوں فروری ۱۹۳۴ء کے پہلے ہفتے میں ہٹلر نے جرمن میں اقتدار سنبھالنے کی پہلی سالگرہ کے موقع پر جرمن قوم سے مختصر خطاب کیا۔

"یہ کہنا جھوٹ اور غلط ہے کہ قیصر پھر جرمن میں واپس آئے گا۔ نازی پارٹی اس کے باوجود سابق حکمران خاندان کو غدار تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں یہ جرمن قوم کا کام ہے کہ وہ جسے چاہے اپنا رئیس مان لے۔ اس وقت فیصلے کی باگ ڈور نازی پارٹی کے ہاتھ میں ہے۔

ہٹلر نے یقین دلایا کہ جرمن قوم اس بات کی خواہاں ہے کہ وہ فرانس کی حفاظت کے لیے کسی طرح بھی موجب خطرہ نہ بنے۔ ہم صرف مساوات کے طلب گار ہیں۔ مساوات کے بعد ہم سے نیک نیتی اور امن پسندی سے جو ثبوت مطلوب ہو ہم دینے کو تیار ہیں۔ لیکن ایک عظیم الشان قوم کو ہمیشہ کے لیے دباؤ کے تحت رکھنا ممکن نہیں۔

اس سے اگلے روز برطانوی پارلیمنٹ نے ایک یادداشت مرتب کی جس میں تخفیف اسلحہ پر اپنی رائے پیش کی گئی۔

"جرمن کو فوجی قوت بڑھانے کی اجازت کے بغیر اس سے مفاہمت ناممکن ہے۔ برطانوی رائے ہے کہ جرمن، اٹالیہ، پولینڈ اور فرانس کو جنگ عظیم کے بعد دو دو لاکھ فوج رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن جرمن تین لاکھ فوج کا مطالبہ کرتا ہے۔ برطانیہ کی رائے میں تخفیف اسلحہ کے ساتھ جرمن کی اگر یہ

شرط اگر مان لی جائے تو کوئی حرج نہیں ؟
برطانوی اخبارات نے پارلیمنٹ کی اس تجویز کو لغو اور بے معنی قرار دیا۔

تحفظ والیانِ ریاست کا بل

کشمیر، الور اور کپور تھلہ کی ریاستوں میں رعایا کے حقوق کی جو لڑائی مجلس احرار نے شروع کر رکھی تھی نواب اور مہاراجوں کے علاوہ انگریز بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ راج واڑوں کا یہ خاندان برطانوی سامراج کا ازلی وفادار گروہ تھا۔ راجگدیوں پر بیٹھ کر اپنی مظلوم رعایا سے جو ناانصافیاں انہوں نے کیں برطانیہ اپنی سیاسی ضرورت کے لیے ان کی پردہ پوشی اور حمایت ضروری سمجھتا تھا موجودہ ہندوستان کے تغیر میں ان ریاستوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ حالات بھی انہیں منہ لگانے سے انکاری تھے۔ ایسے میں ریاستوں کے برطانوی آقاؤں نے ہاتھ بڑھایا اور سات کروڑ ریاستی عوام کے جذبات سے ماورا ہو کر ان کے تحفظ کا فیصلہ کر لیا۔

تحفظ والیان ریاست کا بل ۸۔ فروری ۱۹۳۴ء کو سنٹرل اسمبلی میں خود حکومت کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اس بل پر تقریر کے دوران سر محمد یامین ممبر سنٹرل اسمبلی نے کہا۔

"اس بل کے تین مقصد ہیں۔

۱۔ والیانِ ریاست کو ان ناجائز حملوں سے بچانا ہے۔ جو اکثر اخبارات آئے دن ان کی ذات پر کرتے ہیں۔

۲۔ ریاستوں کی حکومتوں پر ناجائز حملوں سے اخبارات[1] کو روکنا۔

۳۔ برٹش انڈیا اور دیسی ریاستوں کا ایک دوسرے کی مدد کرنا۔

سوال نمبر ا۔ کوئی اس کو پسند نہیں کرے گا کہ برٹش انڈیا کے اخبارات راجوں اور نوابوں پر ذاتی رکیک حملے کریں اور اس غرض سے ان سے روپیہ وصول کریں۔ اگر کسی والئی ریاست کا ذاتی چال چلن خراب بھی ہو تو اس کو معتوب کرنے کا حق کسی اخبار کو نہیں پہنچتا۔

---

[1] سردار دیوان سنگھ مفتون (آنجہانی) کا اخبار ہفت روزہ "ریاست" اور مجلس احرار کا آرگن "آزاد" ان دنوں ریاستوں کے اندرونی رازہائے سربستہ کو عوام کے سامنے پیش کر رہے تھے

مہابیردل کی قرارداد

متحارب قومیں میدانِ کارزار میں ہوں تو وار کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتیں۔

ہندو سیاسی لڑائی کو بھی کاروبار کے انداز پر لڑتا ہے۔ اس کی یہی بڑی غلطی آئندہ ہندوستان کی تقسیم کا باعث بنی۔ وہ اکثریت میں ہوکر اقلیت پر ہمیشہ اپنی برتری کا خواہاں رہا۔ اس کا یہ تعصب اس کی بین الاقوامی رسوائی کا ذریعہ بنا۔ ورنہ غیر ملکی حکمرانوں کا فریب اتنی عمر حاصل نہ کرتا۔

ریاست کپورتھلہ جہاں کہ مسلمانوں کی آبادی ستر فیصد تھی اور باقی تیس فیصد میں سکھ زمیندار بھی شامل تھا جو ہندو ساہوکار کے سود در سود کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا جب اسے اپنی محرومی کا احساس ہوا۔ اس نے ریاست کی اکثریت سے مل کر صرف اور صرف اپنے حقوق کی جنگ لڑی۔ جس میں اسے قربانی کی بنیاد پر کامیابی ہوئی، تو ریاست کا غیر مسلم ساہوکار اپنے سرمائے کی حفاظت میں انصاف سے میلوں دور نکل گیا۔

۴۔ فروری ۱۹۲۴ء کو کپورتھلہ مہابیر دل (ہندو سبھا کی شاخ) کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں یہ قرارداد منظور کی گئی۔

> "ریاست کی مجوزہ اصلاحات اطمینان بخش نتائج پیدا کرنے کی بجائے مستقل مسلم راج قائم کرنے کے مترادف ہیں۔ یہ اصلاحات اقلیت اور ریاست کے لیے ایک عظیم خطرہ ہے۔ لہٰذا ووٹروں پر تعلیم اور جائیداد وغیرہ کی شرائط عاید کی جائیں۔ نیز ہر امیدوار کے لیے لازمی ہو کہ وہ دوسری اقوام سے تیس فیصد ووٹ حاصل کرے۔ اور اقلیتوں کے لیے پاسنگ مقرر کیا جائے۔ اس قرارداد کے ساتھ وزیرِ اعظم کپورتھلہ کی علیحدگی کا مطالبہ بھی کیا گیا۔"

اس کے جواب میں ۱۶ فروری کو مہاراجہ نے صرف اتنا کہا کہ "مجھے اپنے وزیرِ اعظم پر اعتماد ہے۔"

مولانا مظہر علی اظہر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے

۱۱۔ فروری کو سرکاری اعلان میں کہا گیا کہ شیخ دین محمد (گوجرانوالہ) کی پنجاب اسمبلی کی ممبری سے علیحدگی کے بعد جو نشست خالی ہوئی تھی اس پر (مولانا) مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ

(لاہور) شیخ عطا محمد (گوجرانوالہ) ملک برکت علی ایڈووکیٹ لاہور بطور امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ ووٹوں کی کل تعداد چھ ہزار چھ سو تینتیس تھی جن کی تفصیل درج ہے۔

(مولانا) مظہر علی اظہر۔ دو ہزار نو سو بیس۔

شیخ عطا محمد۔ دو ہزار سات سو پچپن۔

ملک برکت علی۔ نو سو ترپن۔

اس شہری حلقہ میں شیخوپورہ، لدھیانہ، جالندھر اور گورداسپور شامل تھے۔

مولانا مظہر علی اظہر کی کامیابی کے بعد پنجاب اسمبلی میں مجلس احرار کے نمائندوں کی تعداد تین ہوگئی۔

چودھری افضل حق۔ ہوشیار پور، چودھری عبدالرحمٰن (راہوں والے) جالندھر اور مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ لاہور۔

ماسٹر تاج الدین انصاری

۱۷۔ فروری ۱۹۳۴ء کو ماسٹر تاج الدین انصاری پہلی مرتبہ لدھیانہ مجلس احرار کے صدر منتخب ہوئے۔ اس سے پیشتر آپ میونسپل کمیٹی لدھیانہ کے ممبر تھے اور شہر کے بہت بڑے سرکاری ٹھیکیداروں میں شامل تھے۔ اس طرح وہ اپنے شہر میں رئیس کہلاتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن کی دوربیں نگاہوں نے انہیں وطن عزیز اور ملت اسلامیہ کی خدمت کے لیے ڈھونڈ نکالا۔ پھر وہ تادم احرار سے وابستہ رہے۔ تا آنکہ ان کا انتقال بھی لاہور احرار کے دفتر میں ہوا۔

مسٹر جناح اور سر آغا خاں

گزشتہ ربع صدی کے مسلم پولیٹکس میں مسٹر محمد علی جناح اور سر آغا خاں کی شخصیتیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے رہیں۔ دونوں کے متضاد خیالات کا ٹکراؤ ایک مدت تک ملت اسلامیہ ہند کے لیے دردِ سر بنا رہا۔ سر آغا خاں انگریزی اقتدار کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ مسلمانانِ ہند کے نمائندہ ہونے کے بھی دعویدار تھے جب کہ محمد علی جناح اپنے نقطہ نظر سے ہمیشہ مسلمانوں کی فلاح سوچتے رہے۔

لندن کی پہلی گول میز کانفرنس کے موقع پر یہ اختلاف کھل کر سامنے آگیا۔ اس خلیج

کے وسیع کرنے میں میاں سر فضل حسین کا ہاتھ بھی تھا (جیسا کہ گذشتہ اوراق میں ظاہر کیا جا چکا ہے) یہی وجہ تھی کہ قائد اعظم کو بادلِ نخواستہ تین سال لندن گذارنے پڑے۔ ۱۹۳۴ء جنوری کے شروع میں جب وہ ہندوستان پہنچے تو ان دنوں مسلم لیگ دو گروہوں میں منقسم تھی۔ ایک کی رہنمائی میاں عبدالعزیز کر رہے تھے۔ تو دوسری مسلم لیگ کے لیڈر حافظ ہدایت حسین تھے۔ مسٹر جناح کے نزدیک یہ بُعد ختم ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ کسی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی رہے اور انہیں مشترک مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ عین انہی دنوں سر آغا خاں نے دہلی میں ازسرِنو اس قصے کو شروع کیا۔ بظاہر اس کانفرنس کے ایجنڈے میں یہ شق نمایاں تھی کہ مسلم لیگ مسلم کانفرنس اور لکھنؤ اتحاد کانفرنس کا باہم الحاق کر دیا جائے اور اس بہانے دونوں مسلم لیگیں اکٹھی ہو جائیں حالانکہ پیشتر مسٹر جناح اس قصے کو ختم کر چکے تھے۔

راجہ سلیم پور اور نواب اسمٰعیل خاں اس سلسلے میں سر آغا خاں کے معاون تھے۔

سر آغا خاں کی اس حرکت سے بھی اس اختلاف کی بُو آ رہی ہے۔

سر آغا خاں نے دہلی مسلم لیگ کی میٹنگ میں مسٹر محمد علی جناح کو شمولیت کی دعوت دی۔ لیکن وہ شامل نہیں ہوئے۔ کیونکہ وہ پیشتر ہی اس قضیے کو بمبئی میں طے کر چکے تھے۔ اور مشترک مسلم لیگ کے اتحاد پر انہیں صدر منتخب کر لیا گیا تھا۔ ان حالات میں سر آغا خاں کی دعوت پر دہلی جانا حیرت انگیز تھا۔ آخر سر آغا خاں نے مسلم لیگ کو ساتھ لے کر کام کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ان دنوں ہندوستان میں برطانوی اعلان پر سیاسی جماعتوں کی کشمکش عروج پر تھی۔ برطانوی وزیر اعظم کے جواب میں کسی بہتر مشترک فارمولے کی تلاش جاری تھی۔ اس ہنگامہ آرائی نے رہنمایان ہند کو ملک کے دوسرے معاملات سے غافل کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۶۔ جنوری کو بہار میں اور ۲۰۔ جنوری ۱۹۳۴ء کو کانپور میں اس قدر خوفناک زلزلے آئے کہ ہزاروں بندگانِ خدا ہلاک ہو گئے۔ بے گھر ہونے والوں کی تعداد ان سے کہیں زائد تھی۔ مگر کانگریس سے مسلم کانفرنس تک کسی کی توجہ اس خدائی قہر پر نہیں تھی۔ ہر کوئی نئے انتخاب اور برطانوی اعلان کے پیچھے بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔ ریاست کشمیر پر بھی ڈوگرہ شاہی کے مظالم ازسرِنو انگڑائیاں لے رہے تھے۔ شمال مغربی صوبہ سرحد میں آزاد قبائل پر انگریزوں کی بمباری اس قدر شدت اختیار کر چکی تھی کہ پہاڑوں

کی غاروں میں زندگی گذارنے والے بن موت مر رہے تھے۔ ان کی فردِ جرم میں انگریزوں کی اطاعت نہ کرنا سب سے بڑا جرم تھا۔ فرنگی غلامی کی زنجیریں ان تک پہنچنے میں عاجز آ چکی تھیں اور بلوچستان کے رہنماؤں کو آزادیٔ وطن کے جرم میں جیل خانوں میں ڈالا جا رہا تھا۔

ہندوستان اور یورپ کے اخبارات برطانوی استعمار کی اس حرکت پر ناراض تھے مگر ہندوستانی رہنما تھے کہ ان کے دل، کان اور آنکھیں صرف آئینِ افرنگ تک محدود تھے۔ ایسے میں فقط مجلس احرار تھی جو اس اکھاڑے سے باہر تھی۔ اس کے صدر نے ۱۲ فروری کو لاہور میں حسب ذیل بیان دیا۔

"بہار، بنگال اور کانپور میں تباہی خیز زلزلے نے جو نقصانِ عظیم کیا ہے، ملک کے تمام سمجھدار طبقہ کی تمامتر توجہ اس کی طرف ہے۔ مسلمان ابھی تک مصیبت زدگان زلزلہ کی امداد سے پورے طور پر عہدہ برآ نہیں ہوئے تھے کہ حکومت کشمیر نے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم شروع کر دیے۔ عالمگیر پکڑ دھکڑ کے علاوہ بیت زنی کی انسانیت سوز سزائیں دی جا رہی ہیں اور متعدد مسلمان شہید کر دیے گئے ہیں، جس سے مسلمانوں کے دل پھر سے زخمی ہو گئے ہیں۔ مصیبتیں اکیلی نہیں آئیں، ادھر کشمیری یتیم بچوں اور بیواؤں کی چیخ و پکار اور مصیبت زدگان زلزلہ کی آہ و فغاں مسلسل کانوں میں آ رہی ہے۔ ادھر بلوچستان میں اصلاحات کے حامی عبدالصمد اچکزئی اور عبدالعزیز خاں گرفتار کر لیے گئے ہیں۔

مجلس احرار کو مصیبت زدگان بہار، بنگال اور کانپور اور شہدائے کشمیر کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بلوچستان کے رہنماؤں کی گرفتاری نے تشویشناک صورتِ حال پیدا کر دی جس نے تمام احرار کارکنوں کو پریشان کر دیا ہے۔ متذکرہ امور پر جماعتی طور سے غور کرنے کے لیے میں نے لاہور میں ۱۸ فروری کو مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کر لیا ہے۔ مجلس احرار کو کشمیر کے کمزور دل رہنماؤں سے ہمیشہ یہ تمنا رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مطالبات کو کشمیری مسلمانوں کی آرزوؤں کے مطابق پیش کریں۔ مگر وہ عمداً گریز کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

کشمیری مسلمانوں کی عظیم الشان قربانیاں ادنیٰ مطالبات کے عوض ضائع کردی گئیں۔ امید ہے کہ کشمیر کے لیڈر اور ان کے بیرونی ہمدرد ذمہ دار اسمبلی کے مطالبہ کو پیش نظر رکھیں گے۔ نیز بلوچستان کے بہی خواہ جو قربانیوں کے لیے آمادہ ہیں اس غلطی کا اعادہ نہ کریں گے۔ جو کشمیر کے مسلمان رہنماؤں نے ابتدا میں کی تھی اور اب پھر کر رہے ہیں۔

آزاد قبائل پر برطانوی بمباری نے جو قیامت خیز سماں پیدا کر دیا ہے اور جس کی وجہ سے سرحد کے مظلوم قبائل برطانوی استعمار کا شکار ہو رہے ہیں مجلس احرار اس سے بھی غافل نہیں۔

میں ہندوستان کے ان تمام لوگوں سے جو مجلس احرار سے دلی ہمدردی رکھتے ہیں سے اپیل کروں گا کہ وہ متذکرہ بالا واقعات کو سامنے رکھ کر ہر مقام پر مجلس احرار کو مضبوط کریں۔"

کشمیر اور سکھ

برصغیر میں سکھ قوم عقل، سوچ اور فکر کے اعتبار سے عجیب قوم سمجھی جاتی ہے۔ یہ نہ صرف وقت پر عقل کی بات نہیں کرتے بلکہ وقت سے کوسوں دور چلے جانے کے بعد انہیں یاد آتا ہے کہ کوئی بات کہنی تھی۔ مگر وقت بیت چکا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی بات کا وزن بھی ضائع ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کوتاہی، کمزوری اور ناعاقبت اندیشی سے ہندو قوم نے سکھوں کو ہمیشہ اپنے سیاسی اغراض کے لیے استعمال کیا۔ اور آخر کو ہندوستان میں اس قوم کی حیثیت اچھوتوں سی ہو کر رہ گئی۔ باوجودکہ ان میں دلیر قوموں کے اوصاف بدرجہ اتم موجود ہیں۔

۲۴-۱۹۲۲ء کی اکالی تحریک اس کی گواہ ہے کہ گوردواروں کو مہنتوں کے اقتدار سے آزاد کرانے اور گوردوارہ ایکٹ بنوانے میں جو قربانیاں اس قوم نے دیں، ہندوستان کی تاریخ اس سے تہی نظر آتی ہے۔ پنجہ صاحب (حسن ابدال)، ننکانہ صاحب، گورو کا باغ (امرتسر) اور بھائی پھیرو (ضلع لاہور) یہ وہ مقامات ہیں جن کی دیواروں پر ہنوز سکھ نوجوانوں کا خون ان کی جرأت اور بہادری کی شہادت دے رہا ہے۔ لیکن بنیا قوم نے اپنے ترازو کی ڈنڈی

اس بری طرح ان کے سر پر پاری ہے کہ اچھے بھلے ہوتے ہوئے ناسمجھ ہو جاتے ہیں۔
تحریک کشمیر ۱۹۳۱ء سے شروع ہے اور ۱۹۴۲ء کے آغاز تک اس تحریک میں سکھ کہیں نظر نہیں آئے۔ مگر فروری کے وسط میں نہ جانے انہیں کیا سوجھی کہ ان کے لیڈر گیانی کرتار سنگھ نے ۱۷ فروری کو بلا ضرورت ایک بیان دے دیا۔

ریاست کشمیر میں سکھوں کے مطالبات

کشمیر کے سکھوں کی حمایت میں سکھ لیڈر گیانی کرتار سنگھ نے ریاستی سکھوں کے لیے حسب ذیل مطالبات کیے۔

۱۔ سٹیٹ اسمبلی اور ملازمتوں میں سکھوں کے لیے دس فیصد نیابت مقرر کی جائے۔
۲۔ کشمیر کی وزارت میں ایک سکھ وزیر کو شامل کیا جائے۔
۳۔ جو گوردوارے حکومت کے قبضے میں آچکے ہیں وہ واپس کیے جائیں۔
۴۔ سکھ طلباء کے لیے وظائف کا انتظام کیا جائے۔
۵۔ فوج میں سکھوں کے لیے پندرہ فیصد ملازمتیں ہوں۔

کشمیر میں سکھ آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ لیکن محض ہندوؤں کے اکسانے پر انہوں نے کشمیر کے پھٹے میں ٹانگ اڑا دی۔ پنجاب میں بھی انہیں اپنی عددی حیثیت کا علم ہے کہ وہ ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں کے مقابل تیس لاکھ سے زائد آبادی نہیں رکھتے۔ مگر حقوق کہیں زیادہ مانگ رہے ہیں۔ اس طرح ہندوستان کے دیگر صوبوں میں ان کی تعداد صفر کے برابر ہے اس پر بھی مسلسل کئی سالوں سے آزادی وطن کے راستے میں روڑے بنے ہوئے ہیں۔

کشمیر میں جمہوریت کا مطالبہ

کشمیری رہنماؤں کی باہمی رقابت نے یہاں کے مسلمانوں کو پہلے ڈوگرہ شاہی کا اور بعد میں بھارت کا غلام بنا دیا اس طرح آزادی کشمیر کی جنگ میں بیرون کشمیر کے مسلمانوں کا خون اور محنت بھی رائیگاں گئی۔ قومیں صدیوں کے بعد بیدار ہوتی ہیں۔ اگر لیڈر نیک اور بیدار مغز ہو تو اس موقع سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں جو لڑائی کشمیر کے لیے لڑی گئی اس کا اعادہ پھر کبھی نہ ہو سکے گا۔ اگر یہ لوگ

گلینسی کمیشن کے کھلونے کو توڑ کر ذمہ دار اسمبلی کو اپنا مقصود قرار دے لیتے۔ تو برصغیر کی آئندہ سیاست یورپین اقوام کی بجائے کشمیریوں کے اقتدار میں ہوتی۔ مگر مخلص قوم کے غیر مخلص لیڈروں نے سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔

۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک تو مہاراجہ کشمیر کو ظالم حکمران ٹھہرا کر اس سے آزادی کا مطالبہ ہوتا رہا۔ لیکن ۱۶۔ فروری ۱۹۳۴ء کو چودھری غلام عباس نے کشمیر مسلم کانفرنس کے تحت ایک قرارداد کے ذریعے حکومت کشمیر سے ایک نیا مطالبہ کر دیا۔

"گلینسی کمیشن کی رپورٹ کے باوجود مسلمانوں پر تشدد ہو رہا ہے اور ان کے مطالبات پورے نہیں کیے جاتے الہٰذا ہماری تجویز ہے کہ مہاراجہ کے زیر سایہ کشمیر میں جمہوری نظام نافذ کیا جائے۔ (روزنامہ انقلاب لاہور۔ ۱۵ فروری ۱۹۳۴ء)

؎ مجھ کو مل جائے چہکنے کے لیے شاخ مری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

چودھری غلام عباس نے آزادئ کشمیر کے مطالبے سے ہٹ کر محض جمہوریت کا مطالبہ کیا اور وہ بھی مہاراجہ سر ہری سنگھ کے زیر سایہ۔ یہ کیوں؟ اس سوال کا جواب کشمیری رہنما ہی دے سکتے ہیں۔

ان دنوں کشمیر میں بیت زنی کی سزاؤں کا رواج زور پکڑ چکا تھا۔ غریب کشمیری ہزاروں کی تعداد میں روزانہ زخمی ہو رہے تھے۔ کشمیر کے حالات ۱۹۲۱ء کی سول نافرمانی سے کئی درجہ خراب ہو چکے تھے۔ اس پر بھی مہاراجہ کے زیر سایہ جمہوریت کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ ؎
خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔ کہ سلطانی بھی عیاری ہے اور درویشی بھی عیاری۔

۲۵۔ فروری کو علامہ اقبال نے وائسرائے ہند کو اپنے برقی پیغام میں کہا۔

"کشمیر کے حالات پر توجہ فرمائیں۔ کیونکہ ریاست سے نہایت خوفناک اطلاعات آ رہی ہیں۔ بلا امتیاز بیت زنی کی جا رہی ہے اور گولیاں چلائی جا رہی ہیں"

اسی روز (۲۵۔ فروری) مرکزی مجلس احرار کی عاملہ کا نہایت اہم اجلاس لاہور میں صدر مرکزیہ نے طلب کر لیا۔ جس میں مسلسل چار گھنٹے تک بحث رہی۔ آخر ورکنگ کمیٹی کو اختیار دے

دیا گیا کہ وہ حالات کے پیش نظر جیسے چاہے اپنا فیصلہ دے۔ اس کے فوراً بعد مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ جس کی تمام کارروائی خفیہ رکھی گئی۔ یہاں تک کہ اخباری نمائندوں کو بھی داخلہ کی اجازت نہیں تھی۔

اس اجلاس میں شمولیت کے لیے کشمیری رہنماؤں کو بھی دعوت نامے روانہ کیے گئے تھے۔ اور ان کے انتظار میں اجلاس دوسرے دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

۲۶۔ فروری کو مجلس عاملہ کا دوبارہ اجلاس ہوا۔ اس میں احرار رہنماؤں کے علاوہ جموں و کشمیر کے جن رہنماؤں نے شرکت کی ان میں شیخ محمد عبداللہ صدر آل جموں کشمیر کانفرنس۔ پروفیسر محمد سعید صدر ینگ مین ایسوسی ایشن سرینگر۔ سردار گوہر الرحمن اور شیخ اللہ رکھا ساغر نمایاں ہیں آخر فیصلہ کیا گیا کہ اس بربریت کے خلاف تمام ہندوستان میں ۹۔ مارچ کو یوم کشمیر منایا جائے۔ جس میں کشمیری حکام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے۔ رضاکار بھرتی کیے جائیں: جلسے ہوں۔ جلوس نکالے جائیں۔ آخر میں مندرجہ ذیل قرارداد منظور ہوئی۔

۱۔ یہ اجلاس اہل کشمیر کے لیے ذمہ دار حکومت کے مطالبہ کو اہل کشمیر کی خستہ حالی کا واحد حل سمجھتا ہے۔ اور انہیں یقین دلاتا ہے کہ مسلمانان ہند ان کی ہر ممکن امداد سے پہلو تہی نہیں کریں گے۔

۲۔ یہ احتجاج کشمیر میں انگریز وزیر اعظم کے عہد حکومت میں بیت زنی کے مسلسل اور روزانہ واقعات کو نہایت وحشیانہ اور ظالمانہ تصور کرتا ہے۔ اور ان کے خلاف زبردست صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا ریاست کی بے درد حکمت عملی کی پرزور مذمت کرتا ہے۔

۳۔ مجلس عاملہ ہندوستان کی تمام سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں سے استدعا کرتی ہے کہ بیت زنی کی اس وحشیانہ سزا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔

اس اجلاس کے فوراً بعد دفتر احرار میں کشمیری راہنماؤں نے مجلس احرار کی تائید میں ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ ہم آئندہ متحد ہو کر آزادئ کشمیر کی جنگ لڑیں گے۔ انہوں نے زوردار الفاظ میں کہا کہ آئندہ ذمہ دار اسمبلی ہی ریاست کی آزادی کی ضامن ہو سکتی ہے۔

اس اتحاد کا فوری اثر یہ ہوا کہ چودھری غلام عباس نے ۲۶ اور ۲۷۔فروری کی درمیانی رات کو حکومت کشمیر سے ذمہ دار اسمبلی کے مطالبہ کی بنیاد پر سول نافرمانی کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور خود ہی اس تحریک کے پہلے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے۔ اس تحریک کا مرکز جموں قرار پایا۔ ریاست کے بعض ہندو اور سکھ بھی اس تحریک میں شامل ہوئے۔

اس سے پیشتر چودھری غلام عباس نے کشمیر کے انگریز وزیر اعظم مسٹر کالون سے فرنچائز پر گفتگو کرنے کی درخواست کی جسے مسترد کر دیا گیا تھا۔

۲۸۔فروری کو سری نگر کے حکام نے مسجد خانقاہ معلیٰ کے منتظمین کو ایک نوٹس کے ذریعے اطلاع دی کہ آئندہ یہاں کسی قسم کی سیاسی تقریر کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ مسجد کے منتظمین نے حکومت کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ادھر جموں میں چودھری غلام عباس کو دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ جموں کے رضا کاروں نے میونسپل کمیٹی کی چنگیوں پر پکٹنگ کی لیکن کوئی گرفتاری عمل میں نہ آئی۔ جموں کے بعد ۵۔مارچ کو سرینگر میں بھی تحریک شروع ہو گئی۔ یہاں کے حکام نے گرفتاریوں اور کارکنوں کی زبان بندی کا سلسلہ شروع کر دیا۔

۹۔مارچ کو یوم کشمیر کے سلسلے میں مجلس احرار نے تمام ماتحت مجالس کو ہدایت جاری کی کہ کشمیر کے انگریز وزیر اعظم اور ریاست میں بیت زنی کی سزاؤں کے خلاف زیادہ سے زیادہ قرار دادیں پاس کر کے ان کی نقول دفتر مرکزیہ کے علاوہ حکومت ہند اور مہاراجہ کشمیر کو بھیجی جائیں۔

ریاستیں مجلس احرار کی روز اول سے رائے رہی ہے کہ ہندوستانی ریاستیں انگریزی کھونٹے سے بندھی ہوئی ہیں اور یہی ان کا محور ہے برطانوی اقتدار کی ضرورت بھی یہی ہے کہ وہ دیسی ریاستوں کو اپنی گرفت میں رکھیں تاکہ نئے آئین کے نفاذ میں یہ لوگ ملکی ضرورت کی بجائے غیر ملکی ضرورت کو تقویت دیں۔

؎ صحن چمن کا یہ خار زار پودا آئندہ بہاروں میں لالہ وگل کا نہیں خزاؤں کا معاون ہوگا۔ اسے کاٹ پھینکنا ہی بہتر ہے۔ لیکن مجلس احرار کی اس خواہش کی تکمیل تک پہنچنے میں کئی برس

لگ گئے اور اس دوران برطانیہ نے ہندوستان کی اسمبلی میں ریاستوں کے تحفظ کا بل پیش کر دیا۔ اس موقعہ پر ۲۶۔ فروری کو مسٹر محمد علی جناح نے "وائٹ پیپر اور ریاستیں" کے عنوان سے ایک بیان میں کہا۔

"وائٹ پیپر میں جس فیڈریشن کا نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ حقیقی فیڈریشن نہیں ہے۔ جس کا ہندوستان مطالبہ کر رہا ہے۔ جب کہ اس فیڈریشن میں دیسی ریاستوں اور برطانوی ہند کے تعلقات میں تلخی پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے کہ دیسی ریاستیں ملک کی ترقی خواہ قومی عناصر کے خلاف منظم رہیں گی۔ کیونکہ آئندہ مجلس وضع قوانین میں دیسی ریاستوں کے نمائندوں کی حیثیت وہی ہوگی جو اس وقت حکومت کے نامزد ممبروں کی ہے۔"

ہندو مسلم اتحاد

۵۔ مارچ ۱۹۳۴ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر نواب سر احمد سعید خاں آف پٹوڈی نے مسلم کانفرنس کی صدارت کے دوران کہا

"میں اپنی سیاسی زندگی کے آغاز ہی سے مختلف اقوام میں اتحاد باہمی کے ساتھ خوشگوار تعلقات کے قیام کا خواہاں رہا ہوں۔ کہ اس وجہ سے ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں کا باہمی اختلاف ان کے لیے سخت تکلیف کا باعث ہے۔"

مسٹر جناح کی لندن سے واپسی پر مسلم لیگ کے متحارب گروہوں کے مابین کشمکش ختم ہو چکی تھی۔ اس کی تصدیق کے لیے ۴۔ مارچ کو دہلی میں دونوں مسلم لیگوں کا آخری مشترک اجتماع ہوا۔ جس میں جنوری کے فیصلے کو آخری شکل دے دی گئی۔ یعنی حافظ ہدایت حسین اور میاں عبدالعزیز جو بیشتر سے اپنے اپنے گروہوں کے سربراہ تھے + اپنے عہدوں سے مسٹر جناح کے حق میں مستعفی ہو گئے۔ نیز کہا کہ وہ جیسے چاہیں کریں۔ اس پر ۸۔ مارچ کو مسٹر محمد علی جناح نے اعلان کیا۔

"میں انتہائی دیانت کے ساتھ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اس مقاصد کے حصول کے لیے

مجھے نہ صرف مسلمانوں کی امداد کی ضرورت ہے بلکہ دیگر اقوام کی تائید بھی درکار ہے۔

میں حتی المقدور مسلمانوں اور دیگر اقوام کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کروں گا۔ میں نے ذمہ دار رہنماؤں کے نام ایک دوستانہ اپیل شائع کی ہے۔ مجھے نہایت اضطراب کے ساتھ اس کے جواب کا انتظار ہے۔"

اس پر مدراس کے مسٹر ستیہ مورتی نے مسٹر جناح کو مبارک باد کا پیغام بھیجا۔

"میں مسٹر جناح کو مسلم لیگ کا صدر منتخب ہونے پر اول درجہ کی سیاسی اہمیت قرار دیتا ہوں۔ جناح نے ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے اشتراک عمل کے متعلق جو اپیل کی ہے اس کا میں پرجوش خیر مقدم کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ اپیل ہندوستان کے مقدس وقار کے لیے اہم ہے۔

میں مسٹر جناح کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کو فرقہ پرستی کی لعنت سے نکال کر قوم پرستی اور آزادی کی بلندی پر گامزن کرنے کے لیے میری کوششیں اور دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

یوم کشمیر

۹۔ مارچ کو مجلس احرار کے حکم پر تمام ہندوستان میں یوم کشمیر منایا گیا۔ اس دن جلوس نکالے گئے، جلسے ہوئے، اسکول اور کالجوں میں حکومت کشمیر کے خلاف مظاہرے ہوئے اور قراردادیں منظور کی گئیں۔

۱۰۔ مارچ کو چودھری غلام عباس کو ایک سال قید کی سزا دی گئی۔ ان کی جگہ سردار گوہر الرحمٰن دوسرے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے تو انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اسی طرح اللہ رکھا ساغر بھی گرفتار کر لیے گئے۔

بیت زنی کا خاتمہ

ریاست اور بیرون ریاست کی تحریک جدید کا یہ اثر ہوا کہ یوم کشمیر کے دوسرے روز حکومت کشمیر نے بیت زنی کی سزاؤں کو حکماً روک دیا۔ اور ساتھ ہی دربار کشمیر نے فرنچائز تجویز کا بھی نفاذ کر دیا۔

اس رپورٹ کے نفاذ کے لیے مندرجہ ذیل طریق کار ہوں گے۔

۱۔ سٹیٹ کونسل میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کی بجائے سات ہوگی۔

۲۔ چھ سو روپے کی غیر منقولہ جائیداد رکھنے والوں میں اڈس بورڈ والوں کو بھی شامل کر لیا گیا۔

۳۔ ۱۲ سرکاری افسروں میں سے دو کی حیثیت وزیر اسمبلی کی ہوگی۔

۴۔ چار وزیر غیر مسلم ہوں گے۔ باقی چھ سرکاری ممبروں میں سے تین مسلمان وزیر ہوں گے۔

گویا اب مسلمان ممبروں کی تعداد میں کم از کم پانچ کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس طرح پچھتر ارکان اسمبلی میں مسلمان بیس کی بجائے پینتیس ہوں گے۔

ہندوستان میں غیر ملکی حکومت بین الاقوامی حالات سے پریشان تھی اور ہندوستان اپنے اندرونی خلفشار کے باعث موت و زندگی کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ کانگریس جو اس وقت تک اپنے کو متحدہ ہندوستان کی نمائندہ سمجھ رہی تھی اشدید اختلاف میں مبتلا تھی اس کے لیڈر مہاتما گاندھی نے (جسے حکومت ہند نے گرفتاری کے تھوڑے دنوں بعد مرن برت رکھنے کے باعث قبل از میعاد اسیری رہا کر دیا تھا) اخلاقی طور پر اپنے کو قیدی تصور کرتے ہوئے کسی غیر آئینی تحریک کے شروع کرنے سے اجتناب کیا اور اگست ۱۹۳۳ء سے مارچ ۱۹۳۴ء تک کے لیے سول نافرمانی کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ بنابریں کانگریس تین دھڑوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ ایک گروہ حکومت سے لڑائی پر زور دے رہا تھا تو دوسرا انتخابات میں شریک ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ کانگریس میں شریک نیشلسٹ مسلمان ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی معیت میں کونسل اور اسمبلیوں میں جانے کے حق میں تھے۔ اور کانگریس کا دوسرا گروہ سوراج پارٹی کے عنوان سے ڈاکٹر انصاری کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ تیسرا گروپ پنڈت مدن موہن مالویہ کا تھا۔ جس نے اس بنیاد پر کانگریس سے الگ ہو کر نیشلسٹ پارٹی بنائی اور اپنے ٹکٹ پر الیکشن کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

کانگریس میں شامل مسلمانوں کے علاوہ مسلمان مسلم کانفرنس، مسلم لیگ، احرار،

جمعیتہ علمائے ہند میں تقسیم تھے۔ اچھوتوں میں دو پارٹیاں تھیں۔ ایک گاندھی کی تحریک اچھوت الدھار کی حامی تھی تو دوسری ڈاکٹر امیبت کر کی رہنمائی میں اچھوتوں کو ہندوؤں سے الگ کر کے اپنی تنظیم کر رہی تھی۔ سکھوں نے جدا یونٹی بورڈ قائم کر لیا تھا۔

اس سیاسی کشمکش میں کوئی راہ ایسی نہ تھی جس سے صاف اور واضح راستہ مل سکتا۔

تاہم اس اندھیرے میں صرف احرار واحد جماعت تھی جو اپنے متعینہ راستے پر گامزن تھی۔

چودھری عبدالعزیز کا بیان

میں نے لاہور میں حضور مہاراجہ کی خدمت میں گذارش کی تھی کہ ریاست میں ساہوکاروں کا موجودہ ہنگامہ محض آپ کے اعلان ۲۵۔ پوہ (۱۹۹۰ ب) کو منسوخ کرانا ہے اس کا جواب مجھے سرکاری طور پر ۱۶۔ مارچ کو وصول ہوا کہ حکمران کپورتھلہ اس قانون میں ترمیم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے لیکن ۱۷۔ مارچ کو اچانک مجھے کپورتھلہ جانا پڑا تو وہاں کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے پر شبہ ہوا کہ مہاراجہ صاحب اپنے متذکرہ قانون میں اس طرح ترمیم کرنے کا خیال کر رہے ہیں کہ زمینداران ریاست کو پھر محض ساہوکاروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ کل زمیندار ساہوکاروں کے حلقے میں ایسے ہی اعلان کی امید کی جا رہی تھی۔

میں ریاست کے ذمہ دار حکام کو متنبہ کرتا ہوں کہ جنوری کے اعلان پر ریاستی زمینداروں میں جو جان پیدا ہوئی تھی۔ اگر حکومت نے چند غیر ذمہ دار لوگوں کی ہنگامہ آرائی میں آ کر کوئی ایسا اقدام کیا تو یہ ریاست کے مستقبل کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔

اس کے جواب میں حکومت کپورتھلہ نے ۲۲۔ مارچ کو کہا۔

"حکومت کوئی ایسا اعلان نہیں کر رہی جس سے قانون انتقال اراضی میں ترمیم ہو۔ یہ افواہ غلط ہے۔ البتہ مہابیر دل کے قیدیوں کو رہا کر دیا جائیگا۔"

(جنوری میں حکومت کپورتھلہ کے مجوزہ اعلان کے خلاف ۲۴۔ فروری ۱۹۳۴ء کو

مہا بیر دل نے ریاست کپور تھلہ میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر رکھی تھی ۔)

مہا بیر دل کے بعد سکھ بھلا کیوں خاموش رہتے ۔انہوں نے ۲۶ ۔مارچ کو لاہور میں سکھ نیشنل کانفرنس کے اجلاس کپور تھلہ میں ذمہ دار اسمبلی کے مطالبے کی مخالفت میں ایک قرارداد منظور کی ۔اسی اجلاس میں برطانیہ کے فرقہ وارانہ فیصلے کے خلاف تحریک چلانے کے لیے ایک لاکھ سکھ والنٹیر بھرتی کرنے کا اعلان بھی کیا گیا

سکھوں کی دوسری پولیٹیکل پارٹیز خالصہ دیوان اور اکالی دل اس موقع پر خاموش رہیں ۔

کپور تھلہ مجلسِ احرار کا قیام

کام اور نام جس طرح دو مختلف حروف ہیں ۔ان کے معنی اور مطالب میں بھی امتیاز ہے ۔جن افراد نے دونوں میں گڈمڈ کرنے کی کوشش کی یا انہیں ہم وزن پایا ان کے نام کام کی طرح تاریخ سے ہمیشہ کے لیے محو رہے ۔بقائے دوام انہیں حاصل رہا جن کی مستعار زندگی نے نام سے ماورا ہو کر کام کو اپنا شعار قرار دیا ۔ایسے افراد اپنی داستانِ حیات اپنے کارناموں سے درخشاں کرتے ہیں ۔

اگر مستقبل کی تاریخ دیانت دار قلم کے ذمہ ٹھہری تو مجلسِ احرار کا کردار تاریخ کا منفرد باب ہوگا ۔اس جماعت کے رہنماؤں سے کارکنوں تک کی گفتار و کردار میں کوئی داغ نہیں جس سے زندگی کا دامن میلا ہو ۔وطنِ عزیز سے ملتِ اسلامیہ کے ہر مشکل موڑ پر یہ گروہ فاسد طاقتوں سے نبرد آزما رہا ۔

تحریک کپور تھلہ کی بنیاد انسانی حقوق کے اصولوں پر اٹھائی گئی تھی ۔گو اس تحریک کا تمام تر بوجھ مجلس احرار پر تھا لیکن نام کی جگہ چونکہ کام مقصود تھا لہٰذا اس تحریک کا تمام تر کریڈٹ سنٹرل زمیندارہ لیگ کے لیے مخصوص رہا ۔احرار رہنماؤں نے کپور تھلہ میں قیام مجلس احرار پر کبھی توجہ نہیں دی تھی اور نہ ہی اس خواہش کا کبھی اظہار کیا ۔اس کے باوجود وقت آیا کہ ریاستی عوام نے مجلس احرار کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا ۔چنانچہ ۱۲ ۔مارچ ۱۹۳۴ء کو ریاست کپور تھلہ میں احرار کا قیام عمل میں لایا گیا ۔جس کے پہلے صدر چودھری عبدالعزیز مقرر ہوئے ۔

۲۲- مارچ ۱۹۳۴ء یہ تاریخ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ایک مستقل تاریخ ہے کہ اس روز آل انڈیا مجلس احرار کے صدر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی پہلی مرتبہ قادیان پہنچے۔ اسٹیشن سے شہر تک صدر مجلس احرار کا استقبال ان لوگوں کے دلوں کا آئینہ تھا جنہیں مرزائیوں نے گزشتہ نصف صدی سے غیر قادیانی ہونے کے جرم میں پریشان کیا ہوا تھا۔

بٹالہ، گورداسپور، پٹھانکوٹ اور مضافات کے ہزارہا شہری اور دیہاتی مسلمانوں نے اپنے نجات دہندہ کا والہانہ خیر مقدم کیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن کے قادیان پہنچنے پر خوف وہراس کی اس سیاہ چادر کے چیتھڑے اڑ گئے، جو مرزائیوں نے اپنے مخالفین پر تان رکھی تھی۔ استقبالیہ ہجوم کے چہروں کی رونق غمازی کر رہی تھی کہ کفر کے ستائے ہوئے دل ایمان کی روشن قندیل سے منور ہو رہے ہیں۔

مجلس احرار زندہ باد، مرزائیت مردہ باد کے فلک شگاف نعروں نے قصرِ خلافت کو متزلزل کر دیا۔

ہندو اور سکھ تو کافر تھے لیکن مرزائی دستور نے مسلمانوں کو بھی کافر قرار دیا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ قادیان میں کاروبار بھی مرزائیوں کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ دکاندار سکھ ہو، ہندو ہو یا مسلمان ان سب کے لیے قادیانی خلیفہ بشیر الدین محمود کے حکم پر ناظر امور عامہ نے حسب ذیل معاہدۂ تجارت شائع کیا ہوا تھا۔

۱۔ قادیان کی جماعت احمدیہ نے جو معاہدہ ترقی تجارت شائع کیا ہے۔ مجھے منظور ہے۔

۲۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ ضروریاتِ جماعت احمدیہ کا خیال رکھوں گا، اور جو حکم ناظر امور عامہ دیں گے اس کی بلا چون وچراں تعمیل کروں گا۔ نیز جو ہدایات وقتاً فوقتاً جاری ہوں گی ان کی بھی پابندی کروں گا۔

۳۔ میں عہد کرتا ہوں کہ میرا جو جھگڑا احمدیوں سے ہوگا اس کے لیے امام جماعت احمدیہ (قادیان) کا فیصلہ میرے لیے حجت ہوگا۔

۴۔ میں ہر قسم کا سودا احمدیوں سے خریدوں گا۔

۵۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کی صورت میں بیس روپے سے اسی روپے تک جرمانہ
ادا کروں گا۔

۶۔ اور بیس روپے پیشگی جمع کرا دوں گا۔

۷۔ اگر میرا جمع شدہ روپیہ ضبط ہو جائے گا تو مجھے اس کی واپسی کا حق نہ ہوگا۔

۸۔ نیز میں عہد کرتا ہوں کہ احمدیوں کی مخالف مجلس میں شریک نہ ہوں گا۔

شرائط معاہدہ تجارتی لائسنس جاری کردہ ناظر امور عامہ قادیان ....

یہ تھے قادیان کے مذہبی، معاشرتی اور سیاسی حالات جن سے تنگ آ کر یہاں کے مسلمانوں نے مارچ ۱۹۳۴ء میں بٹالہ کے (حاجی عبدالرحمٰن اور حاجی عبدالغنی) رئیس کی امداد اور تعاون سے قادیان میں مجلس احرار قائم کی اور صدر مجلس احرار، جماعت کی دعوت پر قادیان پہنچے تھے۔

صدر مجلس احرار کا قادیان میں استقبال دکھی دلوں کی آواز تھی! استقبالیہ تقریب سے فراغت کے بعد قادیان کے عوام نے صدرِ احرار کو سپاسنامہ پیش کیا۔

"سپاسنامہ:۔ حضرت قبلہ عالم!

ہم اراکین مجلس احرار اسلام قادیان حضور کی خدمت اقدس میں نہایت صدقِ دل سے آپ کے ورودِ مسعود پر خوش آمدید کہتے ہیں اور خلوصِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے ہم بیکس اور ناتواں مسلمانوں کی ایسی حالت میں دستگیری کی جبکہ ہم جبر و تشدد کی چکی میں بالکل پس چکے تھے۔ ہم نے ان لوگوں (مرزائی) کے ساتھ کسی قسم کی دشمنی نہیں کی ہمارا صرف یہی گناہ ہے کہ ہم سرکارِ دو عالم کے نام لیوا ہیں۔ صرف اسی گناہ کی پاداش میں ہم ایک عرصہ سے ظلم و تشدد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

قادیان میں مسلمانوں سے سوشل بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ اِکّے دُکّے آدمی پر حملے کیے جاتے ہیں۔ شہر کی عام گزرگاہوں پر پھاٹک لگائے جاتے ہیں۔ مکان مسمار کر دیے جاتے ہیں۔

اشتہار پھاڑ دیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ مسجدوں کے گرانے سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ اختلافِ عقائد کی بنا پر قتل تک کو جائز قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حاجی محمد حسین شہید کی شہادت کا واقعہ حضور کو یاد ہو گا۔

حضرت مولانا! یہ تمام حقائق حقیقت سے برتر ہیں۔ ایسے حالات میں جب ہم اپنے انجام پر غور کرتے ہیں تو ہماری روح کانپ اٹھتی ہے حکومت بھی ان لوگوں کی منافقانہ وفاداری سے دھوکہ کھا چکی ہے۔ اور ہمارے گلے میں ان منافقانہ وفاداری کے حصے میں مزید غلامی کا طوق ڈالا جا رہا ہے اور حکومت بھی کوئی نوٹس نہیں لیتی۔ جناب کی خدمت میں سچ عرض کرتے ہیں کہ ہم قادیان میں برطانوی حکومت نہیں سمجھتے بلکہ ہم پر قادیانی جماعت کی حکمرانی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قادیان میں برطانوی حکومت کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ اس لیے ہم لوگوں پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ قادیان سے غیر احمدیوں کو کان سے پکڑ کر نکال دینا ہر روز کا مشغلہ ہے۔ جرمانوں اور بیت زنی کی سزا دی جاتی ہے قتل تک ہضم کر لیے جاتے ہیں۔ چنانچہ تھوڑا عرصہ گزرا کہ محمد امین مجاہد کو دن دہاڑے قتل کیا گیا اور قاتل اقبال جرم کرتا ہے۔ مگر کوئی مقدمہ نہیں چلتا۔

باقاعدہ امور عامہ، امور داخلہ، امور خارجہ مقرر ہیں۔ خانہ ساز ہائیکورٹ اور اس کے ماتحت لوئر کورٹ موجود ہے۔ خصوصیت سے مسلمانوں کے متعلق ان کی پالیسی یہ ہے کہ مسلمانوں کو قادیان سے نکال دیا جائے۔ ان کا مذہبی عقیدہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ سمال ٹاؤن قادیان کے موجودہ پریذیڈنٹ کا عدالت میں بیان ہوا۔ اور اس نے الاعلان کہا کہ قادیان کے غیر احمدیوں کے لیے صرف دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو محمد رسول اللہ صلعم کے دامن اقدس کو چھوڑ کر قادیانی ہو جائیں یا قادیان سے نکل جائیں۔

آپ ہی فرمائیں کہ جب حکومت کا یہ وطیرہ ہو کہ وہ خود اپنے نظام کو درہم

برہم ہوتا دیکھ کر کوئی حرکت نہ کرے اور ہمارے متعلق مخالف جماعت کی یہ جدوجہد ہو کہ مسلمانوں کو قادیان سے نکال دیا جائے تو ایسی صورت میں ہمارا نیست و نابود ہو جانا یقینی ہے۔

بس ہمارا رہ سہہ کر آخری سہارا خداوند عالم ہے کہ جس نے آپ جیسی بزرگ اور مقدس ہستیوں کو ہم مصیبت زدہ مسلمانوں کی امداد پر آمادہ کر دیا۔ ہمارے جسم کا ذرہ ذرہ آپ اور آپ کی جماعت کے لیے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی مقدس جماعت کو بیش از بیش خدمت اسلام سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

صدر مجلس احرار! ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل میں مقامی دفتر کا انتظام مولانا عنایت اللہ چشتی کے سپرد کر دیا ہے۔ ہر روز قرآن کریم کا درس ہوتا ہے۔ حاجی عبدالرحمٰن رئیس بٹالہ اور ان کے رفقاء کے لیے بھی دعا فرمائیں کہ انہوں نے مقامی مجلس کے قیام میں ہر ممکن امداد فرمائی۔

آخر میں پھر حضور کی خدمت میں صدق دل سے مبارک باد عرض کرتے ہیں اور آپ کے ورودِ مسعود پر خوش آمدید کہتے ہیں۔

ہم ہیں آپ کے ناچیز خدام

اراکین مجلس احرار اسلام قادیان"

جواب سپاسنامہ

صدرِ مرکزیہ نے سپاسنامے کے جواب میں کہا "یہ سپاسنامہ مجلسِ احرار کی طرف سے نہیں بلکہ کسی سرکار پرست جماعت کی طرف سے معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ احرار اور اس بزدلی کا مظاہرہ؟ سنو! اور کان کھول کر سنو! احرار دنیا میں مٹنے کے لیے نہیں بلکہ ظلم اور سرکشی کو مٹانے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ پس احرار کا دنیا میں ایک ہی کام ہے کہ حق بات کہیں اور اس کی پاداش میں مٹ جائیں۔ اس فنا کے بعد بقا کا جدید دور شروع ہوتا ہے۔ احرار کے لیے فنا کے درجہ میں بقا کا راز مضمر ہے۔

مرزائیو! تم نبوت کی بحث کس سے کرتے ہو، جو سرے سے مرزا غلام احمد کو مسلمان ہی نہیں سمجھتا۔ آؤ! تم کو مدنی نبوت کا حال سناؤں کہ ریگستان کے لق و دق صحرا میں، تنہا بے چارگی کے عالم میں علم توحید بلند کرتا ہے۔ اپنے پرائے دشمن ہو گئے۔ قتل کے منصوبے کیے گئے۔ وطن سے نکلنا پڑا۔ اس پر بھی کفار مکہ سے کسی قسم کی درخواست نہیں کی۔ کفار آئے اور انہوں نے صرف اس قدر کہا کہ آپ ہمارے بتوں کو برا نہ کہیں ہم تمہارے خدا کو برا نہیں کہتے۔ اگر کوئی قادیان کا نبی ہوتا تو کہتا کہ صورت بہت اچھی ہے چلو مان جاؤ۔ مگر سرکارِ دو عالم نے فرمایا۔ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھ دیا جائے۔ پھر بھی علائے کلمۃ الحق سے باز نہیں آؤں گا۔

یہ ہے شانِ نبوت۔ تم ہی بتلاؤ کہ قادیان کی نوزائیدہ نبوت۔ پولیس کے بغیر کبھی دو قدم بھی چلی ہے۔ ایک دن بتلاؤ کہ فلاں دن قادیان کی نبوت انگریزی سہارے کے بغیر ایک قدم چلی ہو۔ پس یہ نبوت تو پولیس کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے وہ نبی بنا دے۔

یاد رکھو کہ سچا جب کمزور ہوتا ہے تو وہ اپنی بہادری اور شجاعت کا عظیم الشان مظاہرہ کرتا ہے اور جب طاقتور ہوتا ہے تو اپنے دشمنوں تک کے لیے رحیم ہوتا ہے۔

میں نے آج اخبار میں پڑھا ہے کہ محمود نے اپنے خطبے میں کہا ہے کہ اب انگریز بھی ہم سے ناراض ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب خدا ہی تم سے ناراض ہے تو انگریز اگر ناراض ہو گیا تو کوئی تعجب نہیں۔ کیونکہ خدا کبھی کبھی دین کی حمایت کفار سے کرا لیتا ہے۔ البتہ جب خداوندانِ لندن ناراض ہو گئے۔ تو وحی کون بھیجے گا۔

میں قادیان کے مسلمانوں کو پھر کہتا ہوں کہ جرأت اور بہادری سے خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے پر امن طور پر علم توحید بلند رکھیں۔ میں خوش ہوؤں گا کہ

میں قادیان کے مسلمانوں کو یقین دلانے آیا ہوں کہ حکومت بے شک اپنے منافق اور وفادار ٹولے کو پستول، ریوالور اور دوسری قسم کے ہتھیار ہمارے سینوں کو چھلنی کرنے کے لیے دے۔ اس کی مطلق پرواہ نہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آج ہمارے سینے ان نشانوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں تو آنے والا کل ان گولیوں کا منہ دوسری طرف پھیر دے گا۔ منافقت ایک عرصہ تک چھپائی جا سکتی ہے، لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں۔

مرزائی، اسلام میں ایک فتنہ کھڑا کیا گیا ہے۔

قادیان کے مسلمانو! تمہارا فرض ہے کہ اس فتنے کو جس قدر جلد مٹا سکتے ہو، مٹا دو۔ اور اس کے عوض تمہارے سر پھوڑ دیے جائیں چاہے تمہیں گولی کا نشانہ بنایا جائے اور بے تابانہ موت سے بغلگیر ہو جاؤ۔ خدا کی قسم میں اس وقت کا منتظر ہوں کہ قادیان کی گلیوں میں احرار رضا کاروں کے خون کی نہریں چلیں تو میں سمجھوں گا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اگر میں یا میرے رفقا اس مشن کو پورا کرتے ہوئے محمود کے حواریوں کے ہاتھوں قادیان میں قتل ہو جائیں تو یہ سودا مہنگا نہیں۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اس کفر کے ہاتھ سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

سید غریب شاہ کو مرزائیوں نے مارا ہے تو میں سمجھا کہ انہوں نے شہید کے لال کو پیٹا ہے۔ اب ان کی موت آ گئی۔ یہ غریب شاہ کی مار کا نتیجہ ہے کہ آج حبیب الرحمٰن تم کو قادیان میں دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک اور احرار والنٹیر کو قتل کر دیا جائے تو پھر انشاء اللہ قادیان میں ہماری حکومت ہوگی۔

قادیان کے مسلمانوں کو محمود کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ اس نے مباہلہ بلڈنگ جلائی۔ حاجی محمد حسین کو شہید کیا۔ غریب شاہ کو پیٹا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یہ دن تم کو نصیب نہ ہوتا۔

اس کے صلے میں تمہیں قتل کیا جائے۔ ہمارا جب کوئی والنٹیر شہید ہوتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ کام کے لیے راستہ کھل گیا ہے۔ شہید الٰہی بخش کو جب کشمیر کے محاذ پر برچھا لگا تو اس نے زور سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا نعرہ مارا

میں چاہتا ہوں کہ تم میں بھی شہید الٰہی بخش جیسا جذبہ پیدا ہو جائے۔

قادیان میں مجلس احرار کی شاخ قائم ہو چکی ہے۔ اس کی دل کھول کر امداد کریں۔ پرائمری سکول کھولیں، تعلیم قرآن کے لیے درسگاہ کی ضرورت ہے

ابتداء میں جب مجلس احرار قادیان میں قائم کی گئی تو محمود نے کہا قادیان میں احرار کا کوئی دفتر نہیں لیکن الحمد للہ کہ آج قادیان میں مجلس احرار کا دفتر موجود ہے۔

میں نے سنا ہے کہ یہ جلسہ سکھوں کی زمین پر ہو رہا ہے جس پر ہم نے اذان دے کر نماز جمعہ ادا کی، حالانکہ میں اسلام کی رو سے سکھوں کو کافر سمجھتا ہوں۔ کافروں نے تو اپنی دریا دلی کا ثبوت دیا ہے مگر نبوت کے دعویداروں کو یہ توفیق نصیب نہ ہوئی۔

میں آخر میں حکومت کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنے دناداروں کو قانون شکنی سے فوراً روک دے۔ ان کی ڈنڈا فورس کو توڑ دے۔ میں حیران ہوں کہ ہمارے لیے تو چھڑی تک رکھنا جرم ہے۔ مگر قادیان میں ڈنڈا فورس غنڈوں کی طرح دندناتی پھرتی ہے۔

اگر قانون شکنی جائز ہے اور حکومت خود کو قانون شکنی پر مجبور کرنا چاہتی ہے تو اسے گذشتہ واقعات کو یاد رکھنا چاہیے۔ کہ اس کی ایسی ہی روش نے دار و رسن کو بوسہ دینے والے لاکھوں انسان پیدا کر دیے تھے۔ ہزاروں نے اپنے سینوں کو گولیوں کا نشانہ بنوایا تھا۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو اس کا نتیجہ خطرناک ہوگا۔ جس کی ذمہ داری حکومت پر ہوگی۔

تقریر ختم کرنے سے پہلے میں ایک بار پھر حکومت سے کہوں گا کہ

ہم قادیان میں کسی طرح کی بدامنی پیدا کرنی نہیں چاہتے۔ بلکہ احسن طریقہ پر
پر تبلیغ کریں گے۔ مجلس احرار کشمیر اور کپور تھلہ کی تحریکات میں اس قدر مصروف
ہے کہ اسے دوسری فرصت نہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اگر کوئی
ہم سے الجھنا چاہے تو ہم میدان سے بھاگ جائیں گے۔ ہم میدان سے بھاگنے
والے نہیں۔"

تقریر کے بعد ایک مرزائی نے مولانا کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا اور
دعا کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

قادیان اور مرزا غلام احمد

بعض دفعہ مکین کے چلن سے مکان بھی رسوا ہو جاتا ہے۔
پھر اس کی صفائی پر صدیاں گذر جاتی ہیں۔ مرزا غلام احمد،
اس کی جسمانی اور روحانی اولاد نے اپنے اخلاق، مذہب اور سیاسی کردار سے زمینِ
قادیان کو بھی ناپاک کر دیا ہے، ورنہ زمین خالقِ کائنات کا بچھایا ہوا دامن ہے جس پر
اس کی مخلوق آباد ہے۔ یہ دامن انسانوں کے لیے نہ تنگ ہو سکتا ہے نہ داغدار۔

قادیان ضلع گورداسپور کا معروف قصبہ دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے۔
شہنشاہ بابر جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس کی فوج میں ہادی بیگ نام کا ایک
سپاہی تھا۔ مغل حکومت نے اس کے لڑکے کو بیاس کے علاقہ میں قاضی مقرر کیا تو اس
نے یہاں قاضیاں کے نام سے ایک بستی آباد کی۔ جو بعد میں قادیان کے نام سے معروف
ہوئی۔ مرزا غلام احمد اسی بستی کا رہنے والا تھا جس نے آگے چل کر اسلام کے قلعے کو گرانے
میں عیسائی حکومت سے بھرپور تعاون کیا۔ اور ملت اسلامیہ کی بیخ کنی کے لیے وطنِ عزیز
سے بھی غداری کی۔ یہ شخص (مرزا غلام احمد) ۱۸۳۵ء میں قادیاں میں مرزا غلام مرتضٰے کے
ہاں پیدا ہوا۔ اور ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو لاہور میں ہیضہ کی موت مرا۔ اس کے سابقہ خاندان
اور موجودہ نسل نے مسلمانوں کے مقابل سکھ حکمران (رنجیت سنگھ) کی امداد کی اور ۱۸۵۷ء
کی جنگِ آزادی میں انگریز سے بھرپور اشتراکِ عمل کر کے ہندوستان کو نقصان پہنچایا
اور جاگیریں حاصل کیں۔

بنگال کے میر جعفر، دکن کے صادق اور پنجاب کے مرزا غلام احمد قادیانی انگریز اقتدار میں غداروں کے سرغنہ قرار دیے جا چکے ہیں۔ برصغیر کی آئندہ نسلیں انہیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔

آل انڈیا کشمیر ایسوسی ایشن

قادیان میں مجلس احرار کے داخلے پر مرزائیت کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ انہیں کسی طرح یقین نہیں تھا کہ احرار قادیان کا حصار توڑ سکیں گے۔ اور ان کے ظلم و جور کی داستان بدبو کی طرح پھیل جائے گی۔ لیکن ایسا ہو چکا تھا۔ کشمیر، الور اور ریاست کپور تھلہ کے بعد مرزائی ریاست پر احرار کی یلغار نے سرکار پرست عناصر کو مرزائی سمیت نئی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ کشمیر کے حالات مجلس احرار کی مداخلت سے ہندوستان کے مسلمان کو از سر نو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے کہ کشمیر کمیٹی کی باسی کڑہی میں ابال آیا۔ لاہور کے لورین ہوٹل میں ۲۵۔ مارچ ۱۹۳۴ء کو ایک اہم اجلاس منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل حضرات نے شرکت کی۔

۱۔ عبدالمجید سالک۔ ۲۔ غلام رسول مہر (مدیران انقلاب) ۳۔ شیخ نیاز علی ایڈووکیٹ لاہور۔ ۴۔ پروفیسر علم الدین سالک لاہور ۵۔ منشی محمد دین فوق لاہور۔ ۶۔ چودھری اسد اللہ ایڈووکیٹ لاہور (سر ظفر اللہ کا حقیقی بھائی)۔ ۷۔ سید عبدالقادر ایم۔ اے۔ ۸۔ جلال الدین شمسی (مرزائی)۔

اس کمیٹی کا دوسرا اجلاس ۲۸۔ مارچ کو پھر اسی ہوٹل میں ہوا۔ جس میں کمیٹی ہذا کا صدر مرزا بشیر الدین محمود کو منتخب کیا گیا۔

اس اجلاس میں سابقہ ممبران کے علاوہ سید حبیب مدیر روزنامہ "سیاست" بھی شریک ہوئے۔ آخر میں ایک مختصر سی قرارداد[2] منظور کی گئی۔

۱۔ "آل انڈیا کشمیر کمیٹی کو اپنا کام دوبارہ شروع کر دینا چاہیے۔

۲۔ محض اس لیے کہ اس کشمیر کمیٹی اور ڈاکٹر سر اقبال کی کشمیر کمیٹی میں امتیاز ہو سکے۔ کمیٹی ہذا کا نام آل انڈیا کشمیر ایسوسی ایشن تجویز کیا جاتا ہے۔"

---

[1] ان کے والد ملک غلام قادر مرزائی تھے۔ [2] (بحوالہ روزنامہ انقلاب لاہور۔ یکم اپریل ۱۹۳۴ء)

۲۵۔ مارچ کو مسلم اخبارات میں سرینگر سے شیخ عبداللہ کا ایک بیان شائع ہوا۔
"میرے متعلق غیر مسلم اخبارات نے عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے
کہ خدانخواستہ میں نے زعمائے احرار سے اپنا تعلق منقطع کر لیا ہے۔ اور
کسی قادیانی جماعت سے وابستہ ہوگیا ہوں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔
البتہ میرا شروع سے اصول رہا ہے کہ میں کشمیری قوم کی کامیابی کیلئے
بیرونی امداد کی بجائے خود اہل کشمیر کے باہمی تعاون اور ان کی اپنی
مسلسل سعی کو بہتر سمجھتا ہوں اور اس طرح جو لوگ کشمیریوں کی امداد
کریں وہ ہمیشہ میرے شکریہ کے مستحق ٹھہرے ہیں۔
مجلس احرار کے متعلق غیر مسلم اخبارات نے جو غلط فہمی پیدا کرنے کی
مذموم کوشش کی ہے۔ وہ کوئی نئی چیز نہیں۔ ہندو اخبارات کی ہمیشہ
سے یہی عادت چلی آرہی ہے۔
زعمائے احرار کے متعلق میں کئی دفعہ اعلان کر چکا ہوں کہ موجودہ
زمانہ میں وہ مجاہدین اسلام کے صف اول کے مخصوص سپاہی ہیں۔ اور
تحریک حریت کشمیر میں ان کی قربانیوں کی نظیر نہیں ملتی۔ باقی رہے
کشمیر کمیٹی کے ارکان تو میں ان کا بھی ممنون ہوں۔

مسلم لیگ کی تجویز

اقتدار کا جادو واقعات کو ایسے سانچے میں ڈھالتا ہے کہ
خرد بھی محیط ہو کر رہ جاتی ہے۔ برطانیہ کے فرقہ وارانہ اعلان
نے ہندوستان کو عجیب بھول بھلیوں میں ڈال دیا کہ جو ہاتھ برطانوی گریبانوں تک
پہنچنے چاہیں تھے اپنی بوٹیاں نوچنے لگ گئے۔
ایک سال بیت گیا مگر پانی کسی پل کے نیچے سے نہ گزر سکا۔ غلط کو غلط کہنے
میں وقت کا صحیح حصہ خواہ مخواہ صرف کر دیا۔ اس موقع پر مسٹر محمد علی جناح کی رائے
مجلس احرار سے الگ نہ رہ سکی۔ ۲ اپریل ۱۹۳۴ء کو انہوں نے مسلم لیگ کونسل
کے اجلاس دہلی میں ایک تقریر کے دوران کہا۔

"وائٹ پیپر کی وضاحت کے لیے کسی استدلال یا منطق کی ضرورت نہیں بلکہ وائٹ پیپر کی کسی تجاویز کا ایک سرسری مطالعہ ہی کافی ہے اور اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

اس سلسلہ میں بعض حضرات کی یہ رائے ہے کہ یہ بہت بڑی سکیم ہم پر مسلط ہونے والی ہے۔ میں پیشتر ازیں اس اسکیم پر اپنی رائے ظاہر کر چکا ہوں۔ اس وقت اہم ترین سوال صرف یہ ہے کہ اس اسکیم کو مسلط ہونے سے ہندوستان کو کیسے بچایا جائے۔ اس کا واحد علاج یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان آپس میں متحد ہو جائیں۔ اس وقت ہندوستان کو ایک متحدہ احول کی ضرورت ہے۔ کیا اس نازک مرحلے پر بھی ہم اس قابل نہیں کہ مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ اختلاف کو بھول جائیں اور اس چیز کی مخالفت کے لیے آمادہ ہو جائیں جو لندن اور دہلی میں تیار کی جا رہی ہے۔

یہ لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ آپس میں متحد ہو جائیں۔ مجھے اس بات کے علاوہ اور کسی بات پر مسرت نہیں ہوگی کہ ہندو اور مسلمانوں میں کامل اتحاد اور تعاون ہو جائے۔

ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ مسلمان میری تائید کریں گے۔ میں جب سے انگلستان سے واپس آیا ہوں۔ مجھے اس بات پر کامل یقین ہو چکا ہے کہ ہندو اور مسلمان ملک کی بھلائی کے لیے اور موجودہ سیاسی ارتعاع پر غور کریں گے۔ مسلمان صرف اس وجہ سے فرقہ وارانہ اعلان پر زور دے رہے ہیں کہ انہیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ ملک کی طرف سے جو قومی مطالبہ پیش کیا جائے اس میں کم از کم مسلمانوں کا تحفظ ضرور شامل ہو

ذمہ دار حکومت کے مطالبے میں مسلمان کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں لہٰذا اس وقت اہم ترین سوال یہ ہے کہ آیا ہم مسلمانوں کو یہ یقین دلا سکتے ہیں کہ جن تحفظات پر اس وقت زور دیا جا رہا ہے وہ ہندوستان کے

آئندہ دستور میں شامل ہوں گے!“

اس کے بعد مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

”جب تک مختلف اقوام کی طرف سے کوئی متفق تجویز پیش نہ کی جائے۔ اس وقت تک فرقہ وارانہ اعلان قبول کر لیا جائے۔ اس بنا پر ہندوستان کے لیے ایک قابل قبول دستور حاصل کرنے کے لیے ملک کی دیگر اقوام اور پارٹیوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔“

مسٹر جناح کی اس تقریر کے فوراً بعد ۳۔اپریل کو نیو دہلی میں ہندو، سکھ اور مسلمان رہنماؤں کا ایک مشترک اجلاس ہوا۔ جس میں مولانا شوکت علی، پنڈت مدن موہن مالوی بھائی پرمانند اور سردار سنت سنگھ شامل ہوئے۔ اس اجلاس میں مسٹر جناح کی کونسل لیگ کے اجلاس کی تقریر زیر بحث آئی۔ لیکن یہ اجلاس بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو گیا۔ اسی روز نیو دہلی میں نیشلسٹ مسلمان اور دوسرے خیال کے ذمہ دار لوگ مسٹر جناح کی قیام گاہ پر سیاسی مشوروں کے لیے ان سے ملے۔ جن میں آصف علی ایڈوکیٹ، مسٹر ستیہ مورتی اور مسٹر زیمان نمایاں تھے۔

مسجد میں سؤر کا گوشت

خیر اور شر ایک ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں
فتح کس کی ہوتی ہے یہ آخرت کی بات ہے۔

ہندوستانی رہنما ایک طرف ملکی فلاح کی تلاش میں تھے تو دوسری طرف ہندوستان کی دائمی غلامی کے اسباب پیدا کرنے والے بھی موجود تھے۔ انہی دنوں جب ہندوستان اپنے روشن مستقبل کی تلاش میں تھا۔ روہتک مجلس احرار کے جنرل سیکرٹری چودھری عبدالغنی نے لاہور مرکزی دفتر کو اطلاع دی۔

”۳۔اپریل کو روہتک کے بعض ہندوؤں نے ریاست جیند کی جامع مسجد میں سؤر کا گوشت پھینک دیا ہے۔ اس واقعے سے علاقے کے مسلمانوں کے جذبات بری طرح مجروح ہوئے ہیں۔ وہ عیدالاضحیٰ کی نماز بھی ادا نہ کر سکے۔ اور نہ ہی انہوں نے قربانی کی۔

ہندوؤں کی اس حرکت پر مسلمانانِ روہتک کا ایک بڑا اجتماع ہوا۔ جس میں ہندوؤں کے اس فعل کی مذمت کی گئی۔

مجلس احرار کے علاوہ اس تار کی ایک نقل گورنر پنجاب کو بھی بھیج رہا ہوں۔"

"عبد الغنی"

کپورتھلہ میں احرار کانفرنس

ریاست جیند کے بعد کپورتھلہ میں مہاریر دل کی تحریک سکھوں کی ہنگامہ آرائی اور کشمیر کے واقعات میں آئے دن کا اضافہ اس کا غماز تھا کہ ریاستوں کے حکمران انگریز کی شہہ پر ایسی حرکتیں کر رہے ہیں، جن کے باعث برطانوی ہند کے رہنما کسی بہتر فارمولا کی تلاش میں ناکام رہیں۔ اس ماحول میں مجلس احرار نے اوّلاً کپورتھلہ میں براہِ راست دخیل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اور ۳-۴ اپریل ۱۹۳۴ء کو ریاست کے مرکزی شہر کپورتھلہ میں کانفرنس منعقد کی۔ اس کے صدر مولانا مظہر علی اظہر منتخب ہوئے اور استقبالیہ کا خطبہ چودھری عبد العزیز نے پڑھا۔

خطبہ استقبالیہ:۔ "ریاست کپورتھلہ کے موجودہ شاہی اقتدار کو تقریباً دو صدی کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اس دوران مسلمان ریاست کے وفادار رہے اور مسلمانوں کے اس طرز عمل نے ریاست میں بین الاقوامی سطح کی نہایت عمدہ مثال پیدا کر دی تھی۔ لیکن گذشتہ بیس پچیس برس سے بعض خود غرض اور تنگ نظر غیر مسلم افراد نے ایسا طریقہ اختیار کیا جس نے ریاست میں غلط اثرات چھوڑے۔ فرقہ پرستی کے اس طوفان میں مسلمانوں کے حقوق نہایت بری طرح پامال ہوئے۔ بے روزگاری نے مسلمانوں کو ساہوکاروں کی حلقہ بگوشی پر مجبور کر دیا۔ اس طرح حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ آخر حساس مسلمانوں نے اس مصیبت کی روک تھام کی کوشش کی۔ لیکن کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ ۱۹۳۱ء میں رقت انگیز حالات سے مجبور ہو کر بقائے حیات کے جذبات نے زمیندارہ لیگ کی صورت اختیار کر لی۔

حکومتِ ریاست نے ۲۵۔ پوہ ۱۹۸۹ بکرمی کو قانونِ انتقال اراضی کو

غیر مکمل شکل میں نافذ کر دیا۔ جس سے ہمیں قدرِ تحفظ کی صورت نظر آنے لگی۔ لیکن حکومت نے اپنی اقلیت نوازی کی حکمتِ عملی کے ذریعے سرمایہ دار اقلیت کے اقتدار کی ضرورت محسوس کی۔ آخر انجمن رضاکاران اسلام نے مسلمانان ریاست کے غصب شدہ حقوق واپس دلانے کی کوشش شروع کی اور حکومت کی توجہ دلائی۔ مگر حکومت کی مایوس کن اور مستقل خاموشی سے تنگ آکر ایک عرضداشت کے ذریعے ریاست کی اقلیت واکثریت میں نمائندگی کے تناسبی جواز کو واضح صورت میں پیش کیا۔ اس پر بھی حکومت کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ آخر زندگی کے لیے جدوجہد کو ضروری سمجھا گیا۔"

"ریاست کپورتھلہ میں زمیندار اور مزدور عرصہ سے شکوہ شکایت کیے بغیر ریاست اور ساہوکاروں کے تمام بوجھ سہتے چلے آرہے ہیں جب تک وہ گذارہ مالیہ اور قرضہ ادا کرنے کے قابل تھے ادا کرتے رہے۔ اس طرح بہت سی جائیدادیں بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئیں۔

سرچارلس رواٹز نے ستاون برس کا عرصہ ہوا۔ قرضہ کی ادائیگی میں اراضی کا نیلام روکنے کا قانون نافذ کیا تھا۔ لیکن سوائے اس کے دیوان عزیز بخش مرحوم نے دو مقدمات پر اس قانون کا عمل کیا۔

دو لپشت تک وہ قانون طاق پر پڑا رہا اور عدالتوں تک نے اس کی تعمیل کرنا اپنا فرض نہ سمجھا۔ اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد اب پھر زمینوں کو قرضہ میں نیلام ہونے سے بچانا نامناسب سمجھا گیا ہے۔ لیکن ساہوکار لوگ جو سوسائٹی کا خون چوسنے کے عادی ہیں وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی تمام دولت صرف ہمارے قبضے میں آجائے زمینیں نیلام ہوں، مکان رہن رہیں، مویشی بک جائیں اور غریب مزدور اور زمیندار بے گھر ہو جائیں۔ کون ہے جو ان سانپوں کو دودھ پلانے والوں کو سمجھائے کہ انسانوں کو زندہ رہنے دینا بھی دھرم اور ایمان کا ایک جزو ہے۔

راج کپورتھلہ کی طرف سے جہاں اراضی کے نیلام کو روکنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہاں ۲۷۔ چیت ۱۹۹۰ بکرمی کے حکم کی رو سے قرار دیا گیا ہے کہ جن قرضوں کی زمین کی متاثیری نہ ہو سکے گی ان کے قرضوں کی قسطیں مقرر کی جائیں گیں۔ اگر کوئی نادار زراعت پیشہ شخص، جس کی زمین کی آمدنی اس کے گھرانے کے گذارے کے لیے بمشکل کافی ہو اور وہ قسط ادا نہ کر سکے تو ریاست اس کا قرضہ کو ادا کرے گی۔ اور ۲۰ سال کے اندر اندر یہ رقم بطور تقاوی مقروض لوگوں سے وصول کی جائے گی۔

قسطوں پر چھ روپے فیصد سالانہ سود بھی ہوگا۔ البتہ تقاوی کی رقم پر سود نہ ہوگا۔ لیکن پیشتر اس کے حکومت یہ امید رکھے کہ کوئی نادار زراعت پیشہ شخص کوئی قسط یا تقاوی کی کوئی رقم ادا کرے حکومت کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جب اس کی زمین کی پیداوار اس کے گھرانے کے گذارے کے لیے ناکافی ہے تو وہ فالتو رقم کہاں سے لائے گا، جو ساہوکار اور سرکار کو ادا کر سکے۔ جب تک حکومت اس کا انتظام نہ کرے کہ زمیندار زمین کی پیداوار کے علاوہ اور بھی کوئی ذریعہ آمدنی اختیار کر سکے چوری، دغا بازی اور ڈاکہ وغیرہ کے علاوہ رقموں کے دینے کی وہ اور کون سی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ ان حالات میں حکومت کے لیے زیبا نہیں کہ وہ اپنی فلاکت زدہ رعایا کو گناہ و جرم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے۔

ہر شخص کے لیے رہنے کو مکان، پہننے کو کپڑا اور کھانے کے لیے روٹی کی ضرورت ہے۔ اگر ان کے مکانات نیلام کیے جائیں تو حکومت کا فرض ہے کہ ان کے رہنے کی جگہ مہیا کرے۔ اگر زمین ان کے قبضے سے نکال کر ان کو بیکار اور بیروزگار کر دیا جائے، تو پھر ان کے لیے روزگار کی کوئی دوسری سبیل پیدا کرے ورنہ لازمی ہے کہ ایسے قوانین نافذ کیے جائیں جن کی رو سے سکونت اور اغراضِ کاشت کے لیے جن مکانوں کی ضرورت ہے انہیں قرقی اور نیلام سے مستثنیٰ

قرار دیا جائے۔ اور زمینوں کو بھی زمیندار کے ہاتھ سے نکلنے سے بچایا جائے۔
لیکن مقروض اور مفلس کاشتکاروں اور مزدوروں کی امداد کے لیے جو قوانین وضع کیے جائیں وہ انہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ اگر ان قوانین کو نافذ کرنے والے عہدیدار اور عدالتیں ان کی ہمدرد نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ سر چارلس لوائمز کے نافذ کردہ قانون کے باوجود پچاس برس کے عرصہ میں دو مرتبہ زمین کی تشخیص کی گئی اور اس طویل عرصہ میں عدالتیں اور دیگر حکام اس قانون کی اہمیت سے انکاری رہے۔ اس طرح حال کے نافذ شدہ قوانین کچھ مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔ اگر ہمدرد اہلکاران کے لیے موجود نہ ہوں۔ زمیندار اور بالخصوص مسلمان طبقے کو عرصہ سے یہ شکایت ہے کہ ملازمت میں ان کو مناسب حصہ نہیں ملتا۔ جبکہ مسلمانوں کی آبادی ریاست میں ۵۶ فی صد سے زائد ہے۔ لیکن ملازمتوں میں ایک تہائی نظر آتے ہیں۔ اور تنخواہوں کے حساب سے دیکھا جائے تو ان کا حصہ اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اعلیٰ ملازمتوں میں انہیں بہت کم حصہ مل رہا ہے۔

اندریں حالات نافذ شدہ قوانین کے اجراء کی کافی امید نہیں ہو سکتی۔ دیگر محکموں کے علاوہ فوج میں خاص کر مسلمانوں کی تعداد قلیل ہے۔ جگجیت جنرل اور اس کے محکمہ میں ایک سو چورانوے مسلمان اور چار سو انیس غیر مسلم ہیں۔ جیت انفنٹری اور اس کے محکمہ میں چوالیس مسلمان اور ایک سو انتیس غیر مسلم ہیں۔ اسی طرح دوسرے سرکاری محکموں کا حال ہے جن پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

ریاست کی طرف سے جو وظیفے سالانہ غیر مسلم اقوام کو دیے جاتے ہیں ان کا مقابلہ ان وظیفوں سے کیا جائے جو مسلمان طلباء کو دیے جاتے تو معلوم ہوگا کہ جہاں غیر مسلموں کو ان کی اراضیات پر آمدنی کے علاوہ جن سے کوئی لگان وصول نہیں کیا جاتا۔ سال میں قریباً ستر ہزار روپیہ عطا کیا جاتا

ہے۔ وہاں مسلمانوں کے لیے صرف ساڑھے آٹھ ہزار کی رقم مقرر کی گئی ہے یہ فرق اتنا زیادہ ہے کہ اس کے لیے کوئی وجہ جواز پیدا نہیں کی جا سکتی۔ ان حالات میں ریاست کے ارباب لسبت وکشاد کا فرض ہے کہ وہ اس تفاوت کو کم کرنے اور مسلمانوں کو ان کا مناسب حصہ دینے کی طرف توجہ دیں

ریاست کے ان امور کی طرف توجہ دلانا ہی کافی نہیں ہو سکتا۔ وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ نظام حکومت کی بنا ایسی ہو، جو عوام الناس کو مطمئن کر سکے۔ ورنہ دنیا کی تمام مصیبتوں کا حل کسی زمانہ میں خواہ کیسا ہی اچھا کیوں نہ ہو ممکن نہیں۔ لیکن موجودہ دور میں یہ ضروری ہے کہ نظام حکومت میں لوگوں کا دخل ہو۔ اور ان کی رائے سے حکومت کا کام ہو تو وہ اپنی ذمہ داری کو زیادہ سے زیادہ محسوس کرنے لگیں گے۔

ان کے بعد کانفرنس کے منتخب صدر مولانا مظہر علی اظہر نے خطبہ صدارت پڑھا۔

خطبہ صدارت: حضرات! جب میں نے گذشتہ دسمبر میں حکومت کپور تھلہ کا یہ اعلان پڑھا کہ ریاست کا آئندہ نظام ایک اسمبلی کے سپرد ہو گا تو مجھے یک گونہ مسرت ہوئی کہ ہمارے ملک کے ایک گوشے سے تو یہ آواز اٹھی جس میں کچھ امید کی جھلک ہے۔ کہنے والوں نے اسی وقت کہا تھا کہ بات تو اچھی ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس پر عمل ہوتا ہے یا نہیں۔

ریاست کے مسلمانوں نے تو حق رائے دہی کے ساتھ غیر مشروط انتخاب پر لبیک کہا لیکن بے حد افسوس ہے کہ ہندو اور سکھ جو تمام ہندوستان میں قوم پرستی کے دعویدار بنے پھرتے ہیں ریاست کپور تھلہ کے اس قوم پروارانہ پیش کش کو قبول نہ کیا۔ اور ایسی ایسی ترمیمات اس میں پیش کیں کہ جن سے ان کے مقاصد ہی فوت ہو کے رہ جاتے ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ اگر نامزدگیوں کے ذریعے اسمبلی کو بے کار بنانے کی کوشش نہ کی گئی اور منتخب ممبران میں سے وزرا مقرر کر کے

مختلف محکموں کا نظم و نسق ان کے سپرد کیا گیا۔ اور اسمبلی کو ذمہ دار حیثیت دی گئی اور وزراء کو بھی ذمہ دار قرار دیا گیا تو مسلمان مجوزہ آئین کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ لیکن اگر بعض ہندو اور سکھوں کی باتوں میں آکر حق رائے دہی کے طریقہ انتخاب میں تبدیلی کی گئی اور مسلمانوں کو اسمبلی میں اقلیت یا مساوات تک لانے کی کوشش کی گئی تو حکومت انہیں ترک تعاون پر مجبور پائے گی۔ اور ایسے حالات میں تمام تر ذمہ داری ریاستی حکام پر ہوگی۔ یہاں میں یہ بات بھی کہہ دوں کہ مسلمان تو ذمہ دار اسمبلی کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن ہندو اور سکھ انگریز چیف منسٹر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ انگریز چیف منسٹر کا تقرر کوئی ایسا مہرہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ جو دنیا کے دکھوں کا علاج ہو۔ اسے خود برطانوی ہند میں انگریزی حکومت نظام سلطنت کی ذمہ داری صوبجات میں کامل طور پر اور مرکز میں جزوی طور پر خود ہندوستانیوں کے سر پر ڈال دی ہے۔ ان حالات میں یہ ریاست کے ہندوؤں کو کب تک اپنے سر لے گی۔

موجودہ حالات میں ذمہ دار حکومت کے علاوہ کوئی طریق حکومت جمہور کے لیے اطمینان کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مجلس احرار نے کشمیر میں ذمہ دار حکومت کے قیام کا مشورہ ریاست کشمیر کے ارباب حل و عقد کو دیا۔ ریاست کپور تھلہ اور ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے لیے بھی خواہ ان کا والی ہندو ہو کہ سکھ یا مسلمان ہم ذمہ دار حکومت کو ہی ریاستی عوام کے مستقبل کا بہترین حل سمجھتے ہیں جو والئی ریاست ذمہ دار حکومت کے قیام میں پیش قدمی کرے گا۔ وہ موجودہ اور آئندہ نسلوں میں شکریے کا مستحق ہوگا۔ اور ہندوستان کا محسن کہلائے گا۔ اور جو اس بارے میں تاخیر سے کام لے گا تو اس کے سامنے تھوڑے عرصہ میں مصیبت زدہ مجبوروں کا بے شمار لشکر اس مطالبے کو لے کر آئے گا۔ کہ جمہور کو قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں گی۔ لیکن انجام کار فتح بھی انہی کے نام لکھی جائے گی۔ اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو

ان مطالبات کی صداقت آخر تسلیم کرنی ہوگی۔ ہم کسی والئی ریاست کے دشمن نہیں۔ لیکن تباہ حال انسانوں کی ہمدردی کا ہمیں حق حاصل ہے اور ہمارے اس حق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ذمہ دار حکومت کا قیام جہاں کاشتکاروں کے لیے مفید ہے، وہاں مزدور کے لیے بھی سودمند ہے۔ حق رائے دہی بالغان ہوتے ہوئے وہ اپنے حقوق کا تحفظ کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کا باہم چولی دامن کا ساتھ اس لیے دونوں کو متحد ہو کر اپنے حقوق کی دوڑ میں شریک ہونا چاہیے اور کسی کے جھانسے میں آ کر ایک دوسرے کی مخالفت پر آمادہ نہیں ہونا چاہیے۔ آخر میں میں ریاست کے تمام لوگوں سے کہوں گا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے ہمت سے کام کریں اور یاد رکھیں کہ دنیا کا کوئی قانون اور حکومت کا کوئی طریق کار کسی قوم کو بچا نہیں سکتا جب تک وہ خود کو بچانے کی کوشش نہ کرے۔

آج تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک مشکل آن پڑی ہے۔ اسی طرح ریاست کا مسلمان اگر زندہ رہنا چاہتا ہے، تو اسے اپنے سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ اقتصادی مشکلات کا جائزہ لینا ہوگا۔ ورنہ آپ دوسری غلامی میں پھنس کر رہ جائیں گے۔ میں آخر میں دعا کرتا ہوں کہ پروردگار ہمارے گناہوں کو معاف فرمائیں۔ ہمیں موجودہ مصیبت کے گڑھے سے نکال کر عزت کی بلندیوں اور کامرانیوں کا منہ دکھائیں۔ اور آخرت میں اپنے حضور سرخرو اٹھائیں (آمین ثم آمین)

کانفرنس کے آخری اجلاس میں متعدد قراردادیں منظور کی گئیں، جن میں آخری اور اہم قرارداد ریاست میں ذمہ دار اسمبلی کی قرارداد تھی۔ جس کے ذریعے مہاراجہ سے ریاست میں جلد سے جلد ذمہ دار حکومت قائم کر کے ریاستی عوام کو مطمئن کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

وزیر اعظم سے ملاقات

احرار کانفرنس کے ابتدائی اجلاس سے فراغت کے بعد زعمائے احرار گورنمنٹ ہاؤس کپورتھلہ میں وزیر اعظم سر میاں عبدالحمید سے ملنے گئے اور ان سے کہا۔

"دسمبر ۱۹۳۲ء میں حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا تھا کہ یکم مارچ ۱۹۳۴ء تک ذمہ دار اسمبلی جو مخلوط طرزِ انتخاب اور بالغ حق رائے دہی کے اصول پر مبنی ہوگی قائم کر دی جائے گی۔

۲۔ ریاست کے متعلق چھ ارکان پر مشتمل جو کونسل قائم کی گئی ہے اس میں صرف دو مسلمان ہیں۔ اس سے ریاستی مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا ہو رہا ہے۔ ارکانِ وفد نے کہا کہ ذمہ دار اسمبلی ہی مسلمانوں کے دکھ درد کا واحد علاج ہے۔ نیز ریاست میں مسلمانوں کو ان کی تعداد کے لحاظ سے ملازمتیں دی جائیں اور زمینداروں کی زمینوں اور ان کے حقوق کی حفاظت انتقالِ اراضی جیسے قانون کے ذریعے ہونی چاہیے۔"

اس ملاقات کے بعد دوسرے روز وزیر اعظم بغیر کسی اطلاع کے اچانک کانفرنس کے پنڈال میں پہنچ گئے۔ زعمائے احرار کے علاوہ ہزاروں مسلمانوں نے وزیر اعظم کا خیر مقدم کیا۔ وزیر اعظم نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"جو قانون انتقالِ اراضی نافذ کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی ترمیم نہیں ہوگی بہاراجہ صاحب کی یورپ سے واپسی پر چھ ماہ بعد ذمہ دار اسمبلی قائم کر دی جائے گی۔ جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی۔

زیر بحث کونسل عارضی چیز ہے۔ یہ کسی صورت ذمہ دار اسمبلی کے قائم مقام نہیں ہے اور نہ ہی اس کونسل کا میرے اختیارات پر کوئی اثر ہے۔ بلکہ موجودہ صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے میری تجویز پر بنائی گئی ہے۔ اس کونسل میں ایک ایسا سرکاری آفیسر بھی شامل کیا گیا ہے جو زراعت پیشہ لوگوں کے مفاد سے خاصی واقفیت رکھتا ہے اس طرح حکومت نے

زمینداروں کے تحفظ کی ایک اور صورت نکالی ہے۔

مہاراجہ بہادر کو یہ معلوم ہے کہ ریاست کے بعض محکموں میں مسلمانوں کو ان کی تعداد کے مطابق ملازمتیں نہیں دی جا رہی ہیں المذا اس کمی کو پورا کرنے کیلئے بہت جلد اقدام کیا جائے گا (آخر میں آپ نے کہا) وقت کی تنگی کے باعث وہ یہاں مسلمانوں کے باقی مطالبات کا اعلان نہیں کر سکتے"۔

اس کے بعد احرار کے مرکزی صدر مولانا حبیب الرحمٰن نے وزیر اعظم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اگر مسلمانوں کے مطالبات جلد پورے نہ کیے گئے تو مسلمانوں کو مہاراجہ کی حکومت پر جو اعتماد ہے۔ یہ سب زائل ہو جائے گا"

مہاراجہ کپورتھلہ نے اپنی یورپ کی روانگی سے پیشتر چھ اشخاص پر مشتمل انتظامی کونسل کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ جس میں دو مسلمان، دو ہندو اور دو سکھ شامل تھے۔ اس کونسل پر نہ صرف ریاستی مسلمان معترض تھے، بلکہ ہر انصاف پسند مہاراجہ کی اس تجویز پر ششدر رہ گیا۔ ریاست میں مسلمان غالب اکثریت رکھتے ہیں۔ سکھ صرف دس فیصدی کے مالک، ہندو درمیانے درجے کی آبادی۔ لیکن نمائندگی برابر کی۔ انصاف کا یہ خون خود سربراہ ریاست کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔ اس پر ۴۔ اپریل کو سیکرٹری مجلس احرار کپورتھلہ نے برقی پیغام کے ذریعے مہاراجہ سے سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"کپورتھلہ کے مسلمانوں کو اس بات پر سخت افسوس ہوا ہے کہ آپ (مہاراجہ) نے چھ ارکان کی جو کونسل بنائی ہے۔ اس میں صرف دو مسلمان لیے گئے ہیں۔ حالانکہ ریاست میں مسلمانوں کی آبادی کے اعتبار سے ان کے حقوق کا تحفظ آپ کی یہ کونسل نہیں کر سکے گی۔ لہٰذا مسلمان ایک بار پھر اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ اس کونسل پر انہیں کوئی اعتماد نہیں اور نہ ہی وہ اس قسم کے انتظام پر مطمئن ہو سکتے ہیں جب تک کہ کونسل کو اس انداز سے ترتیب نہ دیا جائے جس سے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت

ہوسکے۔ کیونکہ موجودہ ادارہ میں غیر مسلموں کو اکثریت دی گئی ہے۔ اس سے مسلمانوں کے حقوق محفوظ نہیں ہیں۔

حکومتِ کشمیر کا اعلان

۵۔اپریل کے اخبارات کے ذریعے حکومت کشمیر نے گلینسی رپورٹ کے تحت ایک نیا اعلان کیا

"مجوزہ لیجسلٹو اسمبلی میں مسلمانوں کو باون ۵۲ فیصد نمائندگی دی جائے گی۔ اس میں سرکاری ارکان بھی شامل ہوں گے۔ حکومت کشمیر نے کہا ہے کہ فرنچائز کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق جو احکام صادر فرمائے تھے، وہ بھی اسی پالیسی میں شامل ہوں گے۔

ان تجاویز کے مطابق جن کو حکومت کشمیر نے منظور کیا ہے۔ طے پایا ہے کہ اسمبلی ۶۳ غیر سرکاری اور ۱۲ سرکاری ارکان پر مشتمل ہوگی۔ غیر سرکاری نشستوں کا ایک حصہ مختلف جماعتوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ ۱۶ نشستیں فرنچائز کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق نامزد ارکان کے لیے مخصوص رہیں گی۔ اگر حکومت زیادہ مسلمانوں کو نامزد کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ گو ۱۲ سرکاری نشستیں فرقہ وار نیابت میں شامل نہیں ہیں۔ کیونکہ سرکاری ارکان کابینہ کی تبدیلیوں کے زیر اثر یا اسمبلی کی ضرورت کے پیش نظر تبدیل ہوتے رہیں گے۔ نیز یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ سرکاری ارکان میں کم از کم پانچ مسلمان ہونے چاہییں۔ تاکہ اسمبلی کی پچھتر نشستوں میں انتالیس نشستیں مسلمانوں کے پاس رہیں۔"

مجوزہ اسمبلی کے قواعد

جو گلینسی کمیشن کی سفارشات پر مشتمل ہے۔

"اس میں ارکان اسمبلی کو آزادی تقریر، بجٹ اور کونسل میں پیش ہونے والے دیگر مسائل پر نکتہ چینی کا اختیار ہوگا۔ لیکن بعض محکمہ جات محفوظ قرار دیے گئے۔ چنانچہ جن پر اسمبلی میں بحث نہ ہو سکے گی۔ ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ وہ حالات جن کا تعلق ہز ہائی نس مہاراجہ کی ذات گرامی یا شاہی خاندان کے کسی فرد یا ان کے خانگی انتظام سے ہو۔
۲۔ ملک معظم اور ریاست (کشمیر) یا حکومت ہند یا کسی غیر ملکی حکومت یا کسی اور ہندوستانی ریاست کے درمیان تعلقات و معاہدات۔
۳۔ لداخ، گلگت کی سرحدوں کے معاملات۔
۴۔ علاقہ داروں اور جاگیرداروں کو صنعتوں کی بنا پر عطا کردہ حقوق۔
۵۔ ریاستی فوج کا نظم و ضبط۔
۶۔ وہ ریاستی محکمات جو اس وقت مہاراجہ بہادر کے تحت ہیں یا منسلکہ فہرست میں ان کی وضاحت کی جا چکی ہے۔
۷۔ دھرم ارتھ کے محکمے۔
۸۔ اس ضابطے کی شرائط اور اس کے تحت توانین اور ان کی تنسیخ و ترمیم وغیرہ۔
ریاست کی مجلس آئین ساز، کونسل اور اسمبلی پر مشتمل ہوگی۔ کونسل کا صدر وزیراعظم ہوگا۔ اور وہ ایسے وزراء سے مل کر جن کا تقرر مہاراجہ کی مرضی پر موقوف ہوگا۔ ریاست کا نظم و نسق چلائیں گے۔
اسمبلی کے صدر کو مہاراجہ خود ایک معینہ مدت کے لیے مقرر کریں گے۔ اسمبلی اپنے اجلاس اول سے لے کر تین سال تک کام کرے گی۔ بشرطیکہ مہاراجہ بہادر اپنی مرضی سے قبل از وقت منسوخ یا اس کی میعاد میں توسیع کا حکم نہ دے دیں۔
اسمبلی کے بالعموم سال میں دو اجلاس ہوں گے۔ (ایک اکتوبر کو سرینگر میں اور دوسرا مارچ میں بمقام جموں) اگر اسمبلی نے کسی قانون کو مسترد کر دیا یا تبدیل کر دیا تو مہاراجہ کو ریاست کے نظم و نسق اور آئین و سکون کی خاطر اپنے طور پر منظور کرنے کا حق حاصل ہوگا۔
شخصی اقتدار کا مالک جمہور کے تابع رہ کر بھی اپنی دمنعداری قائم رکھتا ہے۔ عوام کی ضروریات حیات اور وقت کے تقاضے اس کے ارادوں کو نہ متزلزل کرتے ہیں اور نہ وہ خود کسی تذبذب میں پڑتا ہے۔ تاہم عوام کے دلوں کی دھڑکن سننے والوں کانوں میں اگر

حکومت مصلحت کا شکار نہ ڈیل دے تو یہ آواز دور تک سنی جا سکتی ہے۔ اگر شہیدوں کا خون اس سے ہم آہنگ ہو تو یہ صدا الصحرا ثابت نہیں ہوتی۔

کشمیری عوام نے ڈوگرہ شاہی سے گلو خلاصی کے لیے جس قدر جدوجہد کی مگر اس کے رہنماؤں میں دیانت کا فقدان نہ ہوتا تو کشمیر کا رئیس اپنی رعایا سے اس طرح مذاق نہ کرتا۔ ؎ آگ دی جب باغبان نے آشیانے کو میرے

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔

مجلس احرار کے مسلسل منع کرنے پر بھی کشمیری لیڈروں نے فرنگی تجویز (گلینسی کمیشن کی رپورٹ) منظور کر لی۔

گلینسی کمیشن کی یہ رپورٹ خونِ شہدائے کشمیر کی توہین تھی۔ اس دیوار پر کھڑے ہو کر کشمیر کے حکمران نے کشمیری لیڈروں کے سہارے اپنی عافیت کا سودا کیا۔ اور غلام کشمیریوں کو کاغذی پیرہن میں ایک ایسا کھلونا دیا۔ جو ملمع سازی کا خوبصورت شاہکار تھا۔

پونچھ میں مجلس احرار کا قیام

مندرجہ بالا اعلان کے ہوتے ہی پونچھ کے مسلمانوں نے مجلس احرار کے قیام کا اعلان کر دیا۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے فرنگیوں سے کشمیر کے سودے سے پیشتر دیگر مختصر ریاستوں کی طرح پونچھ بھی ایک خود مختار ریاست تھی۔ لیکن گلاب سنگھ نے ان سب کو اپنے تحت کر لیا۔ بظاہر اب بھی اس علاقے کا رئیس الگ ہے لیکن اس کی مستقل حیثیت نہ تھی۔ یہاں ان دنوں (۱۹۳۲ء) مسلمانوں کی آبادی چار لاکھ کے قریب تھی۔ ڈوگرہ شاہی کے بڑھتے ہوئے تشدد کی صدائے بازگشت یہاں بھی سنائی دینے لگی تو اس علاقے کے مسلمانوں نے سنبھالا لیا۔ اور سید احمد شاہ نامی ایک شخص نے مجلس احرار کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اور یہی ابتدا میں مجلس احرار پونچھ کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ انہوں نے پریس کے نام ایک پیغام میں کہا۔

"مسلمانانِ پونچھ جن کی تعداد ریاست میں چار لاکھ کے قریب ہے۔ وہ اپنی مشکلات اگر راجہ پونچھ سے بیان کرتے ہیں تو دربارِ کشمیر انہیں مجرم قرار دیتا

ہے۔ اگر اہلِ پونچھ کو پکارتے ہیں تو وہ ناراض ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم یہاں مجلس احرار قائم کریں اور اسی قدر ایثار و قربانی سے کام لیں کہ جس قدر کشمیر کے مسلمانوں نے اپنے حقوق کے حصول میں قربانی دی ہے اپنے اندر زندگی پیدا کریں۔

لہٰذا ہم مجلس احرار کے رہنماؤں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہماری امداد کریں۔ ہمارے مطالبات یہ ہیں۔

۱۔ پونچھ میں مسلمانوں کو کم از کم پچھتر فیصد ملازمتیں دی جائیں۔

۲۔ لوکل مطالبات جو مختلف اوقات میں پیش کیے جا چکے ہیں انہیں فوراً منظور کر لیا جائے۔

۳۔ گلینسی کمیشن کی سفارشات کا مکمل نفاذ۔

۴ مجلس احرار پونچھ، آل انڈیا مجلس احرار سے اعانت کی فوری اپیل کرتی ہے۔"

(نوٹ) مرکزی مجلس احرار نے پونچھ مجلس احرار کے الحاق سے پیشتر مطالبہ نمبر ۲ کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

ریاستوں کے تحفّظ کے بل کی منظوری

ہندوستان کے سیاسی حالات میں جیسے جیسے تغیر آتا گیا۔ انگریزی سامراج کے نزدیک ریاستوں کا تحفظ اہم ہوتا چلا گیا۔ آخر سنٹرل اسمبلی نے ۱۱۔ اپریل ۱۹۳۴ء کو اٹھائیس کے مقابل ستاون ارا سے والیانِ ریاست کے تحفظ کا بل منظور کر لیا۔

اس بل پر آخری روز بحث کے دوران مسٹر جوشی نے ایک ترمیم پیش کی۔

"اس بل کے تحت صرف انہی ریاستوں کی حفاظت کی جائے جن میں باضابطہ طور پر نمائندہ مجالس وضع آئین کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ حکومت ہند کے سیاسی محکموں کو اگرچہ اس بات کا احساس ہے کہ ریاستوں میں اصلاحات کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن اس کے پاس اس قدر اختیار نہیں کہ وہ ریاستوں کو اصلاحات کے نفاذ پر مجبور کرے۔ بنا بریں اس قسم کی اصلاحات کا نفاذ حکومت کے ذمہ ہے۔ لہٰذا حکومت کو میری اس ترمیم کی تائید کرنی چاہیے۔"

مسٹر اظہر علی ممبر سنٹرل اسمبلی نے اس ترمیم کی تائید میں کہا۔

"اس بل کے تحت والیانِ ریاست کی چونکہ کامل حفاظت ہو جائے گی نیز وہ ریاستوں میں اصلاحات کی ضرورت سے ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہو جائیں گے۔ لہٰذا مسٹر جوشی کی ترمیم کو منظور کر لینا چاہیے۔"

آخر میں مسٹر ہیری ہیگ نے حکومت کی طرف سے یہ ترمیم منظور کر کے والیانِ ریاست کے تحفظ کا بل منظور کر لیا۔

۱۴۔اپریل کو مرکزی مجلس احرار نے ریاستوں کے تحفظ کے بل پر غور کیا اور اس پر کافی دیر بحث ہوتی رہی۔ اسی اجلاس میں ریاست جیند کے واقعہ اور ریاست کشمیر میں روزنامہ انقلاب اور روزنامہ آزاد لاہور پر حکومتِ کشمیر کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے خلاف احتجاجی تار دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ریاست جیند کے واقعہ پر جمعیۃ علمائے ہند نے بھی جیند کے راجہ کو تار دیا۔

تحریک کپور تھلہ نئے موڑ پر

ریاستوں کے تحفظ کا بل منظور ہوتے ہی فرنگی خطاب یافتہ اور انگریز وزیر اعظموں نے ریاستوں میں نئے فرائض کی انجام دہی میں عوام کا محاسبہ شروع کر دیا۔

ریاست کپور تھلہ کے حالات نئی اصلاحات سے قدرے سلجھنے پائے تھے، راجہ اور رعایا کے مابین اعتماد بحال ہو رہا تھا کہ یہاں کے ہندو اور سکھوں نے محرم کے موقعہ پر ریاست میں نئے حالات پیدا کر دیے۔ چنانچہ اس فرقہ وارانہ حالات کا بہانہ تراش کر ۲۲۔اپریل (۱۹۳۴ء) کو حکومت نے ریاست کے ایک اہم شہر سلطان پور لودھی میں محرم کے جلوس پر لاٹھی چارج کر دیا۔ ہوا یہ کہ

سابق روایات کے مطابق مسلمان محرم کا جلوس لے کر سلطان پور کے بازاروں سے گذر رہے تھے کہ راستے میں بڑ کا درخت آیا۔ مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ یہ درخت کاٹ دینا چاہیے۔ ہندو اسے مقدس سمجھ کر اس کی حفاظت پر مصر تھے۔ یہ تنازعہ یہاں تک بڑھا کہ فریقین میں تلخی نے زہر گھول دیا۔ حالات مزید بگڑ گئے۔ آخر پولیس نے مسلمان ہجوم پر لاٹھی چارج کر دیا۔ جس سے عورتیں اور بچے خاصی تعداد میں زخمی ہوئے۔ اس کی صدائے

بازگشت جب ریاست کے دوسرے شہروں میں پہنچی تو مسلمان ہجوم در ہجوم سلطان پور پہنچنا شروع ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد حکومت نے سلطان پور کے علاوہ بھگواڑہ، بگھیوال اور شہر کپور تھلہ میں دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ اور ساتھ ہی شہری مجلس احرار کے صدر خلیفہ امام دین اور اس کے رفقاء کار کو امن عامہ کے تحت گرفتار کر لیا۔

ان دنوں مجلس احرار اور جمعیتہ علمائے ہند کے رہنما اجودھیا (مہاراجہ رامچندر کا جنمستان) میں تھے۔ یہاں کی ہندو آبادی نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ قصہ ایک مسجد کا تھا جسے شہنشاہ بابر نے اپنے عہد میں تعمیر کیا تھا۔ اس نسبت سے یہ بابری مسجد کہلاتی ہے۔ ہندو اپنی اکثریت کے زعم میں اس جگہ مندر تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ یہ جھگڑا شہری امن کے ساتھ اجودھیا کے مسلمانوں کے لیے ہر روز نئی قیامت کا باعث بن گیا تھا۔

اس سے پیشتر ۱۰ اپریل کو جمعیتہ علمائے ہند کے صدر مولانا مفتی کفایت اللہ نے اجودھیا جا کر واقعات کی جانچ پڑتال کی اور جماعت کی ورکنگ کمیٹی میں حسب ذیل رپورٹ پیش کی۔

"اجودھیا میں فساد سے قبل حاکم ضلع کو ہندوؤں نے ایک درخواست دی کہ محلہ شاہجہان پور کے مسلمان امسال عید کے موقعہ پر گائے کو مارنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس فعل سے روکا جائے۔ کیونکہ ہمارے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

شاہجہان پور فیض آباد کا ایک محلہ ہے اور یہ محلہ فیض آباد سے تقریباً ڈیڑھ میل دور واقع ہے۔ اس محلہ میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔ اور ہندوؤں کے چند گھر ہیں۔ درمیان میں تالاب ہے۔ اس تالاب کے مشرق کی جانب ہندوؤں کے چند گھرانے ہیں اور مغربی جانب مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے۔"

اس درخواست کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندو مجسٹریٹ نے دونوں جانب کے آٹھ آٹھ افراد کو گرفتار کر لیا۔ لیکن دوسرے روز ہندوؤں کی ضمانت لے لی گئی اور مسلمانوں کو جیل بھیج دیا

یہ تمام فیصلہ مجسٹریٹ نے صرف ایک گھنٹہ کی کارروائی کے دوران کیا۔ حالانکہ اس علاقہ کے مسلمانوں کو قربانی کا حق مذہب کے علاوہ قانون نے بھی دے رکھا ہے اور سال ہا سال سے وہ اپنے پڑوسیوں کے احترام کے پیش نظر گائے کی قربانی خفیہ طور پر اپنے مکانوں میں کرتے تھے۔

بیراگی کون ہیں ؟

بیراگی خانہ بدوش فقیروں کا گروہ ہے۔ یہ لوگ کبھی کبھار شہر سے باہر جا کر مادرزاد ننگے ہوتے ہیں۔ کمزور عقیدہ کے ہندوان کے درشنوں کے لیے آتے ہیں اور انہیں بھیک دے جاتے ہیں۔ ان کی اخلاقی حالت بہت خراب ہے، جس کی پڑھے لکھے ہندوؤں کو کافی شکایت ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ بد چلنی کی شرارتیں کرتے رہتے ہیں۔

۱۸۵۵ء میں انہی لوگوں نے بابری مسجد میں دو سو چوہتر مسلمانوں کو شہید کر کے مسجد پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت واجد علی شاہ کی حکومت برائے نام تھی۔ مسلمانوں نے جب واجد علی شاہ کی توجہ اجودھیا کے اس واقعہ کی طرف دلائی تو وہ بھی کچھ نہ کر سکے۔

انگریزی عہد میں اس علاقے کے ہندوؤں نے جرأت اور دلیری سے اس مسجد کو شہید کر کے اس پر مندر بنانے کی کوشش کی۔

ان حالات کا جائزہ لینے کے بعد یو۔ پی کی مجلس احرار نے اس میں مداخلت کا فیصلہ کیا۔ اور اپنے اس ارادے سے مرکزی مجلس احرار کو آگاہ کر دیا۔ جمعیتہ علمائے ہند کے رہنما مجلس احرار کے ہمنوا تھے۔ دونوں جماعتوں نے ہندو اور مسلمانوں کو باہم رضامندی پر ہر ممکن آمادہ کیا۔ لیکن کوئی بات طے نہ ہو سکی اس دوران غیر ملکی قانون اور اس کے محافظ تماشائی بنے رہے۔ یہاں تک کہ یہ آگ دلوں سے اٹھ کر مکانوں تک جا پہنچی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس الاؤ نے مسلمانوں کے گھر راکھ کا ڈھیر بنا دیے۔

قانون کی غیر جانبداری اور غیر مسلموں کی ضد نے یو۔ پی مجلس احرار کو مجبور کر دیا کہ وہ آئین شکنی کی راہ اختیار کرے۔

مرکزی احرار اور جمعیتہ علمائے ہند کے مشترک فیصلے کے تحت یو پی مجلس احرار نے

اجودھیا میں رضاکار بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۱۔ اپریل کو پہلا قافلہ اجودھیا ریلوے اسٹیشن پر اترا ہی تھا کہ اطلاع آگئی ۔ حکومت نے مسلمانوں کو مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دے دی ہے ۔ لیکن غیر مسلموں نے حکومت کا یہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر اس علاقے کے ڈپٹی کلکٹر سید واجد علی شاہ نے حکم دیا کہ ہندو اور مسلمان کے درمیان سمجھوتہ ہو کر رہے گا اس کے لیے ایک کمیٹی بنا دی گئی ۔

کپورتھلہ میں نئے حالات کی اطلاع احرار رہنماؤں کو دہلی پہنچنے پر ملی ۔ وہ اجودھیا سے واپس آئے تھے ۔ سلطان پور لودھی کے حالات ہر روز نیا رنگ اختیار کرتے جا رہے تھے ۔ جالندھر اور کپورتھلہ کے مضافات کے مسلمان قافلوں کی صورت میں سلطان پور پہنچتے اور حکومت انہیں ۱۴۴ کی خلاف ورزی پر گرفتار کر لیتی ۔ ۲۲ سے ۲۴ ۔ اپریل تک تین سو کے قریب رضاکار گرفتار ہو چکے تھے ۔ ۲۵ تاریخ کو چودھری عبدالعزیز سلطان پور پہنچے ۔ ہندو اور سکھ رہنماؤں کے علاوہ حکام سے بھی ملے ۔ بات درخت کی ٹہنیوں تک آن پہنچی جو تعزیہ کی بالائی منزل کو چھو رہی تھیں کہ اگر یہ ٹہنیاں کاٹ دی جائیں تو تنازعہ ختم ہو سکتا ہے ۔ لیکن حکام کے علاوہ غیر مسلم بھی اس پر آمادہ نہ ہوئے ۔

سورج ڈھلے اور چراغ جلے تک جب فریقین کسی فیصلے پر نہ پہنچے ، تو چودھری صاحب مایوس لوٹ گئے ۔ صبح یوم عاشورہ تھا ۔ امام حسین کی شہادت کے واقعات مسلمانوں کے سامنے تھے ۔ جدید کربلا کا سامان بھی ہو رہا تھا ۔ اگر فرات کے پانی نے داستانِ کربلا کو جلا بخشی تو درخت کی ٹہنیوں نے سلطان پور کے مسلمانوں کو حیاتِ ابدی کے گر سکھائے اور آخر کو یہی کہانی تحریک کپورتھلہ کی منزل کا نشان ثابت ہوئی ۔

درخت کی ٹہنی ہو کر چلو بھر پانی انسانی جان کی قیمت نہیں ہو سکتے ۔ مگر انسان ہے کہ اس نے فطرت کی ان انمول چیزوں پر خالق کائنات کے حسین شاہکار توڑ ڈالے ۔ دریاؤں کے پانی خشک ہو کر موسم برشگال میں پھر چلنے لگتے ہیں ۔ پت جھڑ میں ہر شے اداس ہوتی ہے ۔ لیکن بہار کے آتے ہی ٹہنیوں اور شاخوں پر بھی بہار آ جاتی ہے ۔ البتہ انسان ہے کہ اگر یہ گھروندہ ٹوٹ جائے تو اس کے معمار کا دل ٹوٹ جاتا ہے جس

سے کائنات روٹھ جاتی ہے۔ برصغیر کی سیاست میں درخت کی ٹہنیاں گائے کا گوشت اور بینڈ باجے کی آواز کو انسانوں نے اپنی عبادت میں ہمیشہ اپنا رقیب پایا۔ اور اس لڑائی کو خدائی عبادت کا درجہ دے کر انسانوں کا خون جائز اور روا رکھا۔ کاغذ اور لکڑی کے سجائے ہوئے بت، جانوروں کا گوشت، موسیقی کی دھن، درخت کے پتے اور ٹہنیاں نہ تو خدا ہو سکتے ہیں، نہ خدا کی عبادت کا ذریعہ۔ لیکن یہی اشیاء محکوموں کے مذاہب کی محبوب رہیں۔ جن کے بناؤ سنگھار پر آدمی اور آدمیت کے خون سے رنگ و روغن ہوتا رہا۔

۲۶۔ اپریل کا سورج طلوع ہوا۔ تو دلوں کی بھٹیاں دہک رہی تھیں۔ نہ درخت کی ٹہنیاں کٹ سکتی تھیں، نہ تعزیہ جھک سکتا تھا۔ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ وقت کے ساتھ ہجوم میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جب کوئی امید بر نہ آئی تو مسلمان تعزیہ اٹھا کر ماتم کرتے ہوئے متعینہ راستے پر چل پڑے۔ ایک طرف ہندو اور سکھ مسلح گشت کر رہے تھے تو سامنے پولیس اور فوج بندوقیں سنبھالے کھڑی تھی۔ جیسے جیسے تعزیہ کا جلوس درخت کی طرف بڑھتا گیا، دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی چلی گئیں۔ آخر وہ بات ہو کے رہی۔ تعزیہ دار ہنوز درخت سے چالیس گز کے فاصلے پر تھے کہ حکام نے بغیر کسی نوٹس اور اعلان کے مسلمانوں پر گولی چلانا شروع کر دی۔ جس پر پچاس مسلمان شہید اور دو سو کے قریب زخمی ہوئے۔ بالائے ستم یہ کہ موقع پر کسی میڈیکل ایڈ کا انتظام نہ تھا اور نہ ہی تڑپتے ہوئے زخمیوں کو پانی مہیا کیا گیا۔

سلطان پور کے اس حادثے کے فوراً بعد صدر مجلس احرار نے حسب ذیل مطالبات کے ساتھ تمام ریاست میں ہڑتال کا اعلان کر دیا۔

۱۔ مہندی اور تعزیہ کا جلوس مقررہ راستوں سے گذرنے کی فوراً اجازت دی جائے۔

۲۔ گرفتار شدگان کو رہا کر دیا جائے۔

۳۔ ریاست کے جن غیر مسلم حکام نے شہدائے کربلا کی توہین کی ہے انہیں ملازمت سے علیحدہ کر دیا جائے۔

۴۔ مسلمان نوجوانوں پر جو ظلم ہوا ہے، اس کی فوراً تلافی کی جائے۔ نیز حادثہ سلطان پور کی غیر جانبدارانہ تحقیقات بیرون ریاست کے کسی جج کے حوالے کی جائے۔

۵۔ شہیدانِ سلطان پور کے ورثاء کو خون بہا دیا جائے۔

تحقیقاتی وفد

۲۷۔ اپریل کو مرکزی مجلس احرار نے مولانا عبد الغفار غزنوی اور مسٹر عبد الغفار اختر۔ بی۔ اے پر مشتمل ایک تحقیقاتی وفد سلطان پور بھیجا۔ جس کے دائرہ اختیار میں بھگواڑہ، بھیگووال اور سلطان پور لودھی بھی شامل تھا۔

اسی روز حکومت کپورتھلہ نے اعلان کیا کہ سلطان پور میں صرف بائیس مسلمان ہلاک ہوئے ہیں۔

سکھ لیڈر

حادثہ سلطان پور سے متعلق مقامی ہندوؤں اور سکھوں نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ متنازعہ فی درخت بی بی نانکی (گورو نانک کی بہن) سے وابستہ ہے لہٰذا ان کے لیے یہ مقدس مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر گوردوارہ پربندھک کمیٹی امرتسر کے سکھ رہنما (ماسٹر تارا سنگھ، سردار جودھا سنگھ پروفیسر خالصہ کالج امرتسر) نے اپنے بیان میں کہا۔

"سلطان پور کے جس بڑ کے درخت کو مذہبی حیثیت دی گئی ہے۔ یہ نہ تو کوئی پرانا درخت ہے اور نہ ہی اس سے سکھوں کی کوئی مذہبی روایات وابستہ ہیں۔ دو سال ہوئے کہ ایک مکان کی تعمیر کے سلسلے میں متنازعہ فی درخت کی تمام شاخیں کاٹ دی گئی تھیں مگر اس وقت کوئی معترض نہ ہوا۔ لہٰذا من حیث القوم سکھوں کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔"

(انگریزی روزنامہ ٹریبیون لاہور۔ ۳۰ اپریل ۱۹۳۴ء)

چودھری افضل حق کپورتھلہ میں

حادثہ کے دوسرے روز چودھری افضل حق (ایم۔ ایل۔ اے) ریاستی حکام کی اجازت سے سلطان پور پہنچے۔ جہاں انہوں نے واقعہ کی جگہ دیکھی اور ہسپتال میں زخمیوں سے ملے۔ آپ نے انسپکٹر جنرل

پولیس سے مل کر واقعات معلوم کیے۔ اسی شام آپ لاہور واپس آ گئے۔

دہشت انگیزی

ریاستوں میں تحریک آزادی کے یہ لیل و نہار تھے۔ کانگریس مہاتما گاندھی سمیت کونسلوں اور اسمبلیوں کے لیے پر تول رہی تھی۔ ہندوستان میں ٹوڈی مسلمان کے علاوہ قوم پرست اور مذہبی ذہن کا مسلمان بھی جیل خانوں کے مسلسل مصائب سے تھک ہار کر گوشۂ عافیت ڈھونڈھ رہا تھا۔ ان کے لیے بھی امان کی جگہ کونسل اور اسمبلیوں کے ایوان تھے۔ ایسے میں دہشت پسند تحریک نے از سر نو پر پرزے نکالے۔ مدراس اور کلکتہ اس تحریک کے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ۲۔ مئی (۱۹۳۴ء) کو مدراس کے حکام نے کالجوں اور اسکولوں کے پروفیسروں اور ہیڈ ماسٹروں کو ایک سرکلر بھیجا۔

وہ جو لڑکا اپنی کلاس سے غیر حاضر ہو، اس کے متعلق تحقیقات کرو کہ وہ کسی دہشت پسند تحریک سے وابستہ تو نہیں۔ اگر ان میں سے کوئی لڑکا اپنے گھر سے غائب ہو تو اس کے متعلق بھی معلومات فراہم کریں، کہ وہ کہاں رہتا ہے اور اس کی بیٹھک کن لوگوں سے ہے۔ اس کی اطلاع اپنے علاقے کے مجسٹریٹوں کے علاوہ دوسرے حکام کو بھی کریں۔ نیز کسی لڑکے کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر سکول اور کالج سے چھٹی نہ دی جائے۔ اس ضمن میں ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھی بے حیثیت ہوگا۔"

اس تمام احتیاط کے باوجود ۸۔ مئی کو دارجلنگ میں دو بنگالی نوجوانوں نے گورنر بنگال پر ریوالوروں سے حملہ کر دیا۔ وہ اس وقت کھلے میدان میں گھڑ دوڑ دیکھ رہے تھے۔ گورنر کے تمام ساتھی محفوظ رہے، سوائے ایک لڑکی کے جسے معمولی زخم آئے۔ ملزم گرفتار کر لیے گئے۔

اس سے دو روز قبل کونسل آف سٹیٹ میں ہوم سیکرٹری نے ہندوستان میں دہشت پسند تحریک کی تفصیل بتائی۔

۱۵ جنوری ۱۹۳۱ء سے فروری ۱۹۳۴ء تک ہندوستان میں حسب ذیل حادثات ہوئے۔

قاتلانہ حملے ۳۰۔ ۱۲۔ حملوں کے اقدام ۲۷۔ ۴۔ ڈکیتیوں کے اقدام ۷۔ ڈکیتیاں ۷۹۔ لوٹ مار کے واقعات ۴۶۔ لوٹ مار کے اقدام ۱۴۔ بم پھٹنے کے واقعات ۱۰۔ بم چلنے

کے حادثات - ۵ - مسلح حملے - ۱ - غیر منظم اور بے ترتیب حملے - ۱ - آفیسر ہلاک ہوئے - ۲۰ زخمی - ۵۰

ان تمام واقعات میں بنگال کے دہشت پسندوں کا زیادہ دخل رہا۔ چنانچہ ان حملوں میں ایک سو چودہ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ خصوصاً سرکاری آفیسر پندرہ ہلاک اور تیرہ مجروح ہوئے۔

اس کے علاوہ دیگر علاقوں میں دہشت پسندوں کے حملوں سے دوسو اکتیس ہلاک اور اڑتالیس زخمی ہوئے۔ اسی طرح دیگر صوبجات میں سیاسی حملوں کی تعداد اور تفصیل حسب ذیل ہے۔

مدراس میں چھ، بمبئی میں سترہ، بہار اور اڑلیسہ میں چودہ، آسام میں بارہ، شمال مغربی صوبہ سرحد میں چھ، صوبجات سے متوسط چھ، برما میں صفر، صوبجات متوسط آگرہ اور اودھ میں چھتیس، پنجاب میں بیس، دہلی میں چار۔ میزان ایک سو بائیس۔

مجروحین اور ہلاک شدگان کی یہ تعداد بنگال کے علاوہ ہے۔

دہشت انگریزی کے واقعات اور حکومت کی اس رپورٹ کے بعد عدم تشدد کے حامی لیڈروں نے ہر مقام پر اپنے قدم سمیٹ لیے۔ سفر میں اس قدر احتیاط کہ اپنوں پر پرایوں کا گمان ہونے لگا۔ رہائش گاہوں کے نگہدار مشتبہ نظر آنے لگے۔ دہشت پسند تحریک چونکہ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تھی۔ لہٰذا کوئی واقعہ ایسا نہیں جس سے ہندوستان کے کسی سیاسی رہنما کو نقصان پہنچا ہو۔

ورکنگ کمیٹی کا اجلاس

انسانی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو سلطان پور کا حادثہ جلیانوالہ باغ اور قصہ خوانی بازار کے بعد تیسرا عظیم حادثہ تھا کہ محض درخت کی چند ڈالیوں کے عوض انسانی خون کی ارزانی کو جائز سمجھا گیا۔ لیکن ۲۶۔ اپریل سے ۲۔ مئی تک ایک زبان ایسی نہیں جو سلطان پور کے سانحہ پر کھلی ہو۔

آل انڈیا کانگریس کو اس سلسلہ میں سب سے بڑی مجرم جماعت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ مسلم جماعتوں کی ذمہ داری تھی۔ کیونکہ سلطانپور میں مسلمان شہید ہوئے تھے۔ مگر کیا مجال کہ ایک لفظ کسی نے کہا ہو۔ البتہ مسلم اخبارات میں صرف روزنامہ انقلاب

لاہور نے ہیں پر قلم اٹھایا۔ حالانکہ ہندو پریس حکومت کپور تھلہ کے اس فعل کی برابر حمایت کر رہا تھا۔

سیاسی ضرورت کے لیے اقتدار کا حصول لازمی ہے۔ لیکن انسانیت سے ماورا ہونا بھی ضروری نہیں۔ ہندوستان کے رہنما انتخاب کی ہماہمی کے باعث سلطان پور کا واقعہ شیر مادر کی طرح ہضم کر گئے۔ ہفتہ بھر کی اس خاموشی کے بعد بالآخر مجلس احرار نے ۲۔مئی کو لاہور میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کر لیا۔ اسی روز قبل از دوپہر احرار وفد نے سلطان پور کی تحقیقاتی رپورٹ پیش کی۔ اس کے مطالعہ کے لیے اجلاس ۴۔مئی پر ملتوی کر دیا گیا۔

احرار وفد کی رپورٹ

۱۔ بڑ کا درخت جو میونسپل کمیٹی کی زمین پر واقع ہے۔ اور اسی کی ملکیت ہے۔ اس کی عمر چالیس پچاس سال سے زائد نہیں۔ اور نہ ہی اس کی کوئی مذہبی حیثیت ہے۔ جیسے کہ ریاست کے ہندو، سکھ کہہ رہے ہیں۔ کہ یہ درخت چار سو سال پیشتر بی بی نانکی کے ہاتھوں نصب کیا گیا تھا۔ اس کی تردید پروفیسر جودھا سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ نے کر دی ہے۔

۲۔ ان حالات میں بڑ کے درخت کو محض بہانہ بنا کر ریاستی مسلمانوں پر جو تعزیہ اٹھائے بڑ کے درخت کے قریب سے گزرنا چاہتے تھے گولیوں کا بے دریغ نشانہ بنایا گیا۔ یہ قتل عام بھی جلیانوالہ باغ کی طرح کیا گیا۔ فرق یہ ہے کہ اس ظلم کے کرنے والا انگریز جنرل ایڈوائر تھا اور اس نے تمام ظلم کا اقرار جرأت سے کیا تھا۔ اس کے برعکس ریاستی حکام نے اپنے ظلم پر پردہ ڈالنے کے لیے بڑی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اعتراف جرم سے انکار کیا ہے۔ مثلاً لائن گن کا استعمال کیا گیا تھا، اس سے انکار کر کے کہا جا رہا ہے کہ فقط اکیس راؤنڈ چلائے گئے ہیں۔ اس واقعہ کے انکار پر وزیر اعظم ریاست نے جو بیان اخبارات کو دیا وہ محض واقعات پر پردہ ڈالنے کے لیے ہے۔

۳۔ بھگواڑہ کے ہندوؤں نے ۷۔محرم کو ہندی کے جلوس پر خشت باری کی۔

اور اس شرارت کے لیے ریاست کے سکھوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس طرح ہندو اور سکھوں کی اکثریت نے وہاں کے مسلمانوں کو بے بس کر دیا۔ اگر مسلمان رہنماؤں نے دونوں فریقوں (ہندو اور مسلمان) کو سمجھانے کی کوشش کی تو انہیں آگے جا کر روکنے کی کوشش کو ناکام بنا دیا گیا۔

۴۔ ان واقعات اور حالات کی موجودگی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ریاستی حکام نے صرف ہندو اور سکھوں کو خوش کرنے کے لیے مسلمانوں پر گولیاں چلائیں۔

۵۔ مجلس احرار کے وفد نے تجویز کیا کہ غیر جانبدارانہ تحقیقات کرنے کیلئے ریاست سے باہر کے ہائیکورٹ کے جج مقرر کیے جائیں۔ اور ان مسلمانوں کو جن کا جانی د مالی نقصان ہوا ہے انہیں مطمئن کرے۔ نیز ان لوگوں کو جو اس ظلم سے تنگ آ کر ریاست چھوڑ کر انگریزی علاقہ میں ہجرت کر چکے ہیں۔ واپس لانے کا انتظام کرے تاکہ ریاست کا مسلمان اعتماد سے زندگی بسر کر سکے۔

عبدالغفار غزنوی رکن وفد مجلس احرار اسلام ہند۔ لاہور

بیس کے قریب ریاستی زمینداروں نے بھی سلطان پور کے واقعہ کی آزادنہ تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے۔

ورکنگ کمیٹی کا اجلاس

۴ مئی۔ لاہور دفتر مرکزیہ میں مجلس عاملہ کا عام اجلاس شروع ہوا جس کی صدارت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کی۔ سب سے پہلے چودھری عبدالعزیز نے سلطان پور کے حالات بیان کیے اور احرار وفد کی رپورٹ پر غور کیا۔ لعد میں چودھری افضل حق نے حالات بیان کیے۔ یہ کارروائی دن بھر جاری رہی اور اجلاس اگلے روز پر ملتوی کر دیا گیا۔

۵ مئی کو مجلس عاملہ کا دوبارہ اجلاس ہوا جس میں مندرجہ ذیل قرارداد منظور ہوئی۔

۱۔ مجلس عاملہ کا یہ اجلاس سلطان پور کے واقعہ پر انتہائی رنج اور افسوس کا اظہار کرتا ہے اور نہتے مسلمانوں پر بے رحمی سے گولی چلانے کی پر زور مذمت کرتا ہوا ان کے پسماندگان سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ نیز انتظامیہ کو نسل کی بے پروائی

اور نا اہلیت کو اس قتل عام کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے اس حقیقت کا اعلان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ انہوں نے سکھوں اور ہندوؤں کی بیجا حمایت کر کے افسوسناک جانبداری کا ثبوت دیا ہے۔ نیز یہ جلسہ مطالبہ کرتا ہے کہ ایک آزاد کمیٹی اس خونچکاں واقعہ کی تحقیقات کے لیے مقرر کی جائے۔ اور شہداء کے ورثاء اور مجروحین کو پورا پورا معاوضہ دیا جائے۔ نیز اس واقعہ کے مجرم آفیسروں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

۲۔ مجلس عاملہ کا یہ اجلاس ریاست جیند میں مسلمانوں پر مسلسل تشدد اور ہندو نوازپالیسی کی مذمت کرتا ہے۔ اور بیگناہ مسلمانوں کی گرفتاریوں پر صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا، ریاست سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مسلم کش روش سے باز آ کر مسلم رعایا سے انصاف کرے۔

۳۔ مجلس عاملہ کا یہ اجلاس ہندو بیراگیوں کے ہاتھوں اجودھیا میں مسلمان مرد۔ عورتوں اور بچوں کے بے رحمانہ قتل اور مسلمانوں کو زندہ جلائے جانے اور مسجد کے شہید کیے جانے پر انتہائی رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے نیز اس واقعہ کو وہاں کے ہندو افسران کی سازش کا نتیجہ سمجھتا ہوا حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ غیر جانبدارانہ تحقیقات کرے اور ان افسران کو جن کی موجودگی میں ایسے اہم واقعات ظہور میں آئے ہیں، عبرت ناک سزا دے۔"

تحقیقات کا فیصلہ

۷۔ مئی کو وزیراعظم کپورتھلہ نے سلطان پور کے واقعے کی خود تحقیقات کا فیصلہ کیا۔ اور اس کے لیے انہوں نے گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب کے نام ایک تار میں کہا۔

"آپ کا کوئی نمائندہ میرے ساتھ ہونا چاہیے کہ یہ تحقیقات زیادہ ذمہ دار ہو سکے۔"

اس پر گورنر جنرل نے اپنے سیکرٹری مسٹر گرفن کو تحقیقات میں وزیراعظم کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔

جلیسے ہی مجلس احرار کو اخبارات کے ذریعے اس بات کا پتہ چلا کہ وزیراعظم کپورتھلہ

سلطان پور میں گولی چلنے کے واقعہ کی خود تحقیق کریں گے۔ تو مولانا مظہر علی اظہر سیکرٹری جنرل مجلس احرار اسلام ہند نے وزیر اعظم کو اطلاع دی۔

"تحقیقات کی رپورٹ سے مجلس احرار کو پوری طرح آگاہ رکھا جائے اور اس سلسلہ میں جس قدر شہادتیں ہوں ان کی پوری نقلیں ہمیں مہیا کی جائیں"۔

یوم سلطان پور

مرکزی مجلس احرار نے اعلان کیا کہ ۱۱ مئی کو تمام ہندوستان میں یوم سلطان پور منایا جائے۔ اس روز جلوس نکالے جائیں، جلسے کیے جائیں۔ واقعہ سلطان پور کی مذمت کی جائے۔ ان قرار دادوں کی نقلیں دفتر مرکزیہ کے علاوہ ریاستی حکام کو روانہ کی جائیں۔

لندن کی ٹوڑی پارٹی

امسال ہندوستان کے حالات برطانیہ کے لیے سود مند نہیں تھے دیسی ریاستیں جن پر حکومت کا آخری تکیہ تھا اپنی رعایا سے الجھی ہوئی تھیں۔ ہندوستان کا ٹوڈی اور رجعت پسند طبقہ آئندہ الیکشن میں اپنے ووٹروں کے خوف سے کھلے بندوں حکومت کی حمایت سے جی چرا رہا تھا۔ کانگریس اور نیشلسٹ مسلمان گو انتخاب کے باعث کسی قانون شکنی کے حق میں نہیں تھے تاہم حکومت ان سے بھی مطمئن نہیں تھی۔ اسی طرح برطانوی دانشور یورپ اور ایشیا کے سیاسی جوار بھاٹا سے بھی فکر مند تھے۔

پہلی بڑی لڑائی کے بعد جاپان کے حصے میں کوئی کارآمد علاقہ نہیں آیا تھا۔ اس نے جرمن کی شکست سے بھی سبق لیا۔ کہ جرمن کے ہاں سامان حرب بنانے کے لیے خام مال کی کمی تھی اور خوراک بھی پوری طرح میسر نہیں تھی۔ اگر ایسا ہی کوئی واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا تو جاپان کی حیثیت تو جرمن سے بھی کم ہے۔ لہٰذا آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر جاپان نے دنیا کے نقشے پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے شمال میں روس، جنوب میں برطانیہ، مشرق میں امریکہ اور مغرب میں چین تھا۔ چین کے شمالی حصہ میں جاپان کو قدرے خلا نظر آیا۔ اس نے اس طرف رخ کرنا بہتر سمجھا۔ لیکن چین اپنی جگہ مطمئن تھا کہ میثاق کیلوگ (KELLOG) کے ذریعے امریکہ، برطانیہ، روس، جاپان، فرانس اور بلجیم اس کی آزادی کی ضمانت دے چکے ہیں اور اگر کسی نے مجھ پر حملہ کیا تو یہ ممالک میری حمایت کریں گے۔ مگر حکومتوں کے وعدے

کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جانے میں وقت نہیں لیتے۔ آخر جاپان نے برطانیہ کی در پردہ حمایت کے سہارے منچوریہ کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ گو برطانیہ کی اس حرکت پر روس ناراض ہوا۔ مگر جو ہونا تھا ہو چکا۔

ایشیا کے یہ حالات اور یورپ میں ہٹلر نے آہستہ آہستہ عہدنامہ ورسائی کا خاتمہ کر کے جرمن میں جبری بھرتی کا قانون نافذ کر دیا تھا۔ جس نے جرمن کے نوجوانوں میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ بری، بحری اور ہوائی فوج میں اس قدر اضافہ کر لیا کہ اتحادی طاقتیں گھبرا اٹھیں چنانچہ انہوں نے ہٹلر کے جارحانہ عزائم کے خلاف اکثر احتجاج کیے۔ مگر بے سود۔ یہاں تک کہ امن امن کے بہانے ہٹلر نے اپنی مسلح افواج کی تعداد اس سال ساڑھے پانچ لاکھ کر لی۔ مڈل ایسٹ کی عرب ریاستوں کے رئیسوں کی باہم کوئی متحد امارت نہیں تھی۔ ہر حکمران مختصر صحرا میں اپنی بہاریں سجائے بیٹھا تھا اور اپنے چاک گریباں کا تماشہ کرنے میں انہیں مزا آ رہا تھا۔

مصر کے شاہ فاروق اور اردن میں شریف حسین کی اولاد برطانوی بساط کے مہرے بنے ہوئے تھے۔ بدیں حالات برطانیہ کے لیے یہ گوشہ انتہائی اطمینان بخش تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے آخر تک وسط ایشیا فرنگی سیاست کی آماجگاہ بنا رہا۔

بین الاقوامی سیاست کے اس پس منظر میں لندن کی ٹوڑی پارٹی نے (جس کے لیڈر مسٹر چرچل تھے) ۵۔ اپریل کو برطانیہ کی برسر اقتدار پارٹی کو نوٹس دیا کہ وہ

"یورپ میں ہٹلرازم کے عروج اور ایشیا میں جاپان کی نئی پوزیشن کے پیش نظر وائٹ پیپر کی موجودہ پالیسی پر غور کرے۔ جس کی وجہ سے ہندوستان میں برطانوی مفاد کو خطرہ درپیش ہے۔ کیونکہ جو لوگ اس وقت وائٹ پیپر کی مخالفت کر رہے ہیں۔ وہ آئندہ برطانوی انتخابات میں سوشلسٹ نظام کو لانے کی کوشش کریں گے۔"

لندن کی اپوزیشن پارٹی کا ذہن اور فکر کس قدر واضح تھا کہ اگر آنے والے کل کو کسی دوسری جنگ عظیم کا سامنا کرنا پڑا تو برطانوی مدبّروں کی یہ تجویز ان کا ساتھ نہیں دے گی۔ کیونکہ ہندوستان اس تجویز کے خلاف ہے۔

قانون پر دستخط دیسی ریاستوں کے تحفظ پر ۱۹-مئی ۱۹۲۴ء کو گورنر جنرل نے کونسل کے قانون پر دستخط کر دیے۔ یہ قانون نیو اسٹیٹ پروٹیکٹ ایکٹ ۱۹۲۴ء کہلایا اور ۲ اپریل ۱۹۲۴ء سے نافذ العمل سمجھا گیا۔

آئینی تعاون میں رکاوٹ وزیر اعظم کپور تھلہ نے سلطان پور کے سانحہ پر جب تحقیقات کا فیصلہ کیا تو مرکزی مجلس احرار کے ناظم اعلیٰ نے ریاستی حکام کو اطلاع دی کہ جماعت کو تحقیقاتی عدالت سے واقف رکھا جائے اور گیارہ مئی کو ایک دوسری اطلاع دی کہ حکومت (مولانا مظہر علی اظہر) کو تحقیقاتی عدالت میں سلطان پور کے مسلمانوں کی طرف سے بطور قانونی مشیر کے پیش ہونے کی اجازت دیے۔ اس پر حکومت نے یہ عذر تراش کر انہیں روک دیا کہ آپ ریاست کے اندرونی معاملات پر کوئی سوال نہیں کر سکتے۔

تحقیقات ختم وزیر اعظم کپور تھلہ کی قائم کردہ تحقیقاتی کمیٹی نے ۲۵-مئی کو اپنا کام مکمل کر لیا اور جیسے ہی شہادتیں ختم ہوئیں۔ ریاست کے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ ان میں وہ رضا کار بھی شامل تھے۔ جنہوں نے سلطان پور میں سول نافرمانی کی تھی۔ نیز حکومت نے اعلان کیا کہ ۷-جون کو تحقیقات کے نتیجے سے عوام کو آگاہ کر دیا جائے گا۔

متضاد فیصلے آل انڈیا کانگریس کے اندر اور باہر خاصا بُعد تھا۔ اس کشمکش نے پارٹی کو مختلف دھڑوں میں تقسیم کر دیا۔ ملک میں نئے انتخاب کے دن قریب آ رہے تھے۔ لیکن کانگریس سمیت کوئی سیاسی جماعت کسی فیصلے پر پہنچنے سے قاصر تھی۔ آخر ۲۰-مئی کو پٹنہ میں کانگریس نے اپنے مخصوص اجلاس میں چھ گھنٹے کی مسلسل بحث کے بعد سول نافرمانی کی راہ چھوڑ کر کونسلوں اور اسمبلیوں کے لیے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور مندرجہ ذیل حضرات اس بورڈ کے ممبر منتخب ہوئے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ چودھری خلیق الزمان، مسٹر کے شیروانی، مسٹر آصف علی مولانا ابو الکلام آزاد، پنڈت مدن موہن مالوی، پنڈت پنتھ، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو، ڈاکٹر ستیہ پال،

مسٹر بی سی - رائے امسٹر ستیہ مورتی / سری کرشن سنہا / مس سروجنی نیلڈو، کے - ایم منشی اور مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی -

ڈاکٹر انصاری اس بورڈ کے صدر اور مسٹر بی - سی - رائے اور بھولا بھائی ڈیسائی جنرل سیکرٹری منتخب کیے گئے -

اس فیصلے کے باوجود ۲۰ - مئی کو اس بورڈ کی مخالفت میں مسٹر اینے نے کہا کہ سوراجیہ پارٹی کانگریس کے اس فیصلے کی پابند نہیں ہوگی - بلکہ وہ فرقہ وارانہ اعلان کی مخالفت کرتی رہے گی - پنڈت مالوی نے کہا " کانگریس جداگانہ انتخابات قبول نہیں کرے گی " ڈاکٹر اقبال نے کہا -

" کانگریس کو فرقہ وارانہ اعلان کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے - بلکہ وائٹ پیپر کی ترمیم پر متفقہ غور کرنا ضروری ہے "

مندرجہ بالا بیانات ایک ہی دن کے اخبارات میں شائع ہوئے - ۲۲ - مئی کو کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر ڈاکٹر ستیہ پال نے اپنے اس بیان کے ساتھ بورڈ کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا -

" چونکہ پٹنہ میں پارلیمنٹری بورڈ کا انتخاب کرتے وقت بورڈ نے سخت غلطی کی ہے کہ اس نے پنجاب سے کسی قوم پرست مسلمان یا سکھ کو اس میں شامل نہیں کیا - اگر ایسا ہو جاتا تو موجودہ کاذ کو کافی تقویت پہنچتی "

ان متضاد بیانات اور ڈاکٹر ستیہ پال کے استعفیٰ سے شبہے کا امکان تھا کہ آل انڈیا کانگریس ممکن ہے مجلس احرار سے کوئی تصفیہ کرے - اس پر ۲۸ - مئی (۱۹۳۴ء) کو آل انڈیا مجلس احرار کے جنرل سیکرٹری مولانا مظہر علی اظہر نے پریس بیان کے ذریعے جماعت کی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہا -

" لاہور کے اخبار " ویر بھارت " میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ڈاکٹر ستیہ پال نے کانگریسی پارلیمنٹری بورڈ سے استعفیٰ دیا ہے اور اس سلسلے میں مجلس احرار سے گفت و شنید ہو رہی ہے تاکہ مجلس احرار کا کوئی نمائندہ بورڈ کی رکنیت قبول کرے

جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ مجلس احرار کے کسی رکن سے ایسی کوئی گفتگو نہیں ہو رہی۔ لیکن اس امر سے قطع نظر کہ آیا کسی سے گفتگو ہو رہی ہے یا نہیں ؟ ۔ میری رائے میں پنڈت مالوی اور ڈاکٹر اینے کے بیانات کے بعد جو حال ہی میں فرقہ وارانہ اعلان کے متعلق شائع ہوئے ہیں۔ باہمی تعاون کے لیے کوئی راہ نہیں رہتی۔ اگر کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کو فرقہ وارانہ فیصلہ میں اپنی مرضی کے مطابق ترمیم کرانی ہے۔ تو کسی باہمی مفاہمت کی عدم موجودگی میں فریقین کو اپنا اپنا نقطۂ نگاہ جداگانہ طور پر پیش کرنا ہوگا۔ ورنہ بجائے تعاون کے کسی نہ کسی مرحلے میں مخالفت کی نوبت کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔

ان حالات میں مجلس احرار کانگریسی پارلیمنٹری بورڈ میں شامل ہونا مناسب نہیں سمجھے گی "

ہندو پریس کو معلوم تھا کہ احرار ۱۹۲۱ء سے جداگانہ انتخاب کے حامی چلے آ رہے ہیں۔ اسی بنا پر وہ خود (ہندو اخبارات) اپنے ادارتی کالموں میں انہیں اکثر مطعون کر چکے ہیں تاہم وہ اپنے سیاسی اور مذہبی حریف کو موقع ملنے پر معاف نہیں کرتے۔ کانگریس اور دیگر سیاسی جماعتیں محض الیکشن کی آڑ میں اپنے لیے جو راستہ تجویز کر چکی ہیں احرار اس راستے سے انحراف کر رہے تھے۔

ریاستوں کی مظلوم رعایا اپنے حکمرانوں کی نشاط انگیز زندگی کے باعث بے خانماں ہو رہی تھی۔ احرار نے ہندوستان کی غلامی کے ساتھ ریاستی عوام کی غلامی کو بھی شدت سے محسوس کیا۔ اور وہ اپنی بے سروسامانی کے باوجود ان کی امداد کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ سوئے اتفاق جن راجاؤں کی احرار سے مڈبھیڑ تھی وہ غیر مسلم تھے۔ اس طرح کانگریس سمیت ہندو پریس مجلس احرار کو عوام میں رسوا کرنے کے لیے بے بنیاد افسانے تراشتے۔ اور اس شاخ سے جو شگوفے پھوٹتے ان کی آبیاری رجعت پسند اور ٹوڈی مسلمان کرتا۔

سیاسیات میں اپنے حریف کو ڈھیل دینا، اس اسکول کی ریت نہیں۔ احرار کا کانگریس سے اتحاد آزادیٔ وطن کے حصول تک رہا۔ اس سے آگے وہ ہمیشہ اسلام کے داعی رہے۔

مگران کا یہ جرم حریفانِ بادہ خوار کی نظر میں اس قدر سنگین قرار پایا کہ فرنگی بساط الٹنے پر بھی احرار کا یہ گناہ گناہ ہی رہا۔

کانگریس کے جانبدارانہ رویے کے باعث سیاسی ذہن کا مسلمان چونکہ احرار سے ہم آہنگ ہو رہا تھا۔ لہٰذا احرار کی بنیاد کے ساتھ ہی کانگریس احرار کو اپنا حریف سمجھنے لگ گئی تھی۔ ان حالات میں کانگریس کے پارلیمنٹری بورڈ کے متعلق احرار کے خلاف سیاسی مہم کا آغاز مناسب سمجھا گیا۔ اور روزنامہ "ویر بھارت" کی یہ خبر کہ احرار کانگریس سے یا کانگریس احرار سے آئندہ انتخابات کے سلسلے میں کوئی گفتگو کر رہی ہے، اس مہم کی اہم کڑی تھی۔ لہٰذا جنرل سیکرٹری مجلس احرار کا مندرجہ بالا بیان نہایت بروقت اور ضروری اقدام تھا کہ جس سے مجلس احرار کی پوزیشن واضح ہو گئی کہ احرار اور کانگریس کسی موڑ پر بھی ہم نوا نہیں۔

شیعہ کانفرنس

بھارت کے صوبہ یوپی کا مسلمان اپنے سیاسی فیصلے میں ہمیشہ متذبذب رہا اور غیر مسلم اکثریت نے اس صوبے کے مسلمان کی بے چارگی سے سیاسی اور مذہبی فوائد حاصل کیے، خاص کر شیعہ سُنّی اختلاف بھی اس صوبے کے ہندو کے لیے سود مند رہا۔ چودہ فیصدی آبادی کا مسلمان اگر اپنے عقیدے میں اختلاف کے باوجود متحد رہتا تو ممکن ہے اکثریت معمولی اقلیت سے بھی مار کھا جاتی مگر ع

نادان گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا۔

انگریز کے فرقہ وارانہ اعلان اور ہندو کی ضد نے اقوامِ ہند کو ایسی راہوں پر ڈال دیا۔ کہ جس سے غیر ملکی مدبروں کی حوصلہ افزائی کے کئی پہلو نمایاں ہوئے۔ انہی دنوں لاہور کے روزنامہ انقلاب نے اپنی ۶۔جون (۱۹۳۶ء) کی اشاعت میں ایک خبر کے ساتھ ادارتی نوٹ بھی شائع کیا۔

"شیعہ کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس کی مجلسِ عاملہ نے فیصلہ کیا ہے کہ شیعہ حضرات صرف انہی امیدواروں کو ووٹ دیں یا امداد کریں جو مخلوط انتخاب کے حامی ہوں اور اگر اس قماش کے مسلمان امیدوار نہ ملیں تو شیعہ حضرات کو چاہیے کہ وہ انتخاب سے بے تعلق رہیں۔"

اس خبر کے بعد اخبار مذکور نے اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا کہ۔

"سر آغا خاں، محمد علی جناح، سر علی امام، مہاراجہ محمود آباد اور راجہ سلیم پور جیسے شیعہ رہنماؤں سے اپیل ہے کہ وہ اپنے اثر سے ان شیعہ حضرات کو اس گمراہ کن اثرات سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔"

اس طرح ۳۰۔ جون کے اخبارات میں ایک دلخراش خبر شائع ہوئی۔

"بنارس کی اہل حدیث لیگ نے کہا اور اس فیصلے پر انہوں نے وائسرائے ہند سے درخواست کی ہے کہ اہلحدیث کے لیے مخلوط انتخاب منظور کیا جائے یا پھر ہمارے لیے نشستیں مخصوص کی جائیں۔" (روزنامہ انقلاب ۲۰ جون [illegible])

اس قسم کی اطلاعات نے کانگریس سے اختلاف رکھنے والی مسلم جماعتوں کو ذہنی طور پر نقصان پہنچایا۔

نیا انتخابی بورڈ

آل انڈیا کانگریس اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے بعد ۵۔ جون کو ایک تیسرا انتخابی ادارہ معرض وجود میں آیا۔ جس کی کارروائی ۷۔ جون کے اخبارات میں شائع ہوئی۔ اس ادارہ کے لیڈر حاجی عبداللہ ہارون اور شیخ عبدالمجید سندھی تھے انہوں نے مسلم جماعتوں سے اپیل کی کہ آئندہ سنٹرل اسمبلی کے لیے ایک مشترک بورڈ مرتب کریں، جس کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کیے جائیں۔ کیونکہ اس کے بغیر مسلمانوں کا استحکام مشکل نظر آ رہا ہے۔

مسلمانوں کی نجات حکومت یا کانگریس کے اعتماد پر نہیں۔ بلکہ ان کی ذاتی قوت اور عمل پر ہے۔ لہٰذا تمام جماعتیں بغیر کسی اختلاف کے مشترک مفاد کی خاطر ہمارے ساتھ اتحاد عمل میں شریک ہوں۔ اگرچہ وائٹ پیپر کی تجاویز میں معقول و مناسب ترمیمات کرنے پر کانگریس زور دے رہی ہے۔ مسلمان بڑی خوشی سے کانگریس کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جب تک وہ مسلمانوں کے مطالبات کی تائید نہیں کرتی۔ یا کم از کم وزیر اعظم برطانیہ کے فرقہ وارانہ اعلان کو منظور نہیں کر لیتی۔ مسلمان اس وقت تک برطانوی ہند کے میمورنڈم سے باہر نہیں جا سکتے۔

"ابھی تک مجلس احرار انتخابی اکھاڑے میں نہیں اتری تھی۔ اور نہ ہی موجودہ حالات میں کسی پر اعتماد تھا۔ احرار ویسے بھی ریاستوں کے ظالمانہ نظام کے خلاف عملی جہاد میں مصروف تھی۔ مسلمان جماعتوں کے مختلف گروہ بغیر لیڈرشپ کے آوارہ آہو کی طرح ٹامک ٹوئیاں کھا رہے تھے۔ کانگریس ایسی منظم جماعت بھی پٹنہ کے اجلاس میں باہم ہمنوا نہ ہو سکی مسلم لیگ کے لیڈر مسٹر محمد علی جناح عارضی طور پر لندن جا چکے تھے۔

پنجاب کی یونینسٹ پارٹی بھی جس کے محرک سر ادر خاں بہادر تھے الیکشن سے غافل نہیں تھی۔ سر فضل حسین جو یونینسٹ پارٹی کے سرغنہ سمجھے جاتے تھے۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے مستعفی ہو کر آئندہ پنجاب کے پولیٹیکس میں براہ راست داخلے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

غیر ملکی حکمران ٹولہ ہندوستان کی اس ابتری کو اپنے لیے نیک فال سمجھ رہا تھا ریاستی تحفظ کے بل کی منظوری کے بعد ریاستوں پر اس کی گرفت مزید مضبوط سمجھی جا رہی تھی۔

ان کوائف پر غور کرنے کے لیے مجلس احرار نے ۱۲۔جون ۱۹۳۴ء کو لاہور میں اپنی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کر لیا۔

"زندگی" ضبط کر لی جائے

انھی دنوں پنجاب کے ہندو پریس نے چودھری افضل حق (ایم ایل۔ اے) کی معروف تصنیف "زندگی" کے خلاف اپنے ادارتی کالموں میں ہنگامہ آرائی شروع کر رکھی تھی۔ کہ کتاب ہذا میں مصنف نے حکومت کے خلاف بغاوت کا درس دیا ہے، لہٰذا اسے ضبط کر لیا جائے۔

چودھری صاحب نے یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں گورکھ پور کے جیل خانہ میں لکھی تھی۔ اس کی مقبولیت، حسن عبارت اور موضوع کے پیش نظر حکومت پنجاب مصنف کو تین ہزار روپیہ انعام دے چکی تھی۔ لیکن اخبارات کے بار بار اکسانے پر چیف سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ نے زندگی کا انگریزی ترجمہ کرا کر اس کا مطالعہ شروع کیا۔

کپورتھلہ تحقیقاتی رپورٹ

۷۔جون ۱۹۳۴ء کو حکومت کپورتھلہ نے حادثہ سلطان پور کے متعلق اپنی تحقیقاتی رپورٹ پریس کے حوالے کی۔

جو ۹۔جون کے اخبارات میں شائع ہوئی۔ یہ رپورٹ دیوان مسٹر عبدالحمید وزیراعظم کپور تھلہ اور مسٹر سی۔ایل۔گریفن نے مشترک طور پر مرتب کی تھی۔رپورٹ حسب ذیل ہے۔

"گولی لگنے سے بائیس اشخاص ہلاک اور تینتیس مجروح ہوئے۔

تحقیقات ۹۔مئی سے ۳۰مئی تک ہوتی رہی۔اس دوران مہاراجہ کے مشورے بھی شامل رہے۔مسلمانوں کی طرف سے مسٹر خالد لطیف گابا بار ایٹ لا لاہور موجود تھے۔سرکاری اور غیر سرکاری گواہوں کی تعداد ایک سو دو تھی۔

انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر کوٹھے والا پر بھی بحث ہوئی کہ انہوں نے مسلمانوں سے کیوں گفتگو نہیں کی۔اس طرح کپتان روپ سنگھ کو اور مسٹر کوٹھہ والا کو ریاست کی ملازمت سے علیحدہ کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔کیونکہ کپتان روپ سنگھ گولی چلانے کا حکم دینے میں حق بجانب نہیں تھے۔

تحقیقات میں سکھوں اور ہندوؤں کا مسلح ہو کر درخت کے قریب تسلیم کر لیا گیا ہے۔

گولی چلانے سے پیشتر ۱۴۴ نافذ نہیں کی گئی اور نہ ہی ہجوم کو یہ شبہ ہونے دیا گیا کہ ان پر گولی چلے گی۔اگر ایسا ہوتا تو ممکن ہے مسلمان رک جاتے

تحقیقات کے خاتمے تک مقتولین کی تعداد ۲۴ اور مجروحین کی تعداد ۳۴ تھی۔ سترہ اشخاص کو معمولی زخم آئے تھے۔"

تحقیقاتی کمیٹی کے خاص نقطے:۔ ۱۔گولی ضرورت سے زیادہ چلائی گئی اور غیر محتاط طریق پر چلائی گئی۔

۲۔میجر کوٹھہ والا انسپکٹر جنرل پولیس نے صورتِ حال کو سنبھالنے میں افسوسناک فقدان کا مظاہرہ کیا۔

۳۔متنازعہ فیہ راستے پر تعزیہ لے جانے کی اجازت دینے سے انکار کیا گیا حالانکہ ضروری یہ تھا کہ تعزیہ کے لیے دوسرا راستہ متعین کر کے اس کا اعلان کر دیا جاتا۔

۴۔میجر کوٹھے والا نے خود مسلمانوں کے مجمع میں جا کر راستے کی بندش کا اعلان

نہیں کیا۔

۵۔ جو لوگ ۱۲۔ بجے سے متنازعہ راستے سے گذرنے کے لیے جمع ہونے لگ گئے تھے۔ میجر کوٹھے والا کو چاہیے تھا کہ سوا بارہ بجے تک لیے کوٹھے کے پاس جم کر کھڑا رہنے کی بجائے بارہ بجے تک ہی جائے اجتماع پر پہنچ کر ہجوم کو منتشر کر دیتے۔

۶۔ ہجوم دو بجکر پچیس منٹ پر فوج سے ایک سو چالیس گز کے فاصلے پر تھا۔ سوا چار بجے اس کا ہراول پچیس گز کے فاصلے پر تھا۔ گویا کم و بیش دو گھنٹوں میں ہجوم زیادہ سے زیادہ اسی نوے گز کے قریب آگے بڑھا۔ اور یہ بے قابو ہجوم کی عام رفتار اقدام نہیں ہے۔

۷۔ اگر ۱۲۔ بجے ہجوم کو منتشر نہیں کیا گیا تھا تو سوا بارہ بجے ضرور منتشر کر دینا چاہیے تھا۔ جبکہ میجر کوٹھے والا کو قطعی اطلاع مل چکی تھی کہ ہجوم متنازعہ فیہ راستے سے گزرے گا۔

۸۔ اکیس گولیاں چلانے کی اگرچہ تصدیق ہو گئی ہے۔ لیکن یہ کوئی ٹھیک ثبوت نہیں ہے کہ واقعی اکیس گولیاں چلائی گئی ہیں۔

۹۔ بوئس گن چلائے جانے کے متعلق کپتان عزیز احمد کے بیان کو بے بنیاد نہیں بتایا جا سکتا۔ اس لیے کہ چودھری عبدالرشید مجسٹریٹ کے ایک قول سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جو فائرنگ کے سلسلہ میں کونسلر اصغر علی کے سامنے پیش ہوا تھا۔

مجلس احرار کا احتجاج

جیسے ہی مندرجہ بالا رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی ۱۰ جون کو مجلس احرار نے اپنے ایک احتجاجی بیان میں کہا۔

"تمام تحقیقات میں متعلقہ افسران نے سلطان پور میں ہجوم پر بوئس گن کے ذریعے گولیاں چلانے سے انکار کیا ہے۔ دوسرے آفیسر مسٹر کوٹھے والا کو فقط ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ جبکہ یہ کوئی بڑی سزا نہیں کیونکہ

یہ آفیسر حکومت کپورتھلہ نے پہلے سے مستعار لیا ہوا تھا۔ اس پر تمام ہندوستان میں احتجاج کیا جا رہا ہے۔"

اس طرح ۱۱۔ جون کو سلطان پور کی تحقیقاتی عدالت کے فیصلے پر مسلمانوں کے وکیل مسٹر خالد لطیف گابا ایڈووکیٹ نے کہا۔

"سلطان پور تحقیقاتی رپورٹ مسلمانوں کے نزدیک اطمینان بخش نہیں۔"

احرار انتخاب کے میدان میں

ایکٹ ۱۹۳۵ء برطانیہ حکومت کے اس اعلان اور وعدے کا مظہر ہے جو اس نے پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر ہندوستان سے کیے تھے۔ یہ ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے۔ اس کے بعد رولٹ ایکٹ بنا جس کے خلاف احتجاج ہوا۔ اور جواب میں ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ میں گولی چلی۔ سینکڑوں بیگناہ ہندوستانی موت کا شکار ہوئے۔ پھر شاردا ایکٹ بنا۔ جسے علمائے ہند نے مداخلت فی الدین قرار دیا اور اس کے خلاف جرأت ایمانی کے مظاہرے کیے لیکن حکومت اپنے وعدے پورے نہ کر سکی۔ ع

غلام سے جو بھی ہوگا وعدہ ضرور ناپائیدار ہوگا۔

ہندوستان نے پہلی لڑائی میں بغیر کسی شرط کے برطانیہ سے عسکری تعاون کیا تھا۔ اس جنگ میں ہزاروں ہندوستانی ہلاک ہوئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس فتح کی خوشی میں غلام ہندوستان کو آزاد کر دیا جاتا۔ الٹا انہیں سرِعام پھانسیاں دی گئیں۔ چوک اور بازاروں میں ٹکٹکیوں سے باندھ کر بیدزنی کی سزائیں دیں، کالے پانی بھیجا اور جیل خانوں میں ان کی زندگی موت سے بدتر کر دی گئی۔ جائیدادیں ضبط ہوئیں۔ اس جور و ستم کے باوجود بھی برطانوی وعدے کی وفا میں تاخیر ہوتی چلی گئی تاآنکہ یورپ میں دوسری جنگ عظیم کے آثار ابھرنے لگے۔ برطانوی مدبروں کو ہوش آیا اور انہوں نے فرقہ وارانہ اعلان کے ذریعے اپنا ایک وعدہ پورا کیا اور یہی ایکٹ ۱۹۳۵ء ہے۔

اس کی رو سے ہندوستان کے تمام صوبوں کو اندرونی خود مختاری ملی۔ گورنر صرف آئینی حاکم کی حیثیت سے رہ گئے۔ صوبے کے وزرائے اعلیٰ کے اختیار میں تھا کہ وہ اپنی کیبنٹ

آپ بنائیں۔

اس آئین کے تحت انتخابات "ہنوز دلی دور است" لیکن سیاسی جماعتوں نے ابھی سے اس کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چنانچہ امسال سنٹرل اسمبلی کے الیکشن کی جدوجہد درحقیقت اُسی الیکشن کی ابتدا تھی۔ جو پارٹی اس میں برتری حاصل کرے گی۔ ایکٹ ۱۹۲۵ء کے انتخابات میں نمایاں پوزیشن اسی کی رہے گی۔

انگریزی اقتدار کے خواہاں اور رجعت پسند گروہ بھی برطانوی اشارے پر ڈنٹ پیل رہے تھے۔ مجلس احرار امسال اپنی عمر کے چوتھے سال سے گزر رہی تھی۔ گو اسے آل انڈیا حیثیت حاصل تھی۔ مگر الیکشن کی لڑائی ہنوز اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ دولت سے تہی دامن مخلصین کا یہ ٹولہ ایثار و قربانی کے سوا رکھتا ہی کیا تھا۔ اس پر بھی غیر ملکی حکومت کے علاوہ اپنے اور پرائے کرگسوں کی طرح تاک میں تھے۔ ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش ہیں۔ میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

پنجاب ایک ایسا صوبہ تھا۔ جس کی سیاسی باگ ڈور ان دنوں احرار کے ہاتھ میں تھی۔ اگر وہ تھوڑی سی جدوجہد کرے تو واقعات کی رفتار سے مستقبل کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۲۔ جون کے اجلاس میں سنٹرل اسمبلی کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ انبالہ کی سیٹ پر ڈاکٹر محمد عالم۔ مولانا غلام بھیک نیرنگ پہلے ہی سے امیدوار تھے جبکہ اسی سیٹ پر مجلس احرار نے رانا فیروز الدین وکیل ہشیار پور کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ لیکن آگے چل کر مولانا غلام بھیک نیرنگ کی درخواست پر احرار نے اپنا نمائندہ واپس لے لیا۔ اور پنجاب کے دوسرے اضلاع کے لیے جن میں لدھیانہ۔ امرتسر اور لاہور کا شہری حلقہ شامل تھا۔ خان بہادر حاجی رحیم بخش کے مقابل نومسلم خالد لطیف گابا ایڈووکیٹ لاہور کو احرار کا ٹکٹ دے دیا گیا۔

اول الذکر کو حکومت کے علاوہ مسلم کانفرنس اور یونینسٹ پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔

خالد لطیف گابا پنجاب کے سابق وزیر لالہ ہرکشن لال کا بیٹا تھا۔ یہ ہندو رؤسا میں خاص حیثیت کے مالک تھے۔ کاروبار میں دیوالیہ ہونے پر بیٹے کو

اسلام قبول کرنے کی سوجھی۔ چنانچہ یکم مارچ ۱۹۳۳ء کو اپنی اہلیہ سمیت انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کا نام کنہیا لال گابا کی جگہ خالد لطیف گابا رکھا گیا۔ اور ان کی بیگم کا نام حسن آراء تجویز ہوا۔

چونکہ فطرتاً ہندو تھے۔ لہٰذا اپنا نام پہلے بھی کے۔ ایل۔ گابا لکھتے تھے اور مسلمان ہوئے تو دستخط اسی طرح کرتے رہے۔

مسلمان ہوتے ہی مسٹر گابا نے انگریزی میں حضور سرورِ کائنات صلعم کی سیرت PROPHIT OF DESERT (پیغمبرِ صحرا) لکھی جو کافی مقبول ہوئی۔

گذشتہ سال جب کہ مہاتما گاندھی تحریک اچھوت الدھار شروع کیے ہوئے تھے۔ مسٹر گابا نے انہیں یرودھا جیل میں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے ہوئے لکھا

"آپ جیسی سو قیمتی جانیں بھی ان مظالم کا جو صدیوں سے اچھوتوں پر کیے جا رہے ہیں کفارہ ادا نہیں کر سکتیں۔ پھر آپ اپنی زندگی کو کیوں ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ لہٰذا میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ بمعہ اچھوتوں کے اسلام کے دامن میں پناہ لیں۔ جہاں آپ کو حقیقی اخوت اور مساوات کی بجائے جس کے حصول کے لیے آپ اس قدر سرگرداں ہیں خالص اور سچی اخوت اور مساوات ملے گی۔"

آپ کا نام خالد لطیف گابا ۔۔ مئی ۱۹۲۲ء ۔۔۔۔

۷ مئی ۱۹۳۲ء کو سلطان پور لودھی کے حادثہ پر مظلوم مسلمانوں کی قانونی امداد کے لیے جب مولانا مظہر علی اظہر کو روک دیا گیا تو مسٹر خالد لطیف گابا نے کیو۔۔۔ پہنچ کر ۔۔۔ کی وکالت کی۔

ان سب سے بڑھ کر وہ نو مسلم تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی احرار کا مذہبی فرض تھا۔ احرار اس الیکشن کو بطور ٹیسٹ کیس کے بھی لڑنا چاہتے تھے۔ تاکہ انہیں ۔۔۔ کے لیے اپنی طاقت کا اندازہ ہو سکے۔ یہ بات درکنگ کمیٹی تک محدود تھی۔ اس کا ۔۔۔ پارٹی ۔۔۔ فساد کے خلاف تھا۔

۱۲۔ جون کے فیصلے کا اعلان لاہور میں مجلس احرار نے دہلی دروازے سے ۔۔۔ پہلے

پبلک اجتماع میں کیا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے ورکنگ کمیٹی کے ممبر شیخ حسام الدین نے کہا۔

"ہم مسٹر گاہا کے الیکشن کو بطور آزمائش لڑنا چاہتے ہیں۔ اگر احرار نے یہ سیٹ حاصل کر لی تو آئندہ وہ اس میدان میں آئے گی"

احرار کے سیاسی حریفوں نے یہ بات بڑے نزدیک سے سنی۔ اور تحریک مسجد شہید گنج اس کی صدائے بازگشت تھی (جس کی تفصیل کتاب ہذا کی دوسری جلد میں آئے گی انشاء اللہ)

گھر سے لے کر سلطنتوں کے نظام اور پولیٹیکل پارٹیز کا تمام کاروبار باہم اعتماد پر چلتا ہے۔ یہ آبگینہ اگر ٹھوکر کھا جائے تو اس دراڑ سے ساری عمارت کو نقصان پہنچتا ہے۔

احرار ورکنگ کمیٹی کی یہ تجویز کہ وہ مسٹر گاہا کے انتخاب کو اپنی آئندہ کامیابی کا ابتدائی پتھر سمجھتے ہیں۔ ممبرانِ ورکنگ کمیٹی کے دلوں تک رہنی چاہیے تھی۔ لیکن بڑے آدمی سے غلطی بھی بڑی ہوتی ہے۔

شیخ حسام الدین نے جوشِ خطابت میں بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی جس سے جماعت اور ان کے اپنے اعتماد کو ٹھیس پہنچی۔

تاریخ کی یہ دوسری بڑی لغزش تھی۔ اس سے پیشتر ۱۹۳۱ء میں آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر ڈاکٹر ستیہ پال نے کی تھی۔ انہوں نے ایک راز عوام میں اگل کر بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی لگوایا تھا (اس کی تفصیل گذشتہ اوراق میں آ چکی ہے۔)

دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح مجلس احرار انتخابی مہم کا آغاز کر چکی تھی۔ کہ کپور تھلہ سنٹرل زمیندارہ لیگ نے ریاستی حکام کی تحقیقاتی رپورٹ کو غیر تسلی بخش قرار دیتے ہوئے ریاست میں عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک جاری کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس سے پیشتر ریاست میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہو چکی تھی۔

۱۵۔ اور ۱۶۔ جون کی درمیانی شب کو چودھری عبدالعزیز اور ان کے تمام رفقاء گھروں سے گرفتار کر لیے گئے۔ اس افراتفری نے احرار کی نئی سرگرمیوں میں قدرے رکاوٹ ڈال دی۔ کپور تھلہ کا سنبھلتا ہوا امن از سرِ نو ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ ۱۸۔ جون کو سیشن جج کپور تھلہ نے چودھری صاحب کو پانچ سال قید سخت اور پانچ ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی

نیزان کے والد چودھری فضل احمد کو حکم دیا کہ وہ فوراً اپنا گاؤں چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جائیں۔ ریاست کے اس رویے پر مجلس احرار نے اپنے بیان میں کہا۔

"ریاستی حکام نے چودھری صاحب کے متعلق اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ گذشتہ کئی برسوں سے اپنے عوام کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ ایسے مخلص رہنما کو جیل میں ڈال دینے سے ریاستی عوام کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ حکام کو چاہیے کہ وہ چودھری صاحب کے ساتھ ان کی خواہش کے مطابق سمجھوتہ کریں اور جس قدر جلد ممکن ہو ریاست میں ذمہ دار اسمبلی قائم کریں جبکہ حکومت خود بھی اس کا اعلان کر چکی ہے۔ اس مطالبے کو فوراً مان لیا جائے اور چودھری صاحب کو رہا کر دیا جائے۔"

اس بیان کے فوراً بعد ریاست میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ قانون ریاستہائے متحدہ کے تحت جالندھر کے مجسٹریٹ نے احرار رضاکاروں پر پابندی لگا دی کہ کوئی قافلہ ریاست کی حدود میں داخل نہ ہو۔ کپورتھلہ میں مارشل لا کے ساتھ قانون تحفظ والیان ریاست بھی نافذ کر دیا گیا اور اس کے لیے انگریز جنرل انسپکٹر پولیس کو متعین کر دیا گیا۔

بنگھووال میں چودھری صاحب کی تمام جائیداد ضبط کر لی۔ ان کے بھائی چودھری عبدالرشید ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور کپتان عزیز احمد کو سرکاری ملازمت سے برطرف کر دیا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے چودھری عبدالعزیز نے بطور احتجاج جیل میں بھوک ہڑتال کر دی۔ اس پر چودھری صاحب کے والد نے ۲۰ جون کو بیرن میں مہاراجہ کے نام ایک تار میں کہا۔

"چونکہ میرے لڑکے گزیٹڈ آفیسر ہیں۔ وزیر اعظم انہیں مہاراجہ کی منظوری حاصل کیے بغیر ملازمت سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا فوراً مداخلت کی جائے۔"

اس تار کی ایک نقل گورنر جنرل حکومت ہند کو روانہ کی گئی۔

گاندھی جی مان گئے

دانشمندی اسی میں ہے کہ رائے سے اختلاف کے باوجود مخالف کی بات کا وزن کیا جائے۔ اگر اس کا کوئی پہلو مفید اور کارآمد ہو تو اسے محض اس لیے رد نہیں کر دینا چاہیے کہ یہ مخالف کی رائے ہے، بلکہ اسے قبول کر لینا چاہیے۔

پھول کانٹوں کی طرف سے آئیں یا صحرا سے ان کی حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ متحدہ ہندوستان کے پولیٹکس میں یہ ریت گرہ پکڑ چکی ہے کہ اپنے اکھاڑے سے باہر کی رائے کو تسلیم کر لینا اپنی توہین ہے، حالانکہ یہ ذہنی کمزوری ہوتی ہے۔

۱۹۳۱ء میں احرار نے ریاستی حکمرانوں کے خلاف محاذ آرائی کی تو گاندھی سمیت تمام کانگریسی احرار سے ناراض ہو گئے۔ حالانکہ یہ لڑائی اس نہج پر تھی جس طرح آل انڈیا کانگریس انگریز سے لڑ رہی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ انگریز غیر ملکی سامراج تھا اور دیسی ریاستوں کے رئیس اپنی ہی رعایا کا خون چوس رہے تھے۔ احرار چونکہ ہندو راجاؤں سے ٹکرا رہے تھے اس لیے بھی مجرم تھے۔ اور ایک سال بعد یہی لڑائی کانگریس نے جب ریاست راجکوٹ سے لڑی تو کانگریس حق بجانب ٹھہری۔

برطانوی وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ اعلان پر مجلس احرار نے دو حیثیتوں سے غور کیا۔ اول یہ کہ ہندوستان کے نزدیک اس اعلان کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ ایک کھلونا ہے جو دلفریب رنگ و روغن سے آراستہ کیا گیا ہے۔ دوسری رائے یہ تھی کہ کہ مسلم مفاد کے پیش نظر اس اعلان کو کسی بہتر تجویز کے آنے تک قبول کر لیا جائے۔ نیز تمام مسلمان جماعتوں کی بھی یہی رائے تھی۔ جبکہ کانگریس نے اپنے متعدد اجلاسوں میں برطانوی اعلان کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ اس پر سال رواں میں جوتے دے ہوئی۔ برطانوی مفاد کو اس سے فائدہ پہنچا تھا۔ آخر ۱۴۔ جون ۱۹۳۴ء کو اخبار ٹربیون کے نمائندہ نے الہ آباد سے اطلاع دی کہ۔

"مہاتما گاندھی نے پنڈت مالوی کو ایک خط کے ذریعے اطلاع دی ہے کہ جب تک کوئی باہم فیصلہ نہ ہو جائے موجودہ حالات میں فرقہ وارانہ فیصلے

کو بہرحال قبول کر لینا چاہیے۔ اگر آگے چل کر کوئی مفاہمت ہو جائے تو
فرقہ وارانہ فیصلہ ختم کیا جا سکتا ہے۔ ۵

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

۱۰۔ جون کو آل انڈیا کانگریس نے اپنے بمبئی کے اجلاس میں گاندھی جی کی رائے کی تصدیق کر دی۔

کانگریس اور گاندھی جی کے نئے فیصلے کے ایک ہفتہ بعد ۲۹۔ جون کو گاندھی جی کی ٹرین کے نیچے بم رکھ دیا گیا۔ وہ اس حادثہ میں بال بال بچ گئے۔ یہ واقعہ سفر کے دوران پیش آیا جبکہ وہ بہار جا رہے تھے۔ اس سے پیشتر انہیں مہاراشٹر کے ایک مقام پر اجتماع میں بم مار کر ہلاک کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ ان حملوں میں سناتن دھرم ہندوؤں کا ہاتھ تھا۔

(نوٹ) تا دمِ تحریر چودھری عبدالعزیز کی بھوک ہڑتال کا چھٹا روز تھا۔

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ —— جاری ——

جولائی ۱۹۳۴ء سے جون ۱۹۴۰ء تک

مضامین کی فہرست

- قادیاں میں احرار کانفرنس۔
- تحریک کپور تھلہ کے نتائج۔
- تحریک ریاست بہاول پور مسٹر جی۔ڈی۔کھوسلہ کا فیصلہ
- تحریک مسجد شہید گنج۔
- تحریک مدح صحابہ۔
- قادیاں میں نماز جمعہ پر پابندی۔
- دوسری جنگ عظیم۔
- تحریک پاکستان کی ابتداء۔
- کلہاڑی اور بیلچہ۔
- شعراء حریت۔

نیز

دیگر

عنوانات

(زیر طبع)

کاروانِ احرار

جلد دوم

مصنف کی دوسری تصانیف

کاروانِ احرار (جلد دوم)

(تاریخ آزادی برصغیر)

قیمت -/۲۰ روپے

بڑھتا ہے ذوقِ جرم

جیل خانوں کی کہانی -/۴ روپے

تارِ گریباں

جانباز مرزا کا مجموعہ کلام -/۳ روپے

جانباز پاکٹ بک

مرزائیت کا سیاسی محاسبہ -/۳ روپے

ملنے کا پتہ

مکتبہ تبصرہ ۲۔ گلشن کالونی شاد باغ لاہور